٦٦

وبھوتی نرائن رائے

خالد طور

شمس الحق عثمانی

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج: پہلی جلد

ترتیب: اجمل کمال

Rs.795

ارشد محمود

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

Rs.200

تیسری جنس

مؤلف: اختر حسین بلوچ

Rs.200

ہوشنگ گلشیری

شہزادہ احتجاب

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.70

افضال احمد سید

مٹی کی کان

Rs.500

Scanned with CamScanner

ترجمہ:

زیبا علوی

۲۲

ترتیب: اجمل کمال

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 66

فروری 2010

سالانہ خریداری:
پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 600روپے (بشمول ڈاک خرچ)
بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 60امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:
پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 35213916 35650623
ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:
Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

آج کی نئی کتابیں

آج
(پہلی جلد)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.795

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ
ارشد محمود
Rs.200

تیسری جنس
سندھ کے خواجہ سراؤں کی
معاشرت کا ایک مطالعہ
مولف: اختر حسین بلوچ
Rs.200

شہزادہ احتجاب
(ناول)
ہوشنگ گلشیری
فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.70

ریت پہ بہتا پانی
(شاعری)
قاسم یعقوب
Rs.160

اردو کا ابتدائی زمانہ
(تنقید و تحقیق)
(تیسرا ایڈیشن)
شمس الرحمٰن فاروقی
Rs.250

امید اور دوسرے خطرناک مشاغل
(ناول)
لیلیٰ العلمی
انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن
Rs.100

انگی کے دیس میں
(ناول)
ولاس سارنگ
مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال
Rs.150

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

کراچی کی کہانی
(جلد اول و دوم)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.1100

ریت پر لکیریں
(انتخاب)
محمد خالد اختر
Rs.300

قرۃ العین حیدر کے خطوط
ایک دوست کے نام
ترتیب: خالد حسن
Rs.180

انیس
(سوانح)
نیر مسعود
Rs.375

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.150

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

لغاتِ روزمرہ
(تنقید و تحقیق)
شمس الرحمن فاروقی
Rs.250

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سید رفیق حسین
Rs.375

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.280

کافکا کے افسانے
(افسانے)
نیر مسعود
Rs.70

Scanned with CamScanner

ترتیب

وبھوتی نرائن رائے

7

تبادلہ

(ناول)

❁

خالد طور

225

برچی

(ناولا)

❁

شمس الحق عثمانی

295

ابوالفضل صدیقی کی کہانیاں: فہم و نظر کا اسپلاش

Scanned with CamScanner

سٹی پریس میں دستیاب اردو رسائل و جرائد

سہ ماہی نقاط، فیصل آباد
مدیر: قاسم یعقوب
قیمت: 150 روپے

سہ ماہی دنیازاد، کراچی
مدیر: آصف فرخی
قیمت: 160 روپے

سہ ماہی آئندہ، کراچی
مدیر: محمود واجد
قیمت: 80 روپے

بادبان، کراچی
مدیر: ناصر بغدادی
قیمت: 200 روپے

سہ ماہی ارتقا، کراچی
ترتیب: راحت سعید، ڈاکٹر محمد علی صدیقی
قیمت: 100 روپے

سہ ماہی روشنائی، کراچی
مدیر: احمد زین الدین
قیمت: 250 روپے

سہ ماہی سمبل، راولپنڈی
مدیر: محمد علی فرشی
قیمت: 150 روپے

کتابی سلسلہ اجرا، کراچی
مدیر: احسن سلیم
قیمت: 250 روپے

کتابی سلسلہ مکالمہ، کراچی
مدیر: مبین مرزا
قیمت: 350 روپے

شعر و حکمت، حیدرآباد دکن
مدیر: شہریار، مغنی تبسم
قیمت: ضخامت کے اعتبار سے

سہ ماہی نیا ورق، ممبئی
مدیر: ساجد رشید
قیمت: 120 قیمت

سہ ماہی اردو، کراچی
مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان
قیمت: 100 قیمت

ماہنامہ قومی زبان، کراچی
مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان
قیمت: 15 روپے

ماہنامہ الحمراء، لاہور
مدیر: شاہد علی خان
قیمت: 50 روپے

ماہنامہ نیا زمانہ، لاہور
مدیر: محمد شعیب عادل
قیمت: 20 روپے

Scanned with CamScanner

وبھوتی نرائن رائے

تبادلہ

ہندی سے ترجمہ

زیبا علوی

Scanned with CamScanner

انیسویں صدی کے نصف وسط میں برصغیر پر انگریزوں کے نوآبادیاتی تسلط کا جب ایک نیا مرحلہ شروع ہوا تو انھوں نے اس خطے کو معاشی طور سے برطانیہ کی معیشت سے جوڑنے کے عمل کا آغاز کیا۔ جس کے تحت یہاں کی زرعی [illegible] کاشت اور پیداوار [illegible] جو برطانیہ کی بڑھتی ہوئی صنعتی معیشت کو درکار تھیں اور انھیں بندرگاہوں تک پہنچانے اور سمندری راستے برآمد کرنے کا پورا انتظام تیار کیا جاتا تھا۔ تب ہی بڑے پیمانے پر ان منصوبوں کی بھی شروعات ہوئی جنھیں 'ترقیاتی' و 'تعمیراتی' سرگرمیوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بندرگاہوں، سڑکوں، پلوں، آبپاشی کی نہروں اور مواصلاتی نظام کو تعمیر کرنے کے مقصد سے نوآبادیاتی حکمرانوں نے جو ادارہ قائم کیا جو پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ (PWD) کہلاتا ہے۔ یہ ادارہ ان افسروں اور اہلکاروں پر مشتمل ہے جنھیں [illegible] انجینئر، ورک ایجنٹ اور ٹھیکہ کریٹ کہا جاتا ہے اور جو ان تمام تعمیراتی کاموں کی نگرانی پر متعین کیے جاتے ہیں۔ تعمیراتی اور ترقیاتی کاموں کے لیے ٹھیکیدار نامی مخلوق کو وجود میں لایا گیا جو مقامی مزدوروں کو شروع شروع میں بیگار کے روایتی طریقے کے تحت اور بعد میں قلیل معاوضے پر بھرتی کر کے پی ڈبلیو ڈی کے نگراں ان کاموں کو سرانجام دینے لگے۔ اس عمل کے نتیجے میں ٹھیکیدار اور اس کی نگرانی پر متعین سرکاری اہلکار کا اہم اور دلچسپ گٹھ جوڑ وجود میں آیا جس نے گہرے سماجی اثرات مرتب کیے۔ یہ پورا نظام جوں کا توں آج بھی قائم ہے فرق صرف یہ آیا ہے کہ اس گٹھ جوڑ میں ایک تیسرے اور با اثر فریق کے طور پر (منتخب و غیر منتخب) سیاست کار (وزیر اور ان کے متوسلین) بھی شامل ہو گئے ہیں۔

ہندی کے معروف ادیب وبھوتی نارائن رائے کے طنزیہ ناول تبادلہ کا موضوع یہی نظام اور اس کے مختلف کردار ہیں۔ جن سب کو مصنف نے اپنی قوت مشاہدہ اور طنز کی نشتریت سے بھرپور کام لیتے ہوئے نہایت ہی [illegible] مختصر ناول میں تحریر کیا ہے۔ رائے 1950 میں مشرقی یوپی میں پیدا ہوئے، بنارس اور الہ آباد میں تعلیم پائی۔ انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد انھوں نے پولیس سروس میں ملازمت کر لی۔ [illegible] جنرل ریٹائر ہونے کے بعد اب وہ وردھا کی مہاتما گاندھی یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔

وبھوتی نرائن رائے کا ناول شہر میں کرفیو اردو میں ایک سے زیادہ بار شائع ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ ان کے ناول [illegible] شائع ہو چکے ہیں گھر، قصہ لوک تنتر اور پریم کی بھوت کتھا۔ ان کے علاوہ انھوں نے ہندو مسلم فسادات میں ہندوستانی پولیس کے کردار کے موضوع پر ایک جرأت مندانہ کتاب بھی تحریر کی ہے۔

Scanned with CamScanner

سر پر کمبھ اور تبادلہ اگر محاورے کی زبان میں کہا جائے تو شری کملا کانت ورما، جنھیں شعبے کے ایگزیکیٹیو انجینئر محکمہ تعمیرات ہونے کے ناطے یہ کیفیت کسی جنت سے کم نہ تھی۔ آخر تو رہا اختتام اور کمبھ میلے کا موسم اپنے عروج پر تھا۔ زیادہ تر کاموں کے ٹینڈر مکمل ہو چکے تھے۔ کچھ کام پورے ہو چکے تھے، کچھ ابتدائی مراحل میں تھے۔ میلے کے علاقے کی سڑکیں تقریباً بن چکی تھیں اور پلوں کے لیے ٹین کے پیپے ندی کے کنارے پہنچ گئے تھے۔ بلیاں، شامیانے، چیک پوسٹس وغیرہ کے ڈھیر گنگا جمنا کے کنارے پڑے تھے۔ میلے کے علاقے میں جیپ پر سوار ہو کر جب بھی کملا کانت نکلے تو تقریباً ہر مرتبہ بند کے پر کہیں گاڑی رکوا کر سارے پھیلے ہوئے سامان پر ایک تسلی بخش نظر ڈالتے۔ ان چیزوں سے ٹکراتی ہوئی ہوا کو وہ گہری سانس کھینچ کر اپنے پھیپھڑوں میں بھرتے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے سرکاری نوٹ چھاپنے کی مشینوں سے ٹکرا کر آ رہی ہو یہ ہوا۔ ٹھنڈک اور تازگی بخشنے والی۔

ایسے وقت میں تبادلہ، اتنا کچھ خرچ کر کے وہ یہاں آئے ہیں، ابھی تو دسواں حصہ بھی نہیں نکلا۔ کیفیت کی بات تو دور رہی۔ اسی لیے کملا کانت ورما، جنھیں دفتر میں سب بڑے صاحب کہتے ہیں، دل برداشتہ ہیں۔ دراصل کمرہ بند کر کے اپنے خاص ماتحتوں کے ساتھ اس حکم نامے پر صلاح مشورہ کر رہے ہیں جسے ابھی ابھی صدر دفتر سے ایک چپراسی تھما گیا تھا۔

کمرے میں ورما صاحب کے علاوہ چار لوگ اور تھے۔ یہ چاروں افراد مختلف وجوہات کی بنا پر وہاں موجود تھے۔ وہاں ان چاروں کی موجودگی کی ہر ایک خاص وجہ تھی۔ بالائی سطح پر دفتر میں اہم تبدیلی ہونے جا رہی تھی اور یہ بالائی سطح کی قیادت کے ہمنوا تھے۔ دفتر شاہی میں بھی سیاست کی طرح ان تبدیلیوں کے رونما ہوتے ہی منہ پھیرنے کا رواج شروع ہو چکا تھا، مگر یہ لوگ پرانے وفادار

لگتے تھے، جو تبادلے کا حکم آنے کے باوجود بھی صلاح مشورہ دینے کے لیے موجود تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چھوٹے موٹے بنانا رپبلکوں کی طرح یہاں بھی ابھی سب کچھ غیر یقینی تھا۔ تختہ پلٹ بھی سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاہِ وقت دشمن کے ہاتھی گھوڑوں کو روندتا ہوا واپس قلعے پر قابض ہو جائے۔ ویسے بھی اس صوبے میں نوکرشاہی کے تبادلوں کے احکامات نیلام ہوتے تھے۔ دن میں چار بار بھی ان میں تبدیلی ہو سکتی تھی۔ جو بھی وجہ ہو، یہ چاروں لوگ تبادلے کا حکم آنے کے بعد بھی وہاں تھے اور حکم نامے کو بار بار الٹ پلٹ کر پڑھ رہے تھے۔ سرگوشیاں کر رہے تھے اور بڑے صاحب کو بھی قیمتی آرا سے مستفیض کر رہے تھے۔

ورما صاحب سے بائیں طرف تھے رضوان الحق جو اس دفتر میں اسسٹنٹ انجینئر تھے۔ پچاس کے پیٹے میں پہنچ کر ان کا جسم بیماری اور صدمات کی وجہ سے ڈھل چکا تھا۔ پیشانی کے اوپر آدھی صفاچٹ چاند کی وجہ سے ان کی پوری شخصیت گمبھیر قسم کی لگتی تھی۔ وہ کم بولتے تھے اور بغیر مانگے بھی رائے نہیں دیتے تھے۔ دفتر میں کوئی بھی بڑا صاحب آ جائے، ان کی اسی عادت کی وجہ سے انھیں اپنا رازدار بنا لیتا تھا۔ لوگوں کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ کبھی کسی ایگزیکٹیو انجینئر سے ان کی ان بن ہوئی ہو۔

جب کملا کانت ورما یہاں آئے تو کچھ دنوں تک ان سے بھڑکتے رہے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ سابق افسر کے قریب تھے اور ماضی میں جب ورما اسی طرح کا حکم نامہ لے کے لکھنؤ سے روانہ ہوئے تو ان کے سابق افسر نے اپنے بنگلے پر جو ایک ایمرجنسی میٹنگ کال کی تھی، اس میں بھی وہ شریک ہوئے تھے۔ دفتر میں کچھ دنوں تک حق صاحب کو بے چین دیکھا گیا۔ ان کے مخالفین نے چٹخارے لے لے کر حقیقی، نیم حقیقی، تصوراتی خبریں نشر کرنا شروع کر دیں کہ حق صاحب کو کس کس طرح بڑے صاحب کے کمرے میں گھسنے سے پہلے تین گھنٹے انتظار کرنا پڑا، یا یہ کہ ان کے پاس اب کوئی اہم اسائنمنٹ نہیں رہا، یا یہ کہ جلد ہی بڑے صاحب انھیں ڈیزائن سیکشن میں شفٹ کرنے والے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

حق صاحب ان ساری افواہوں سے گھبرائے نہیں۔ دفتر کے تجربہ کار بابوؤں کی طرح انھیں بھی یہ معلوم تھا کہ یہ تو ایک غیر مستحکم دور ہے، یہ ہر بار نئی سطح پر تبدیلی کے ساتھ آتا ہے، پھر چند مہینوں میں سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اس مرتبہ بھی یہی ہوا۔ کبھی عید پڑی، کبھی بقرعید۔ حق صاحب

Scanned with CamScanner

کی بیگم اچھا مرغ پکاتی تھیں اور بڑے صاحب کی بیوی کھانے کی شوقین تھیں۔ پچھلی عید پر حق صاحب بڑے صاحب کے سرد مہری کے رویے کے باوجود جو انھیں مبارکباد پیش کرنے کے موقعے پر جھیلنا پڑا تھا، دوپہر سے ہوتے ہوئے بولے، "سر، میری فیملی کی بڑی خواہش تھی کہ میڈم اور بچے ہمارے غریب خانے پر تشریف لاتے، مگر آپ اتنے بزی رہتے ہیں کہ عرض کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ اب میں خود ہی حاضر ہوا ہوں۔ بیگم نے اپنے ہاتھ سے مرغ پکایا ہے، امید ہے بچوں کو پسند آئے گا۔"

مرغ بچوں کو خوب پسند آیا، پر بڑے صاحب کی پیشانی ابھی کھٹک رہی تھی۔ آنے والے دنوں میں بھی حق صاحب کی بیگم صاحبہ کسی نہ کسی موقعے پر مرغے یا بکرے کی کوئی لذیذ ڈش بنا کر بھیجتی رہیں۔ مخالف کیمپ کا چپراسی بڑے صاحب کے گھر پر تعینات تھا۔ اس سے بات کھلی تو یہ کیمپ چوکنا ہوا۔

ایک شام جب دامن کیریئروں میں بھر کر مٹن قورمہ، چکن مغلئی، مٹن یخنی اور تکہ کباب جیسی چیزوں کے ساتھ جونی واکر بلیک لیبل کی بوتل اس اصرار کے ساتھ بھیجی گئی کہ "یہ میرا سالا کل ہی عرب سے آیا ہے، وہی ایئرپورٹ سے میرے لیے ڈیوٹی فری کاؤنٹر سے لایا۔ اب میں نے تو چھوڑ رکھی ہے۔ سادہ طبیعت ہوں، ہاتھ نہیں لگاتا۔ بیگم نے کہا، بڑے صاحب اس کی قدر جانتے ہیں، انھیں یہ بھجوا دو۔ ساتھ میں تھوڑا سا ویجیٹیرین بچوں کے لیے لیتے جاؤ۔ پتا نہیں کیسا ہے، بیگم صاحبہ نے کبھی رکھنے نہیں دی۔" مخالف کیمپ متحرک ہو گیا۔ جاسوس چھوڑے گئے، اور جو خبر لائے گئے، اس سے اس کیمپ کی باچھیں کھل گئیں۔

دوسرے دن بڑے صاحب کے کمرے میں اسٹاف میٹنگ کے دوران جب چائے کا وقفہ ہوا تو ہلکی پھلکی باتوں کے درمیان اسسٹنٹ انجینئر گپتا نے ایک بے ضرورت حق صاحب سے پوچھ لیا، "جناب کی کوک کب سے رکھے ہیں حق صاحب؟ کب تک ساؤتھ انڈین کے ہاتھ کا کھانا کھائیں گے؟"

حق صاحب نے چونک کر دیکھا۔ وہ پڑھے کم تھے مگر ماحول کا نازکی سے ادراک کرتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ بڑے صاحب کو مخالف کیمپ یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ پچھلے دو مہینے سے ان کی بیوی اپنے میکے حیدرآباد گئی ہوئی ہیں اور وہ کریم ہوٹل سے مرغ وغیرہ منگا کر بیگم کے نام پر بڑے صاحب کو کھلا رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

بڑے صاحب نے چائے کا پیالہ نیچے رکھا اور ملنے سے چشمہ ہاتھ میں لے کر اسے رومال سے پونچھنے لگے۔ "بیگم تو بارہ بنکی اور یہاں کے بیچ چکر لگایا کرتی ہیں۔ دراصل سر، جب سے فادر ان لا کی طبیعت خراب ہوئی ہے، انھیں دو جگہ کے انتظام دیکھنے پڑ رہے ہیں۔ ایک ہی بھائی ہے ان کا، جو سعودی عرب میں ہے۔ زمینداری ہے، چھوڑی بھی نہیں جا سکتی، بیگم کو ہی دیکھنی پڑ رہی ہے۔ کل سالا انھیں لے کر آیا تھا۔ آج پھر واپس گئے ہیں وہ لوگ۔"

مخالف کیمپ کے لوگ اس طرح مسکرائے کہ کسی اور کو مسکراہٹ دکھائی دے نہ دے، بڑے صاحب کو ضرور دکھائی دے۔

اپنے ملک میں پچھلے کچھ سالوں میں اور کوئی ترقی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، پر الیکٹرانک ایکسچینجوں کی بہار ضرور آ گئی ہے۔ محلے محلے میں کھلے پی سی اوز میں سے ایک بارہ بنکی کے لیے متحرک ہوا اور دیر گئے رات تک بیگم حق شہر میں حاضر ہو گئیں۔ مخالف کیمپ والوں کو زور کا دھچکا لگا جب انھیں معلوم ہوا کہ میم صاحبہ کی بیماری کی خبر سن کر، جو کہ بالکل بے بنیاد تھی، بیگم صاحبہ بڑے صاحب کے گھر اگلے دن دوپہر کو حال چال پوچھتی دیکھی گئیں۔ ساتھ میں پچھلے دن سے بڑا ٹفن کیریر تھا۔

بعد میں، جیسا کہ پچھلے کئی موقعوں پر ہوا تھا اور دفتر کے تجربہ کار بابو پہلے سے جانتے تھے، ویسا ہی ہوا۔ وہ بڑے صاحب کی خیر خواہ ٹیم کے ممبر بن گئے، اور اسی حیثیت میں آج کے صلاح مشورے میں شامل تھے۔

کمرے میں بڑے صاحب کی داہنی جانب بیٹھے ہوئے شخص کی موجودگی کی وجہ بڑی ہی دلچسپ تھی۔ چھوٹے چھوٹے بال، گینڈے جیسی گردن اور ٹوٹے ہوئے کان والے ان حضرت کو کسی اکھاڑے میں ہونا چاہیے تھا۔ وہ دفتر میں تھے، پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ زندگی کے متعلق ان کی سوچ کا لب لباب تھا کہ یہ زندگی بجائے خود ایک اکھاڑا ہے۔ وہ کبھی بھی، کہیں بھی کشتی لڑنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ چونکہ اپنی زندگی کا بیش قیمت حصہ وہ دفتر میں گزارتے تھے، اس لیے اپنی موجودہ زندگی کی زیادہ تر کشتیاں بھی وہ وہیں لڑتے تھے۔ افسران کے ساتھ بات چیت کرنے والوں کو ان سے کشتی کے اس فن کو جاننے کا ایک بہت اچھا موقع ملتا تھا۔ دھوبیا پاٹ ان کا پسندیدہ داؤ تھا، دفتر کے برآمدے میں اگر کوئی کارندہ، ٹھیکیدار یا ملاقاتی لنگڑاتا ہوا دکھائی دے جاتا تو خیر بتانے

ہوئے لوگ سمجھ جاتے کہ وہ شخص ان سے کسی بہت سنجیدہ قسم کے موضوع پر تبادلۂ خیال کر کے جا رہا ہے۔

دھورو لال یادو ایسے ہی حضرت جونیئر انجینئر تھے اور ڈاکٹر رگھوبیر جیسے خوشیلے ہندی پریمیوں کی محنت کو واضح بتاتے ہوئے لوگ انھیں جونیئر انجینئر نہ کہہ کر "جے ای" کہتے تھے۔ وہ جے ای تھے، اس لیے جب تک بولتے یا لکھتے نہیں تھے، لوگ یہی سمجھتے کہ انھوں نے سول انجینئرنگ میں ڈپلوما ضرور حاصل کیا ہوگا۔ جیسے ہی ان کے مبارک ہونٹوں سے کوئی جملہ نکلتا یا وہ کاغذ پر اپنے پیشے سے متعلق کوئی چیز لکھتے، سامنے والا سمجھ جاتا کہ وہ بھی ان فنکاروں میں سے ایک ہو سکتے ہیں جنھیں ہمارے ماہرینِ تعلیم اسکول، کالج، یونیورسٹی یا پولی ٹیکنیک کے نام سے پکارتے ہیں اور جو ہزاروں سال سے ہر سال لاکھوں کی تعداد میں دھورو لال جیسے ہونہار بناتے رہے ہیں۔ انھوں نے پالی ٹیکنیک میں پڑھائی کے علاوہ استعمال ہونے والے دو طریقوں میں سے ایک کا استعمال کر کے ڈپلوما حاصل کیا تھا۔ اور ان کا اپنا وضع کردہ طریقہ ڈپارٹمنٹ میں بھی بہت کام آتا ہے۔ انھیں نوکری کے شروع کرتے ہی اس کا خوب اندازہ ہو گیا تھا۔

دھورو لال یادو کے سامنے زندگی کے اولین مقاصد بہت واضح تھے۔ ان کے باپ منجھولے درجے کے کاشتکار تھے اور تقریباً بیس عدد کالی بھینسوں کی خدمت گزاری کے سبب اپنے خاندان کو اوسط درجے کے ہندوستانی کسان کی زندگی سے بہتر زندگی دے رہے تھے، لیکن دھورو لال اپنے ماحول کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی حوصلہ مند تھے۔ ٹخنے ٹخنے تک گوبر میں ڈوب کر کالی بھینسوں کی خدمت کرنا اور شام کو کان پر ہاتھ رکھ کر برہا گانا، صرف ان دو کاموں تک روایتی زندگی کو محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے، لہٰذا انھوں نے پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ باپ کے بہت سے بچے تھے۔ زمانہ بھی بدل رہا تھا۔ اپنے لیے اب "کالا اکشر بھینس برابر" سنتا باپ کو کھٹکنے لگا تھا۔ اس لیے ایک لڑکے کا پڑھنے کی طرف رجحان اس کے لیے خوشی کی بات تھی۔ اس نے اوپری دل سے "سسری مہنگائی" کا رونا ضرور رویا لیکن دھورو لال کو شہر بھیج دیا۔

بچپن سے ہی دودھ گھی کا کھلا کھانے اور باپ کے پسندیدہ محاورے کے مطابق جوتا مار کر گنّا کھانے میں جھیل دیے جانے کے باعث دھورو لال ایک عمدہ کسرتی بدن کے مالک تھے۔ ان کا

Scanned with CamScanner

قد چھ فٹ سے کچھ اوپر تھا، دونوں طرف کے کان ٹوٹے ہوئے تھے، رنگ گندمی اور آواز بے حد بے ہنگم تھی۔ یہی ساری چیزیں ان کی پونجی تھیں۔ سب سے پہلے یہ پونجی پالی ٹیکنیک میں کام آئی۔

پالی ٹیکنیک میں پہنچنے کے پہلے دو تین ہفتے میں ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ قومی زبان ہندی میں چھپی درسی کتابیں ان کے لیے یونانی اور لاطینی کی اعلیٰ شاعری کی کتابوں کے مانند تھیں۔ دھورو لال یادو کے ایماندار دل نے انھیں صلاح دی کہ بھاگ چل پیارے! کہاں پھنس گیا؟ زندگی ان کتابوں سے پرے زیادہ خوش کن ہے۔ درجہ آٹھ میں کسی شاعر نے، جس کا نام ظاہر ہے کہ وہ بھول چکے تھے، صحیح لکھا تھا کہ ''آہ! گرام جیون بھی کیا ہے، کیوں نہ اسے سب کا من چاہے۔'' لیکن کاش پچھلی دودھ دہی گھی کے ساتھ ساتھ بھوسہ، گوبر اور باپ کے جوتے کا ایک رنگین فلیش بیک کی طرح سامنے آتا کہ وہ تو وہ، ان کا ایماندار دل بھی کانپ اٹھتا۔ انھوں نے اپنے دل کی ان سنی کر دی اور کامیابی کے گر دوسری جگہ تلاش کرنے شروع کر دیے۔

ہندوستانی سوسائٹی میں برادری ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ دھورو لال کے کام بھی یہی طاقت آئی۔ پہلے ریگنگ (ragging) کے وقت بھی یہی طاقت ان کے ساتھ رہی۔ ریگنگ سے تو ان کا ڈیل ڈول اور ٹوٹے ہوئے کان بھی نمٹ لیتے، مگر پڑھائی میں معاملہ کچھ دوسرا تھا۔ ان کی برادری کے سینیئروں نے ان کو بتایا کہ صوبے کے دوسرے پالی ٹیکنیکوں کی طرح اس پالی ٹیکنیک میں بھی کامیابی کے لیے پڑھائی کے علاوہ دو راستے تھے۔ پڑھائی تو خشک قسم کے طالب علم کرتے تھے۔ نتیجتاً دھورو لال کو تو باقی دو راستوں میں سے ایک کو چننا تھا۔

پہلا راستہ تھا طاقت کے برتے پر، اور دوسرا تھا دولت کے بل بوتے پر۔ طاقت کے بل بوتے پر پہنچنے والے طلبہ لاٹھی یا چاقو میز پر رکھتے اور آرام سے کتابیں کھول کر نقل کرتے۔ ان طاقتور طالب علموں کی صلاحیت و اہلیت سال کے شروع ہی میں پہچان لی جاتی اور اساتذہ کا کوئی نہ کوئی گروپ ان کے سر پر نرم ہاتھ رکھ دیتا۔ طاقت کے بل بوتے پر یہ گروہ اپنے مخالف اساتذہ کو پٹواتا یا گالیاں دلواتا رہتا اور امتحان میں انھیں پرچہ آؤٹ کرانے سے لے کر چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر جواب لکھ کر پہنچانے تک کا کام کرتا۔

دوسرا راستہ تھا دولت کی طاقت کا۔ جس وقت دھورو لال پالی ٹیکنیک پہنچے، ہندوستانی سماج میں

Scanned with CamScanner

بہت کچھ بدل رہا تھا۔ تعلیم کی دنیا بدل رہی تھی اور اس سے جڑے استاد بدل رہے تھے۔ وہ دوست محمد طالب علموں سے ایک اچھی رقم وصول کر کے انھیں دوڑ سے پہلے ہی آگے کر دیتے۔ آج کے استاد کا وہ کردار نہیں رہا تھا کہ غریب طالب علم اپنے انگوٹھے کا نذرانہ انھیں پیش کر دے۔ پرنسپل اور کالج کے منیجروں نے نقل کو ایک مستقل روزگار کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ ہر چیز کے ریٹ مقرر ہو گئے تھے۔ اگر انھیں مقررہ کمرۂ امتحان میں نقل کرانی تھی تو اس کی ایک قیمت تھی۔ کسی الگ کمرے میں بیٹھ کر کسی مددگار سے امتحان کی کاپی لکھوانا ہوتا تو اس کی دوسری قیمت تھی، اور اگر کوئی طالب علم چاہتا تھا کہ اسی سبجیکٹ کا استاد اس کے پاس کھڑا ہو کر امداد دے تو اس کی فیس سب سے مختلف تھی۔

دھوروا لال نے پہلا راستہ چنا۔ وہ ایک ایک کر کے سارے درجے پاس کرتے گئے۔ یہ طریقہ امتحان پاس کرنے کے علاوہ نوکری میں بھی ان کے کام آیا۔ شروع میں جب وہ اس دفتر میں آئے ان کا سراپا پہلے ہی یہاں پہنچ چکا تھا۔ اپنے مضبوط گٹھے جسم اور کرخت لہجے کے ساتھ وہ ایک نئی اسٹیبلشمنٹ عنصر بن کر اس دفتر میں گھسے۔ تقرر نامے کے مطابق جس وقت انھیں یہاں ہونا چاہیے تھا اس سے وہ صرف پانچ مہینے لیٹ تھے۔ ہوا یہ کہ سرکاری نوکری سے پہلے انھیں کسی دوسرے ملک میں نوکری دینے کا جھانسہ کسی ایجنٹ نے دیا تھا۔ اس طرح اس سرکاری نوکری کا تقرر نامہ وہ جیب میں رکھے باہر کی نوکری کے لیے دوڑتے رہے اور آخر میں وہیں سے پانچ مہینے بعد اس دفتر میں پہنچے۔ تب ان کے اور بڑے بابو کے درمیان بہت ہی تو تو میں میں بحث چھڑ گئی۔ بڑے بابو کے مطابق کوئی بھی تقرر نامہ کسی خاص مدت کے لیے ہی [illegible] ہوتا ہے۔ پانچ مہینے تک۔ ان کے مطابق دھوروا لال یادو کو پٹنہ سے جا کر نئے تقرر نامے ہی کی نوکری لانا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس دھوروا لال اس بات پر مصر تھے کہ ایک بار تقرر نامہ ملنے کے بعد ریٹائرمنٹ کی عمر تک بحال رہتا ہے۔ انھوں نے بڑے بابو کو چیلنج بھی کیا کہ وہ ایک بھی قانون ایسا دکھائیں جس کے مطابق کوئی بھی تقرر نامہ پانچ مہینے کے بعد منسوخ ہو جاتا ہے۔ بڑے بابو کوئی بھی ایسا قانون نہیں دکھا پائے۔ پھر بھی بڑے بابو کو آزمائش سے کاٹنے کے لیے انھوں نے بہت اچھے لہجے میں التجا کی کہ انھیں پانچ مہینے پہلے کی مقرر کردہ تاریخ میں ہی جوائن کرنے دیا جائے۔ بڑے بابو جو دفتر کے دوسرے بابوؤں کی طرح ان کے گٹھے جسم اور منہ میں گھلتے ہوئے پان کی وجہ سے "یہ تو غنڈہ ہی ہے" [illegible] سے [illegible]

سے انھیں تک رہے تھے، ان کی اس التجا پرتن کر ایک دم سے بڑے بابو بن گئے۔ انھوں نے اپنی تیس سال کی بابوگیری کا نچوڑ فنانشیل ہینڈبک کے فلاں چیپٹر اور فلاں پیرا اور گورنمنٹ سرونٹس کنڈکٹ رولز چیپٹر نمبر اتنے اتنے کے حوالوں سے مثالیں دینا شروع کر دیں، جسے دھوروال کافی بے دلی اور بے صبری کے ساتھ جھیلتے رہے۔ اسی لیے پبلک سیکٹر اس ملک میں ناکام ہو رہا ہے، انھوں نے مایوسی سے سوچا اور ہوا میں مٹھ کر کسی تصوراتی شخص کی ماں بہن کے ساتھ بے جسمانی رشتے قائم کرنا شروع کر دیے۔ بڑے بابو اگر کافی موٹی چمڑی کے نہ ہوتے تو ان رشتوں کو اپنے لیے ہی سمجھ لیتے، پر وہ لاتعلقی ظاہر کرتے ہوئے کسی دوسری فائل میں ڈوب گئے۔ دوسرے بابوؤں نے ضرور آنکھیں مٹکائیں، ایک دوسرے کو دیکھ مسکرائے اور اپنے جذبات کے مطابق ان باتوں کی وضاحت کی کوشش اندر ہی اندر کرنے لگے کہ تری دھوروال جن خواتین کی عزت افزائی کے قصیدے پڑھ رہے تھے، وہ بڑے بابو کی ہی بیوی بیٹیاں تھیں۔

بڑے بابو نے بھارتی نوکرشاہی کا بکا بندھا اصول پکڑ لیا۔ جب کوئی فیصلہ نہ کرنا ہو تو فوراً فائل پر لکھو: "بات کریں۔" یہاں ان کے نیچے کوئی ایسا نہ تھا جس کے پاس "پلیز اسپیک" لکھ کر وہ فائل بھیج سکتے اور موت کے فرشتے کی طرح دھوروال سامنے کھڑے تھے، اس لیے وہ جھنجھناتے ہوئے خود ہی ان کا تقررنامہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑے صاحب کے کمرے کی طرف بات کرنے کے لیے بڑھ گئے اور دو تین گھنٹے تک نہیں لوٹے۔

ان دو تین گھنٹوں کا بڑے صاحب کے مخالفین نے جم کر استعمال کیا۔ دوسرے دفتروں کی طرح اس دفتر میں بھی کام ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، سیاست خوب ہوتی تھی۔ کوٹلیہ کی کتاب ارتھ شاستر میں کوٹلیہ نے سینکڑوں برس پہلے سیاست اور جاسوسی کے رشتے کی جو تعریف دی تھی اس پر دفتر بڑی عقیدت مندی سے عمل پیرا تھا۔ جاسوسی ایجنسیوں کی طرح یہاں رازوں اور خبروں کی کثرت میں خبروں سے نہیں 'بیچتی' تھیں بلکہ انھیں حاصل کرنے کے لیے محنت کی جاتی تھی، اس لیے اکثر ان میں کچھ دم بھی ہوتا تھا۔ دھوروال یادو کا کمرے میں داخل ہونا، بڑے بابو کے ساتھ ان کے ڈرامائی انداز کے ٹکراؤ اور بابوؤں کے ردعمل کے بیچ اپ تک جیسوال نائی ٹھیکیدار کیوں بابوؤں کی خدمت میں رہا گیا، مسکی دن کا آدھے سے زیادہ بھرا پڑا تیواری بابو کی میز پر چھوڑ کر کمرے سے غائب

Scanned with CamScanner

ہو گیا؟ اس بات کا پتا لگانے کے لیے اشوک کمار شکلا، اسسٹنٹ انجینئر (اے ای)، کے کمرے میں چلنا پڑے گا جو اس کمرے سے متصل کمرہ تھا اور جس میں چورسیا نامی ایک دوسرے اے ای یعنی اسسٹنٹ انجینئر بیٹھتے تھے اور اس وقت کسی سائٹ پر گئے ہوئے تھے۔ اگر وہ ہوتے تو یہ میٹنگ کہیں اور ہوتی۔ ان کے وہاں نہ ہونے سے ہی دھورو وہاں مدعو کیے گئے تھے، کیونکہ ان کے بارے میں شکلا کا خیال تھا کہ وہ بڑے صاحب کے جاسوس تھے اور انھیں اس کمرے میں بٹھایا ہی اس لیے گیا تھا کہ وہ شکلا اینڈ کمپنی کی نگرانی کر سکیں۔

اسی کمرے میں دھورو لال یادو کی دفتری تربیت شروع ہوئی تھی۔

کمرے میں دو میزیں تھیں۔ دو میزیں اس لیے تھیں کہ صرف دو ہی میزیں اس میں آ سکتی تھیں۔ دونوں میزوں کے پیچھے ایک ایک کرسی تھی۔ ایک کرسی کا ایک ہتھا ٹوٹا ہوا تھا اور پیچھے کے تانت بھی جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے تھے؛ اس پر شکلا بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری کرسی تھوڑی ثابت تھی اور اس پر نہ صرف ایک میلی سی گدی تھی بلکہ پیچھے ایک لحاف بھی تھا جو شروع میں ضرور سفید رہا ہوگا، پر اب بدرنگ ہو چکا تھا۔ کرسیوں کی یہ حالت دفتر میں بڑے صاحب سے قربت کا پتا دیتی تھی۔

دونوں میزوں کے سامنے دو کرسیاں تھیں۔ چار میں سے کوئی کرسی ثابت نہیں تھی۔ کسی کے پیچھے کے تانت ٹوٹے تھے، کسی کے پیچھے کے، کسی کا ہتھا ہل رہا تھا تو کسی کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ میزوں پر بے ترتیب فائل کور، کاغذ، پیپر ویٹ اور پان کے خالی کھوکھے پڑے ہوئے تھے۔ پورے کمرے میں سگریٹ کے ٹکڑے اور راکھ بکھری ہوئی تھی اور کمرے کے کونے کی دیواریں پان کی پیک سے ایبسٹریکٹ آرٹ کا نمونہ پیش کر رہی تھیں۔ دفتر میں بڑے صاحب کے کمرے کو چھوڑ کر سبھی کمروں کی ایسی ہی حالت تھی اور اس کمرے میں بھی دوسرے کمروں کی طرح سرکاری کام کے علاوہ سب کچھ ہوتا تھا۔

اسی کمرے میں دھورو لال یادو نے نوکر شاہی کی تربیت پائی تھی۔ انھیں چپراسی [illegible] کنکھیوں سے اشارہ کرتے ہوئے یہاں تک لے آیا تھا۔

کمرے میں شکلا نامی اسسٹنٹ انجینئر یا اے ای کے علاوہ دو جے ای اور ایک بابو پہلے سے ہی تھے۔ چھوٹے کمرے میں انھوں نے سامنے پڑی کرسیوں کا رخ اس طرح موڑ رکھا تھا کہ پہلی بار

داخل ہونے پر کسی گول میز کانفرنس کا سا ماحول لگتا تھا۔ کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں پڑی، دھورو لال نے چوتھی خالی پڑی کرسی پر قبضہ کر لیا۔ جیسو لال نے چاروں طرف اس طرح دیکھا جیسے اس کے دیکھنے سے وہاں کوئی کرسی پیدا ہو جائے گی۔ ابھی اس کی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ شکلا اسے چورسیا کی کرسی پر بیٹھنے کو کہتے، اس لیے تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھ کر وہ "ابھی پان لے کر حاضر ہوتا ہوں" جیسا کوئی جملہ بڑبڑا کر غائب ہو گیا۔

"آئیے... آئیے، یادو جی۔ ڈپارٹمنٹ میں آپ کا سواگت ہے۔"

دھورو لال کچھ کسمسائے۔ اس طرح کے بے تکلف ماحول کے وہ عادی نہیں تھے۔ انھوں نے گمبھیر ہو کر انگریزی میں "تھینک یو" سے ملتا جلتا کچھ کہا۔

کمرے میں موجود آٹھ جوڑی شاطر آنکھوں نے ان کا معائنہ شروع کر دیا۔ بیچ بیچ میں یہ آنکھیں ایک دوسرے کو اپنے اپنے اندازے بھی دے رہی تھیں۔ بے پناہ زوردار ایسا آدمی جو جسمانی طور سے مضبوط اور دماغی طور سے کمزور ہو، ان کے لیے بڑے کام کا تھا۔

دھورو لال کو کمرے کا ماحول گھبراہٹ پیدا کرنے والا لگ رہا تھا۔ وہ وہاں موجود لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی خود اعتمادی ظاہر کرنے کی بیچ بیچ میں کوشش کرتے مگر جلد ہی ان کی آنکھیں جھک جاتی تھیں۔ ان کے لیے یہ یک دم اجنبی دنیا تھی۔ اگر کوئی بتاتا کہ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی کو وہ نمسکار کریں تو وہ بہت خوش ہوتے، مگر یہاں تو معاملہ "آکرا اس دی ٹیبل" یعنی میز کے آر پار تھا۔ دوسرے حد زیادہ منجھے ہوئے تھے، اس لیے وہ چھنٹتے گئے۔

"جوائن کر لیا؟" بغل میں بیٹھے بابو نے جولے پن سے ٹھیٹ ہندی میں پوچھا۔

"رجسٹرار نے بڑے بابو کو جوائننگ لیٹر دے دیا ہے۔" دھورو لال نے اپنی خود اعتمادی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"سالا ایک مہر کا پانی ہے۔ جوائن کرتے وقت تاریخ دیکھ لیجیے گا۔"

"دو ہزار ہی ہے صاحب۔ بغیر پیسے یہ دنا کچھ نہیں ہے۔ ایک پیسہ بھی مت دیجیے گا۔ جوائن تو ان سے آپ کرا ہی لیں گے۔"

"آسان مت سمجھیے گا مسٹر بابو۔ پچھلی بار آیا دھیانے کا کیس نہیں یاد ہے؟ بیچارہ کتنے دن

Scanned with CamScanner

یہاں سے لکھنؤ دوڑا۔ بس یہی غلطی تھی کہ اپا صاحب سے بیچارہ تھم دل بیٹھ گیا تھا۔ سالے نے اس کے ہزاروں روپے خرچ کرا دیے، جب جا کر کہیں جوائن کرنے دیا۔"

دھوروال کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ تو پانچ مہینے لیٹ ہیں۔

"پر یہ سب سالے جوتے کے یار ہیں۔ آپ نے سمجھایا کہ سالے کی ماں بہن ایک کر دی۔ اب آپ سے یہ شرافت سے بولے گا۔" "اچھا تو شہرت یہاں تک پہنچ گئی!" وہ خوش ہوئے۔

یہ ایک مہینے بھر کی خوشی تھی۔ آنے والے دنوں میں جو خوفناک امکانات ان کے سامنے رکھے گئے، ان کے مطابق کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ پانچ ماہ لیٹ تھے (اغلب ہے یہ بات کمرے کے اس اسٹاف کو معلوم تھی)۔ بڑا بابو انھیں جوائن کرنے دینے سے انکار کر سکتا تھا۔ اور بھی کچھ ہو سکتا تھا، مثلاً ان کی تقرری منسوخ ہو سکتی تھی، ان کی سینیارٹی خطرے میں پڑ سکتی تھی، ان جیسا کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ حتی الامکان قائم رکھنے کی کوشش کرتے کرتے اور روہانسے ہو گئے۔ گفتگو کرنے والوں نے [illegible] کیا اور جو کچھ انھوں نے پوچھا اس کا مطلب یہ تھا کہ اب انھیں کیا کرنا چاہیے۔

انھیں بتایا گیا کہ اب ان کے پاس تین طریقے بچے ہیں:

پہلا یہ کہ وہ ہائی کورٹ کی پناہ میں جائیں جو خوش قسمتی سے اسی شہر میں تھا، اور جہاں متعلقین، تو ایسے معاملات جو سرکاری ملازمین وارثین ہوں ہوا کرتے تھے۔ [illegible] تھی تو یہ کہ انھیں چند ہزار روپے خرچ کرنے پڑتے اور اگر قسمت [illegible] تو پانچ سال تک [illegible] تک انتظار کرنا پڑ سکتا ہے۔'

دوسرا: وہ شام کی گاڑی سے لکھنؤ چلے جائیں اور کسی زوردار ایم ایل اے [illegible] تک منسٹر کے سامنے حاضر ہو جائیں اور جب منسٹری کی سفارش [illegible] بڑے بابو جیسے بڑے صاحب بے دام ہاتھ میں لے کر جوائن کرے گا۔

تیسرا: وہ [illegible] ہوئے حالات میں پھنسنے پر ان کے جیسے [illegible] کرنا چاہیے۔ [illegible] جو تا [illegible] لگا [illegible] جوائن کرے گا۔"

تھوڑی [illegible] طریقوں پر [illegible] [illegible]

دھورولال نے خارج کر دیا۔ نہ تو ان کے پاس پیسہ تھا اور نہ اتنا صبر و استقلال کہ اگر قسمت ساتھ نہ دے تو وہ کچھ سالوں تک انتظار کریں۔ مشورے دینے والی کمیٹی بھی اس طریقے کے معاملے میں سنجیدہ نہیں تھی کیونکہ اس میں مسالہ فلموں کا سب سے اہم جز یعنی ایکشن نہیں تھا۔ بغیر ایکشن کے وہ اس دفتر میں وہ ایک غیر ضروری چیز بنے بیٹھے رہتے اور ساری ملائی بڑے صاحب کے اردگرد بیٹھے لوگ کھاتے رہتے۔

دوسرے طریقے کے لیے ایک عدد زوردار ممبر اسمبلی درکار تھا۔ بغیر زیادہ زور دیے ان کے دماغ میں جھٹ سے خیال آیا کہ ان کے ایک دور کے ممیا سسر ایم ایل اے زوردار ہیں یا نہیں؟ بار بار پوچھنے پر بھی ان کے پاس کوئی تسلی بخش جواب نہیں تھا کیونکہ ابھی تک ان سے کوئی کام نہیں پڑا تھا۔ مگر ہاں، وہ ہوں گے زوردار، کیونکہ ایم ایل اے ہونے سے پہلے ان پر قتل اور ڈکیتی کے کئی مقدمے درج ہوئے تھے، اتنی دلیل وہ ضرور دے پائے۔ وہ اس وقت لکھنؤ میں ہوں گے، یا ان کے پی ڈبلیو ڈی کے منسٹر سے اچھے تعلقات ہیں، وہاں ہوں گے۔ کیا وہ دھورولال کے پہنچتے ہی ہاتھ میں سونا لے کر سکریٹریٹ چل دیں گے؟ سوالات کی ایسی بھول بھلیاں تھیں جس میں پھنس کر کمرے میں موجود لوگ چاروں سے انھیں تیسرے طریقے کی طرف دھکیل رہے تھے۔

تیسرا طریقہ دھورولال کو شروع ہی سے پسند تھا، کیونکہ وہ ان کی شخصیت اور سوچ کے مطابق بالکل درست تھا۔

اس طریقے کو سرانجام کیسے دیا جائے، اس پر سنجیدگی سے صلاح مشورے شروع ہوئے۔ ان مشوروں میں جیسوال ٹھیکیدار کا کردار بڑا اہم رہا۔ وہ اس عرصے میں پان لے کر لوٹ آیا تھا۔ سب کو باری باری سے پان کھلانے کے بعد وہ چورسیا والی میز پر اس طرح ٹک کر کھڑا ہو گیا کہ دیکھنے والے اپنی اپنی آسانی کے لحاظ سے اسے کھڑا یا بیٹھا سمجھیں۔ اس طرح اسے بیٹھنے کا سکھ بھی مل گیا اور کمرے میں موجود اے ای اور جے ای اس جیسے نٹ پونجیے ٹھیکیدار کے سامنے میز پر بیٹھ کر ڈسپلن توڑنے کے الزام سے بھی بچ گئے۔

جیسوال جیسے دارث دفتروں میں بٹائی کے بارے میں دھورولال کی عام معلومات میں کافی اضافہ کیا۔ 'یادو جی، ابھی تو آپ کو بہت نوکری کرنی ہے۔ ان سالوں کو جوتے کی نوک پر رکھیے۔ پچھلی

Scanned with CamScanner

دوری میں سکینہ جی نے مجھے پے منٹ میں جڑوا دیا۔ میں نے کہا کہ سالے! ایڈوانس کمیشن تم لو، گھر کی سبزی دور واش پانی تم منگواؤ، بچوں کی فیس تو ہم سے بھروا دو۔ اب رجسٹریشن چندے کے اتار، تمھیں اور کیا چاہیے؟ ارے پے منٹ کرو اور باقی کمیشن بھی لو ہم کہاں بھاگے جا رہے ہیں؟ پر نہیں صاحب، بیٹھا ہاتھ دھرنے دے۔ کبھی بولے سائٹ پر پھر سے میجرمینٹ کریں گے، کبھی میٹریل گھٹیا ہونے کی شکایت۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ میں پریشان ہو گیا۔ یہ تو بعد میں شکلا صاحب نے بتایا کہ اس میں دفتر کی پالیسی ہے۔ میں تو سینہ ٹھونک کر کہتا ہوں کہ شکلا صاحب کا آدمی ہوں تو اس لیے نہیں ہو رہا تھا پے منٹ۔ پر راستہ بھی صاحب نے ہی بتایا۔" جیسوال شکلا صاحب کی طرف اشارہ کر کے چپ ہو گئے۔ دھوروال کے سامنے ایک نئی دنیا آشکار ہو رہی تھی۔ وہ چاہتے تھے جیسوال اس نامعلوم راستے کے بارے میں تفصیل سے بتائے۔

کافی دیر تک کمرے میں بیٹھے لوگ ان کی بے چینی کا مزہ لینے کے لیے پان کھانے، کھانسنے، ضرورت یا موسم کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے جیسی بے ہودہ باتوں میں مشغول رہے۔ اگر دھوروال یاد آتی جیسی صورت حال میں مبتلا نہ ہوتے تو وہ بھی ان ساری حرکتوں میں مزہ لیتے اور خود جی بھر کر شدہ روپ والی حیثیت میں "ہم نے کیا مطلب" کا تاثر چہرے پر لا کر جیسوال کو ٹھیکیدار کو اصل بات پر آنے کے لیے مجبور کر دیتے۔ پر اس وقت تو وہ پورے بدحواس تھے (یہ لفظ بعد میں ان کا پسندیدہ اصطلاح بن گیا تھا اور وہ کئی بے تکی باتوں میں اپنے مخالف کے سپاٹ چہرے پر شکن لانے اس کا استعمال کرتے تھے)۔ تھوڑی دیر میں ان کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا اور باوجود کوشش دکھاوا دینے والی حالت کے جس کا وہ مظاہرہ کر رہے تھے، جب وہ بولے تو ان کی آواز کچھ کھنچی کھنچی سی تھی۔

"پھر کیا ہوا جیسوال صاحب؟"

کمرے میں بیٹھے لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"ابھی سرکار، ہوا کیا؟ وہی فارمولا نمبر تین۔"

دھوروال نے تعجب انداز میں آنکھیں جھپکائیں۔

"اپنے شکلا صاحب کا فارمولا نمبر تین بڑا کارگر ثابت ہوا۔ صاحب نے مل جل کر دی اور

میں دوسرے دن اپنی بلٹ پر..."

"ارے پاجی! مجھے کیوں بدنام کرتا ہے؟" شکلا نے اسے گھورا۔

جیسوال کائیاں ڈھنگ سے مسکرایا۔ "بغیر آپ کے حکم کے میں ایک قدم آگے نہیں دھرتا۔ یادو صاحب تو اپنے آدمی ہیں اس لیے زبان پھسل گئی نہیں تو مجال ہے کہ کہیں زبان کھول ہوں۔"

دھوردھال کو اس غیر ضروری تفصیل میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ فارمولا نمبر ایس جاننا چاہتے تھے ور یہ ہوگی بات کو طول دینے پر تلے ہوئے تھے۔

بہرحال تھوڑی دیر میں ان کی بے چینی ختم ہوگئی۔ ہوا کچھ یوں کہ جیسوال ٹھیکیدار اپنی بلٹ موٹر سائیکل پر دو مقامی غنڈوں کو لے کر جونیئر انجینئر سکینہ کے گھر پر صبح صبح پہنچا۔ وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کیے سڑک پر کھڑا رہا، اور دونوں غنڈے، جنہیں اس کی زبان میں "ٹھیکیداروں کو پالنا ہی پڑتا ہے" دندناتے ہوئے اوپر سکینہ کے گھر پر چڑھ گئے۔ جب تک نیچے مالک مکان کا خاندان یا اوپر سکینہ کی بیوی کچھ سمجھتیں تب تک دونوں سکینہ کو بنیان پاجامے میں گھسیٹتے ہوئے نیچے لے آئے۔

اس کے بعد سانا چار گھونسوں میں ہی لائن پر آ گیا۔ بیوی کے پیچھے چھپ گیا۔ بیوی نے بھیا بھیا کہنا شروع کیا۔ ہم نے بھی کہا، چل بیٹا قسمت ہی خراب ہے سالی، ساری بہنیں ہی ملتی ہیں۔"

جیسوال انتہائی گھناؤنے ڈھنگ سے مسکرایا۔

آگے کی کہانی ہندی فلموں کے انجام کی طرح واضح تھی۔ جیسوال ٹھیکیدار کا سب مست ہو گیا۔ ہاں، انھوں نے سکینہ جونیئر انجینئر اور اوپر والوں کا کمیشن پورا دیا کیونکہ "صاحب، دھندے کے اصول بہت صاف ہیں۔ اگر ٹھیکیداری کرنی ہے تو کمیشن تو نقد گن کر ہی دینا پڑے گا۔"

اس دن یادو جی نے بھی فارمولا نمبر ایس اپنایا۔

ہوماں کی طرح کمرے میں موجود لوگوں کی حوصلہ افزائی سے، جو ان کی طاقت کے متعلق تھی، وہ پھول اٹھے اور پہلے انھوں نے دفتر کے کمرے میں بڑے بابو نامی جاندار کو تلاش کیا۔ کئی گھنٹے گزر جانے کے باوجود بھی وہ ابھی تک اپنی کرسی پر نہیں آئے تھے۔ بعد میں جب وہ اس سسٹم کا حصہ بن گئے تب ان کی سمجھ میں آئی لمبی غیر حاضری کی وجہ آئی۔ جب کبھی ایسی کٹھن گھڑی بڑے بابو کے پیش نظر ہوتی، وہ راجنیتاؤں کی طرح اس محاورے پر عمل کرنے لگتے تھے جس میں شتر مرغ ور

Scanned with CamScanner

ریت کا ذکر آتا ہے۔ وہ بڑے صاحب کے کمرے میں فائل دبائے گھسے تھے اور تھوڑی دیر تک کھسر پھسر کر کے دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے تھے اور نیم، املی، جامن جیسے پرانے درختوں کے نیچے کھلے، سب سے اوپن ایئر ریسٹورنٹوں میں سے کسی ایک میں بیٹھے، چائے سموسے کے تیسرے دور سے گزرتے ہوئے چائے والے کا بھگتان کرتے ہوئے کسی ٹھیکیدار کے ساتھ سنجیدہ گفتگو میں مشغول تھے۔

اس بیچ بڑے صاحب بھی اٹھ کر لنچ پر چلے گئے۔

مسئلہ پیچیدہ تھا اور دھوروال اکیلے اس کا حل نہیں نکال سکتے تھے۔ دوست، فلسفی اور رہنمائی کرنے والے کی حیثیت میں جیسوال ٹھیکیدار اگر وقتے وقتے سے جنم نہ لیتا رہتا تو وہ دفتر کی بھول بھلیاں جیسی گلیوں میں کسی بے چین روح کی طرح ادھر ادھر بھٹکتے رہتے۔

جیسوال بیچ بیچ میں انھیں اشارے سے کسی چائے پان کی دکان پر لے جا کر جو بتاتا رہا، اس سے یہ صاف ظاہر تھا کہ آج نہ بڑا صاحب آئے گا اور نہ بڑا بابو۔ یہ دونوں جب ہی آ سکتے تھے جب دھوروال انھیں ایسی حرکتوں سے مجبور کر دے۔ دھوروال نے یہی کیا۔

بڑے صاحب کے کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر انھوں نے ہوا میں کسی اجنبی چند رکھوال بہن کی گالیاں دیں۔ جھوٹے چپراسی کے سامنے اونگھتے ہوئے کو زور دار لات مار کر کھولا، اور بڑے صاحب کی غیر حاضری جیسی سچائی کی اپنے احمقانہ طور طریقے کے ذریعے تصدیق کی۔ پھر وہ بہارتے سانڈ کی طرح بڑے بابو کے کمرے کی طرف گئے۔ وہاں جیسوال کے اشارے پر بڑے بابو کے خالی دیکھے ہوئے کے سامنے کھڑے ہو کر انھوں نے طرح طرح کے اعلانات کیے۔

دھوروال کے اعلانات علم حیوانیات اور زبان کے ماہروں دونوں کے لیے زبردست اہمیت کے حامل تھے۔ جسم کے ایک ایک انگ کی اتنی خوبصورت تعریف دونوں کے لیے آنکھ کھول دینے کے مترادف تھی۔ ان کے یہ اعلانات اقوام متحدہ کے اعلانات یا نیوٹیسی کی طرح بے معنی اور محض زبانی جمع خرچ جیسے نہ تھے۔ ان سے ٹھوس اقدامات اور منصوبوں کی جھلک مل رہی تھی۔ ان منصوبوں کے مطابق اگر شام تک انھیں تو ان نہ کرنے دیا گیا تو بڑے صاحب اور بڑے بابو کی جائداد ان کے فانی جسم کے کچھ حصوں کا ایسا خوبصورت استعمال ہوتا جس کا بیان سن کر غلیظ، فحش اور پھوہڑ زبان کا

Scanned with CamScanner

استعمال کرنے والے بابو، ٹھیکیدار اور دفتر میں لاتعداد گھومنے والے ازل بھی سناٹا کھا گئے ہوتے۔

اشومیگھ یگیہ کے "اشو" (گھوڑے) کی طرح بڑی گردن کے ساتھ برآمدوں، کمروں، فائلوں، کرسیوں، میزوں پر سخت گیر نظر دوڑاتے ہوئے شری دھورو ول یادو باہر پیپل کے درخت کے نیچے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے چلے تو گئے مگر ان کی کرخت، جوشیلی آواز سے پیدا شدہ تھرتھراہٹ کافی دیر تک اس دفتر کو کپکپاتی رہی۔

اس کے بعد کے واقعات بڑی تیزی سے رونما ہوئے۔ بڑے صاحب اور بڑے بابو یعنی حکمراں ٹولے کے تمام حمایتی بابوؤں، چپراسیوں اور ٹھیکیداروں کی ایک ایمرجنسی میٹنگ کال کی گئی اور عام رائے بنی کہ ایسے باصلاحیت شخص کا مخالف کیمپ میں چلے جانا اپنے کو جوکھم میں ڈالنے کے مترادف ہوگا، چنانچہ ان تمام خوبیوں سے لیس یادو جی کو اپنے کیمپ میں شامل کرنا ہی مناسب ہے

اس پورے واقعے میں دھورو ول کا شکلا کے کمرے میں جانا اور بار بار جیسوال ٹھیکیدار کے ساتھ کھسر پھسر باتیں کرنا، ان سب باتوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور رام دین چپراسی اور ول تیواری جونیئر انجینئر کو اگلی کارروائی کے لیے مقرر کیا گیا۔ ان سفیروں نے بڑے بابو کو کچہری کی ایک لسی کی دکان پر ڈکارتے ہوئے پکڑا۔ ان کے ساتھ گپ لگا رہے ٹھیکیدار کو بھگتان (پے منٹ) کا اشارہ کرتے ہوئے وہ انھیں ایک پان کے کھوکھے پر لے گئے۔ جتنی دیر میں بناری پان لگا، منھ میں گیا اور پہلی پیک تھوکی گئی، بڑے بابو سارا معاملہ سمجھ گئے۔ لسی کے پیسے دے کر ان کا پچھلا ساتھی جب تک لوٹا، بڑے بابو رکشا پر بیٹھ کر چل چکے تھے اور ول تیواری پان کے پیسے دے رہے تھے۔

شام کو چار بجتے بجتے بڑے بابو کے غائب ہونے کا نتیجہ بھی برآمد ہو گیا۔

رام دین چپراسی نے پیپل کے نیچے واقع چائے کی دکان پر دھورو ول کو نہایت آہستگی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"صاحب، آپ یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم پوری کچہری ڈھونڈ ڈھونڈ کر حیران ہو گئے۔ چلیے، بڑے بابو کب سے آپ کو بلا رہے ہیں۔"

دھورو ول نے کسی بوزنہ کی طرح آنکھیں جھپکائیں۔ وہ مسلسل دفتر کے دروازے پر آنکھیں گڑائے بیٹھے تھے۔ بڑا بابو اندر گھسا کیسے؟ ان کا بلاوا کیوں؟ وہ اس کھیل کے نئے کھلاڑی تھے، یہ

Scanned with CamScanner

سارے سوالات ایک ان بوجھ پہیلی کی طرح تھے مگر پیشو میں بیٹھے ہوئے جیسوال تحصیلدار کے اشارے سے، انھیں چپراسی کے ساتھ جانے کو کہہ دیا گیا۔

اندر کا ماحول استقبال اور دلی مسرتوں سے بھرپور تھا۔ دن بھر کے تناؤ کا مداوا کلمون جیسا اختتام انتہائی خوش کن تھا اور دھورو لال کے لیے خلافِ امید بھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو سنجیدہ بنائے رکھنے کی کوشش کی، پر بیچ بیچ اس کے بھدے چہرے پر بڑے بابو کی مصری میں گھلی باتیں سن کر بےبسی سے مسکراہٹ آ ہی جاتی تھی۔

"کہاں تھے بابو جی آپ؟ بڑے بابو کب سے آپ کو تلاش کر رہے تھے۔ بیچارے اس دوپہریا میں آپ کا کاغذ دستخط کرانے بڑے صاحب کے بنگلے تک گئے تھے۔"

دھورو لال نے دیکھا کہ بولنے والا وہی چپراسی تھا جسے انھوں نے بڑے بابو کا خاص چمچہ بتایا تھا اور جسے وہ بھی کریلا کہتے تھے۔ اس کے چہرے پر دوں خوشی بسی تھی۔

"بنا مٹھائی کھائے تو جانے نہیں دوں گا۔"

بڑے بابو کے رویے پر دھورو لال شرمائے۔ انھوں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر پاس کھڑے ہوئے چپراسی کو تھما دیا۔

"ان افسروں کا تو نام سے بھی اور کام سے بھی عادت ہوتی ہے۔ آپ کا کاغذ تیار ہو گیا تھا پر بڑے صاحب کے بیچ کا کام ہو گیا۔ جب تک کاغذ لے کر پہنچے صاحب نکل گئے۔ بڑا ہی چلچلاتی دھوپ میں راستے پر بیٹھ کر ان کے گھر گیا۔ کھوپڑی تپ گئی۔"

دھورو لال پوری طرح چت ہو گئے۔ بیکار بڑے بابو ان پر خفا ہوئے۔ مسکراتے ہوئے بولے، "بیکار پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی بڑے بابو، کل دستخط ہو جاتے۔"

"ارے نہیں بھیا، ایک بار دفتر سے نکلے افسر کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ پھر تم نے بتایا تھا۔ اس لیے میں نے کہا کہ یک دوپہر نو بجے ہمارے دفتر میں آ جائیے کل ہمارے صاحب آئیں گے، ان کے کاغذ بڑی پتی کی چیز ہیں، کل کا بھروسہ نہیں، صاحب کہیں نکل جائیں، اس لیے چلچلاتی دھوپ میں بیٹھا ہوا تو چلا گیا۔ ورنہ بھی کام کرتا تو کئی دن کی کھچی تھی۔ صاحب کل لکھنؤ جا رہے ہیں۔ مہینے بھر کے لیے۔"

دھورو لال کو جیسوال شخصیت اور اس کے ٹولے کے سارے لوگ دنیا کے سب سے نیچ انسان لگ رہے تھے۔ اگر اس وقت جیسوال شخصیت ارل گیا ہوتا تو وہ یقیناً اس کے ساتھ طاقت آزمائی کر چکے ہوتے۔ بڑے بابو جیسے بھلے مانس کے لیے کیسے کیسے گندے خیالات ان کے دماغ میں بھر دیے تھے اس نے۔

اب جب دھورو لال یادو اس نظام کا حصہ بن چکے ہیں، انھیں کبھی کبھی اس واقعے کی یاد آتی ہے تو مسکرا کر کہتے ہیں، ''سالا... چالو... اچھی، ایکٹنگ کرتا ہے۔ خوب بڑبک بنایا۔''

پہلے دن دھورو لال کی انقلابی جنگ مین کی جو تصویر بنی، وہ آج تک ان سے چپکی ہوئی ہے۔

دفتر میں کئی ٹولے تھے۔ آخر کوئی نہ کوئی ٹولہ ان کا استعمال اپنے مخالف کیمپ کے کسی نہ کسی ممبر کی پٹائی کرنے یا گالی دلوانے کے لیے تیار کیا کرتا تھا۔ پر شروع میں وہ اپنی اس تصویر کے کارن گھاٹے میں رہا کرتے تھے۔ وہ نظام کی مخالفت کے چکر میں اکثر دفتر کے ہائی اپس (high ups) کے عتاب کا شکار ہو جاتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ ان سے خوفزدہ رہتے۔ انھیں دفتر میں جنگلی سانڈ کی طرح پھنکتے پھدرے گھومتے ہوئے دیکھ کر لوگ ان پر نثار ہوتے ہوئے ان کے کسرتی بدن کی طرف جھوم جھوم کر تعریفی نگاہیں ڈالتے۔ چائے پان کی دکانوں پر گھیر کر ان کی خوب واہ واہ کرتے، خاطر مدارات کرتے۔ لیکن مارچ کے مہینے میں جب کمیشن کے آخری بٹوارے کا وقت آتا تو وہ سب سے کم پیسے جیب میں ڈالے ہوئے نکلتے۔

وقت نے دھیرے دھیرے انھیں ہوشیار بنا دیا۔ وہ اب بھی بے ڈھنگے، اجڈ اور عقل سے عاری تھے اور اپنی جسمانی صلاحیت کا ہی استعمال کرتے تھے، پر اب وہ حکمران ٹولے کے استعمال کی چیز تھے۔ جس طرح ہندی ادب کا ایک انقلابی ادیب پہلے بایاں بازو، محنت، اشتراکیت کے اعلان کرتا پھرتا ہے پھر دھیرے دھیرے عزت اور ستائش سے ریڈر بننے کے چکر میں اپنے لیے ایک دوسرا میدان منتخب کرتا ہوا ادبی عیش و آرام کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے، اسی طرح دھورو لال یادو، جیسے جیسے وقت نے دھیرے دھیرے تمام کر دیا تھا کہ دھورو دفتر کے حکمران طبقے کی چھتر چھایا میں رہ کر دفتری محاورے کے مطابق سال بھر کافی موٹی رقم چیرتے تھے۔

ابھی سب دھورو لال یادو اس وقت سنجیدہ قسم کے اس اصلاح مشورے کی میٹنگ میں شریک تھے۔

Scanned with CamScanner

مشورے میں شامل دو اور لوگ بڑے صاحب کے سامنے بیٹھے تھے۔ بائیں طرف بیٹھے تھے دفتر کے بڑے بابو لالہ رام چندر شرما جو مستقل طرف دار ہوں۔ انھوں نے اس دفتر میں اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارا تھا۔ انھوں نے ٹھیک تیس سال پہلے اپنی سرکاری زندگی اسی دفتر میں بابوؤں کے سب سے نچلے درجے سے شروع کی تھی۔ وہ مکاری، چاپلوسی اور گراوٹ کے بھی نچلے درجے پر تھے اور اسی لیے اب وہ مستقل بڑے بابو بن گئے تھے۔ بھارتی نوکر شاہی ان جیسے پختہ کھمبوں پر ہی ٹکی ہوئی تھی۔

رام چندر شرما، جن کا اصلی نام دفتر کے زیادہ تر افسر، بابو یا تحصیلدار نہیں جانتے تھے اور جنھیں لوگ لالہ جی کے نام سے پکارتے تھے، بیچ بیچ میں تبادلہ ہو کر باہر جاتے تھے لیکن ہر تیسرے چوتھے سال چھ مہینے میں واپس آ جاتے تھے۔ اس شہر میں انھوں نے ایک مکان بنایا تھا جسے وہ خود بہت ہی انکساری اور عاجزی سے "جھونپڑا" کہتے تھے اور ان کے مخالفین اس کے تیار ہونے کے بعد سے اسی وقت سے "قصر محل" کہتے تھے۔ سب سے اوپری منزل پر دو چھوٹے چھوٹے کمروں میں وہ اپنے کنبے یعنی خود، بیوی اور چار لڑکوں کے ساتھ رہتے تھے۔ باقی دو منزلوں پر ان کے کرایہ دار رہتے تھے۔ ان کرایہ داروں کے بارے میں لالہ جی اور ان کی بیوی کے علاوہ اس محل میں رہنے والے کوئی نہیں جانتے تھے کہ کس وقت وہاں کتنے کتنے کرایہ دار تھے۔ مکان بنواتے وقت انھیں جہاں تک چلا، انھوں نے پاخانہ، غسل خانہ یا دوسری خانہ بنا دیا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ ضرورت کی دس بارہ کوٹھریاں نکل آئیں جن میں انھوں نے کرایہ دار بسا دیے۔ پورا گھر ایک دڑبے کی طرح لگتا تھا اور اس میں رہنے والے آدمی کبوتروں کی طرح بھانت بھانت کے لگتے تھے، جن سے مستقل گالیاں، جھڑکیاں اور چیخیں وصول کرتے ہوئے بھی وہ ہر روز صبح کی پوجا میں ایشور کا شکریہ ادا کرتے تھے۔

لالہ جی کی زندگی کے کچھ بنیادی اصول تھے، جنھیں وہ کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ ان میں سے ایک ان کی نرم خوئی تھی۔ بڑی سے بڑی ذلت آمیز صورت حال میں بھی وہ "جی جی جی" کرتے رہتے اور اپنے غصے کو دبائے رکھتے تھے۔ بھارتی نوکر شاہی میں بابوؤں کی پوزیشن تو ہمیشہ ایک بے بس ذلت کی گھڑیاں پیٹ کے ساتھ آتی رہتی ہیں۔ کبھی افسر گھڑکتے، کبھی ماتحت...

کے محکمے میں تو تحصیلدار نامی ایک تیسرا طبقہ بھی تھا، یہاں بھی فرمٹ، چارٹ بنی سے مستقل بابوؤں کا پارہ چڑھا تھا۔ تحصیلداری میں جونئیر بابو جوانوں کی آمدنی تھی وہ ایک مرتبہ راجہ تھی، جو چاپلوسیوں کے بل پر سارا کام کرانا چاہتی تھی۔ ان کی گالم گلوچ کا سیدھا نشانہ بابو ہی بنتے تھے، پر لالہ بابو مشکل سے مشکل گھڑی میں بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔

حالیہ دنوں میں جو نئے بابو آرہے تھے، انھیں دیکھ کر لالہ بابو کو ضرور کچھ مایوسی ہوتی تھی۔ یہ بابو نئے فیشن کے کپڑے پہنتے، افسروں کے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتے، کئی بار ان سے تو مذاق بھی کرلیتے اور سب سے بڑی بات، دفتر میں اپنے پیسے سے منگا کر چائے سموسے کھا لیتے۔ لالہ بابو کی بےچینی نئے بابوؤں کے ساتھ بیٹھ کر ان کی پست ذہنی کا ماتم کرنے کے سوا کچھ نہ کر پاتے۔

کسی نئے بابو کے آنے پر وہ اپنی زندگی کا ایک تجربہ ضرور سناتے۔ یہ قصہ دفتر کے سارے بابوؤں کے سامنے الگ الگ ڈھنگ سے سنایا جا چکا تھا۔ کبھی دوسرے بابو کے منھ سے اور کبھی ان کے مخالف کیمپ کے کسی فرد کی زبانی، اس لیے دفتر کے تقریباً سبھی لوگ اس کی ایک ایک کڑی سے واقف تھے۔ کسی ایک کڑی کو اگر بیان کرنے والا بھول بیٹھے تو سننے والے اس کڑی کو جوڑ دیتے تھے۔ بڑے بابو اس قصے کو یوں شروع کرتے تھے: "برخوردار، جب میں بھی تمھاری طرح جوان تھا..." یہ تب میری بھی کمر میں طاقت تھی، تب کا واقعہ ہے...' مخالف کے لوگ اسے یوں سناتے: "سالا جب نیا نیا آیا تھا تب سے ہی افسروں کے سامنے تلوے چاٹتا رہا ہے۔ ایک بار یہ بابو کے..."

جس طرح ہندی کی زیادہ تر فلموں میں کہانی تقریباً ایک جیسی ہوتی ہے صرف طرزِ بیان بدلتا رہتا ہے، اسی طرح دونوں کیمپوں کی کہانی کا لب لباب ایک ہی تھا، صرف سنانے کا ڈھنگ بدل جاتا تھا۔ کہانی شروع ہوتی تھی لالہ بابو کے ایک نوجوان جونیئر کلرک کی حیثیت سے دفتر میں ان کے آنے اور افسروں کے لیے ان کی تابعداری کے حسن کے بیان سے۔ اس منظر کو لالہ بابو بڑی فرض شناسی، توجہ، محنت، وقت کی پابندی جیسی خصوصیات سے مرصع کر کے بیان کرتے اور ان کے مخالفین "کہا حرامزادہ ہمیشہ افسر کا کتا بنا رہتا تھا" جیسے حاسدانہ جملوں سے بھرے اسلوب میں بیان کرتے۔

اس کے بعد کہانی کا دلچسپ حصہ شروع ہوتا جس کو بڑے بابو تیزی کے ساتھ اس جز کو ٹال

Scanned with CamScanner

حساب کرتے ہوئے بتاتے کہ ”میری عمر والوں کو گاؤں کا پانی راس نہیں آ رہا تھا، اس لیے سوچا جب سے گئی تب سے یہاں، ناپڑ... کا دفتر میں بڑے صاحب سے کہہ کر ایک کوارٹر لیا جس میں تنخواہ پندرہ سال ہم لوٹ رہے، اور ایک یک ٹر کر کے چار بیٹیوں کی وصولی نہیں ہوئی۔“

پر مختلف لوگ ان کو جمعداری میں نہ سناتا۔ پہلے تو وہ اس معاملے کی تہہ میں جانے کی کوشش کرتا مگر ان کی بیوی چونکہ گاؤں سے ایک دن دفتر کے دروازے پر کیسے وارد ہوئیں۔ اس کے بارے میں مختلف کہانیاں تھیں، پر کم و بیش اس معاملے پر سب کی ایک ہی رائے تھی کہ ... میں کچھ ... کی ... طرح گاؤں پہنچیں کہ ان کے بوڑھے باپ اپنی بہو کو ... سیدھے ... پہنچ گئے، ... ہاتھ کا ... بابو کے پاس چھوڑ کر سیدھے ... روانہ ہوئے۔

مسئلہ بڑا پیچیدہ تھا۔ ... بابو خود ایک دوسرے بابو کے ساتھ ایک کمرے میں رہتے تھے۔ دونوں اکیلے تھے ... کوئی دقت نہیں تھی۔ دفتر کے ایک چپراسی کو ان لوگوں نے رکھا تھا، وہ کھانا ... کے ساتھ ... میں کھانا پکایا کرتا تھا۔ ... کی خبریں اڑتی پڑتی گاؤں تک پہنچی تھیں، وہ ... سے ... تھیں۔ ... میں ... بابو بیوی کو ... جاتے

... میں چونکہ بیوی کی موجودگی ... کہ اس ... چہروں پر جو مسکراہٹیں تیر رہی تھیں، ... بابو ... یہ مسکراہٹیں معنی دار، تمسخر آمیز ... اور ... سے بھری تھیں۔ ... چونکہ ... کی بیوی کو دفتر کے سامنے ایک ... چائے ... پر چھوڑا اور ... وقت کے دفتر ... بابو بھی ... کے پاس ... سمجھا کر اپنے رہائش کے رستے ہولے گئے۔

واقعہ ... پرانا ہے مگر دفتروں کی سیاست آج بھی ویسی کی ویسی ہے۔ اس ... کے بڑے بابو بھی ... کی طرف بھی بڑے صاحب سے نہیں پہنچی تھی۔ انہوں نے ... کو دفتر کی سیاست کا شکار بنا دیا۔

... دفتر کے ... کی فوری ... کی ... معاملے ... سے ... مشورہ ... بابو ... بہت ... ایک ... سے ... پایا ...

وقت لال بابو کو بہت کھلا تھا، مگر اب، جب وہ بھی اسی درخواست قسم کے نظام کا حصہ بن چکے تھے، انھیں اس وقت کی اس تجویز کے دونوں پیچ سمجھ میں آ گئے تھے۔

پی ڈبلیو ڈی کالونی میں یک ٹائپ نو کا مکان کافی دنوں سے خالی تھا۔ اس زمانے میں دہلی میں مکان بہت کم تھے، پر آج کے مقابلے میں دفتروں میں کام کرنے والے افسر و ماتحت بھی کم ہی تھے، اس لیے مارا ماری بھی کم و بیش آج جیسی ہی تھی۔ یہ مکان کسی بھی بابو کو مل سکتا تھا اور کئی بابو شہر کے گندے اور تنگ علاقوں کے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں رہتے تھے۔ ان سبھی نے اس مکان کے لیے اپنی اپنی عرضیاں لگا رکھی تھیں۔ وہ باری باری بڑے صاحب کے سامنے پیش ہوتے تھے اور جھڑکیاں کھا کر واپس لوٹ آتے تھے۔ یہ مکان کسی بابو کو الاٹ کیوں نہیں ہو رہا تھا، یہ بخشی بابو اور دفتر کے سبھی پرانے بابو اور چپراسی جانتے تھے۔ نہیں جانتے تھے تو صرف لال بابو یا ان کے جیسے وہ چار نئے لوگ جو اس دنیا میں نئے نئے آئے تھے۔ بات کچھ ایسی تھی کہ بڑے صاحب کا ایک دور کا سالا کافی دنوں سے بے روزگار تھا۔ ان کی میم صاحب کی ضد کچھ ایسی تھی کہ بڑے صاحب نے اپنا سارا اثر و رسوخ استعمال کر کے اسے کسی طرح بابو بنا دیا تھا۔ اب وہ کوشش کر رہے تھے کہ اس کا تبادلہ اسی دفتر میں ہو جائے۔ تبادلہ ہو بھی جاتا مگر اس بیچ ایگزیکٹو انجینئر کے دفتر میں ان کا ایک مخالف ایگزیکٹو انجینئر ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ مسلسل ٹانگ اڑا رہا تھا اور کئی مہینوں سے ان کی کوشش کامیابی کے قریب پہنچ کر مقصد سے تھوڑی دور رہ جاتی۔ یہ مکان اسی چکر میں پچھلے کئی مہینوں سے ان کے سالے کے انتظار میں خالی پڑا تھا۔

اس دن بخشی بابو کی میز کے ارد گرد جو میٹنگ ہوئی، اس میں یہ طے پایا کہ سب بابو اس مکان کے لیے اپنی درخواست پیش کریں گے۔ لیکن لال بابو اس کی کاٹ بھی نہیں سمجھ پائے۔ بڑے ملائم لہجے سے بتایا گیا کہ نہیم پورشیری میں کوئی بابو ہے، جو بڑے صاحب کا دور کا رشتے دار ہے اور جس کا یہاں تبادلہ کرانے کے لیے بڑے صاحب کوشاں ہیں۔ اول تو یہاں کوئی جگہ نہیں جہاں اس کا تبادلہ ہو سکے، اور اگر ہو بھی گیا تو اس کے یہاں پہنچنے میں دو چار مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔ سب بابو کا مقصد تھوڑی مسرت ہے۔ فی الحال وہ اپنی بیوی کو لے کر اس مکان میں بیٹھ جائیں۔ بعد میں اگر بڑے صاحب کا رشتے دار یہاں آ گیا تو وہ مکان خالی کر دیں گے۔ تب تک سب لوگ مل کے ان کے لیے شہر

میں کوئی نہ کوئی مکان ڈھونڈ ہی لیں گے۔

لالہ بابو کو ایک بات اور الگ طریقے سے سمجھائی گئی۔ اس دفتر میں سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔ دفتر کے سیدھے سادے لوگوں پر بھی افسر سواری گانٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بڑا صاحب بھی آسانی سے نہیں مانے گا۔ پر لالہ بابو کو اپنی آواز تھوڑی سی اونچی کرنی ہوگی اور آنکھیں ترچھی کرنی ہوں گی۔ مکان دے گا کیسے نہیں؟ کوئی اس کے باپ کا کوارٹر ہے؟ کتنے مہینے سے خالی پڑا ہے، سرکار کو کرائے کا اتنا نقصان ہو رہا ہے، اسے کون بھرے گا؟

سارے بحث مباحثے اور دلیلوں میں یہی ایک مشکل درپیش تھی۔ لالہ بابو کی فطرت کے یہ خلاف تھا کہ وہ صاحب کے سامنے اونچی آواز میں بول سکیں، یہ پوری عمر چپ ہی کی دکان پر قسمت آزمائے بیٹھی تھی۔ اس شہر میں کوئی سگا رشتے دار بھی نہیں تھا کہ جس کے پاس جا کر دو چار دن رہا جا سکیں۔ کرائے کا مکان بھی اتنی آسانی سے کہاں ملے گا؟ انھیں رہ رہ کر بچے، باپ اور بیوی پر غصہ آ رہا تھا۔ پر اب غصہ کرنے سے کیا ملنے والا تھا؟ شام ہو رہی تھی۔ ایک بار بڑے صاحب گھر چلے گئے تو انھیں پکڑ پانا بہت مشکل ہوگا۔ انھوں نے ایک کاغذ قلم سے کر یہ درخواست لکھی اور میدان جنگ کی طرف بڑھ چلے۔

تیجی بابو نے ان کے ساتھ دو تین بابو اور کر لیے۔ یہ ایک طرح کی ایکشن کمیٹی کی شکل بن گئی جس نے شروع میں تو لالہ بابو کا خوب حوصلہ بڑھایا، پر بعد میں کمرے سے باہر نکلنے پر انھیں سب یوں ساتھ چھوڑ جانے کا افسوس ہوا کیونکہ بہت سی باتیں باہر نکل کر انھی لوگوں سے مشورہ کر کے طے کی گئی تھیں۔

جب یہ مہذب دستہ کمرے میں داخل ہوا تو بڑے صاحب میز پر جھکے کسی فائل کو پڑھنے میں مشغول تھے۔ ایک بابو ان کی بغل میں کھڑا اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تین چار بابوؤں کا اس کمرے میں ایک ساتھ گھس آنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس لیے اس نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ پہلے سے کھڑے بابو کی بات بڑے صاحب کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے فائل کے سامنے نیچے پر دستخط کر کے فائل سرکا دی۔

بڑے صاحب نے تھوڑی دیر انتظار کیا کہ آنے والے بابوؤں میں کوئی کاغذ ان کے سامنے رکھیں گے، پر ان کی طرف سے کوئی حرکت نہ ہوتے دیکھ انھوں نے خود ہی پوچھ لیا۔ کیا

بات ہے؟"

"سرکار... یہ... بابو کچھ عرض کرنے آئے ہیں۔ اس کی بیوی گاؤں سے آ گئی ہیں۔" لالہ بابو کی خاموشی نہ ٹوٹنے پر ایک دوسرے بابو نے کھیسیں نکالتے ہوئے کہا۔

"جی؟" صاحب نے ایک عجیب مضحکہ خیز انداز میں لالہ بابو کو دیکھا جیسے اس نے بات کی سب سے بڑی چوری کی ہو۔ تھوڑی دیر پھر خاموشی رہی۔ ایک بابو نے لالہ بابو سے مذاق کے انداز میں ماحول کو کچھ سازگار بناتے ہوئے، اپنے کو پُر مذاق ثابت کرتے ہوئے اور صاحب کی دریادلی کی تعریف کرتے ہوئے، لالہ بابو کے اس روکھے پن کے رویے کو یوں دور کرنے کی کوشش کی۔

"ارے مسئلہ بتا دو لالہ بابو۔ صاحب سے کیا شرم! کوئی بھگا کر تو لائے نہیں ہو، بیاہتا ہے۔ اس انجان شہر میں صاحب ہی تو کارجین ہیں۔ بتا ڈالو۔"

لالہ بابو نے ہمت جٹائی اور عرضی صاحب کے آگے بڑھا دی۔

بڑا صاحب چونک کر بولے "تو یہ معاملہ ہے! سالے بڑے گھاگھ ہیں، بیوی کا بہانہ بنا کر مکان ہتھیانا چاہتے ہیں۔ ضرور اسے بھی نے پٹی پڑھائی ہوگی۔" اس نے دل ہی دل میں اپنا طریقۂ جنگ متعین کر لیا۔

اس کے بعد کہانی میں کیا ہوا اس کے بارے میں لالہ بابو اور ان کے مخالفین میں اتفاق رائے نہیں ہے۔ لالہ بابو بتاتے ہیں کہ کافی بحث مباحثے اور جدوجہد کے بعد جب بڑے صاحب کسی طرح ٹس سے مس نہیں ہوئے تو انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ "ہم تو آپ کی اولاد ہیں۔ نہیں مکان دیں گے تو شام تک آپ کی بہو کو لے کر آپ کے گھر پہنچ جائیں گے۔ کہیں نہ کہیں سر چھپانے کی جگہ میم صاحب دے ہی دیں گی۔ کچھ روکھا سوکھا بھی مل جائے گا، پڑے رہیں گے۔"

ان کے سامنے تو کوئی کچھ نہ کہتا، پر پیٹھ پیچھے لوگ ان بابوؤں کی پھیلائی افواہوں یا باتوں کو دہراتے جو لالہ بابو کے ساتھ اس تاریخی لمحے سے جڑی ہوئی تھیں۔

مخالف کیمپ اس برتاؤ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ جب بڑی دیر تک بڑا صاحب دھتکارتا رہا اور ڈپٹتا رہا، ساتھ گئے بابوؤں کے اشارے کے باوجود لالہ بابو نے آواز اونچی نہیں کی، اور ساتھ میں گئے پورے مہذب دستے کو یہ یقین ہو گیا کہ اب زیادہ بحث مباحثہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں،

ں سے واپس جانا ہی بہتر ہے۔ تبھی ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ کمرے میں موجود سبھی لوگ دل برداشتہ ہو گئے۔

افسروں کی موجودگی میں ہمیشہ بھیگی بلی کی صورت بنے رہنے والے لالہ بابو نے اچانک ورلی انکساری سے کام لیا۔ انھوں نے ہاتھ جوڑ دیے اور بولتے بولتے ان کی آواز رندھ گئی۔ ''حضور ماں باپ کی جگہ ہیں۔ یہیں پلیں گے تو ہم کہاں جائیں گے؟''

اس کے علاوہ بھی لالہ بابو بہت کچھ بولے مگر آواز کے رندھ جانے سے سب کچھ غیر واضح رہا۔

بڑا صاحب دل ہی دل میں تمسخر، تسکین اور خود پسندی کے ملے جلے احساس سے لالہ بابو کی آواز کو سنتا رہا۔ وہ ان کے ان جذبات سے متفق تھا کہ وہ رحم دل ہیں، بندہ پرور، غریب نواز جیسے نہ جانے کیا کیا ہیں۔

لالہ بابو اور مخالف کیمپ والوں، دونوں کی کہانیوں کا نچوڑ یہی تھا کہ صاحب نے بالآخر لالہ بابو کی درخواست پر گھسیٹ کر ''کونسڈرڈ'' لکھ دیا اور فاتحانہ جذبات کے ساتھ مہذب دستخط کر کے باہر آ گیا۔

یہ کہانی لالہ بابو نے بابوؤں کو اس جذبے سے سنائی تھی کہ وہ بھی افسر کو ماں باپ سمجھیں۔ شروع میں تو سب ٹھیک ٹھاک چلتا رہا تھا لیکن پچھلے سالوں سے بابوؤں کی سوچ میں کچھ مخصوص تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ اب وہ پہلے جیسی عزت افزائی اور اچھے برتاؤ جیسی گفتگو پر ذرا بھی دھیان نہیں دیتے۔ بلکہ تو ان کا نام ور ان کے وقار کو ٹھیس پہنچاتے ہوئے کہانی کے بیچ میں ہی اٹھ کر چل دیتے ہیں، کچھ منھ بناتے ہیں، کچھ طنز بھرے انداز میں مسکرانے لگتے ہیں اور کچھ تو ایسے شرارتی ہو گئے ہیں کہ مخالف کیمپ کی پھیلائی ہوئی افواہوں اور جھوٹ کو ان کے قصے میں بیچ بیچ جوڑتے جاتے ہیں۔ بابوؤں میں موجود اس تبدیلی سے متعلق سوچ کر لالہ بابو بے چین ہو جاتے ہیں۔

تمام تر تبدیلیوں کے باوجود لالہ بابو نے اپنی یہ روش نہیں چھوڑی۔ وہ پچھلے تیس سالوں سے افسر کو مائی باپ سمجھتے آئے ہیں۔ آج بھی اس عادت کی بنا پر نئے سے نئے چھوکرے افسر سے آگے بھی ان کا سر ادب سے جھکا رہتا ہے۔ آج بھی وہ روز سویرے ایک خشوع خضوع سے پوجا کرتے

ہیں۔ روز بھگوان کا اس بات کے لیے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے انھیں لڑکیاں نہیں دیں، چار بیٹے ہی دیے، گھر کا کچھ باہر نہیں جائے گا، گھر میں ہی کچھ نہ کچھ آئے گا۔ کبھی کبھی کوئی کرایہ دار بہت تنگ کرتا ہے تو تب ہی وہ آخری آپشن کے طور پر دل میں اس کے لیے تھوڑے برے کی دعا کرتے ہیں بھگوان سے، ورنہ اتنے سے ہی مطمئن ہو جاتے ہیں کہ بھگوان کرایہ دار کی جیب میں پیسہ اور نیت بھی پیدا کر دے کہ وہ انھیں وقت پر کرایہ دے دیا کریں، یا کرایہ دار کی بیوی میں اتنی سمجھ بھر دے کہ وہ اپنا کوڑا کچرا لالہ بابو کے باہر نکلنے والے دروازے پر نہ ڈالا کرے، یا کرایہ داروں میں سے نہ جانے کس کا بچہ جو ان کی سائیکل کا پہیہ بلیڈ سے کاٹ دیتا ہے، اسے عقل آ جائے اور وہ ایسا کرنا بند کر دے۔ یہ چھوٹے چھوٹے معاملے تھے جو لالہ بابو برسوں سے شکریہ شکوے کے روپ میں ایشور سے کرتے جا رہے تھے۔

برسوں سے لالہ بابو دال روٹی کھا کر دفتر کے وقت سے آدھے گھنٹے پہلے گھر کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے۔ اپنی بڑھیا سائیکل کو پندرہ منٹ تک جھاڑتے پونچھتے، دونوں پہیوں کی ہوا چیک کرتے، بریک، پیڈل اور چین کا معاینہ کرتے، گھنٹی بجاتے اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہونے پر دفتر کے وقت سے دس منٹ پہلے گھر سے نکل پڑتے۔ ان کے گھر سے دفتر قریب تھا اور سات منٹ میں وہ دفتر پہنچ جاتے۔ جب یہ زمین انھوں نے خریدی تھی، تب شروع کے کئی سالوں تک ایشور کا شکر ادا کرنے کے ایجنڈے میں یہ زمین بھی شامل تھی، جو دفتر کے اتنے قریب تھی اور جو بھگوان کی مہربانی سے ہی انھیں حاصل ہوئی تھی۔ البتہ وہ ضرور ایشور کا شکریہ اس لیے کم ادا کر رہے تھے کیونکہ اب شکر ادا کرنے لائق اور بہت سی چیزیں ہو گئی تھیں۔

دفتر میں پہنچنے والوں میں لالہ بابو ہمیشہ پہلے یا دوسرے ہوتے۔ چوکیدار یا فراش ابھی دفتر کا تالا کھول رہے ہوتے یا میز کرسیوں کی دھول پر کپڑا مار رہے ہوتے کہ لالہ بابو کی بڑھیا سائیکل دفتر کے باہر آ کر کھڑی ہوتی۔ چوڑے پائینچے والی پینٹ میں لوہے کا ایک چمٹا کلپ سا لگائے ہوئے لالہ بابو دھیمی رفتار والی اپنی سائیکل پہیے کی چرچراہٹ کے ساتھ روکتے اور آہستہ سے نیچے اترتے۔ جب سے وہ بڑے بابو ہوئے ہیں، کوئی نہ کوئی چپراسی یا چوکیدار انھیں کہیں سے نمودار ہو جاتا ہے اور ان کی سائیکل پکڑ کر برآمدے میں کھڑی کر دیتا ہے۔ اگر کوئی نظر نہیں آ رہا ہوتا تو خود ہی دھیرے دھیرے

لے جا کر سائیکل مقررہ جگہ پر کھڑی کر دیتے ہیں۔ ان کی سائیکل ہمیشہ ایسی جگہ کھڑی ہوتی ہے جہاں سے وہ اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے فائلوں سے سر اٹھا کر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے دیکھ لیتے ہیں۔ وہ اس دفتر میں الگ الگ جگہوں پر بیٹھے ہیں لیکن سائیکل کے لیے ہمیشہ انھوں نے ایسی جگہ تلاش کر لی ہے جہاں سے سائیکل انھیں دکھائی دیتی رہے۔ اسی طرح سائیکل میں تالا لگانے کا کام بھی وہ ایک خاص اصول کے تحت کرتے ہیں۔ سائیکل کوئی ہلکی بھی کرے، تالا وہ خود لگاتے ہیں۔ تالا لگا کر وہ دو تین بار چیک کرتے ہیں، پھر مطمئن ہونے پر ہی آگے بڑھتے ہیں۔ دھڑ دھڑ خراب ہو گیا ہے لیکن پہیے وہ ہر چند حالات کی رنجیدہ ... ساتھ رکھتے ہیں جسے اگلے پہیے میں لگا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی شدت جذبات میں بھی ... کی دعا میں اس بات پر بھی جھگڑوں کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ... میں کبھی ان کی سائیکل کبھی چوری نہیں ہوئی۔

بچپن سے ... اپنی عمر کے کافی ... ہیں ... سے ... موجود ... والی ... ڈاڑھی، ... ہوئے ... ہوئے ... چھوٹے چھوٹے ... دل ... اور ... پاپیچے ... بتلون ... کی طرح ... کے مختلف پہلوؤں کا مظہر ہیں۔

... کی ... سنجیدہ ... میں ... ہی ... تھیں۔ ویسے تو ... سے ... ہیں ... موجود ... صاحب ... کا ... تعلق ... دیتے ... ہیں ... کی بیوی ... تھے ... شادی کی ... کبھی ... رشتے ... مناسب ... کی ... نہیں ... رشتے ... نہیں ہوئے۔

دوسری وجہ بھی ... ہم نہیں تھی۔ ... بڑے صاحب تھے ... جیسے ... آدمی بھی ... بھی ... ہیں ... تھے ... پہلے بھی ... دفتر میں رہ چکے تھے۔ ایسا ... تھا ... پاس ... ان کے ... کا رواج ہوتا ... بیچارے ...

Scanned with CamScanner

پنڈت جی منھ میں پان دبائے، اپنے بیچ میز کے باہر نکال کر دفتر میں بیٹھتے۔ ان کے کمرے میں داخل ہونے پر بابوؤں اور چپراسیوں کو پہلے ان کے پیر چھونے پڑتے۔ افسروں میں بھی زیادہ تر پیر چھوتے۔ پیر تو لالہ بابو نے بھی خوب چھوئے، پر بات بگڑی نہیں۔ دونوں بار اپادھیائے نے لالہ بابو کا تبادلہ کرا دیا اور دونوں ہی بار وہ خوب پریشان ہو کر وہ اس دفتر میں لوٹ پائے۔

آج کی اس میٹنگ میں لالہ بابو کی شرکت کار ریکی تھی۔ اپنے رویے اور فطرت کے برعکس بنوک چند کی آمد نے اس میں ایک غصہ اور جوشیلا پن بھر دیا تھا اور خلاف فطرت وہ اپنے ممبروں کے سامنے بھی، جو بار بار اپادھیائے کے آنے کے بارے میں صلاح مشورے کر رہے تھے، کبھی کبھی منھ بسور کر کہہ اٹھتے تھے: "حرام اد ہرا!"

لالہ بابو کے پہلو میں، یعنی بڑے صاحب کے سامنے میز کی دوسری طرف، چیچک کے داغوں والا چہرہ لٹکائے، بھورے اور کالے رنگوں کے بیچ کے کسی رنگ والا چشمہ پہنے اور اوپر کے دو کھلے بٹنوں والا چار خانے کا سفاری سوٹ چڑھائے اور بولتے وقت منھ میں ٹھونستے ہوئے پان کی پیک دبائے بائیں سامنے ہر طرف چھلکاتے ہوئے، پھوہڑپن ہی جس کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ تھا، اشرفی ملن رائے براجمان تھے۔ ان کا یہاں ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ دفتر کا کوئی بھی شخص انھیں محکمے سے متعلق کسی میٹنگ میں شریک ہوتے دیکھتا اور وہ ملن رائے کے پس منظر سے واقف ہوتا تو اسے کوئی تعجب نہ ہوتا اور انھیں دوسرا شخص نہ مان کر ان کی وہاں موجودگی کو ایک عام سی بات محسوس کرتا۔

ملن رائے گوناگوں صلاحیتوں اور خوبیوں کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز اخبار کے ہاکر کی حیثیت سے کیا تھا۔ اخبار بیچتے بیچتے وہ صحافی بن بیٹھے۔ شروع شروع میں وہ ایک روزنامے کے، جو اسی شہر سے چھپتا تھا، وہ اپنے محلے کے نامہ نگار بن گئے تھے۔ اگرچہ وہ صحیح ہندی نہیں لکھ پاتے تھے اور ان کے زیادہ تر مراسلوں کو ڈیسک پر بیٹھا کوئی نائب مدیر اپنا سر پیٹتے ہوئے تحریر پھر سے پورا لکھتا تھا، پر وہ جلد ہی شہر کے سب سے معروف نامہ نگار بن گئے۔ وہ دور، بغیر کسی اجرت کی خواہش کیے، نئی نئی کھٹنے کا ہے کرتے تھے اور انھیں مدیر ہوتے ہوتے اپنے اخبار کے دفتر [illegible] پاتے تھے۔

ملن رائے اور ان کا خاندان دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ انھوں نے ایک

Scanned with CamScanner

ایسے وقت میں صحافت کی دنیا میں قدم رکھا تھا جب ملک کے دوسرے شعبوں کی طرح صحافت میں بھی ''آدرش'' ایک ناقابل فہم لفظ بن کر رہ گیا تھا۔ ہر شعبۂ زندگی میں خرید و فروخت جیسے طریقے سے صحافت کو بھی ایک کاروبار کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ اس دنیا میں یا تو بڑے کاروباری لوگ تھے جو ریاستی راجدھانیوں سے اخبار نکال رہے تھے اور جن کا مقصد صرف اخباروں کی طاقت کے بل بوتے پر اپنے جوٹ، سیمنٹ، تیل کے سامانوں کی حفاظت کرنا تھا، یا چھوٹے اور مجھولے سرمایہ دار تھے جو چھوٹے شہروں سے اخبار نکال کر اپنی زمینوں کی خرید و فروخت، چٹ فنڈ یا سیاسی داؤ پیچ جیسے دھندوں میں بغیر کسی رکاوٹ کے پھلنا پھولنا چاہتے تھے۔ جس طرح کے اخبار نکل رہے تھے ویسے ہی نامہ نگار تھے۔ ان میں کام کرنے والے زیادہ تر لوگ تھوڑے تعلیم یافتہ یا تقریباً بالکل غیر تعلیم یافتہ تھے۔ انہوں نے اپنی سائیکلوں، اسکوٹروں اور موٹر سائیکلوں پر بڑے بڑے لفظوں میں 'پریس' لکھوا رکھا تھا اور خود کو صحافی کہتے تھے۔ ان سے واسطہ پڑنے والے سرکاری افسروں کی نظر میں وہ صرف دلال تھے جو پارٹ ٹائم صحافت بھی کرتے تھے۔

ان صحافیوں کی ایک ''نیوسنس ویلیو'' (nuisance value) تھی، جس کی وجہ سے سرکاری ملازمین یا افسران ان سے ڈرتے تھے۔ جب یہ کسی کمرے کے سامنے پہنچتے تو ان کے ہاتھ میں اپنے لوگوں کی کوئی نہ کوئی سفارش لیے ہوتے۔ بچے تھے جن افسروں سے یہ اپنی سفارش منوا لیتے، وہ آخر ان سے بھی برے حال ہوتے۔ سفارش کرنے والا جب تک ان کے سامنے رہتا، اس سے سفارش یا شکایت، اور چھوٹی یا دور دراز جگہ کا تبادلہ ہو جاتا۔ افسر ویسا کرنے میں رہ جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے لیکن ایسے بھی صحافی افسر تھے جو کسی قسم کے تعلقات کا ہو جاتے۔ وہ وقت پر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، ان کی بات کرتے ہیں، اس میں ان کا ایک حصہ انہیں بھی مل جاتا۔ ٹھیکیدار اور انجینئر کے بیچ کمیشن کو لے کر کوئی تنازعہ ہو جائے تو یہ ثالث کے فرائض نبھاتے۔ ترقیاتی اور تعمیری کاموں میں چاٹ یا نیلامی سے کرتے ہوئے اپنا حصہ کاٹ کر افسر کو گھر پر ان کے حصے کی رشوت پہنچاتے۔

مثل راے اور صحافی ... کی ایک خاص حیثیت کی وجہ سے ان کے باپ اپنے علاقے کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔ انہوں نے ابتدا تو ایک معمولی ... کی حیثیت سے کی تھی

مگر دھیرے دھیرے پچھلی دو دہائیوں میں ایک بڑے ایجنٹ کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اس میں محنت کے ساتھ ساتھ اس کی قسمت نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔ پہلے وہ اپنے پانچوں لڑکوں کے ساتھ رات تین بجے سے ہی اٹھ کر معمول سائیکل چلاتے تھے۔ گرمی، جاڑا، برسات ان کا ایک ہی جیسا معمول تھا۔ سارے باپ بیٹے صبح صبح ہی سے اٹھ کر اخباروں کے دفتروں یا ایجنٹوں کی دکانوں کے چکر لگاتے اور پھر آٹھ بجے تک گھر گھر گھوم کر اخبار رسالے بانٹتے۔ اس کے بعد ہی ان کے پیٹ میں کچھ ناشتہ جاتا۔ دن میں پورا خاندان الگ الگ جگہوں پر الگ الگ دھندے کر کے روزی کماتا۔ باپ نے بھی بچوں کو پڑھانے کی کوشش کی تھی، پر گھر کے ماحول اور زندگی کی دشواریوں کی وجہ سے سب پانچ پانچ سات سات سال اسکول میں جا کر باری باری اسکول سے نکل آئے۔ بعد میں باپ نے کچھ اخباروں کی ایجنسی لے لی۔ قسمت اور کاروباری صلاحیت نے اب ان کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا تھا کہ باپ بیٹوں کو صرف انتظام دیکھنا پڑتا تھا اور بیسیوں ہاکر ان کے نوکر کی حیثیت سے اخبار لے جا کر بانٹتے تھے۔ اسی ایجنسی کی وجہ سے طلسی رام کو ایک صحافی کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

ہوا کچھ ایسے کہ صوبے کے تین خبر گھرانوں میں ایک قسم کی جنگ چھڑ گئی۔ یہ اخبار صوبے کے مغربی، مشرقی اور وسطی حصوں سے نکلتے تھے اور ان کے اپنے اپنے علاقے تھے۔ کاروباری مسابقت کی بنا پر تینوں کے مالکوں نے ایک دوسرے کے علاقوں میں گھس پیٹھ شروع کر دی۔ تینوں نے دھڑا دھڑ نئے شہروں سے اپنے ایڈیشن نکالنے شروع کر دیے۔ چونکہ اخبار سرمایہ داروں کا پیسہ اور ان کی اخباری طاقت کی وجہ سے آسانی حاصل تھا۔ علاوہ ازیں، ہر صوبے میں ہزار ہزار (جز وقتی) بیچنے والے اور کالم نویسوں میں ایسے حوصلہ مند نوجوان موجود تھے جو صحافی بننے کے لیے دو دو تین تین سو روپے پر بھی آنے کو تیار تھے۔

مشرقی خبر رساں ہی ان اخباروں کی سب سے بڑی ایجنسی تھی۔ ہر طرح کے اخلاق اور احساس ذمہ داری کے اصول سے عاری یہ اخبار سنسنی خیز خبروں کی وجہ سے قصبوں یا دیہاتوں کے چائے خانوں میں سب سے زیادہ مشہور اور پسندیدہ تھے۔ ان میں چھپنے والی خبروں کو لکھنے کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں تھا۔ اس لیے طلسی رام جیسے لوگ ہر طرح سے فٹ تھے۔

طلسی رام میں کچھ خاص بات ضرور تھی جس سے وہ اپنے جیسے کم تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان

Scanned with CamScanner

کی ہنسی بیک مگ بچپن بنا لیتے تھے۔ ان کے ایڈیٹر کم پروپرائٹر ان کی اس صلاحیت کو پہچانتے تھے۔ سب ایودھیا میں ہوئی کارسیوا کے دوران مرے اور ان کے اخبار کے الگ الگ ایڈیشنوں میں مرنے والوں کی تعداد ہزار سے شروع ہو کر بیس ہزار تک پہنچا دی گئی۔ اسی دور میں ملن رائے کی ایک خبر نے ان کی تخیل پسند ایڈیٹر کو بھی چونکا دیا۔ ملن رائے نے ایک شام خبر دی کہ جب سے رام جنم بھومی تحریک چل رہی ہے شہر کی سبزی منڈی کی ایک مذہبی عقیدت سے سرشار بڑھیا کو سبزی والے کی دکان پر بکنے والے بینگنوں کو کاٹنے پر ان میں "جے شری رام" لکھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ان کی انھی صلاحیتوں کا کمال تھا کہ اس کا مالک، جس کا نام اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے جانا جاتا تھا، اس نے صحافت کے علاوہ کچھ اور بھی ذمہ داریاں ان کو سونپ رکھی تھیں۔ بچوں کا داخلہ کرانا ہو، گھر میں گیس ختم ہوگئی ہو یا بندوق کا لائسنس رینیو کرانا ہو، یہ سارے کام ملن رائے کے ذمے تھے۔ مالک کی بیوی کو بازار جانا ہوتا تو ملن رائے کی تلاش جاری ہو جاتی۔ بیٹے سرکس جانا چاہتے تو ملن رائے پاس لے کر حاضر ہوتے۔ گھر میں کسی کی سالگرہ ہوتی تو ملن رائے شہر کے اہل دولت کو دعوت نامے دینے کی ذمے داری نبھاتے۔ وہ کسی بھی تقریب میں مستقل پہلو میں کھڑے رہتے اور مہمانوں کو خوش آمدید اور رخصت کرتے رہتے۔

ان بدلتے ہوئے دور میں لوگوں کے لیے صحافت جیسا پیشہ ایک دلالی بن کر رہ گیا تھا، جیسے بڑے میاں نے پالی تھی۔ مثلاً ملن رائے کا مالک ہوٹل ٹرسٹ کرتا تھا۔ اخبار نے ہی اسے یہ طاقت دی تھی کہ سارے اصولوں سارے قواعد و ضوابط کی دھجیاں اڑا کر عین شہر کے بیچ میں ہماں ملٹی اسٹوری مارکیٹ کا تعمیراتی منصوبہ، جو وزیر برائے شہری ترقیاتی منصوبہ جات نے دیا تھا، اور اب جب اس نے آدھی خریدی اور آدھی غیر قانونی طور پر قبضے کی سرکاری زمین پر ایک فائیو اسٹار ہوٹل بنانے کا اعلان کیا تو اسے لگا کہ جیسا شہر کے معززت کرنے جا رہا تھا۔ یہ اخبار اس کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔

اخبار کے اس ایڈیٹر کم پروپرائٹر کی کاروباری عقل بڑی تیز تھی۔ جب صوبے کے دوسرے شہروں سے اس کے شہر میں دھماکہ ہوا تو اس نے اپنی تمام شاطرانہ چالوں سے اس کو خرید کرایا۔ سب سے پہلے اس نے بازاروں سے بچھے ہوئے جال پر قبضہ کیا۔ بازار میں (سونے) سے کر نیلی ڈش جیسے تحفے بانٹے گئے۔ اس مہم میں ملن رائے ایک سپاہی بن کر ابھرے تھے۔

اس کے باپ بڑے ہاکر تھے اور یہ انھی کا رسوخ تھا کہ نئے اخباروں کو برسوں ان کے علاقوں میں ہاکر نہیں مل سکے۔ ابتدا میں تو نئے اخباروں کو لگتا تھا کہ اس شہر میں ان کے اخباروں کی ترسیل مشکل ہے۔ اب دھیرے دھیرے ان کے پاؤں بھی جمنے لگے ہیں، حالانکہ اب بھی ہاکروں پر للن رائے کے اخبار کا ہی خاص اثر ہے۔ ہاکر بار بار لوگوں کے تقاضے پر ہی کوئی دوسرا اخبار دیتا ہے ورنہ تو للن رائے کا اخبار ہی ان کو پڑھنے کو ملتا ہے۔ برسوں ان اخباروں کے دفتروں میں پراسرار طریقے سے آگ لگتی رہی یا ان کے اخبار میں چھپی چھوٹی سی خبر پر کوئی طلبا تنظیم آ کر توڑ پھوڑ شروع کر دیتی اور پولیس دیر سے پہنچتی یا رات گئے ڈیوٹی سے لوٹتے کسی نائب مدیر کی پٹائی ہوتی رہی۔ اب تو ان اخباروں نے بھی بہت سارے ہتھکنڈے سیکھ لیے ہیں مگر پھر بھی للن رائے کا ملٹی اسٹوری بلڈنگیں بنانے والا مالک ان پر بھاری پڑتا ہے۔

للن رائے کے شہر کے صحافیوں کو افسوس اس بات کا تھا کہ صوبائی دارالحکومت کی طرح ان کے یہاں دلالی کے بڑے بڑے مواقع نہیں تھے۔ وہاں کے صحافیوں کی وزیروں، مشیروں اور افسروں کے ساتھ گزاری جانے والی شاموں کی خبریں جب ان تک پہنچتیں، وہ حسد اور احساس کمتری میں ڈوبنے ترنے لگتے۔ ان کا شہر کہنے کو تو صوبے کے بڑے شہروں میں تھا، پر اس کے ساتھ سلوک پوری طرح قصباتی پن کا ہوتا تھا۔ ایک بوتل شراب دے کر افسر دن جگہ گاتا رہتا۔ ایک تھانیدار کو کماؤ جگہ لگوانے میں جتنا پیسہ لگتا، اس سے زیادہ شہر میں اس کا چرچا ہو جاتا۔ ابھی حال میں ضرور اس چلن نے زور پکڑا تھا کہ پریس کانفرنسیں ریسٹورنٹوں یا ہوٹلوں میں ہونے لگی تھیں، پر ان میں بھی شہر کا قصباتی پن جھلکتا۔ اکثر تو پریس کانفرنس بلانے والے چائے سموسے پر ہی ٹرخا دیتے۔ بہت کم موقعوں پر راجدھانی کی طرح شراب میسر ہوتی۔ راجدھانی کی پریس کانفرنسوں میں ملنے والے سوٹ کے کپڑے، گھڑیاں اور [illegible] ان دنوں تو ابھی بھی اس شہر کے صحافیوں کے لیے حسرت بھری خواہش تھی۔ ابھی تک اس شہر نے بس اتنی ترقی کی تھی کہ اب قلم یا سستی گھڑی تک بات پہنچ گئی تھی۔

صوبے کی راجدھانی کے صحافیوں کی طرح اس شہر کے صحافیوں نے بھی اپنے اپنے بیٹ (beat) چن لیے تھے۔ خبروں اور دلالی کے بیٹ۔ ان میں پولیس سب سے زیادہ پسندیدہ بیٹ

Scanned with CamScanner

تھا۔ ہر صحافی کرائم رپورٹر بننا چاہتا تھا۔ اس بیٹ میں محنت کم اور کھیل زیادہ تھا۔ برمکی زیادہ تر خبریں تو کنٹرول روم میں شام کو فون کرنے پر مل جاتی تھیں۔ دن بھر کرائم رپورٹر تھانوں اور پولیس دفتروں کے چکر لگا کر کاجو اور مٹھائی کھاتے رہتے اور ایک آدھ معاملے کی ڈھونڈ کا مخبر جاتا تو اس کی پیروی کر کے دن بھر کی محنت وصول کر لیتے۔ ایک دو اصول پسند اور آدرش وادی قسم کے صحافیوں کو چھوڑ کر باقی سب کی شام کا انتظام ہو جاتا۔ سب کچھ پہلے سے مقرر کردہ اور طے شدہ طریقے سے چل رہا تھا۔ مجھے پولیس نے بتایا ایک ایک کرائم رپورٹر ایک ایک تھانے دار کے حوالے کر دیا جاتا۔ وہ تھانے دار ہی اس کی بیوی بچوں کے لیے فلم یا سرکس کے پاس پہنچا آتا یا شام کو طے شدہ مقدار میں شراب اور مرغے کا انتظام کر دیتا۔ جیسے جیسے کرائم رپورٹر جو پولیس کے تھانوں تک نہ پہنچ پاتے، وہ چوکیوں یا تھانوں میں دھونی رما کے جم جاتے اور وہیں سے خبریں بھیج لیتے۔ لیکن رمیش نے بھی شروعات میں اسی بیٹ کی مانگ اپنے ایڈیٹر کے آگے رکھی تھی، پر ان کا ایڈیٹر اس پر قطعی راضی نہ ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس کا ایک خاص چہیتا اس بیٹ میں لگا ہوا تھا اور پھر وہ رمیش کی اس صلاحیت سے کسی طرح واقف بھی نہیں تھا۔ اس نے رمیش کو پی ڈبلیو ڈی کا محکمہ الاٹ کر دیا۔ پہلے تو رمیش نے کافی ناک بھوں چڑھائی، ہاتھ پاؤں مارے کہ پولیس ڈپارٹمنٹ مل جائے، مگر بعد میں جب انھوں نے اس محکمے میں قدم جمائے تو معلوم ہوا کہ یہاں بھی پولیس ڈپارٹمنٹ کی طرح چرنے کھانے کے لیے ایک وسیع میدان تھا۔

شروع شروع میں رمیش کو کافی محنت کرنی پڑی۔ پی ڈبلیو ڈی جیسا بڑا ڈپارٹمنٹ ان کے لیے ایک دم نئی دنیا تھی، پر وہ وہاں جلد ہی ایک کامیاب صحافی مانے جانے لگے۔ ایک تو وہ بے حد محنتی تھے، دوسرے انجینئروں کی ٹریننگ کام آئی۔ اس پیشے میں کامیابی کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ تبدیل ہوتی ہوئی سواری، سائیکل، موپیڈ اور اسکوٹر پر وہ دوڑتے تھے تاکہ کم وقت میں زیادہ دفتروں میں بارہ گھنٹے سے زیادہ کام کر سکتے تھے۔ دوسرے کامیابی کے گر انھیں ان کے اخبار میں کام کرنے والے امرت لال گپتا نے سکھائے۔

امرت لال گپتا شہر کی پولیس بیٹ کے وہی صحافی تھے جنھیں شروع میں رمیش نے بڑی کوشش سے سیکھی تھی اور بعد میں وہیں ہو کر ان سے دوستی کا معاملہ تھا۔ پہلی ملاقات میں ہی رمیش کی دھار

رکھنے میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ وہ دوست کے دوست اور دشمن کے دشمن تھے۔ مقامی ٹھیکے دار سے
انھیں روز ایک پاؤ شراب ملتی تھی۔ جب تک یہ انتظام جاری رہتا، ان کے تھانے میں امن و چین کا
راج رہتا۔ جیسے ہی اس نظام میں کوئی رکاوٹ پیدا کرتا، ویسے ہی گپتا جی کا اخبار کچھ خاص طرح کی
سرخیوں سے بھر جاتا۔ ان میں سے کچھ کے نمونے اس طرح تھے: ''تھانہ روپ نگر میں چوروں کی بن
آئی، ڈکیتی ہوتے رہے پولیس تھانے میں سوتی رہی'' یا ''دل دہلا دینے والے تھانے میں بلاتکار۔'' بعد
میں جب ان کی شراب پھر سے بندھ جاتی تو سرخیاں کچھ اس طرح ہو جاتیں: ''تھانہ روپ نگر میں
پوری طرح امن چین'' ''رات بھر پولیس کی گشت سے چوروں کے حوصلے پست'' یا ''اب نہیں بنے
گی کسی بہو کی عزت، روپ نگر تھانہ انچارج لوہا سنگھ کی للکار۔'' دراصل ان کی سرخیاں دیکھ کر ہی ان
کے یار دوست بتا دیتے تھے کہ آج کل پولیس اور امرت لال گپتا کی کیسی چھن رہی ہے۔

ان حضرت جی امرت لال گپتا نے ہی للن رائے کو صحافت کے گر سکھائے۔ ابتدائی دور
میں جب للن رائے ٹٹ پونجیا سا سائیکل پر سوار، اپنے چیچک زدہ چہرے پر ہرے اور کالے رنگ کے
بیچ کسی رنگ کا چشمہ چڑھائے، اپنے جیب رفتہ والے سفاری سوٹ کے ساتھ پی ڈبلیو ڈی کے دفتر
میں تشریف لے جاتے تو افسروں اور بابوؤں نے انھیں کسی چڑی مار سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ انھوں
نے صحافیوں کے رعب داب اور ہیبت کے جو سپنے سجائے تھے، وہ چور چور ہونے لگے۔ وہ مایوسی
اور دکھ کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے رہتے، اگر انھیں امرت لال گپتا کی ماہرانہ خدمات نہ ملی
ہوتیں۔ کافی دکھ اٹھانے کے بعد وہ امرت لال گپتا کی پناہ میں آگئے۔

امرت لال گپتا نے سب سے پہلے للن رائے کی ملاقات ایک ایسے جونیئر انجینئر سے کرائی جو
پی ڈبلیو ڈی میں مسلسل چلنے والی اقتدار کی جنگ میں مخالف کیمپ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے جو
خبریں دیں، ان سے للن رائے کی باچھیں کھل اٹھیں۔ کچھ ادھورے تعمیراتی پلوں اور سڑکوں کا انھوں
نے چپکے چپکے معائنہ کیا، کچھ جگہوں کی تصویریں لیں، پھر دکھائے جوہر ان کی سرخیوں نے: ''ایک
برسات بھی نہیں جھیل پائے گی پرائمری اسکول کی عمارت، اپنے بچوں کو داخل کرنے سے پہلے والدین سو
بار سوچیں گے'' ''انجینئر شرما کا کارنامہ: بننے کے بعد ہی ٹوٹ گیا پل'' ''حیرت انگیز مگر سچ: ایک بوری
سیمنٹ میں ملا دیتے ہیں چھبیس بوری بالو'' یا ''پی ڈبلیو ڈی کا محکمہ تعمیرات موت کا اڈہ بنا''۔ ان سرخیوں

کا چارج لے کر بیٹھا اور ایک دن بڑے صاحب نے ٹلن رائے کو بلا بھیجا۔ بند کمرے میں دونوں کے درمیان ڈیڑھ گھنٹے کی طویل کانفرنس ہوئی جس کے دوران ہر ملاقاتی کو چپراسی مسلسل "صاحب میٹنگ میں ہیں" کہہ کر ٹرخاتا رہا۔ اس میٹنگ کے بعد جب ٹلن رائے باہر نکلے تو وہ اس نظام کا اٹوٹ انگ بن چکے تھے۔

کچھ ہی دنوں میں ٹلن رائے کو پی ڈبلیو ڈی اتنا راس آیا کہ انہوں نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں سوچنا بند کر دیا۔ پی ڈبلیو ڈی میں آنے سے گھر میں ان کی حیثیت بڑھ گئی تھی۔ جیسا عموماً ہوتا ہے [illegible] محکمے کا [illegible] ان سے ملنے آنے لگے۔ یہ سوچ کر ان کے باپ نے پاس پڑی سرکاری زمین گھیر کر دو کمرے بنوا لیے۔ صحافی جی کا گھر بن رہا ہے، یہ جان کر میونسپل کارپوریشن والے روکنے نہیں آئے۔ بالو، اینٹ، سیمنٹ وغیرہ پی ڈبلیو ڈی کے بڑے صاحب نے اپنے ایک جونیئر انجینئر سے دے دلا دیں۔ [illegible] ایک طرف [illegible] دونوں سے [illegible] اس طرح محلے اور پڑوسیوں پر ٹلن رائے کا رعب و دبدبہ جم گیا۔ جلد ہی انہوں نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی کو، جو چوری اور ڈکیتی جیسے دو مقدموں میں جیل جا چکا تھا اور مستقبل قریب میں جس کا زیادہ وقت جیل میں گزرنے کے امکانات تھے، ٹھیکیداری میں ڈال دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس پیشے میں ترقی کر گیا۔

ٹلن رائے بڑے صاحب کے بے تکلف ہمراز ہو گئے تھے۔ موجودہ صاحب انہیں طرح طرح سے استعمال کرتے تھے۔ [illegible] کیمپ سے [illegible] خبر [illegible] ڈیپارٹمنٹ نے وزیر تعمیرات و ترقی جیسے بڑے منتری کی پریس کانفرنس میں صحافیوں کو مدعو کرنا ہو، [illegible] کرنا ہو یا بڑے صاحب نے کسی افسر کو خوش کرنے کے لیے اخباروں میں کوئی خبر چھپوانی ہو، ہر موقع پر ٹلن رائے اپنی خدمات کے ساتھ حاضر ہوتے تھے۔ موجودہ بڑے صاحب [illegible] زیادہ ہی [illegible] حاصل ہو گیا تھا۔ صوبے کے جو لوگوں [illegible] چھوٹی [illegible] جنہیں وہ مستقل [illegible] سمجھتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی نہ ملتا تو وہ ٹلن رائے [illegible] سے [illegible] ٹلن رائے نے اپنے [illegible] تعلقات بھی اس درمیان بنا لیے تھے۔

[illegible] کی اہم میٹنگ میں ان کی شرکت نے [illegible] سارے راز تھے۔

روز کے معمول کے مطابق وہ گیارہ بجے پی ڈبلیو ڈی کے دفتر میں داخل ہوتے۔ اس سے پہلے دس سے گیارہ تک کا وقت کچہری اور دوسرے سرکاری دفتروں کے سامنے چائے پانی کی دکانوں پر بتاتے تھے۔ اکثر ان کے ساتھ امرت لال گپتا بھی ہوتا۔ روز ہی کوئی نہ کوئی جونیئر انجینئر یا ٹھیکیدار مل جاتا جو انھیں لسی، سموسے وغیرہ کھلاتا پلاتا۔ جب للن رائے کی بیٹ کا کوئی مرغا نہ پھنستا تو امرت لال گپتا کسی داروغہ یا سپاہی کو پکڑ لیتا جو ان کے چائے پانی کا خرچ اٹھاتا۔ اس درمیان طرح طرح کے لوگوں سے ان کا انٹرویو چلتا رہتا اور وہ خبریں جمع کرتے رہتے۔ پھر دن بھر کے پروگرام کی آؤٹ لائن وہیں بیٹھے بیٹھے تیار کرتے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی مٹرگشتی کے بعد وہ مگہی پان کا جوڑا منہ میں دباتے اور اپنی اپنی بیٹ پر روانہ ہو جاتے۔ امرت لال گپتا کی منزل ہوتی کسی سینیئر پولیس آفیسر کا دفتر یا کوتوالی تھانے اور للن رائے پی ڈبلیو ڈی کے دفتر میں داخل ہوتے۔

آج اس معمول میں تھوڑی تبدیلی آئی۔ ابھی للن رائے نے اپنا اسکوٹر چائے کی دکان کے باہر کھڑا کر کے اپنا چشمہ اتار کے اس امید سے پونچھنا شروع کیا ہی تھا کہ کوئی نہ کوئی واقف کار چائے پلانے والا یا امرت لال گپتا کہیں نہ کہیں سے انھیں دیکھ کر ان کی طرف آ جائے گا، تبھی بڑے صاحب کا ڈرائیور جانے کہاں سے ان کے سامنے آ ٹپکا۔

"آج بڑی دیر کر دی رائے صاحب۔ بڑے صاحب کب سے انتظار کر رہے ہیں۔ چار بار ہمیں بھیج چکے ہیں۔"

للن نے غور سے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ معاملہ کچھ سنگین لگا۔ ابھی مشکل سے سوا دس بجے تھے۔ بڑے صاحب اتنی جلدی دفتر آ گئے اور انھیں ڈھونڈ رہے ہیں، ضرور کوئی خاص بات ہے۔

"ہمیں پتہ نہیں ہے۔ بس بار بار صاحب ہمیں بھیج رہے ہیں آپ کو دیکھنے کو۔ کہیں آپ نہ ملتے تو گاڑی لے کر آپ کے گھر پہنچ جاتے ہم۔"

"اچھا... چلو... ایک جوڑا پان منہ میں ڈال لیا جائے تو چلیں۔"

"آپ چلیں، ہم پان لگوا کر لا رہے ہیں۔ یہاں کھڑے رہیں گے تو ابھی آپ کو آپ کے چاہنے والے گھیر لیں گے، پھر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، پان لگوا کر آؤ، ہم چل رہے ہیں،" للن رائے نے اپنا اسکوٹر اسٹارٹ کرکے

Scanned with CamScanner

سڑک کی دوسری جانب واقع پی ڈبلیو ڈی کے دفتر کی طرف کچہری کی بھیڑ میں سے دھیرے دھیرے اسکوٹر نکالتے ہوئے بڑھ گئے۔

ملن رائے جب بڑے صاحب کے کمرے کے سامنے پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ دروازہ بند تھا، مگر جس طرح ایک کرمچاری نے دروازہ کھول کر اندر جانے کا اشارہ کیا، اس سے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ معاملہ کچھ خاص تھا اور ان کا انتظار ہو رہا تھا۔

اندر پھیلی ہوئی اداسی اور تناؤ کو گھستے ہی سونگھا جا سکتا تھا۔ ملن رائے نے بھی پورا معاملہ سمجھے بغیر منھ لٹکا لیا۔ انھوں نے یہ سوچ کر ضرور اطمینان کا سانس لیا کہ وہ بڑے صاحب کے لیے کتنے اہم ہیں کہ چار لوگوں کے ساتھ بند کمرے کی رازدارانہ میٹنگ میں صلاح مشورے میں ان کا بھی سر پڑتا ہے۔

کمرے میں بیٹھے لوگ ایک دوسرے سے سرگوشی میں باتیں کر رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی سب چپ ہو گئے۔ بڑے صاحب کی آدھے چاند کی شکل کی اور کافی حد تک شاندار میز کے بائیں جانب اسسٹنٹ انجینئر رضوان الحق، دوسری طرف جونیئر انجینئر دھرم پال یادو اور سامنے بڑے بابو بیٹھے تھے۔ حالانکہ تینوں کے بازو والی کرسیاں خالی پڑی تھیں مگر ملن رائے بڑے بابو کے قریب پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ معاملہ کیا ہے؟ سے چنتت ملن رائے نے بدھو کی طرح باری باری سب کی طرف دیکھا۔ کوئی نہیں بولا تو وہ اور زیادہ بےچین ہو گئے۔ انھیں کچھ نہیں سوجھا تو سامنے پلیٹ میں رکھے پان کے بیڑوں میں سے دو پان اٹھائے، اس کے پاس تمباکو میں سے ایک چٹکی تمباکو نکالی اور منھ میں ڈال لی۔

پان کھا کر ملن رائے ابھی ٹھیک سے اپنے خیالوں میں الجھے ہی رہے تھے کہ صاحب نے اپنے سامنے پڑے ایک کاغذ کو ان کے سامنے سرکا دیا۔ یہ تبادلے کا حکم نامہ تھا جو صبح صبح ایک اسپیشل میسنجر لایا تھا۔
"بڑی جلد بازی ہے صاحب" ملن رائے نے لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کی، پر کوئی مسکرایا تک نہیں۔

مشکل سرکاری ہمدردی میں جو لکھا تھا، اسے پڑھتے ہی ملن رائے کو ضرور وقتی ہول پڑ گئے

Scanned with CamScanner

میں نہیں۔ مطلب صاف تھا کہ بڑے صاحب یعنی شری ملکات ورن کا تبادلہ ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈکوارٹرز میں ڈیزائن سیل میں ہو گیا تھا اور انھیں فوری طور پر دفتر کے نمبر دو شری رشبھ چرن شکلا، اسسٹنٹ انجینئرز کو اپنی ذمے داریاں سونپنی تھیں۔ بھوک چند اپادھیائے، ایگزیکٹو انجینئر، کو بھی آ کر رشبھ چرن شکلا سے اپنی ذمے داریاں لے کر اس ڈویژن کا ایگزیکٹو انجینئر بننا تھا۔ اتنا پڑھنے کے بعد ملن رائے کی سمجھ میں آ گیا کہ معاملہ گمبھیر ہے اور وقت کم ہے۔

انھیں معلوم نہیں تھا کہ ابھی تک کیا پالیسی میدان کارزار کے لیے وضع کی جا چکی ہے اور کیا کیا فیصلے کیے جا چکے ہیں۔ اس پوری واردات میں ان کا کیا کردار ہوگا، یہ سمجھنے کے لیے انھوں نے کاغذ سامنے سے سرکایا اور بڑے صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ بے معنی سا لفظ منھ سے نکالا۔

"تو..."

"تو کیا؟... ایڈیٹر صاحب، آپ بتائیے، کیا کرنا ہے؟" رضوان الحق نے پوچھا۔

اس کا مطلب اس کی رائے کی اہمیت ہے۔ ملن رائے سنجیدہ ہو گئے۔ رائے دینے سے پہلے تمام معلومات کا ہونا بھی ضروری ہے۔

"بھوک چند اپادھیائے کب تک آ رہا ہے؟"

"چل چکا ہے۔ آدھے ایک گھنٹے میں پہنچ رہا ہے۔"

"کیسے پتا؟"

"ٹیلی فون کیا گیا تھا۔ اس کے دفتر سے بتایا گیا کہ صبح کی پرائیویٹ کار سے روانہ ہو گیا ہے۔ اب پہنچنے والا ہوگا۔"

"بڑے صاحب اتنا سویرے دفتر کیوں آ گئے؟"

"دھوکا دے کر بلایا گیا۔ ایس ای نے فون کیا کہ دس بجے وہ دفتر میں ملیں گے۔ یہاں آنے پر اسپیشل میسنجر ملا تھا۔"

"تو ریلیو کر دیا؟"

"صاحب نے نہیں کیا، پر رشبھ چرن صاحب نے ڈسپیچ سے کروا دیا ہے۔"

"اس ڈرامے والے رشبھ چرن سے تو میں نپٹوں گا۔ دفتر میں سادھو سے بڑھ کر وہ چھل رکھ

Scanned with CamScanner

ہے،" دھورو لال نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

بڑے صاحب کے سامنے بالوں سے پیوستہ شدہ ایسی صورت حال [illegible] آ چکی تھی۔ [illegible] آدھا دھیان اپنے ماتحتوں کی بات چیت پر تھا اور آدھا آگے کی حکمت عملی بنانے پر لگا تھا۔ بیچ بیچ مسکرا کر یا کچھ مذاقیہ جملے بول کر وہ اپنے کو مطمئن دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اب کیا کرنا ہے صاحب، جلدی فیصلہ کیجیے۔ بس تو چوک [illegible] کبھی بھی پہنچ سکتا ہے۔" دھورو لال یدو ایکشن میں یقین رکھتے تھے۔ [illegible] لمبی میٹنگ کا دورانیہ اب انہیں [illegible] دینے لگا تھا۔

"آپ نے جو کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اسے یدو صاحب [illegible] گئے ہیں!" بڑے صاحب نے چہل کی۔ بڑے بابو مسکرائے اور [illegible] ہنس دیے۔

دھورو لال کو بھی مزہ آیا۔ [illegible] صاحب [illegible] فرق آ گئی ہے۔ [illegible] بات [illegible] چاہیے۔ [illegible] پیدا [illegible] میں گاڑی رکتے ہی [illegible] اور [illegible] بکسوں میں پیچھے سے راستے سب نکل جائے تا۔ بڑے صاحب [illegible] بات تو [illegible] بھی۔ اگر [illegible] سامنے [illegible] کا بازی [illegible] اور اپنے [illegible] بات [illegible] مسکراہٹ [illegible] ایک آنکھ دبائے اور [illegible] ٹھیک ہے [illegible] چاہیے۔ مگر اس وقت وہ [illegible] تھے، [illegible] مسکرا دیے۔

"چلیے [illegible] مجھے [illegible] سوچتے ہوئے [illegible] تھی۔" [illegible] صاحب نے اپنے [illegible] دکھانے کے لیے [illegible] کرتے ہوئے کہا۔ مگر [illegible] کوئی بھی شخص [illegible] قریب سے جانتا ہو، دیکھ سکتا تھا کہ اس کے [illegible] ساتھ [illegible] رہا تھا۔

"آپ بھی [illegible] بات کرتے ہیں صاحب" [illegible] آواز دھیمی کی۔

"کام کرنے کا مزہ تو آپ ہی کے ساتھ آیا۔ آپ کو جانے نہیں دیں گے ہم۔" رضوان الحق نے اور زور دے کر کہا۔

"ہم تو صاحب سنتھو تھے۔ آپ نے ہمیں جے ٹی بنا دیا۔ پہلی بار دھوروال یادو نے بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ آپ گئے تو بھوک چند کو چار جوتا مار کے پھر لنٹھئی شروع کر دیں گے۔" دھوروال یادو نے بھی اپنی وفاداری کا اعلان کر دیا۔

بڑے صاحب نے چشمے کو ناک پر کھسکایا اور بولنے والوں کو غور سے تو۔۔۔ "سالے یہی سب ڈائیلاگ بھوک چند کے سامنے بھی بیٹھ کر جھاڑیں گے۔ بڑی ذلیل دنیا ہے یہ!" انھوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"راے صاحب، آپ و لکھسو کا مورچہ سنبھالنا پڑے گا۔" رضوان الحق نے کہا۔

"مجھے حکم چاہیے۔" مکلن راے نے بڑے صاحب کی طرف دیکھا۔

"حق صاحب بتائیں گے کہ کسے کیا کرنا ہے۔" بڑے صاحب نے اس جنگ کا سپہ سالار حق صاحب کو مقرر کیا۔

"سب سے پہلے تو آپ ہی یہاں سے تشریف لے جائیے۔ آپ کو دھوکا دے کر یہاں بلایا گیا ہے، پر اب آپ کو یہاں پڑے رہنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ بھوک چند کو آسانی سے چارج نہیں ملنا چاہیے۔"

بڑے صاحب کے چہرے پر ہچکچاہٹ دیکھ کر حق نے چاپلوسی اور شرارت کی چاشنی میں بھگو کر ایک زبان کا وار کیا: "پھر آپ ایس ای صاحب کی مروت میں پڑے۔ انھوں نے آپ کے لیے کیا کیا؟ جھوٹ بول کر بلوا لیا۔ اس کا مطلب، انھیں بھوک چند کے آرڈر کا علم تھا۔ چیف انجینئر کے دفتر سے حکم ملا ہوگا کہ آپ کا چارج سنبھال لے، تو جھوٹ بول کر آپ کو یہاں بلا لیا۔ تھوڑی دیر میں بھوک چند یہاں پہنچ جائے گا، پھر آپ دیکھیے گا ایس ای صاحب بھی پیچھے پیچھے جی جی کرتے پہنچ جائیں گے۔ تب آپ کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوگا، سوائے اس کے کہ چارج دیں۔ وقت کم ہے، آپ پہلے یہاں سے جائیے، تب ہم فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔"

"وقت سچ مچ کم ہے۔" بڑے صاحب نے کمال ذہانت سے سوچا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسا

یقین تھا کہ وہ اس بات کو سمجھ نہیں رہے تھے۔ اپنے ماتحتوں کی باتیں سنتے ہوئے وہ بولے، "ہاں، وقت بہت کم ہے۔" مگر ان کا دماغ مسلسل کام کر رہا تھا۔ دفتر میں آتے ہی وہ سمجھ گئے تھے کہ ان کے خلاف سازش ہوئی ہے۔ سپرنٹنڈنگ انجینئر بیمار ہے۔ ل نے صبح صبح ان کے گھر چپراسی بھیجا کہ وہ دس بجے دفتر آ جائیں گے، اور کوئی ضروری رپورٹ لکھنؤ بھیجنی ہے، اسی کے بارے میں بات کرنی ہے۔ انھوں نے فوراً فون سے مسٹر ای سے رابطہ کر کے معلوم کرنا چاہا؟ معلوم نہیں ہے، لیکن ان کا فون مسلسل بزی ملا۔ سب سمجھ میں آ گیا کہ ان کا ریسیور ہی ہٹا دیا گیا ہوگا۔ اتنے سویرے دفتر پہنچنے والے اس ی کا بھی ان کے دفتر آنا انھیں کھٹکا ضرور، لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ وہاں پہنچنے پر انھیں تبادلے کا آرڈر تھما دیا جائے گا۔

اس توقع کے پس پردہ سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ کملا کانت ورما اپنے کو اس ایریا کے اس کا خاص آدمی سمجھتے تھے اور سپرنٹنڈنگ انجینئر کے ساتھ تعلقات ورما کے غیر یقینی حد تک دوسروں کے لیے حسد کا باعث تھے۔ ان تعلقات کی بنا پر ہی لوگ ان کی پیٹھ پیچھے طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ انھیں ان باتوں کے بارے میں علم تھا لیکن اسے حاسدانہ رویہ سمجھ کر انھوں نے کبھی کوئی پروا نہیں کی۔ انھیں پوری امید تھی کہ کبھی ان کے اوپر کوئی مصیبت آئی بھی تو بیمار سب سے پہلے انھیں آگاہ کریں گے۔ اس طرح دھوکا دے کر دفتر بلائے جانے کا تو انھیں سان گمان بھی نہ تھا۔ دو مہینے اسی وقت کمبھ میلے کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ روز لکھنؤ طرح طرح کی خبریں منگائی جاتی تھیں۔ کئی مرتبہ تو دیر رات تک خبریں جمع کی جاتیں، لمبے چوڑے ڈرافٹ بنتے اور رات میں ہی ٹائپ کر کے دستخط کرائے جاتے اور صبح ٹرین پکڑ کر کوئی نہ کوئی لکھنؤ روانہ ہوتا۔ مہینے میں دس دن سے زیادہ وہ اور سپرنٹنڈنگ انجینئر لکھنؤ میں رہ کر الگ الگ طرح کی میٹنگ میں شریک ہوتے۔ یہ ان کی محنت اور کوشش کا نتیجہ تھا کہ کمبھ میلے کا بجٹ پچھلے کمبھ سے ڈیوڑھا ہو گیا تھا۔

اس ساری محنت کا کیا یہی پھل انھیں ملنا چاہیے تھا؟ کملا کانت ورما نے دکھی ہو کر سوچا۔ اس سارے بکھیڑے سے تو وہ بعد میں نمٹیں گے۔ سامان کا کیا ہو تو یا کسی کا نہیں ہوگا۔ انھوں نے اس کے لیے دفتر کے سارے اصول توڑ دیے۔ پچھلے دس ای جن ٹینڈروں کو خود منظور کرتے تھے صرف ان پر ایک فیصد لیتے تھے، اس نے ڈویژن کی کیش بک دیکھ کر پورے کام پر ایک فیصد

لینا شروع کردیا۔ دوسرے ایگزیکٹو انجینئروں نے مخالفت کی، پر کملا کانت ورما نے منظور کرلیں تو جھک مار کر انھیں بھی یہ صورت حال گوارا کرنی پڑی۔ اسی طرح پچھلا ایس ای ہر ڈویژن سے دو ہزار روپیہ مہینہ لیتا تھا، لیکن اس نے تو آتے ہی پانچ ہزار روپیہ کردیے۔ پہلے بڑی ہائے توبہ مچی، پر کملا کانت نے یہاں بھی سب سے پہلے ہتھیار ڈال دیے۔ دوسرے ڈویژنوں کے انجینئروں نے پہلے تو کچھ دن تک اس کی مخالفت کی مگر پھر ان کو بھی جھکنا پڑا۔ ہر مہینے سپرنٹنڈنگ انجینئر پہلے ہفتے میں سب کی میٹنگ کراتا تھا، اسی دوران کبھی اپنا اپنا مفاد بڑھا دیتے تھے۔ کئی مہینے تک ایس ای معمولی معمولی باتوں پر ان انجینئروں کو ذلیل کرتا رہا جنھوں نے کملا کانت ورما کی طرح لفافے میں پانچ ہزار رکھنا شروع نہیں کیا تھا۔ ان کے کاغذوں پر طرح طرح کے اعتراضات لگتے رہتے۔ آخر میں ایک ایک کرکے سب نے ہتھیار ڈال دیے۔ آپسی بات چیت میں وہ سب کملا کانت کو کوستے تھے کہ انھوں نے پورا ماحول بگاڑ دیا ہے۔

تناسب کرنے کے بعد پیارے دل نے ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا، کمرے سے باہر نکلتے نکلتے انھوں نے درد بھرے انداز میں سوچا۔

ان کے کمرے کے باہر دفتر کا ماحول بے چینی اور پراسراریت سے بھرا ہوا تھا۔ باہر آتے ہی وہ جیپ کی طرف بڑھے۔ مشکل سے دس قدم پر جیپ کھڑی تھی لیکن یہ دس قدم طے کرتے ہوئے انھیں لگا کہ جیسے پورا ایک جگ بیت گیا ہو۔ پتا نہیں یہ ان کا احساس تھا یا حقیقت، انھیں لگا کہ دفتر کے دروازوں اور کھڑکیوں سے آنکھیں چپکی ہوئی ہیں اور وہ آنکھیں انھیں گھور رہی ہیں۔ راستے میں دفتر کے ماتحتوں اور نچلے عہدے داروں نے ہاتھ اٹھا کر سیلوٹ کے انداز میں سلام کیا اور وہ اپنے عام رویے سے ہٹ کر ہلکی جنبش سے انھیں جواب دیتے رہے۔ ان کے جیپ میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی روانہ کردی۔ پورے ماحول کا اثر اس پر بھی تھا۔ روز کی طرح ایک بار بھی اس نے منزل کے بارے میں نہیں پوچھا اور ہڑبڑاہٹ میں دوسرے گیئر میں گاڑی اٹھا دی۔ انجن نے دو تین بار جھٹکے کھائے، ڈرائیور نے کلچ دبایا تو ہلکی تھرتھراہٹ کے بعد گاڑی لے میں آگئی اور دفتر کے گیٹ سے باہر نکل گئی۔

Scanned with CamScanner

صوبائی ڈویژن، پی ڈبلیو ڈی، سے محکمہ تعمیرات کے نام سے اس دفتر میں دوسرے کئی درجن سرکاری دفتروں کی طرح پہلے بھی کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ [illegible] بھی نہیں۔ ذرا فرق صرف اتنا ہے کہ آج بابوؤں اور افسروں نے کام چوری کے ساتھ تخریب، پراسراریت اور سنسنی خیزی [illegible] میں دن بتانا اور ان کی ابتدا پراسرار خبروں سے ہوئی۔

دفتر کا معمول تھا کہ دس بجے [illegible] کے دخول سے [illegible] اور پان کی پیک سے [illegible] [illegible] کی [illegible] کاروبار والے [illegible] میں چہل پہل شروع ہو جاتی۔ [illegible] فراش [illegible] [illegible] وارد ہوتا تھا۔ [illegible] کام [illegible] دفتر کے [illegible] کے اندر کی [illegible] [illegible] کی کسی میز کی پر بیٹھ جاتا اور آس پاس کی [illegible] پر [illegible] منہ میں [illegible] پان کی پیک سے گلگوں پارے بکھیرتا۔ [illegible] [illegible] دیوار پر چھپر لگا کر چائے کی دکان کے جو [illegible] [illegible] آراستہ و پیراستہ زبان کو خوب سمجھتے تھے کہ وہ اس دفتر کے چوکیدار نامی شخص [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اپنے فرائض منصبی ٹھیک طرح سے انجام [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] چوکیدار [illegible] [illegible] [illegible] کھول رکھے۔ تھوڑی دیر [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] فراش [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

Scanned with CamScanner

تھا۔ آج بھی یہی سب ہوا۔ آج بھی وہ تب تک بڑبڑاتا رہا جب تک چوکیدار آ نہیں گیا اور جب چوکیدار نے کمرے کھولنے شروع کیے، وہ دفتر کی دیوار سے سٹی چائے کی دکان پر چلا گیا اور اس نے دن بھر میں دوسروں کے پیسوں سے پی جانے والی پچیس تیس پیالی چائے میں سے پہلی پیالی کا حکم سنایا۔

اس کے بعد چوکیدار نے ایک ایک کمرے کا دروازہ کھولنا شروع کر دیا اور ایک بار پھر فضا روز کی طرح نامعلوم خواتین کی شان میں کہے گئے قصیدوں سے گونج اٹھی۔ اس بار یہ خواتین فراش کے خاندان کی تھیں۔ چوکیدار کی باتوں کو سچ مانا جائے تو اس کی خوبصورت زبان سے برسنے ہوئے جملوں کا نتیجہ کچھ اس طرح تھا: یہ پورا دفتر کام چوروں سے بھرا ہوا ہے، فراش ان میں سب سے بڑا کام چور ہے؛ چونکہ سرکار نے فراش کی تنخواہ کافی کم رکھی ہے لہٰذا اس کے گھر کی عورتوں کو طرح طرح کے ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جن کو بیان کر کے وہ اپنی زبان گندی نہیں کرے گا؛ یہ دفتر صرف بڑے صاحب اور چوکیدار کے دم پر چل رہا ہے ورنہ جیسا کہ زمانے کا چلن ہے لوگ اس کی اہمیت نہیں سمجھ پا رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس درمیان اکا دکا بابو، ٹھیکیدار، دلال وغیرہ آنے شروع ہو جاتے تھے۔ انھیں دیکھ کر چوکیدار کا لہجہ کچھ اور تیز ہو جاتا ہے، پر ان میں سے زیادہ تر اس کی بات سن کر اپنی قمیص سے دھول جھاڑنے لگتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ کسی تصوراتی مکھی اڑانے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

آج بھی اس دفتر میں دن کی شروعات روز کی طرح ہوئی۔

بابو لوگ آئے، اور جن کو انھیں دن کا کافی حصہ چائے کی دکان پر بتانا تھا، وہ اپنا جھولا، رومال یا تولیہ اپنی کرسیوں پر پھینک کر چائے کی دکانوں پر چلے گئے۔

کچھ بابو اور ٹھیکیدار آئے اور برآمدوں میں پان کی پچکاریاں مارتے ہوئے کمروں میں جھانکتے اور "اس ملک میں کام کوئی نہیں کرتا" جیسا کوئی معروف جملہ دہراتے ہوئے چائے کی دکانوں پر چلے گئے۔

دس بجے اے ای ایک بلٹ موٹر سائیکل پر آئے۔ انھوں نے دفتر کے بالکل بیچ سے موٹر سائیکل روکی، کچھ دیر وہیں کھڑے رہے، انھیں لگا کہ انسان نامی جاندار سے خالی دفتر کی دیواریں اور چھت دیر تک تھرتھراتی رہیں اور پھر وہ ایک چائے کی دکان پر موٹر سائیکل لے کر اس انداز میں چڑھ گئے جیسے وہ ب

وحشی کا کوئی غزیل راجپوت سردار اپنی محبوبہ کے سوئمبر میں پہنچا ہو۔

قصہ کوتاہ یہ کہ روز کی طرح آج بھی ساری سڑکیں چائے کی دکانوں کی طرف جاتی تھیں۔

یہ چائے کی دکانیں دفتر کے کسی بھی کونے میں، کسی بھی سرکاری دفتر کے سامنے لگ سکتی تھیں، یہاں بھی لگ گئی تھیں۔ یہاں چونکہ سرکاری دفاتر خاصی تعداد میں تھے اس لیے دکانیں بھی کافی تعداد میں تھیں۔ یہ دکانیں رہائش اور جنریٹر سمیت سرکاری چھتوں کا دائمی ملاپ تھیں۔ ان کا طریقِ رول تھا جہاں بھی دو گز زمین ملے، ایک چھپر ڈال دو۔ پھر اس میں چولہا، فرنیچر اور دیگر چیزیں اپنے آپ سما جائیں گی۔ چھپر کو ٹکانے کے لیے بانس، بجلی کے ساتھ ساتھ سرکاری چار دیواریں بہتات سے تھیں۔ دکانوں کے لیے زمین جیسی بیکار چیز خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ چاروں اطراف سرکاری زمینیں پڑی ہوئی تھیں۔

اپوزیشن پارٹی ٹھیک کہتی ہے کہ ہماری سرکار بہری ہے، کیونکہ مردوں کی طرح دکانوں سے معمولی خرچ داروں میں نشر ہونے والے یہ پیغامات ضرور سنتی۔ دکانوں میں رسیوں کی ... کہ یہ زمین سرکاری ہے وہ زمین ہماری ہے۔"

صفائی، بالی گین ورائن سے ملتے جلتے الفاظ مغرب سے اس لیے گڑھتے ہیں کہ ہمارے جیسے "تیسری" دنیا کے پڑھے لکھے ہندوستانیوں کو بیچ میں شرمندہ کر سکیں۔ پر جو یہ شرمندگی ہماری قومی پیشی کے خلاف ہے۔ اس لیے وہ لکھتے رہتے ہیں اور ہم ان سے قرض لے کر ان کی خواہش دکھیوں، چپلوں اور گندی چیزوں کے ساتھ ملا کر چائے کی پیالیوں میں مدغم کرتے رہتے ہیں۔

سموسہ ہماری ایک قومی غذا اس ملک میں ہر جگہ دستیاب ہے۔ اس کے بیچ ... کی پورے ملک میں افراط ہے۔ یہ ایک قومی غذا ہے جس میں گوشت سالن چھپا ہے ... تک کی رسائی ... حاصل کی جاسکتی ہے۔

سرکار کتنے ہم پیغاموں کو نظر انداز کرتی ہے لیکن ہر شہری کے رویے میں ... بابو، فریادی اپنے اضافی وقت کا زیادہ تر حصہ چائے کی دکانوں پر بتاتے ہیں اور قوم سے منسلک ہونے والے ان پیغاموں کو پورے غور سے سنتے رہتے ہیں۔

روز کی طرح بڑے بابو کی سائیکل مقررہ وقت پر دفتر میں داخل ہوئی۔ فراش صاحب نے بابو

Scanned with CamScanner

سے دور ہو گئی۔ اس نے جھک کر نمسکار کیا اور سائیکل پکڑ لی۔ بڑے بابو نے نظر انداز کرنے والے انداز سے اسے دیکھا اور نمسکار کا جواب نہیں دیا۔ انھیں معلوم تھا کہ فراش نے پروویڈنٹ فنڈ سے قرض کے لیے درخواست دے رکھی ہے اور کاغذ بڑے بابو کے پاس ہے، اس لیے اس کے نمسکار کا جواب نہ دینا ہی مناسب ہے۔ فراش نے سائیکل ایسی جگہ کھڑی کر دی جہاں سے بیٹھے بیٹھے بڑے بابو اسے دیکھ سکیں۔ اس نے سائیکل میں تالا لگا کر چابی بڑے بابو کو دے دی۔ ربڑ کی زنجیر والا تالا بابو نے خود لگایا اور فراش کے لگائے تالے کو ہلا ڈلا کر اطمینان کیا کہ تالا ٹھیک سے لگا ہے کہ نہیں۔ پھر وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

کمرہ خالی تھا۔ پہلے بڑے بابو بھی آتے ہی کرسی پر اپنا جھولا رکھ کر چائے کی دکان پر چلے جاتے تھے، پر بڑے بابو ہونے کے بعد سے نہیں جاتے ہیں۔ ان کے لیے چائے سموسے یہیں آ جاتا ہے۔ دن میں ضرور تین چار دفعہ وہ ٹھیکیداروں یا جونیئر انجینئروں کے اصرار پر ان دکانوں میں چلے جاتے ہیں۔ آتے ہی چائے کی دکان پر جانے سے دفتر کے ڈسپلن کی خلاف ورزی ہوتی ہے، یہ ان کا ماننا تھا۔

ابھی بھی وہ خالی کمرے میں اپنی کرسی پر بیٹھے، اپنی سائیکل کو نہار رہے تھے۔ بار بار کسی ورودا چاپ کی سمت دور تک تکنے پر سامنے پڑی فائل کے صفحے الٹنے لگتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اس طرح وقت پر کرسی پر بیٹھنے سے آفس کا ڈسپلن سدھرے گا اور بابوؤں میں بھی اپنے اپنے فرائض کے تئیں ذمہ داری پیدا ہوگی۔ بابوؤں کی رائے اس معاملے میں بدقسمتی سے بالکل الٹی تھی، اس لیے روز اس طرح وہ اکیلے بیٹھے رہے اور بابو باہر دکانوں پر گشت کرتے رہے۔ تبھی تھرتھری پیدا کرنے والے ان واقعات کی شروعات ہوئی جن سے اگلے آنے والے چند دنوں تک اس دفتر کی زندگی اثر پذیر ہونے جا رہی تھی۔

ابھی دس بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ دفتر میں بڑے صاحب کی جیپ داخل ہوئی اور پورٹیکو میں جا کر کھڑی ہو گئی۔

دفتروں میں بڑے صاحب عموماً دس بجے نہیں آتے۔ ان کے آنے کا وقت گیارہ ساڑھے گیارہ بجے شروع ہوتا ہے، کبھی کبھی دوپہر بعد بھی ہو جاتا ہے۔ خاص طور سے ایسے بڑے صاحبوں

Scanned with CamScanner

کے لیے جن کے کام میں دوروں کی گنجائش ہوتی ہے، دفتروں میں بیٹھنے کے وقت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ ان دفتر کے بڑے صاحب کو بھی دورے کرنے پڑتے تھے، اس لیے ان کے دس بجے سے پہلے دفتر پہنچنے پر چھوٹا موٹا طوفان سا آ گیا۔

بڑے صاحب کے کمرے کو کھولنے اور صاف کرنے کا کام ان کا چپراسی کرتا تھا۔ وہ چائے کی دکان پر تھا۔ سب سے پہلے وہ بھاگا۔

صاحب نے اپنے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ان کا ڈرائیور باہر کی طرف دوڑ پڑا، پر آدھے راستے میں ہی چپراسی سے ملاقات ہو گئی۔ دونوں دوڑتے ہوئے دروازے تک آئے۔ چپراسی نے تالا کھولا، ڈرائیور پردہ اٹھائے کھڑا ہو گیا اور بڑے صاحب اندر گھس گئے۔

بڑے بابو نے بڑے صاحب کو اندر جاتے ہوئے دیکھا تو بغل میں ایک فائل دبائے ان کے کمرے کی طرف لپک لیے۔ ایک تو اپنے افسر کی بے چینی دور کرنے کا مقصد تھا، دوسری طرف بڑے بابو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ دفتر میں صرف وہ وقت سے آ کر اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔

بڑے بابو جب کمرے میں داخل ہوئے تو چپراسی کمرے کے فرنیچر کی جلدی جلدی صفائی کر رہا تھا اور صاحب جیبوں میں ہاتھ ڈالے پنکھے کے نیچے کھڑے دھیمی دھیمی سیٹی بجا رہے تھے۔ سب کچھ پرسکون لگ رہا تھا۔ بڑے بابو کو دیکھتے ہی بڑے صاحب بڑے صاحب بن گئے۔ انھوں نے سیٹی بجانا بند کر دیا۔ جلد بازی میں صاف کی گئی کرسی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بیٹھ گئے۔ بڑے بابو نے فائل سامنے رکھ دی پر اسے پرے سرکاتے ہوئے وہ بولے:

”میں ابھی دورے پر نکلنے والا ہوں۔ آپ کے دفتر میں تو گیارہ بجے کام شروع ہوگا۔ جائیے ان سب کمبختوں کو چائے کی دکانوں سے کھدیڑ کر اندر کیجیے، تاکہ کام دھام شروع کریں۔ کیشیئر بابو سے کہیے کہ فائل مجھے دے جائے۔ شاید کسی بارے میں سرکار کو کچھ بھیجنا ہے۔“

عادت کے مطابق بڑے بابو ”بہت بہتر“ جیسا کچھ بدبدائے اور باہر نکل آئے۔

باہر جو کچھ ان کے ساتھ ہوا اس کے نتیجے میں وہ پانچ منٹ کے بعد اندر بھاگ کر پھر بڑے صاحب کے کمرے میں آ گئے۔

Scanned with CamScanner

بڑے بابو کی کرسی کے پاس جو آدمی کھڑا تھا، وہ ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے وہ جانتے تھے۔ وہ لکھنؤ ہیڈ آفس کا چپراسی تھا۔ پچھلے بیس سالوں سے وہیں تھا۔ وہاں کی ڈاک لے کر آتا تھا۔ اس کے دفتر میں آتے ہی افسروں سے لے کر بابوؤں تک اسے الگ الگ بٹھا کر ہیڈ آفس کی خبریں پوچھا کرتے تھے۔ اس کی چھچھی آؤ بھگت بھی ہوتی تھی۔ پر وہ آج صبح کبھی نہیں پہنچا تھا۔ لکھنؤ سے آنے والی ریل گاڑی نو بجے تک آتی تھی۔ شہر میں اس کے دو ایک اڈے تھے جہاں وہ منہ دھو کر بارہ بجے تک آرام سے ڈاک لے کر آتا تھا۔ آج اتنی جلدی کیسے آ گیا؟ بڑے بابو کا ماتھا ٹھنکا۔

"کیا رے سونے لال؟ اتنی جلدی آ گئے آج۔ کوئی ڈاک ہے کیا؟"

ہیڈ آفس کے چپراسی کو بھی مہمان خاص کا درجہ حاصل ہوتا ہے، یہ بات بڑے بابو نے اپنی لمبی نوکری میں سیکھ رکھی تھی، اس لیے ان کی آواز میں شہد جیسی مٹھاس بھری تھی۔

سونے لال تھا تو ہیڈ آفس کا مگر پچھلے بیس سال سے یہاں اس دفتر میں آ رہا تھا، اس لیے یہاں کے بابوؤں اور چپراسیوں سے اس کے گہرے مراسم قائم ہو چکے تھے۔ وہ جب اس دفتر کے ملازمین سے بات کرتا تو اس کی آواز میں تھوڑی ہیکڑی ضرور ہوتی تھی مگر اس طرح کا حقارت نہیں ہوتا تھا جو اس کی آواز میں بڑے بابو کو جواب دیتے وقت سننے والوں نے محسوس کیا۔

"یہ رسیو کر لیجیے بڑے بابو۔" اس نے بڑے بابو کی طرف ایک لفافہ بڑھایا۔

سیل بند خاکی رنگ کا لفافہ بچھو کے ڈنک کی طرح ہوا میں جھولتا رہا۔ بڑے بابو کے لمبے دفتری تجربے نے انھیں چوکنا کر دیا۔ آگے بڑھانے کے بجائے انھوں نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"بھیا، تم اس دفتر میں نئے ہو کیا؟ ڈاک تو ڈسپیچر کالیکا رسیو کرتا ہے۔ دے دو اسے۔" بڑے بابو نے لجاجت سے کہا۔

"کالیکا ابھی آیا نہیں۔ اس دفتر میں سب سالے کام چور ہیں۔" سونے لال نے یہ بات اسی رعب داب سے کہی جسے ہیڈ آفس والے عموماً اپنے ماتحت دفتروں میں دکھاتے ہیں۔ "آپ ہی لے لیجیے بڑے بابو۔ دفتر کے بڑے تو آپ ہیں۔ سارا دفتر آپ چلاتے ہیں۔"

"نہیں بھیا، اس سے ڈسپلن بگڑتا ہے۔ سب کو اپنا اپنا کام کرنا چاہیے۔"

سونے لال نے بہت سمجھایا کہ اس دفتر میں ڈسپلن نامی شے ویسے بھی کتنی کم مقدار میں ہے تو

اس کے لینے یا نہ لینے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بڑے بابو نہیں مانے۔ سوال اصول کا تھا۔ قومی مسئلوں پر بحث و مباحثے کی طرح یہ گفتگو بھی بہت بچی کھچی سی تھی اور کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم سی ہو جاتی مگر موقع واردات پر اس بحث کا سب سے اہم کردار یعنی وہ ٹھیکیدار اچانک ٹپک پڑا اور اسے دیکھتے ہی بڑے بابو نے اصولی موقف اختیار کرتے ہوئے کاغذ اسے واپس دے کر رسیو کرنے کو کہا۔

"لیجیے کا پیا بابو، تنگ سے رسیو کر لیجیے یہ کاغذ۔" اس نے بابو سے خود اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس درمیان بڑے بابو اور کا پیا بابو کی آنکھوں میں تصادم کی قسم کے جذبات کا تبادلہ ہو گیا لیکن بابو اچانک فطرت کی پارسائی دے گئی۔

"ٹھیکیدار صاحب، ابھی ویسے ہی۔ ہم ابھی پیشاب کر کے آتے ہیں۔"

ایک مرتبہ پھر اصول اور قواعد و ضوابط کو لے کر بحث شروع ہو گئی۔ کا پیا بابو صاحب چونکہ بڑے بابو کی طرح پرانی پیڑھی کے نہیں تھے لہٰذا انہوں نے بیچ و بچاؤ سے انکار کر دیا۔ انہوں نے سامنے اس کو بتایا کہ دفتر دس بجے شروع ہوتا ہے اور اگر وہ کئی گھنٹے سے دبا کر رہا ہے تو اس میں کا پیا بابو کا قصور نہیں ہے۔ پھر انہوں نے بتایا کہ پیشاب کرنا ایک بنیادی حق ہے جسے ہمارے ملک کی دستور کی کتاب میں بھی درج کیا گیا ہے۔ لیکن سونے بابو نے چونکہ اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا اس لیے انہوں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ ہیڈ آفس نے کاغذ سے پیشاب کرنا یا دستخط کرنا حاصل ہے۔

بڑے بابو اپنی فطرت اور رویے کے مطابق بت بنے کھڑے رہے اور انھوں نے اس بحث میں دخل اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

یہ بحث بھی پہلی بحث کی طرح کچھ الجھی سی تھی مگر پھر اس میں نئی بات یہ تھی کہ اس میں آوازیں تنخواہ سے اونچی تھیں اور اس سے دوسروں کو بھی دخل اندازی کا موقع مل گیا۔

اس سلسلے میں رشید احمد شکیل، اسسٹنٹ انجینئر کی دخل اندازی کی ابتدا ہوئی۔ سر ہونے کے ناطے انہوں نے سنتوں اور مستحب دونوں کا استعمال کرتے ہوئے کا پیا بابو کو سمجھایا کہ ان کو فوراً لے لینا چاہیے یعنی ہیڈ آفس کی ہمیشہ ہوتی ہے ورنہ چاہے پیشاب ہو سے اسے ذاتی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ اس نے بیچ میں سے بڑے بابو ہیں

بڑے گے ورکا یک بابو نے ہی یہ جھنجھلاتے ہوئے کہ "اب صاحب کہہ رہے ہیں تو یہ لیتے ہیں،" لفافہ لے لیا اور سونے لال کی ناک پر اپنے دستخط کر دیے۔

یہ تو بڑے بابو کی سمجھ میں بعد میں آیا کہ اسسٹنٹ انجینئر شکلا جی کا دس بجے ہی دفتر میں موجود ہونا اور بحث میں غیر جانبدارانہ رویہ جتاتے ہوئے بھی دخل اندازی کرنا، یہ سب باتیں محض یوں ہی نہیں تھیں جیسا اس وقت وہ ظاہر کر رہے تھے۔

اتنی بحث کے بعد سیل کیے گئے لفافے میں کیا تھا، سب ہی یہ جاننے کے لیے بیتاب تھے۔ ڈسپیچ سیکشن سے لفافہ لے کر بڑے بابو کے پاس آ گیا۔ اسی درمیان بڑے صاحب کے دفتر میں ہونے کی خبر باہر جانے کی دیر تھی، وہاں تک پہنچ گئی تھی اور برآمدوں اور کمروں میں پان کی پیک کی بارش، شور شرابا، گالم گلوچ اور بھاگ دوڑ جیسی سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں، جن سے ایسا لگنے لگا تھا کہ دفتر میں کام شروع ہو گیا ہے۔

بڑے بابو نے اپنی بے چینی چھپاتے ہوئے لفافہ کھولا، کاغذ نکالا، اوپر کی دو تین سطریں پڑھیں اور پھر سے کاغذ لفافے میں ڈال دیا۔ ان کے ارد گرد کھڑے لوگوں کی بے چینی انتہا کا تیز نقطے پر پہنچی کہ بڑے بابو جھٹکے سے اپنی کرسی سے اٹھے اور بڑے صاحب کے کمرے کی طرف لفافے کے ساتھ لپک لیے۔

کافی دیر تک بڑے صاحب کے کمرے میں ان کی نظر میں جو معتبر تھے، ان کے ساتھ ایک سی میٹنگ چلتی رہی اور بڑے بابو کمرے سے باہر نہیں نکلے، مگر لفافے میں بند کاغذ میں کیا تھا، اسے جاننے کے لیے ان کے نکلنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔

''مر گئے نا... بڑے تیس مار خاں بنتے تھے،'' بڑے بابو کی پیٹھ پھیرتے ہی سونے لال نے طنز سے ٹھوکتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟... کیا بڑے بابو پھر گئے؟''

''نہیں جی، ابھی سسر بڑے بابو کے یہ سونے لال اتنی دور سے کل بد دعا دے کر نہیں دوڑیں گے۔ ارے تمہارے بڑے صاحب لد گئے۔ اب کی چیف صاحب خود لفافہ تھما کے بولے: سونے لال، سنبھل کے جانا، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ جاتے ہی

آرڈر رسیو کرا دینا۔ پچھلی بار کی طرح نہ ہو...“

سو اسے اس کو پچھلی بار کا قصہ سنانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دفتر کے سبھی لوگ اس سے واقف تھے۔ پچھلی مرتبہ صاحب کے تبادلے کا حکم لے کر چپراسی سویرے ان کے گھر تک گیا۔ اس کے بعد چپکے سے صاحب پیچھے کی دیوار سے ہو کر بھاگ گئے۔ کافی دیر کے بعد چپراسی کو بتایا گیا کہ صاحب تو پچھلی رات ہی اپنی بیمار ماں کو دیکھنے شہر کے باہر چلے گئے ہیں اور وہ تین دن بعد ہی لوٹیں گے۔ ظاہر ہے لوگ سرکاری کاغذ نہیں لیتے ہیں، اس لیے چپراسی جی بعد میں گئے۔ تین دن بعد صاحب تبادلہ کینسل کرا کے لوٹے۔ جتنی دیر بڑے صاحب کے کمرے میں بیٹھے رہے، رشید چوہان شکل کے کمرے میں دو معمولی اہل کار کی کیفیت صرف مشورے کے نتیجے میں چلتی رہی۔

اس میسج کو دیکھ کر مولوی حضرات ہوش سے جیت کرتے ہوئے کسی بے معنی دیر کے دربار کا وجود سمجھتے تھے۔ جیسے کسی بھی پچھلے معمول ہو جاتے کہ دن میں ان کے آقا کو کوئی دے دیا ہے۔ ان کا سامنے سے وہ صورت دیکھ کر ہر ایک میں بیٹھے کا ذکر بخشش کی تیاری شروع کرتا تھا۔ یہ تمام لوگ جس کی دہلیز پر تھے کے دروازے میں تھیں، اس دربار سے پہلے آکر وہ سب اپنی اپنی وفاداری کی قسمیں کھانے حاضر ہو جاتے ہیں۔

آج سے پہلے کا نیا ماحول بنا ہے۔ میں تو سرکار آپ کا ساتھ دیتا ہوں۔ میں سمجھا کہ مسٹر سونے کی روز مرہ کی پیچھے سے آ رہا ہے اور ایک بار پھر وہ ہمارے بیچ سرکار ڈپٹ کر بولے کہ لے لو کالا لیکا، تو ہم نے سے یہ سب تو کر دیا رہ بچھتے ”کا یک بار بولے“ تجسس کا ہے وہ ہم پر ان کا مطلب یہ تھا کہ انہیں خطرہ تھا صاحب سے ان کے کاغذ چلے جائیں گے بیچ ان کا اشارہ سے پر گھما لیا صاحب تھا۔ مگر انہیں معلوم تھا کہ ان کا مطلب ہو تو وہ اشارے کی پیروی سے کریں خود کی کاغذ پر چسپ کرتے۔

آج معلوم تھا کہ نئے صاحب بہت پڑھے لکھے ہیں۔ اسسٹنٹ انجینئر رشید چوہان شکل کے دوسرے ساز ہو گئے ہیں۔ بیچارہ اسی علاقے کا باشندہ تھا، وہ انہیں شہر کا وقت تک سے بھی جانتے تھے۔ وہ جو بڑے انجینئر تھے، ان سے آتے وقت تو سے بات ہی نہ کا ساتھ ہوا۔ آج تا وہ اس طرح خود سے ملنے کریں گے کہ ان کو کہیں دیکھ کر سنانے میں اپنی بات کہیں۔

طرح وہ راجا کرشن کے ملن مدپ کا اپنی شاعری میں اظہار کرتے، درشاعرانہ انداز بھی بنا رہے اور عقیدت میں کمی بھی نہ آتے، اسی طرح بابو لوگ بھی بدبدا کر شکلا جی کو یہ یقین دہانی کراتے کہ ان کے دلوں میں ان کے لیے کتنی عقیدت اور محبت بھری ہے۔ ورنہ انھیں کو یہ جتایا جاتا کہ کمبخت بیوی اتنی لمبی فہرست تھما دیتی ہے کہ ہر بار شکلا جی کے سامنے پڑنے پر انھیں یاد کرنا پڑتا ہے کہ لسٹ میں کیا کیا ہے۔

آج منظر کچھ بدلا ہوا تھا۔ لوگوں کو جھک کر میز کے نیچے ان کے پیر تلاش کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنے پیر باہر نکال کر پھیلا دیے تھے۔ نائیلون کے موزوں کو۔ جانے کتنے ہفتوں سے دھوپ یا صابن کے درشن نصیب ہوتے تھے کہ ان کے جوتے سے باہر آتے ہی انھوں نے بدبو کے بھبکے حاضرین کی ناک پر مارے، مگر کمرے میں آنے والے چہروں پر انھیں چھوتے وقت گہری مسکراہٹ قائم رہی۔ وہ اقتدار کے اعلیٰ مقام پر تھے۔ اس لیے قابل احترام تھے۔

بیچ بیچ کچھ خبریں بھی شکلا جی ہوائی پٹاخوں کی طرح چھوڑتے جاتے۔

"بس پہنچنے والے ہوں گے۔ ہمیں تو رات ڈیڑھ بجے فون پر بتایا کہ صبح سات بجے چل رہے ہیں۔"

"اس بار بڑی دقت ہو گئی پڑی۔ اسی سال ... کسی کا رستہ تھوپڑی کا ہے۔ ذرا بھی جھنک لگی تو اب تک لکھنؤ ہوتا۔ پچھلی بار کیا ہوا تھا، نہیں معلوم؟"

لوگوں کو پچھلی مرتبہ یاد تھا۔ اس کا پورا علم تھا لیکن پھر بھی کوئی بڑے صاحب کے گھر تبادلے کا آرڈر پہنچنے اور ان کا پیچھے کے دروازے سے نکل بھاگنے کا قصہ سنائے گا

"اب کی چیف صاحب نے ایس پی صاحب کو کہہ دیا ہے کہ اپنے سامنے چارج کرا دو۔ ایس پی صاحب پہنچ رہے ہوں گے۔"

اس درمیان مخالف کیمپ کی بھی میٹنگ شروع ہو گئی تھی۔ اس میں پہنچنے والے ہر نئے دوست کی خبر اس دربار میں پہنچ جاتی۔ ان کے ساتھ مستقبل میں کس طرح کا سلوک کیا جائے گا، اس کا اعلان بھی دربار کرتا جاتا۔

"اس سالے شوبو جی کو پہلی بار پتا چلے گا کہ اونٹ پہاڑ کے نیچے آتا ہے تو کیسا لگتا ہے۔"

سالے نے پوری نوکری مرحلہ وار کاٹ دی۔ میں نے بھائی صاحب سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر آپ کو میں تنزلی کا مزہ چکھاتا ہے تو ہم سے نہیں بنے گی۔ بھائی صاحب بولے کہ بھئی زندگی میں بہت مزہ چکھ لیا، اب ہم ان جھمیلوں سے ڈرتے ہیں۔"

'بابو جی، وہ دن یاد ہیں بہت دنوں تک اور سیری کرتے رہے۔ بھائی صاحب پھر انھیں تفتیش بہ سے نکالیں گے۔ بھول گیا وہ دن جب اسی دفتر میں بھائی صاحب نے بھیجا تھا، میں تو آپ کا سپیڈ ہو گیا ہوتا۔ سالے نے علاوہ اس کی رجسٹر میں خوب بھیج دیا ہے۔ اب کیا چھپانا، نوکری کرتے کے ہیں۔'

اس سال کو سلسلہ وار صحافت نے تمام پر تھوپ دیا ہے۔ ہمارے یہاں پر بڑی مشکل ہے کہ جو بھی ہر ڈنڈے کا یار۔ ان سالوں کو جوتوں کی نوک پر رکھنا چاہیے۔ پر میں صاحب کمال کے تو بچے ہیڈ روم میں گھسے رہتے تھے۔ سب سے زیادہ بدنامی ان کی اس طور کے کارن ہوئی۔ پھر کارے یار لوگ کہتے ہیں کہ بھائی صاحب اس دفتر میں نہیں تھے، یہ ہیں۔

بڑے بابو گھر کی مرغی ساتھ دال برابر تھے۔ ان کے بارے مشہور ہو گیا کہ ان کا منصب دراصل میں اتنی نچلی سیڑھی پر رہ گئے کہ ترقی میں ان کا نام آیا، ورنہ ان اخباروں میں نیچے ہی ان کا نام چھپا ہوتا، کبھی کمال ہو جاتا۔ پر وہ حاشیے پر رہ گئے۔ ان کی حیثیت کو ادارہ نے حقیقت سے ثابت کرنے کی بھی نہیں مانی گئی۔

نئے طور کی ترتیبات لے کر دفتر میں جو نئے سربراہ آئے تھے، ان کی پالیسی نے تو اب تک ادارہ نے شروع شروع میں ان کا ساتھ دینے سے انکار کیا اور بعد میں سے لپٹے رہے جو پر ادارت کا ماحول بنا تھا، وہ تو بڑے ہو رہے عادی ہونے سے ختم ہو گیا تھا، لیکن اب اچھے سے اچھے تبدیلی پیدا کرنے والی حالت میں جو تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ سعودی ملکوں کی طرح یہاں سب کچھ پہلے سے طے شدہ نہیں تھا۔ صحافت میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ چوٹ یہ ہے کہ چوری کا ملا بھی سکتا ہے، نہیں بھی مل سکتا ہے۔ تحسین چوری کے بعد بھی کمال کا ثبوت وا خطرناک مضمون نہیں بھی آ سکتے ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

ہم چپ سادھے رہے گھر دفتر تک سب ٹھیک چل رہا تھا کہ میں ایک صاحب پہنچے

والے ہیں۔ کمل کانت ورما کے کمرے میں میٹنگ ابھی جاری تھی۔ لوگ دم سادھے اس لمحے کا انتظار کر رہے تھے جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوگا۔ دفتر کے لوگوں کو پیارے لال اور کمل کانت کے اندرونی تعلقات کے بارے میں علم تھا اس لیے اس کی ملاقات کا انھیں بے چینی سے انتظار تھا۔

سب کو مایوسی ہوئی جب سب نے دیکھا کہ کمل کانت ورما اپنے دفتر سے نکلے اور پوری کوشش سے چہرے پر اوڑھی گئی اطمینان اور غیر جانبداری کی چادر کے ساتھ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

فوراً ہی ایگزیکیٹو انجینئر کے کمرے سے بڑے بابو رضوان الحق، دھوبولال یادو اور ملن رائے نکلے۔ سب کے چہروں پر سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ انھیں پتا تھا کہ پورا دفتر انھی لوگوں کو دیکھ رہا ہے۔ ایک ایک اردلی ان کے سینوں میں اتر جانا چاہتا ہے کہ چپراسی تک ان تک کسی لوٹ جاتے تھے پر چونکہ کسی کی نظریں دیکھ رہی تھیں اس لیے انھوں نے اپنے چہرے لٹکا لیے اور سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں لیے اپنی اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

بڑے بابو اپنے کمرے تک پہنچتے پہنچتے پھر سے وہی بڑے بابو بن گئے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ... نے ... میں ان کے چہرے پر پچھلے ... نکال ... وہاں ... کے ساتھ ڈوب گئے۔ کوئی ... ہی نہیں ... (...)

ملن رائے اسکوٹر اسٹارٹ کر کے دفتر سے باہر نکل گئے۔ پچھلے دنوں سے وہ دفتر میں بڑے صاحب کے آدمیوں میں جانے جاتے تھے۔ دفتر کے سارے افسر انھیں اپنے پاس بٹھا کر چائے پلاتے، وہ لوگ ... کر ... پیش کرتے اور چپراسیوں کی جماعت کھیسیں نکال کر سلام کرتی۔ آج انھوں نے غور کیا کہ گیٹ پر فراش ان کے اسکوٹر نکلنے سے اس طور پر سلام کر رہا تھا گویا ... انھوں نے مکان کی دوسری منزل شروع کروا رکھی تھی۔ اسکوٹر بھی پرانا ہو گیا تھا، فریج نئے ... چھوٹے بھائی کی ... ابھی ابتدائی دور میں تھی۔ بہت ساری وجوہات تھیں جن سے ملاقات ... ضروری ہو گیا تھا۔ اس کے اندرونی خیالات دل میں اور چبھنے لگے۔

Scanned with CamScanner

رضوان الحق اور دھوندو لال یادو کمرے سے نکلے تو ایک ساتھ، پر اپنی اپنی فطرت کے مطابق انھوں نے حرکتیں الگ الگ کیں۔ رضوان الحق پہلے ہی سے کم بولتے تھے، اس وقت تو وہ اور بھی زیادہ خاموش ہو گئے تھے۔ وہ سر جھکائے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔ [illegible] تھوڑا سا ہی فرق تھا۔ رشبھ چرن شکل کے کمرے میں دربار چل رہا تھا۔ [illegible] اندر والوں نے منتری جی کے مخالف کیمپ کا ایک مضبوط [illegible] وفاداری ظاہر کرنے کو جان بوجھ کر یہاں سے چلا گیا ہے۔ [illegible] کیمپ کا کوئی [illegible] دیکھتا تو اسے سمجھایا جا سکتا تھا کہ رضوان الحق شکلا جی کی [illegible] ہیں۔

دھوندو لال یادو نے دفتر کے برآمدے میں [illegible] ایک نعرہ لگایا۔ موافقت اور مخالفت ظاہر کرنے والے دونوں [illegible] کوئی حتمی رائے نہیں رکھتے تھے اس لیے ان کے اس نعرہ لگانے کے دوران سب نے [illegible] سامنے نہ پڑیں۔ [illegible] دروازے اور کھڑکیاں ان سے چھپنے کو [illegible] تھیں۔ [illegible] جب مخالف کیمپ کے کمرے کے دروازے پر انھوں نے [illegible] سناٹا چھا گیا۔ [illegible] اپنے کمرے میں بیٹھے [illegible] پیچھے سے اپنے [illegible] دفتر کے باہر بھی نکل گئے۔

ہندی فلموں کے لحاظ سے یہ آئیڈیل پوزیشن تھی۔ جس وقت دھوندو لال یادو دفتر سے باہر نکل رہے تھے، ایک [illegible] دفتر کے گیٹ سے اندر آ رہی تھی۔ اس کے سامنے کی طرف [illegible] ایک بڑی سی تختی لگی تھی جس پر چمکیلے موٹے حرفوں میں "[illegible]" [illegible] دھوندو لال یادو [illegible] ہوئے زمین پر پڑے [illegible] [illegible]

صورت حال پیدا ہوئی ہوتی، پر زندگی بندگی نعموں سے نعرے پر نہیں چلتی۔ اس لیے ہوا صرف اتنا کہ یادو جی بچے بچوں سے کنکریاں اڑاتے ہوئے نکل گئے اور دل نیم پلیٹ والی کار دفتر کے پورٹیکو میں جا کر کھڑی ہو گئی۔

کار کے رکتے ہی دفتر کے چپراسیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایک نے دوڑ کر کار کا دروازہ کھول دیا اور دوسرا بڑے صاحب کے کمرے کی چق اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

پیارے لال بائیں طرف سے اور ملوک چند کار کی داہنی طرف سے اترے۔ پیارے لال کے چہرے پر وہی سنجیدگی تھی جو کسی بھی سینیر افسر کے چہرے پر ایسے موقعوں پر ہونی چاہیے تھی۔ اس دفتر میں سبھی ان کے ماتحت تھے، اور ماتحتوں کے سلام دعا کا جواب دینا افسر کو زیب نہیں دیتا، نوکر شاہی کے اس سنہرے اصول کے مطابق وہ سر اٹھائے سیدھے چلتے رہے اور چپراسی کی اٹھائی ہوئی چق کو پار کرتے ہوئے ایگزیکٹو انجینئر کی تختی لگے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ملوک چند کو ایسی کوئی جلدی نہیں تھی، اس لیے وہ تھوڑا پیچھے رہ گئے۔

سب سے پہلے رنجیت چرن نے ان کے پیر چھوئے۔ ان کے منھ میں اتنے پان ٹھنسے تھے کہ مبارک باد کے طور پر جو بھی الفاظ پھوٹے، انھیں ان کی کرسی کو بھی وقت کے بہانے کا دھوکا ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد پیر چھونے اور پان پیش کرنے کی جو ہوڑ دیکھ، اس وقت وہاں مچی ہوئی تھی، اسے دیکھ کر چائے کی دکانوں اور دفتر کے باہر کی سڑک پر موجود تماش بینوں کو یہ یقین ہو گیا کہ اس دفتر میں اگلے تین دنوں تک جمہوریت کے اہم ستون چاپلوسی، خوشامد خوری، اقربا پروری کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائیں گی۔

ملوک چند اس دفتر میں کئی حیثیتوں سے پہلے بھی رہ چکے تھے۔ مگر بڑے صاحب کی پوزیشن میں ان کا یہ پہلا قدم تھا، اس لیے انھوں نے اطمینان اور تکبر آمیز نگاہوں سے دفتر کے برآمدوں، کمروں اور اپنے اردگرد کے خوشامدی ماتحتوں کو دیکھا۔ اس وقت ان کے دل میں وہی جذبات آ رہے تھے جو نوکر شاہی کے کسی بھی پرزے کے دل میں اپنی نئی تقرری کے منظر کو دیکھ کر آتے ہیں۔

پیاسر، رستے ہی سب سے پہلے اپنے دفتر کی ریوں جاری پر رکھی ہوتا ہے جو اس کے سابق

Scanned with CamScanner

مسودوں کی ناکامی کی پیداوار ہوتی ہے۔ سب کچھ برباد ہو گیا، وہ متفکرانہ انداز میں سوچتا ہے۔ سابق مسودوں کا حوصلہ جذباتی شعور سے شرمندگی کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ کیسا بھونڈا فرنیچر خریدا گیا ہے، ان سے کمرے میں بیٹھنے کی جگہ نہیں، اور پردے کتنے بھدے ہیں، قالین اور تکیوں کو جیسے دیکھتے ہیں۔ کیا سوچتے ہوں گے لوگ اس دفتر کے بارے میں، کوئی وقت سے نہیں آتا۔ سب کہنا دیئے ہوئے ہیں۔ ہر طرف گڑبڑ ہے۔ خیر اب میں آ گیا ہوں، سب ٹھیک کر دوں گا۔

ہندوستانی دفتر شاہی کی فطرت شاید یہی واضح ہوتی ہے۔ ضلع میں نیا کلکٹر آتا ہے، تو دفتر میں وقت سے آنا شروع کر دیتے ہیں، ہر وہ شخص جو اپنی میز پر بیٹھے بیٹھے نہیں لیتا بلکہ اٹھ کر پان کی دکان تک ہو آتا ہے۔ کئی بار تو وہ بغیر بھی کچھ کے نکل جاتے ہیں۔ نیا پولیس کپتان آتا ہے، پولیس کا خوف بڑھتا ہے، وہ اعلان کرتا ہے کہ اب وہ آ گیا ہے اس لیے ضلع میں اب جرم نہیں ہوں گے۔ تھانوں میں پولیس عوام کی خدمت شروع کر دیتی ہے۔ تکیوں اور دفتروں سے بے جل جاتے ہیں، فرنیچر کا رویہ بدل جاتا ہے۔ تھوڑے دنوں میں تمام منصوبوں میں ایسے لگ جاتے ہیں پرانی طرح کے انتظامات ہو جاتے ہیں، میز پر بیٹھے بیٹھے رشوت لیتے ہیں اور تھانے میں مار پیٹ ہوتی ہے۔ نئے افسر آتے ہیں جو سب کچھ ٹھیک ہونے کے بعد پرانی طرح کام کرتے ہیں۔

نوٹ چندرے اقتدار کی پرانی جگہ اور برآمدے میں کی تقرری سے جاری کام کی سختی دیکھ رہے تھے کہ اس وقت میں دوسرے پہلے جب وہ یہاں سے گئے تھے تب تو حالات سے بہتر نہیں تھے۔ اچھا ہوا کہ وہ آ گئے ورنہ یہ بھی نہ ہوتا۔ انھوں نے اطمینان سے سب احساس سے سوچا اور تیزی سے چلتی ہوئی پیک دیوار پر ماری۔ وہ ان کے ساتھ چل رہی تھی جب اس کمرے کے سامنے پہنچی جو بڑے صاحب کے طور پر ان کا کمرہ ہونے والا تھا جس میں تھوڑی دیر پہلے پیارے لال نامی بابو گھس گیا تھا۔ چپراسی جو اٹھانے کھڑا تھا۔ پیک تھوکنے کے بعد وہ ان کے گلے اور منہ میں ابھی تک اتنی پیک بھری تھی کہ وہ غوں غوں کی آواز میں ایسا کچھ بولے جس کا مطلب تھا کہ ان کے ساتھ ان کے نقش قدم پر چلنے والے چپراسیوں اور ماتحت اپنے اپنے کمروں میں جا بیٹھیں، اور اب وہ آ گئے ہیں اس لیے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

Scanned with CamScanner

کہہ کر وہ تیزی کے ساتھ کمرے میں گھس گئے۔

جیسا کہ ہمارے ملک کی ہندی فلموں کا رواج ہے کہ ایک نائک اور ایک کھل نائک کے ساتھ ایک چمچہ ضرور ہوتا ہے جو اپنی حماقت آمیز حرکتوں اور باتوں سے اس کا دل بہلانے اور راز دارانہ قسم کے صلاح مشورے دینے جیسا کام کرتا ہے۔ بھوگ چند پادھیائے کے ساتھ ایک اور شخص اس کمرے میں گھس گیا جس کا نام رشبھ چرن شکل تھا اور جس نے کمرے میں گھستے گھستے پہلا فرض یہ نبھایا کہ پھسپھساہٹ بھری آواز میں بھوگ چند کو یہ مشورہ دے ڈالا۔ "اس سالے سے ہوشیار رہیے گا بھیا، وہ حرامی ہے۔"

مشورہ مختصر اور دھیمے لہجے میں اس لیے تھا کہ جس آدمی سے ہوشیار رہنے کی بات کی جا رہی تھی، وہ دس، رو فٹ کی دوری پر بیٹھا میز پر پڑے بے ترتیب کاغذوں پر بظاہر اپنی نظریں گڑائے تھا مگر اس کی ساری توجہ ان کی حرکتوں پر تھی۔

دوری اور وقت نے بھوگ چند کو باادب ماتحت بنا دیا تھا، اس لیے انھوں نے سامنے بیٹھے سپرنٹنڈنگ انجینئر پیارے لال کی شان میں قصیدے نہیں پڑھے، صرف اپنے پیک بھرے منھ کو گول کرتے ہوئے، اپنی آنکھوں کے ذریعے انھوں نے صلاح دینے والے بہی خواہ کے تئیں جس احسان مندی کے جذبات ظاہر کیے، اس کو اس نے یوں لیا:

"میں جیسے چڑنی مار بہت دیکھے ہیں بھائی، اس سے کیا مت لیں گے۔"

کسی نئے ہوتے ہوئے ملک میں صدارت یا وزارت عظمیٰ کی کرسی الٹنے کے بعد جیسی گہما گہمی پیدا ہوتی ہے کچھ ویسی ہی اس دفتر میں ہوئی۔ کمرے میں پیارے لال کے سامنے بھوگ چند اور رشبھ چرن شکل بیٹھ گئے۔ شکل نے ہیڈ آفس سے ہونے والی ڈاک کے آنے، بڑے بابو اور ڈسپیچر کے درمیان ہونے والی کشمکش اور ڈاک بیچ سے اٹھا کر نئے اور بعد میں لے لینے، بڑے بابو کے بھاگ کر کملا کانت ورما کے پاس جانے اور پھر کملا کانت ورما کے کمرے میں چلنے والی میٹنگ اور اس کے بعد ان کے نامعلوم مقام پر فرار ہونے کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ بیان ختم ہوتے ہی پیارے لال نے کہا: "اب؟"

"اب" کے کئی مطلب تھے۔ پہلا مطلب تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ دوسرا مطلب تھا کہ

جب کمرہ [illegible] جا چکی تھیں تو کیا ہو سکتا تھا؟ مشکل سے [illegible] مطلب نکالا، وہ وہی کہا جس کے لیے [illegible] اپنے ساتھ اندر لے آئے تھے۔

"اب کیا؟" بولے "میں [illegible] بڑے بابو کو۔ چارج سرٹیفیکیٹ پر دستخط ہو جائے۔ [illegible] نہیں ہوں گے تو کیا چارج نہیں ہوگا؟"

[illegible] نے ہندوستانی روایت کے مطابق ایک محاورہ سنایا جسے [illegible] نے بھی اپنے [illegible] میں پڑھا تھا اور جس کا مطلب تھا کہ اگر مرغا نہیں بولے گا تو کیا سورج نہیں نکلے گا۔

بیچارے [illegible] لال نے [illegible] بڑے بابو [illegible] کرانے کا حکم صادر ہوا۔

[illegible]

[illegible]

اس لیے وہ بھی کان کھڑے کیے رہے اور [illegible] رہے۔

[illegible]

[illegible] اسکول بدلے گا۔"

[illegible]

"میں نے چیف صاحب سے بہت کہا [illegible]

[illegible] روزی اہم ہوتے ہیں۔"

جب تک بڑے بابو نہیں آئے تب تک اشوک چند صاحب بولتے رہے اور بیچارے لال کان کھجلاتے رہے۔ بڑے بابو کے آنے میں دیر ہوئی تو کان کھجلانا چھوڑ کر وہ دیوار پر رینگ رہی چھپکلی کو گھورنا شروع ہو گئے۔ اس یکطرفہ گفتگو میں انھیں نہ تو اپنا کوئی رول نظر آ رہا تھا، ورنہ ان لوگوں نے کوئی دخل اندازی کی۔ آخر میں انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور بڑے بابو وارد ہوئے۔

"چارج سرٹیفکیٹ بن گیا بڑے بابو؟" بیچارے لال نے پوچھا۔

بڑے بابو نے اپنے قابلِ رحم چہرے کو اور بھی قابلِ رحم بنا کر سوال پوچھنے والے کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے بھارت کی نیوکلیئر پالیسی کے بارے میں کوئی سوال پوچھ لیا گیا ہو۔

"صاحب پوچھ رہے ہیں کہ چارج سرٹیفکیٹ ٹائپ ہو گیا کہ نہیں؟" اتنی دیر کے بعد رشبھ چرن شکل کو اپنی وہاں موجودگی کا جواز ثابت کرنے کی ضرورت پڑی۔

"سرکار، مجھے چارج سرٹیفکیٹ کے لیے تو کوئی نہیں بولا۔"

"بڑے بابو زیادہ قابلیت مت جھاڑیے" رشبھ چرن کے لیے خود پر قابو پانا پہلے بھی بہت مشکل ہوتا تھا، آج تو اور بھی مشکل ہو گیا۔ "آپ کو معلوم نہیں کہ بڑے صاحب کا تبادلہ ہو گیا ہے؟ اتنی دیر جو میٹنگ کر رہے تھے، اس میں آپ کو نہیں بتایا کملا کانت ورما نے؟ نئے صاحب آ گئے ہیں اور آپ نے ابھی تک چارج سرٹیفکیٹ نہیں ٹائپ کیا۔"

رشبھ چرن اپنی آواز پر قابو نہ رکھ پاتے، اگر بڑے بابو کے چہرے سے پھسل کر ایک بار ان کی نگاہ اشوک چند کی سخت نگاہوں سے نہ ٹکرائی ہوتی۔ سپرنٹنڈنگ انجینئر کی موجودگی میں وہ کوئی تماشہ نہیں کھڑا کرنا چاہتے تھے۔

نہیں، اب کیے دیتے ہیں۔ ہیڈ آفس کا حکم نامہ تو آپ ہی کے پاس ہوگا۔ کملا کانت جی تو جاتے وقت دے نہیں گئے، اسی سے نمبر وغیرہ ڈال دیجیے گا۔ ایس ای صاحب کتنی دیر بیٹھیں گے؟ جلدی لے آئیے۔" اشوک چند نے ملائمت سے کہا۔ بڑے بابو کچھ بدبداتے ہوئے باہر نکل گئے۔

"بڑا گھاگھ ہے صاحب۔ جتنا اوپر اتنا نیچے" رشبھ چرن نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

"شکل جی، آپ خود دیکھ لیجیے جا کر، نہیں تو دفتر والے نہ جانے کتنی دیر کریں۔ صاحب کے لیے کچھ چائے وائے بھجوا دیجیے گا۔"

جوگ چند نے کہا تو رشید چوہان اٹھ کر باہر نکل گئے۔ کمرے میں تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پیارے لال ابھی تک کچھ نہیں بولے تھے، صرف سنتے رہے تھے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ زیادہ بولنے والا کہیں نہ کہیں غلطی ضرور کرتا ہے۔ غلطی کرنے کا موقع وہ اپنے مخالف کو ہی دینے میں یقین رکھتے تھے اس لیے اکثر خود چپ رہتے تھے۔ آج بھی بولے تو بہت دیر سے بولے اور جو تھوڑے لفظوں سے وہ کہے اس کی غرض یہی تھی کہ جوگ چند اپنا عہدہ چھوڑنے پر غور کریں اور یہ تبادلے کی تبدیلی ہوئی تو جیسے ہوئی اسے سمجھنے کا موقع دیں۔

"ابھی آپ کا عہدہ بڑی چھان بین کا معاملہ ہے۔ سب پر سب کی نظریں لگی ہیں۔ اگلے مہینے سے ہر ہفتے چیف منسٹر ریویو کریں گے۔ کبھی بھی تیسرے چوتھے چیف صاحب کے یہاں پیشی ہوتی ہے۔ ویسے تو آپ کا پرانا تجربہ ہے آپ سے کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔ مگر چیف صاحب کا فون آیا تو میں نے کہہ دیا کہ آپ وقت ہی پہنچ جائیں گے۔"

جوگ چند نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تول لیا۔ بے مطلب تھا کہ اس سے آگے بات کی جائے، نہیں تو جلد میں بگڑ سکتا ہے۔ انھوں نے جو سنا تھا اس میں کچھ خوش تھا کچھ مات ہوتے ہوئے نہیں۔

چھوٹے، وزیروں اور منتریوں کے حوالوں سے بنا فائدہ مقرری کا قصہ ان کا ذہن تھا۔ پیارے لال اکثر اوپر سے اونچے عہدیداروں سے باتیں کرتے وقت ہمیشہ وہی نہیں کہنا چاہیے جو سچ ہو۔ سچ تو شیشے کی طرح ہوتا ہے جو سامنے والے سے چھپا نہیں اور جواب کی طرح نظر آتا ہے۔ ان کے رابطے میں کچھ نام چھوڑے جاتے ہیں جو وزرا، منتریوں اور اعلیٰ عہدیداروں کے ہوتے ہیں۔ ہوشیاری صرف اتنی برتنی چاہیے کہ یہ نام ایسے ہوں جن سے کسی طرح کی پوچھ تاچھ نہ ہو سکے۔ انگریزی میں جسے نیم ڈراپنگ (name dropping) کہتے ہیں، اس فن کو ہندوستانیوں نے انگریزوں سے بھی زیادہ خوبصورتی سے اپنایا ہے۔ وزیروں اور منتریوں کے نام ایک خاص مقصد کی مناسبت سے چہرے اور آنکھوں میں کسی راز کے سایے کی طرح آ جاتے ہیں۔ جوگ چند نے اس فن میں بڑی مہارت حاصل کر لی تھی کہ وقت ضرورت ان کی آواز بھی کسی راز جیسی لگتی تھی۔ کئی بار تو اور لوگ بھی سمجھتے تھے۔ شاید وہ ایسی صورت حال پیدا کر دیتے کہ ان کا مخالف کوئی مضبوط قدم نہ اٹھا سکے۔

روئے کو دل چاہنے لگتا ہے۔

آج بھی انھوں نے اپنے فارمولے کو جم کر استعمال کیا۔

"میں نے تو سر، بہت منع کیا کہ مجھے مت پھنساؤ اس جھمیلے میں، پر اپنے چیف منسٹر کے سالے ہیں نا، وہی نو گزہ والے ایم ایل اے۔ وہ پیچھے پڑ گئے۔ جب وہاں پوسٹڈ تھا تب سے ان سے میرے گھریلو تعلقات ہیں۔ بولے، اپادھیائے جی، آپ کے بنا کمبھ نہیں سنبھل پائے گا۔ اگر کچھ ہو گیا کمبھ میں، تو بڑی تھو تھو ہوگی۔ میں نے بہت انکار کیا مگر صاحب، بڑے آدمیوں کا معاملہ ہے..."

بٹوک چند بولتے وقت بیچارے لال سے چہرے پر نکاتیں ترائے ہوئے تھے۔ ٹھوس کچھ اثر کر رہے، پر بے ساختگی تھی، چہرے پر کوئی تاثر پیدا نہیں ہونے دے رہے۔ "چیف صاحب سے بھی میں نے ہاتھ جوڑے کہ سر، اب تو بڑھاپا آ رہا ہے، اب پہلے جیسی محنت نہیں ہو سکتی۔ آپ حکم دیں گے تو کیوں نہیں جاؤں گا؟ لیکن کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو بڑھاپے پر کالک لگ جائے گی۔ بالکل نہیں مانے۔"

اس طرح انھوں نے کئی لوگوں کے حوالے دیے اور بتایا کہ کس طرح صوبے کے سامنے کمبھ نامی مشکل مسئلہ پیدا ہونے پر ان لوگوں نے بٹوک چند اپادھیائے نامی مہابلی کے سامنے یہ بیڑا رکھ دیا اور کس طرح ہر بڑے آدمی کو انھوں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس کے اہل ضرور ہیں مگر عمر نامی ایک رکاوٹ ایسی ہے کہ جس کے چلتے وہ اس بیڑے کو اٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔ مگر سارے قصے کا خاتمہ اس ایک نکتے پر نکلتا کہ جیسا کہ بڑے لوگوں کا قرینہ ہے، ان کے سارے اعمال ٹھکرا دیے گئے اور کوشش کرتے رہنے کے باوجود وہ یہاں آ گئے۔ لیکن اب جب وہ آ ہی گئے ہیں تو سب کچھ ٹھیک کر دیں گے اور بھگوان کی کرپا اور ایس ایس پی صاحب کے آشیرواد سے جو کچھ ہوگا، اچھا ہی ہوگا۔

میرے کان بول کچھ نہیں رہے ہیں، بس ان کے لفظوں کے پیچھے چھپے سچ کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بٹوک چند کی پوسٹنگ کے پیچھے ڈی ایم اور چیف صاحب دونوں تھے، پر یہ چیز اس طرح نہیں ہے جس طرح بٹوک چند بیان کر رہے تھے۔ انھوں نے

اڑتی پڑتی سن رکھی تھی کہ اس معاملے میں کافی لین دین ہوا ہے۔

جس سیاستدان کے بارے میں بھوگ چند نے چیف منسٹر کا سالا اور اپنا گہرا دوست ہونے کا اعلان کیا تھا، اس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ بغیر نقد تھمائے گھر کے باہر قدم نہیں نکالتا۔ بھوگ چند جب اپنی گہری دوستی کے دعوے کر رہے تھے، پیارے لال اس رقم کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے جو اس ہاتھ سے اُس ہاتھ میں پہنچی ہوگی۔

محکمے کے سال بھر دو بار ہی ہوتا ہے۔ بڑی بڑی بولیاں لگتی ہیں، بڑے بڑے وارے نیارے ہوتے ہیں۔ اس سال بھی یہی ہوا تھا۔ پانچ چھ نام شروع سے ہی دوڑ میں تھے۔ پیارے لال کو اپنے کو بچائے رکھنے کی فکر رہتی تھی۔ ان کے عہدے کے لیے بھی کئی دعویدار تھے۔ وہ اپنے کو تو بچائے رکھنے میں کامیاب ہو گئے، پر کملا کانت ورما کو ہٹنا ہی پڑا۔

کملا کانت ورما سے ان کی اچھی پٹ رہی تھی اور کہیں میں پیارے لال یہی چاہتے تھے کہ کملا کانت بنے رہیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے ان کی کہیں اور کسی جگہ جانے کی افواہ اڑتی تھی، پر کملا کانت بھی کیل کانٹے سے مضبوط تھے۔ پیارے لال اپنی کرسی بچانے میں اتنے مشغول رہے کہ انھیں کملا کانت کی فکر کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ ویسے بھی وہ جانتے تھے کہ کملا کانت کا ہٹنا آسان نہیں تھا۔

پچھلے ہفتے سے بھوگ چند اپادھیائے کا نام چل رہا تھا۔ پیارے لال نے نام سنتے ہی کہہ دیا تھا کہ اب مقابلہ سخت ہوگا۔ انھوں نے کملا کانت کو وارننگ بھی دے دی تھی۔ بھوگ چند کا شمار ڈپارٹمنٹ میں بڑے گھاگ افسروں میں ہوتا تھا۔ محکمے میں تعیناتیاں کرنے کے لیے بولی ہر بار ہوتی تھی مگر اس مرتبہ سیکرٹریٹ میں مقابلہ زیادہ سخت تھا۔ بیچ میں دو تین بار پیارے لال کی ملاقات کملا کانت سے ہوئی تو ... وہ کسی تگڑے امیدوار کی خبر دیتے۔ پیارے لال کی عادت سے کہ وہ فوراً الرٹ ہو جاتے اور دو تین دن میں سب پتہ ٹھیک ٹھاک کر کے لوٹ آتے۔

اس مرتبہ حالات اتنی تیزی سے رونما ہوئے کہ پیارے لال اور کملا کانت جیسے منجھے ہوئے کھلاڑی بھی حیران رہ گئے۔

جمعہ کی رات کو پیغام آیا گیا، ان کے مطابق رات ایک بجے چیف منسٹر نے کملا کانت کے تبادلے کے آرڈر پر دستخط کر دیے تھے۔ پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ کے سیکرٹری نے یہ کام چپ

Scanned with CamScanner

صاحب کو سوچنا تھا کہ اس حکم نامے پر فوری کارروائی ہونی چاہیے، اور چونکہ بقول چیف صاحب کے وہ آپ اور پیارے لال میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اس لیے یہ ذمہ داری انھوں نے پیارے لال کو سونپی۔ حکم نامے کے مطابق محکمے کے سیکریٹری کو دوپہر بارہ بجے تک چیف منسٹر کو آرڈر کے متعلق رپورٹ دینی تھی۔ سیکریٹری نے چیف صاحب کو ساڑھے گیارہ بجے تک کا وقت دیا تھا، اس لیے چیف صاحب نے انھیں گیارہ بجے کا وقت دے دیا۔ چیف صاحب گیارہ بجے دفتر میں ان کے فون کا انتظار کریں گے۔

چیف صاحب کا حکم ملتے ہی پیارے لال کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ وہ دوسرے بہت سے نوکر شاہوں کی طرح گیتا میں دیے گئے پیغام سے کم از کم اس پیغام کو تسلیم کرتے تھے، کہ نوکری ان کے لیے مہابھارت کی جنگ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ میدان جنگ میں باپ، بھائی، گرو، دوست، ساتھی، کوئی بھی رشتہ معنی نہیں رکھتا تھا اور ضرورت پڑنے پر کسی کا بھی قتل کیا جا سکتا تھا۔ کامیابی کی یہی شرط تھی۔ یہی راز تھا نوکر شاہی میں کامیابی کا۔

سب سے پہلے انھوں نے کملا کانت ورما کے گھر ایک چپراسی دوڑایا اور انھیں دس بجے دفتر پہنچنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد اپنے فون کا ریسیور اتار کر نیچے رکھ دیا۔ انھیں معلوم تھا کہ کملا کانت وجہ جاننے کے لیے فون کریں گے اور یہ سوچ کر کہ ان کا فون خراب ہے، ان کے دل میں کمبھ کا خیال آئے گا۔ آج کل کمبھ کے بارے میں مسلسل ہیڈ آفس خبریں منگائی جا رہی تھیں۔ یہ ضرور تھا کہ سپرنٹنڈنگ انجینئر کے اپنے دفتر میں آنے کی بات کچھ عجیب لگے گی مگر ان کے درمیان جو تعلقات قائم تھے، وہ ایسے تھے کہ کملا کانت کو اپنے خلاف سازش کا شک نہیں ہو سکتا۔

یہی ہوا۔ دفتر آکر ہی کملا کانت کو پتا چل پایا کہ ان کے خلاف سازش ہوئی ہے۔

پیارے لال کا بس چلتا تو وہ کملا کانت کو ہی اس عہدے پر برقرار رکھتے مگر انھیں دھوکا دے کر ہٹانے اور بھوک چند کو چارج دینے پر انھیں افسوس بھی نہیں تھا۔

یہاں سارے کردار بے دلی سے اپنا اپنا رول ادا کر رہے تھے۔ بھوک چند بے دلی سے دھڑا دھڑ جھوٹ بول رہے تھے۔ پیارے لال بے دلی سے سن رہے تھے اور سچ پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سے پہلے انھوں نے بڑی ترکیب سے کملا کانت کو چھلنے کی کوشش کی تھی۔ بار بار

شکل میں بے دلی دکھاتے اور جتاتے ہوئے، بابوؤں اور جونیئر انجینئروں کو بتا رہے تھے کہ بھیا نے تو صاف صاف منع کر دیا تھا، وہ تو چیف صاحب نے بہت سمجھایا اور ساتھ میں ایس ای صاحب کو بھی، نہیں تو بھیا چارج تھوڑے ہی لیتے۔

اور اسی بے دلی سے اسٹیج پر بڑے بابو نمودار ہوئے۔

"لے آئے بڑے بابو؟"

"ہاں سر۔"

"لائیے۔"

مکمل سرکاری زبان والے چارج سرٹیفکیٹ کی دس سے زیادہ کاپیاں جھوک چند کے سامنے رکھ دی گئیں۔ وہ ایک ایک سطر کو غور سے پڑھتے اور دستخط کرتے اور بڑے بابو دستخط سے بھرا ایک ایک ورق کو ہٹاتے رہے۔

جیسا کہ رگھوچرن شکل نے اس ناٹک کی ابتدا میں ہی انہیں مشورہ دیا تھا کہ بڑے بابو نام کے اس کردار پر انہیں ذرا بھی بھروسا نہیں ہے، اس لیے پوری ہوشیاری دکھاتے ہوئے جھوک چند نے دستخط نامی چڑیا بٹھاتے ہوئے کاغذ پر تحریر پوری عبارت تقریباً پڑھ ڈالی۔

"ٹریژری کی کاپی نہیں دی بڑے بابو؟"

"دی ہے سر۔" بڑے بابو نے چارج سرٹیفکیٹ کے نیچے جن لوگوں کو کاپیاں بھیجی جا رہی تھیں، ان کی فہرست کے نویں نمبر پر انگلی رکھ دی۔

جھوک چند نے سرسری نگاہ ڈالی۔

"اسٹیٹ بینک کو کاپی نہیں گئی؟"

"ہاں... یہ غلطی ہو گئی سر۔ ابھی ایک اور کاپی ٹائپ کرواتا ہوں۔"

"میرے دستخط بھی بینک کو بھجوا دیجیے۔"

"ابھی بینک کی کاپی ٹائپ کروا دوں، اسی کے ساتھ آپ کے دستخط والا کاغذ بھیجتا ہوں۔"

بڑے بابو چلے گئے۔ جھوک چند نے فاتحانہ انداز سے پیارے لال کی طرف دیکھا۔

"اس دفتر میں بڑی صفائی کی ضرورت ہے سر۔ سب سالے ڈھیٹ ہو گئے ہیں۔ یہ بڑے

بابو میرے ساتھ پہلے بھی رہا ہے۔ پچھلی بار تو میں نے ہی ہٹوایا تھا۔ اب بتائیے، سالے تیس سال سے نوکری کر رہے ہیں اور بینک کو چارج سرٹیفکیٹ کی کاپی بھیجنا بھول گئے۔ ارے صاحب، ذرا سا چوک جائیں تو لو، بھیرائچ والا قصہ ہو گیا۔"

نوکر شاہی میں ہر موقعے کے لیے موزوں کوئی نہ کوئی قصہ رہتا ہے۔ جھوک چند نے اس موقعے پر بھیرائچ والا قصہ سنایا۔ اس قصے کے مطابق انھی جیسے بھولے بھالے ایک افسر سے اس بڑے بابو جیسے دم دار بابو نے زبردستی کر کے چارج سرٹیفکیٹ پر دستخط کروا لیے۔ اس کاغذ کی کاپی سب کو گئی، پر سٹیٹ بینک کو نہیں گئی۔ لہٰذا اس کا سابق افسر اگلے کافی دنوں تک چیک کاٹ کے ٹھیکیداروں کے بھگتان کرتا رہا۔ بعد میں جب تک پتا چلا اور پچھتاوے کی صورت حال نئے افسر کے سامنے پیدا ہوئی، تب تک اس دورانیے کے سے حالات بن گئے تھے جس میں چڑیا کے کھیت چگ جانے کے بعد پچھتاوے کے بے سود ہونے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جھوک چند کے پاس کسی بھی گھاگ افسر کی طرح اور بھی بہت قصے تھے۔ اگر بڑے بابو نے کمشنر کے نام کاپی جاری نہ کی ہوتی تو وہ بلند شہر والا قصہ سناتے، اور اگر ٹریژری کے نام کاپی نہیں گئی ہوتی تو سنانے کے لیے بلیا والا قصہ ہوتا۔

قصہ کوتاہ یہ کہ سننے کے لیے جھوک چند کے پاس بہت سارے قصے تھے اور پیارے لال کچھ بھی سننے کے لیے بہت بے چین نہیں تھے۔

جتنی دیر میں جھوک چند نے اپنا قصہ ختم کیا، پیارے لال کی ٹیلی فون پر گھومتی انگلیوں نے لکھنؤ میں چیف انجینئر سے فون ملا لیا۔

"ہاں سر، چارج ہو گیا سر۔ کملا کانت نے تو چارج دیا نہیں سر، پر میں نے جھوک چند کو چارج دلا دیا سر۔۔۔ نہیں سر، پتا نہیں چلا سر۔ کملا کانت کو تبادلے کا پتا نہیں چلا سر۔ وہ تو دفتر آ کر بھاگ گیا سر۔ میں ذمہ دار ہوں سر۔۔۔ ٹھیک ہے سر، مہربانی سر۔"

پیارے لال لاٹ کی مانند تھے۔ انھیں سونپا گیا کام کامیابی سے سرانجام پا گیا تھا۔

"اچھا بھائی، پادھیا جی، بیسٹ آف لک، سنبھالیے چارج اپنا پوسٹ۔" انھوں نے کچھ اس طرح آشیرواد دیا جیسے بھارتی استری کسی رنگروٹ کو جنگ کا پیغام دے رہی ہوں۔

Scanned with CamScanner

لوک چند نے بھی ایک فرمانبردار شاگرد کی طرح اپنے گرو جی کی عزت افزائی میں جو کلمات ادا کیے، ان کا مفہوم کچھ اس طرح تھا کہ وہ قابل اور محنتی تو پہلے ہی سے تھے، بس گرو کرپا کی ضرورت تھی۔ ان کی کامیاب نوکری کے دوران بھی بار ایک سچے رہنما پیارے لال کے روپ میں ملے، اس لیے ان کی کامیابی میں کوئی شک نہیں ہے۔ وہ آگئے ہیں اور سب کچھ ٹھیک کر دیں گے۔

وہ آگئے ہیں اور سب کچھ ٹھیک کر دیں گے، یہ جملہ انھوں نے پیارے لال کے جانے کے بعد اپنے خیر خواہوں اور اپنے حامیوں کی بھیڑ کے سامنے بھی کہا۔ پیارے لال کو جو پورٹیکو میں کھڑی ان کی کار تک پہنچا کر ان کے واپس اپنے کمرے میں آنے پر موجود تھے۔

کمرے میں وہ سارے لوگ تھے جنھیں پچھلے کئی سالوں میں اس دفتر میں ستایا گیا تھا۔ اہلیت رکھتے ہوئے بھی انھیں ان جگہوں پر نہیں رکھا گیا جہاں سرسوتی کی لکشمی سے سنگت ہوتی ہے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو پچھلے دور میں بھی بھاری پلڑے پر تھے، کماؤ جگہوں پر تھے اور اس تبدیلی کے بعد بھی انہی جگہوں پر برقرار رہنا چاہتے تھے۔ وہ یہ بتانے آئے تھے کہ پچھلی بار تو انھیں اپنے سینوں پر پتھر رکھ کر پیسہ کمانا پڑا تھا، کام کرنے کا مزہ تو اب آئے گا۔ اس بھیڑ میں ٹھیکیدار، دلال، سپلائر، بیشتر چاپلوس اور اس طرح کے متوسطوں کے نمائندے بھی تھے جو پہلے سے ساتھ دے رہے تھے یا اس تبدیلی کے بعد اسی طرح کمرے میں حاضری دیا کرتے تھے۔

کئی سالوں کے بعد بڑے صاحب کے کمرے میں پیر چھونے کی روایت پھر شروع ہوئی۔ لوگوں کو میز کے نیچے گھس کر پیر چھونے پڑ رہے تھے، اس لیے لوک چند نے پیر باہر نکال کر ایک اسٹول پر رکھ دیے۔ لوگ آتے، ان کے پیر چھوتے تھے اور ان کی پڑیاں آگے بڑھا دیتے تھے۔ لوک چند اپنے گول گھسے ہوئے منھ میں ایک عجیب خوشی لیتے۔

"صاحب، اب آپ آگئے ہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

لوک چند کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ خود بھی تو یہی محسوس کرتے جا رہے تھے۔ وہ آگئے ہیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اخبار والوں نے تو اس دفتر میں آنا بند کر دیا تھا۔ وہی لکھنؤ میں بیٹھ کر خبریں گڑھا کرتا تھا۔ پہلے "آپ آگئے ہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" شہر سے چھپنے والے انگریزی اخبار کے نمائندے سے

کہا۔

"ہاں صاحب، آپ کے دفتر کا تو سارا انتظام ہی چوپٹ ہو گیا تھا۔ بھاگ گئے جو کوئی باضمیر اور عزت نفس رکھنے والا صحافی یہاں آتا ہو۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔" کھدر دھاری نیتا نے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ٹھیکیداروں نے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" دلالوں نے کہا۔

بابوؤں، چپراسیوں، برآمدوں، کرسیوں، چائے خانوں، فرش کر جن جن کی آواز شری ہوک چند 'پادھیائے'، ایگزیکیٹو انجینئر، یعنی دفتر کے بڑے صاحب تک پہنچ سکتی تھی، سب نے پورے یقین کے ساتھ کہا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

ہوک چند نے بھی مجلس برخاست کرنے سے پہلے کہا کہ اب وہ آ گئے ہیں اس لیے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

اس طرح محکمہ تعمیرات کے اس دفتر میں دن بھر "سب ٹھیک ہو جائے گا"، "سب ٹھیک ہو جائے گا" کی آوازیں گونجتی رہیں اور روز کی طرح آج بھی کوئی کام نہیں ہوا۔

Scanned with CamScanner

اس سڑک کے دونوں طرف ابوؤں کی قتل گاہیں بکھری ہوئی تھیں۔

سڑک کو سڑک کہنا کافی حد تک رسم نبھانے جیسا تھا۔ اس پتلی، دبلی، مریل سڑک پر چلنے کے سوا سبھی کام بآسانی کیے جاسکتے تھے۔ سرکاری ریکارڈ میں سڑک کے نام سے جو چیز درج تھی، اسے شوچالیہ (پاخانے) اور مترالیہ (پیشاب خانے) جیسے نام سے پکارا جاسکتا تھا۔ دونوں پٹریوں اور آدھی سڑک ملک کے بے روزگاری اور رہائش جیسے مسئلوں کو حل کرنے میں استعمال ہورہی تھیں۔ عشق ومحبت کے کھیل سے لے کر فوجداری تک اور بھی کئی قومی سطح کی سرگرمیاں تھیں جو اس سڑک پر ہی سرانجام پاتی تھیں۔ ان سب کے علاوہ یہ سڑک چلنے کے بھی کام آتی تھی۔ یہی سب سے زیادہ حیرت انگیز بات تھی جو صرف ہمارے ملک میں ہی ممکن ہے۔

اسی سڑک کے دونوں جانب دور دور تک دفتروں کی قطاریں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان دفتروں میں ایسی مخلوق پائی جاتی ہے جسے بابو کہتے ہیں اور جس کے بارے میں محققین کا کہنا ہے کہ اسے میکالے نامی ایک انگریز دانشور نے دریافت کیا تھا۔ دراصل کولمبس اور واسکوڈی گاما کی دریافت کے بعد یہ سب سے اہم دریافت پائی جاتی ہے، اور جیسے کہ ان دونوں کی دریافتوں کے ساتھ ہوا کہ ان کے مرنے کے بعد بھی ان کی دریافتیں دنیا میں برقرار ہیں، اسی طرح میکالے کی دریافت ان کے بعد بھی ہمارے یہاں پھل پھول رہی ہے۔

افسروں کے کرنے کے لیے اس ملک میں بہت سارے کام ہیں۔ انھیں دورے کرنے پڑتے ہیں، اپنے سے بڑے افسروں کو خوش رکھنا پڑتا ہے، منچ پر جانا پڑتا ہے اور کافی وقت باتھ روم میں رہنا پڑتا ہے۔ اتنی ساری مصروفیتیں ہوتی ہیں کہ وہ دفتر میں بیٹھ نہیں پاتے۔ بابوؤں کو دفتر میں تنہا بیٹھنا پڑتا ہے کہ وہ کسی کام کے لائق نہیں رہتے۔ کبھی کبھی کسی دن کی قسمت اچھی ہوتی ہے۔ بابو سے

نوٹنگ ڈرافٹنگ کر کے، سجا سنوار کر لے آتا ہے اور افسر اس میں ایک اعلیٰ قسم کی پچی کاری کرتا ہے۔ اسے کچھ لوگ چڑیا بیٹھانا کہتے ہیں اور کچھ لوگ دستخط کرنا۔

بابو کی دنیا کی سب سے اہم چیز فائل ہوتی ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ فائل بابو کے لیے بنی ہے یا بابو فائل کے لیے۔ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ بغیر فائل کے بابو کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان فائلوں کے بارے میں یہی بھی کہا گیا ہے کہ انھیں بابو لکھتے ہیں اور بابو ہی پڑھتے ہیں۔ ہندی ادب میں تو کئی بار بابو کے مرنے کے بعد اس کی روح انھی فائلوں میں بھٹکتی ہوئی پائی گئی ہے۔ کئی لکھنے والوں نے رات کے سناٹے میں ان فائلوں سے اٹھتی ہوئی عجیب دردناک کراہیں بھی سنی ہیں۔ انھیں وہ ان مردہ بابوؤں کی کراہیں مانتے ہیں جن کی جوانیاں وقت سے پہلے آگے بڑھ کر ان فائلوں میں دفن ہیں۔ بعض وقت تو ایسا بھی ہوا ہے کہ زندگی بھر پنشن بنانے والے بابو کی روح اپنی پنشن کے چکر میں اس سیکشن میں بھٹکتی ہوئی پائی گئی۔

محکمہ تعمیرات کے اس دفتر میں بھی سب کچھ دوسرے دفتروں کی طرح ہی تھا۔ بابو بھی دوسرے دفتروں کی طرح تھے۔ وہ دور دور سے آتے تھے، آتے ہی چائے کی دکانوں پر چلے جاتے تھے، چائے پی کر پان کھاتے تھے، دونوں کے پیسے کسی ٹھیکیدار سے دلواتے تھے، واپس دفتر آ کر پسرتے تھے اور پھر چائے کی دکان پر چلے جاتے تھے۔ ان کے لیے دوسرے دفتروں کی ہی طرح یہاں بھی اتنی مصروفیتیں تھیں کہ وہ ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ دوسرے دفتروں کی طرح یہاں بھی ایک پیشاب خانہ تھا جس کے دروازے پر "صرف افسروں کے لیے" لکھا تھا۔ اس لیے یہاں بھی بابو پیشاب جیسے عمل کے لیے اس سڑک پر واقع بہت سارے دفتروں کی چہار دیواری میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے تھے۔

بابوؤں کے بیٹھنے کے لیے وہاں عام کرسیاں تھیں۔ ان میں طرح طرح کی چیزیں تھیں۔ سڑی گلی ہوئی اور جیسے لوہا کر بنی ہوئی ایک چیز تھی جسے کرسی کہتے ہیں۔ اگر کسی اسکول کے بچے کو اس کرسی پر مضمون لکھنے کو کہا جائے تو وہ اس کی یہ خصوصیت ضرور لکھے گا۔ پہلی تو یہ کہ اس میں دو سے لے کر چار تک ٹانگیں ہوتی ہیں۔ ایک ٹانگ اس لیے نہیں ہوتی کیونکہ ایک ٹانگ پر زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ جن کرسیوں کی صرف ایک ٹانگ بچتی ہے، ان کے نیچے اینٹیں لگا کر دوسری، تیسری

اور چوتھی ٹانگ کی کمی پوری کر لی جاتی ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ کرسی نامی اس چیز پر بابو لوگ بیٹھتے ہیں۔ وہ اس پر اس لیے بیٹھتے ہیں کہ جب تک ان کی اور دفتروں کی دریافت ہوئی، تب تک زمین پر بیٹھنے کا چلن ختم ہو چکا تھا۔ جب کبھی بابوؤں کا من ان کرسیوں کی بچی کچی ٹانگوں کو توڑنے کا ہو جاتا ہے، وہ مار پیٹ میں بھی ان کا استعمال کر لیتے ہیں۔ کئی بار سرکار خوش ہو کر زیادہ بجٹ دے دیتی ہے یا افسروں کا دل کمیشن سے بیزار ہو جاتا ہے تو کچھ نئی کرسیاں آ جاتی ہیں۔ پر انھیں دیکھ کر بابوؤں کو گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ انھیں لگتا ہے کہ ان کا کلچر ختم کرنے کی یہ بھیانک سازش کی جا رہی ہے، اس لیے وہ نئی کرسیوں کے ہینڈ بلیڈ سے کاٹ دیتے ہیں۔ اگر کسی کو پیک کا سر جوڑنے کا من نہیں کرتا تو کمرے کا فرش توڑنے کے لیے ان کرسیوں کا استعمال کر لیتے ہیں۔ ایک بار جب کرسی چار سے تین یا دو والی ٹانگوں کی ہو جاتی ہے تو اس پر بیٹھنے بھی لگتے ہیں۔

بابوؤں کے کمرے میں کرسی خاندان سے متعلق ایک چیز اور ہے جسے میز کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔ پر ان دفتروں کے کمروں میں شاذ و نادر ہی کوئی چیز تلاش کی جا سکتی ہے جس کی چاروں ٹانگیں دھرتی کو چھو رہی ہوں۔ ٹانگوں میں یقین رکھنے، ماننے والے بابوؤں نے چپراسیوں سے منگوا کر اینٹوں کے سہارے ان میزوں کو کھڑا کر رکھا ہے۔ میزوں پر فائل نامی چیزیں ڈھیر تھیں۔ وزن کم نہ ہو جائے اس لیے فائلوں کے علاوہ دھول بھی ان پر کافی مقدار میں جمی تھی۔ میزوں کے علاوہ فائلیں فرش پر بھی تھیں۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ زیادہ تر فائلیں فرش پر ہی تھیں۔ فائلوں میں دبے اہم کاغذات کے بارے میں دفتر کے چپراسی اتنے فکرمند تھے کہ فرش کی کبھی صفائی نہیں کرتے تھے۔ اس لیے فرش پر بھی فائلوں کے علاوہ دھول کی تہیں جمی تھیں۔

کمروں میں جہاں جہاں جگہ ہو سکتی تھی، وہاں لکڑی یا لوہے کے بڑے ڈھانچے کھڑے کر دیے گئے تھے۔ جب فرش پر جگہ نہیں بچتی تھی تو بابو لوگ اس میں بھی فائلیں رکھ دیتے تھے۔ وہ انھیں الماری کہتے ہیں۔ اگر کبھی یہ عمارت منہدم ہوئی اور آرکیالوجی ڈپارٹمنٹ کو زمانے کے تعین کا کام سونپا گیا تو یقیناً انھیں یہ طے کرنے میں دقت ہوئی کہ اس جگہ دفتر پہلے بنا تھا یا پہلے وہاں الماری رکھ کر اس کے چاروں طرف دفتر بنا دیا گیا تھا۔ ان الماریوں کو رکھنے کے بعد ہٹایا نہیں گیا تھا۔ اس

Scanned with CamScanner

لیے کبھی کوئی پرانی فائل تلاش کرنی ہوتی تو بابو لوگ انھیں پیچھے تلاش کرتے۔

بابو، کرسی، میز، الماری اور فائل نامی کے یہ ان پانچ عناصر سے جو چیز بنتی ہے، اس کو دفتر کہتے ہیں۔ ایک دانشور نے کہا تھا کہ ایک بار قائم ہو جانے کے بعد دفتر اپنے لیے کام خود ہی پیدا کر لیتا ہے۔ کام کرنے کے لیے کاغذ نامی چیز استعمال ہوتی۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، اس پر بابو کچھ لکھتے ہیں اور بابو ہی تحریر کی ہوئی چیز کو، اگر پڑھنے کے لائق ہے تو، پڑھتے ہیں۔ اس کاغذ کا تھوڑا حصہ سرکار دیتی ہے۔ سرکار کے دیے ہوئے کاغذ سے دفتر کا کام نہیں چل سکتا اس لیے اس کا بڑا حصہ افسروں اور بابوؤں کے گھر چلا جاتا ہے اور وہاں ان کے بچوں کی تعلیم کی ترقی میں کام آتا ہے۔ بغیر کاغذ کے دفتر کا کام نہیں چل سکتا اور بغیر کام کے سرکاری محکمہ رہ نہیں سکتا۔ اس لیے وہ عوامی مدد نامی اس پروگرام کا سہارا لیتے ہیں، جو ہندوستانی نوکر شاہی کے کل پرزوں میں تیل پانی دینے کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے۔ مختلف محکمے اپنے رابطے میں آنے والے عوام سے الگ الگ طریقوں سے تعاون مانگتے ہیں۔ مثلاً تھانے پر رپٹ لکھانے جانے والے کو قوم کے نام پر ایک دستہ کاغذ تھوڑی سیاہی یا قلم تحفہ میں دینے کے لیے کہا جاتا ہے۔ کئی بار یہ بھینٹ چوری گئے سامان کی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے، اس لیے بہت سارے لوگ رپٹ لکھانے میں دلچسپی نہیں دکھاتے۔ اکثر کاغذ کی بربادی بچانے کے لیے تھانے والے ہی رپٹ نہیں لکھتے۔ اس دفتر نے بھی کاغذ کی قومی ملکیت کی کمی کو پورا کرنے کے لیے طے کر رکھا تھا کہ جس کا کام ہو، وہ اپنا کاغذ خود لائے! اس کے علاوہ مزید کاغذ بھی لائے تاکہ دفتر میں کام کرنے والے لوگوں کے بچوں کی تعلیمی سرگرمیاں متاثر نہ ہوں۔

کاغذات کو فائلوں میں رکھتے ہیں۔ فائلوں میں اس لیے رکھتے ہیں کیونکہ ابھی تک کاغذوں کو غائب کرنے کا اس سے بہتر طریقہ ایجاد نہیں ہوا ہے۔ بابوؤں کی نئی پیڑھی اس معاملے میں کچھ مختلف سوچ رکھتی ہے۔ اس پیڑھی کے بابو کاغذوں کو اپنی میز، کرسی یا الماری کے پیچھے گم رکھتے ہیں۔ پہلے ان فائلوں کو لال فیتے سے باندھتے تھے۔ لال فیتے سے فائلوں کو باندھنے کا مطلب تھا کہ اب اگلی دو تین پیڑھیوں تک ان کے آرام میں کوئی خلل نہیں ڈالے گا۔ اسی سے زبان کو ایک نیا لفظ ملا: ''لال فیتہ شاہی''۔ ہمارے ملک کے بعض چیف منسٹروں کو یہ لفظ پسند نہیں آیا، اس لیے انھوں نے لال کی جگہ سے، پیلے، گلابی جیسے دوسرے رنگوں کے فیتے استعمال کرنے کا حکم دے دیا۔ اس طرح لال

Scanned with CamScanner

فیتہ شاہی ختم ہوگئی اور کاغذ دوسرے رنگوں کے فیتوں کے نیچے دفن ہونے لگے۔

دفتروں کی بہترین کارکردگی کا اندازہ ان کاغذات کے نپٹارے سے لگایا جاتا ہے۔ اس دفتر کا بابو بھی دوسرے دفتروں کے بابوؤں کی طرح کاغذوں کے نپٹانے میں خاص دلچسپی رکھتا تھا۔ ہر کاغذ کو بابو پہلے سونگھتا تھا، پھر ٹٹول کر دیکھتا تھا اور پھر اس کے مستقبل کا تعین کرتا تھا۔ بابو کے ہاتھ میں آتے ہی کاغذ کے رونگٹے رونگٹے سے کچھ ایسے سر پھوٹتے تھے جنھیں صرف وہی پکڑ پاتا تھا۔ کچھ کچھ علم سے اس مصرعے کی طرح ہوتے تھے جس میں پرندے کو ہی پرندے کی زبان جاننے والا بتایا گیا ہے۔ شروع کے ایک دو مصرعے پڑھتے ہی بابو سمجھ جاتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس کے بعد کاغذوں کا نپٹارا شروع ہوتا ہے۔ 'اشد ضروری'، 'فوری'، 'کانفیڈنشیل' جیسی بھاری بھرکم صفتوں سے دبے کاغذ بابو کی کرسی، میز یا الماریوں کے نیچے پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ زیادہ خوش قسمت ہوتے ہیں تو کسی فائل کے اندر سما جاتے ہیں۔ کچھ نئی عمر کے بابو ابھی تک کاغذ سے ناؤ یا ہوائی جہاز بنانے کے کھیلوں کے شوق سے چھٹکارا نہیں پا سکے، اس لیے کچھ کاغذ بیچ بیچ میں ہوا میں اڑتے نظر آتے ہیں۔ دن بھر بابوؤں کو چائے پکوڑوں سے جوجھنا پڑتا ہے، اس سے بھی کاغذوں کے نپٹارے میں آسانی ہوتی ہے۔ چائے والے کا چھوکرا بابوؤں کو سموسے پکوڑے دینے کے لیے ان کے سامنے کا کاغذ کھینچ کر اس پر تیل چکناتی کھانے کی چیز رکھ دیتا ہے۔ اس طرح دن میں جتنی بار وہ آتا ہے، اتنے کاغذوں کا نپٹارا [illegible] ہے۔

شام ہوتے ہوتے بابو مطمئن ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی نوکرشاہی کے آدرش پرزے کی مانند اس نے دن بھر کڑی محنت کی ہے اور اسے سے زیادہ تر کاغذوں کو نپٹا چکا ہے۔ اب وہ بچے کھچے ان کاغذوں پر توجہ مرکوز کرتا ہے جن پر کچھ وزن رکھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وزن لفظ کا استعمال کی بابوؤں کے زبان و ادب کے تئیں محبت کا ہی ثبوت تھا۔ اکثر وہ سامنے کھڑے فریادی سے کاغذ لے کر اس کا کچھ اس طرح معائنہ کرتا ہے جیسے اس میں لکھی ہوئی زبان یونانی یا لاطینی ہو۔ پھر وہ کاغذ کو ایک طرف رکھ دیتا ہے اور دوسری کسی فائل میں سر گڑا کر پورے منظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ فریادی گر اس کی یکسوئی میں خلل ڈالنے ہونے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سخت ناراضگی کا تاثر چہرے پر لا کر اسے بتاتا ہے کہ ملک ایک بڑے بحران سے گزر رہا ہے اور ابھی جس فائل میں وہ غرق ہے، اس سے فوراً نہیں

Scanned with CamScanner

چھپایا گیا تو یہ بحران مزید شدت اختیار کر سکتا ہے۔ فریادی تھوڑی دیر بعد وہ سوال پوچھتا ہے جس کا جواب دینا نوکرشاہی کے کسی بھی پرزے کے لیے انتہائی دشوار ہے۔ فریادی اپنے کاغذ کے مستقبل کے بارے میں تجسس ظاہر کرتے ہوئے جاننا چاہتا ہے کہ اس پر کارروائی کب تک ممکن ہے۔ تب بابو پراسرار دنیا میں ڈوبے کسی فلسفی کی طرح جواب دیتا ہے کہ کارروائی آج بھی ہو سکتی ہے، اگلے سال بھی ہو سکتی ہے، یا پھر معدود آنے والی پیڑھیوں پر بھی ٹالا جا سکتا ہے۔ فریادی اگر دفتروں میں مستقل آنے جانے والا ہے تو اسے اس کاغذ پر کیا کارروائی ہو رہی ہے، یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی لیکن اگر کوئی نیا آدمی ہو تو اسے ضرور دقت ہوتی ہے۔ اس کے علم کے دریچے کھلتے ہیں جب کوئی چپراسی یا دوسرا بابو اسے اشارے سے الگ بلا کر کسی ان دیکھی مٹھی کا حوالہ دیتا ہے جو اس کے کاغذ کو اڑائے لیے جا رہی ہے۔ اگر کاغذ مضبوطی سے اپنے مقام پر قائم نہیں رہے گا تو اس پر کارروائی کیونکر ممکن ہے؟ پھر فریادی کو صلاح دی جاتی ہے کہ وہ اپنے کاغذ پر وزن رکھے۔ فریادی فوراً سمجھ جاتا ہے اور ریزرو بینک آف انڈیا کے گورنر کے دستخط شدہ کاغذ کے کچھ وزنی ٹکڑے پہلے والے کاغذوں کے اوپر یا نیچے رکھے جاتے ہیں۔

اس بابو نما پیڑھی کے بابوؤں سے جو بے شمار شکایات ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پہلے کے بابو بڑی شائستگی سے وزن رکھواتے تھے۔ اکثر یہ کام باہر کسی چائے کی دکان یا بابو کے گھر پر ختم ہو جاتا تھا۔ اگر دفتر میں کرنا بھی پڑے تو میز کے نیچے ہاتھ ڈال کر لے لیتے تھے۔ متعلقہ بابو چاروں طرف جھینپ کر دیکھتا تھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ باقی بابو ایسے موقعوں پر فائلوں میں اپنا سر گڑائے رہتے تھے تاکہ ان کے ساتھی کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ پر نئے زمانے کے بابوؤں نے تو ساری شرم و حیا ختم کر ڈالی ہے۔ وہ کھلے عام لین دین کرتے ہیں۔ اپنے منہ سے خود ہی بتا دیتے ہیں کہ کاغذ ہلکا ہے اور اس پر وزن رکھنا پڑے گا؛ کتنا وزن رکھنا پڑے گا، یہ بھی بتا دیتے ہیں، اور اکثر دبی آواز میں وزن کا مول تول بھی کرتے ہیں۔

شام تک سارے وزنی کاغذوں کو اکٹھا کر کے بابو انہیں صدر در صدر فائلوں میں سجا لیتا ہے، پھر سب ملا کے سارے نخرے اس پر نذر کرتے ہوئے نوٹنگ ڈرافٹنگ کرتا ہے۔ یہ نوٹنگ ڈرافٹنگ نوکرشاہی کا سب سے بنیادی پہلو ہے۔ اس کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ سب سے

نچلے عہدے والا بابو تیار کرتا ہے اور اوپری سیڑھیوں پر بیٹھے عام عہدیدار اپنے اپنے طریقے سے اس کو برداشت و پیراستہ کرتے چلتے ہیں۔ جن فائلوں میں افسر کی دلچسپی ہوتی ہے ان کے بارے میں بابو کو بتا دیا جاتا ہے وہ وہ اسی حساب سے نوٹنگ کر کے لے آتا ہے۔ جن کے بارے میں اسے اوپر سے کوئی اشارہ نہیں ملتا ان میں وہ ورن کے مطابق نوٹنگ کرتا ہے۔ نوکرشاہی میں بھائی چارے کے جذبات و تعلقات اس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ نیچے سے بھیجی گئی تجویز اوپر تک چلتی چلی جاتی ہے اور منظور ہو کر لوٹ آتی ہے۔ "بابو لکھتے ہیں اور بابا پڑھتے ہیں" والی کہاوت کے مطابق افسر صرف چڑیا بٹھاتے ہیں۔

ہر افسر نوکری شروع کرتے ہی جان جاتا ہے کہ اسے اور جتنا رہنا ہو یا نہ کرنا ہو، پر دستخط بہت کرنے ہوں گے۔ اس لیے وہ اپنے دستخط کو ایک انیشل (initial) میں بدل لیتا ہے، اسے چڑیا کہتے ہیں۔ فائلوں میں بٹھائی جانے والی چڑیوں پر علم طیور رکھنے والوں کا دھیان ابھی تک نہیں گیا ہے۔ اس لیے ان کی شکل صورت، ذات برادری کے بارے میں کوئی سنجیدہ کام نہیں ہوا ہے۔ مستقبل میں اگر کبھی کسی محقق نے کام کیا تو اسے معلوم ہوگا کہ ان پرندوں کی بھی بہت ساری قسمیں ہیں۔ صبح دفتر کھلتے ہی بٹھائی گئی چڑیا شام کو دفتر بند ہوتے وقت کی چڑیا سے مختلف ہے۔ جتنے موٹی چڑیا اتنا ساز بڑے موٹے فائل پر بیٹھنا ہوتا ہے۔ تنخواہ کی خوشبو کے ساتھ فائل پر بیٹھی چڑیا چہکتی نظر آتی ہے اور گھٹتے قاعدوں پر بیٹھی ہوئی مرجھائی۔ ہمارے ملک میں جس طرح نئے موضوعات پر تحقیق ہو رہی ہے، اسے دیکھتے ہوئے مستقبل قریب میں اس بات کی پوری امید کی جاتی ہے کہ یونیورسٹیوں میں کسی دن اس انتہائی اہم موضوع پر بھی تحقیق کا کام شروع کیا جائے گا۔

ہال نما ایک کمرے میں بڑے بابو صرف ایک بابو کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ وہاں کے بیچ میں ایک بڑی میز کے پیچھے بیٹھتے تھے۔ برسوں سے، جب وہ بڑے بابو بھی نہیں بنے تھے، یہ میز یہیں رکھی تھی۔ انھوں نے صرف اتنا کیا کہ میز کا رخ اس طرح کر دیا کہ اس کے پیچھے بیٹھ کر انھیں باہر کھڑی اپنی سائیکل دکھائی دیتی رہے۔ چونکہ یہ بڑے بابو کی میز تھی اس لیے اس کی چاروں ٹانگیں سلامت تھیں اور اس پر ایک میز پوش بچھا ہوا تھا جس سے بڑے بابو دفتر آتے ہی ہاتھ پونچھتے وقت میز پوش غلط استعمال کرتے تھے۔ اس کپڑے نے رنگ کے بارے میں بابو کی رائے میں

آ سکی نہیں تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ لالہ بابو صاحب نے بابو بن کر اس کمرے میں بیٹھے آئے تھے، اس وقت کے ہیڈ کلرک ڈھمی بابو نے ان سے ایک نوٹ شیٹ تیار کرا کے ٹیبل کو خریدنے کی اجازت لی تھی۔ اس وقت جو کپڑا خرید کر آیا تھا، اس کا رنگ ہرا تھا۔ پچھلے بیس سالوں میں اس پر اتنی دھول اور سیاہی جمع ہوئی تھی کہ ہرا رنگ پورے کپڑے میں کہیں کہیں کچھ دھبوں کی شکل میں موجود تھا۔ کپڑا اتنی جگہ سے نچا کھچا تھا کہ اس کی لمبائی چوڑائی کے بارے میں بھی بابوؤں کی آپس میں مختلف رائے تھی۔

اس میز کے پیچھے بیٹھ کر لالہ بابو اپنا چشمہ ناک پر چڑھا کے اپنی سلطنت کا جائزہ لیتے تھے۔ آج بھی وہ بیچ بیچ میں چشمے کو نیچا کر کے سامنے بیٹھے ہوئے بابوؤں، ان کی میزوں کو گھیر کر کھڑے ٹھیکیداروں اور دلالوں کو دیکھ رہے تھے۔ آج صورت حال کچھ مختلف تھی۔ آج کا دیکھنا صرف عادتاً نہیں تھا۔ آج کا دیکھنا کچھ کچھ اس گھبرائے ہوئے آدمی کا ردعمل ظاہر کر رہا تھا جو پوری طرح غیر حاضر رہنے کا ناٹک کرتا ہوا سامنے والوں کے چہرے سے یہ بھانپنے کی کوشش کرتا ہے کہ کہیں اس کا مذاق تو نہیں اڑایا جا رہا ہے۔

کل دفتر میں بالائی سطح کی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ سبھی کو معلوم تھا کہ بڑے صاحب مسٹر کانت ورما اور بڑے بابو کے تعلقات کیسے تھے۔ یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ نئے بڑے صاحب مسٹر چندر سے ان کی نہیں پٹتی۔ مسٹر چندر نے آنے کے بعد بڑے بابو کو طلب کر کے کیا کہا، اس کے بارے میں بھی طرح طرح سے مسالہ لگا کر چاروں طرف باتیں پھیلائی جا چکی تھیں۔

جس طرح طلسماتی کہانیوں میں دیو کی جان طوطے میں بستی تھی، اسی طرح دفتروں کی جان بڑے صاحب نامی مخلوق میں بستی ہے۔ اگرچہ دفتروں میں سب کچھ کافی حد تک روٹین ہو چکا ہے اور بڑے صاحبوں کے آنے جانے سے کچھ بنیادی فرق نہیں پڑتا، پھر بھی کسی پرانے بڑے صاحب کے تبادلے یا نئے بڑے صاحب کے آنے پر چھوٹا موٹا زلزلہ تو آ ہی جاتا ہے۔ ایگزیکٹو انجینیر کملا کانت ورما کے جانے اور مسٹر چندر اپادھیائے کے آنے پر یہی ہوا۔ بیچ کے پیسے کا پورا وقت دفتر کی دیواروں، چپراسیوں، بابوؤں اور ماتحتوں نے محاورے کی زبان میں نہیں بلکہ سچ مچ دم سادھے کسی انہونی کے اندیشے میں بتایا۔

بڑے صاحب کی بدلی کو صرف ایک دن ہوا تھا۔ مسٹر چندر کو دفتر کے لوگ پہلے سے جانتے

تھے لیکن انھوں نے کوئی جوکھم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ آج دس بجے تک سارے بابو دفتر میں آ گئے
تھے۔ آتے ہی انھیں کمرے کھلے بھی ملے۔ آ کر وہ فوراً چائے کی دکانوں پر نہیں گئے بلکہ انھوں نے
اپنے سامنے رکھی فائلوں میں کچھ لکھا بھی۔ ہنومان چند بھی سوا دس بجے آ گئے۔ انھوں نے بھی کچھ فائلوں
پر دستخط کیے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے دفتر میں جو کچھ ہوا، اسے دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے راوی یہ سوچ کر کہ وہ کسی
دوسرے دفتر میں چلے آئے ہیں، باہر بھاگ گئے۔ باہر سے بورڈ پر ایک بار پھر دفتر کا نام پڑھ کر وہ
واپس اندر آئے۔ پر یہاں یہ سب کچھ بہت دیر تک نہیں چل سکتا تھا۔ لنچ تک دفتر میں زندگی واپس
اپنی پٹری پر لوٹ آئی۔ تب تک بالائی سطح پر تبدیلی کا ایک دور ختم ہو چکا تھا۔ واقعات کچھ اس طرح
رونما ہوئے تھے کہ دیکھ کر کسی کو بھی اس چھوٹے موٹے ملک کی یاد آ سکتی تھی جہاں ابھی بھی دور
وحشت ٹھہرا ہوا تھا اور جہاں اقتدار کی منتقلی کے لیے کسی طرح کے طریقے مقبول عام تھے۔ ایک حکمران
سلطنت چھوڑ کر بھاگ گیا تھا، تخت حکمرانی پر دوسرا آدمی قابض ہو کر طاقت کے دلالوں سے ان کی
اسناد وفاداری بٹور رہا تھا۔

روز کی طرح آج بھی آدھے گھنٹے کا لنچ بریک آدھے گھنٹے کی جگہ تین گھنٹے تک چلا۔ ایک بجے
سے لے کر چار بجے تک آج بھی افسر اور بابو لنچ لیتے رہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ روز اس دوران
سارے کمرے خالی ہو جایا کرتے تھے۔ آج افسر کسی نہ کسی بہانے بڑے صاحب کے کمرے میں
اکٹھے ہو گئے اور بابو بھی آتے جاتے رہے۔ ہنومان چند پہلے بھی اس دفتر میں رہ چکے تھے اور لوگوں کو
معلوم تھا کہ انھیں پکوڑیاں اور مشکی پان ایک سو بیس نمبر کے تمباکو کے ساتھ پسند تھے، اس لیے
پورے تین گھنٹے تک ان کے کمرے میں یہی سب پہنچتے رہے۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ اگر اوپر
تر دی چیزوں کو غائب کر کے اس کی کوئی تصویر کھینچی جاتی تو یہی لگتا کہ کوئی پکوڑی کا دلدادہ کسی دفتر کی
میز پر لیٹا ہوا ہے اور اس پر پکوڑی کے ساتھ ساتھ پان کی دھڑ کی رہ رہے۔

دراصل پان اور پکوڑی کے ساتھ ساتھ اپنی وفاداریاں بھی پیش کی جا رہی تھیں۔ جیسے ہی کوئی
نیا صاحب اندر پہنچتا، اس کی آسانی کے لیے ہنومان چند اپنا کوئی پیک دان آگے پیش کرنے لگتے۔ اس
کے قریب آتے آتے پیر کی پوزیشن میں پہنچ جاتا کہ خود اردو ہوا میں ایک خاص زاویے پر اچھالا جاتا تھا
ہوا اپنا، اور پھر لفظے منھ سے خاص قسم کی "غوں غوں" کی صدا یا صاف ظاہر کرتی کہ

عقیدت قبول کر لی گئی ہے۔ اس عمل میں رکاوٹ صرف دو صورتوں میں پڑتی۔ پہلی تو تب جب کوئی گستاخ منصب داروں کو بدلنے والے جیسے آسمان اور عقلمند کو اشارہ کافی جیسے عمل کے باوجود صرف ہاتھ جوڑ کر نمستے جیسی فارمیلٹی تک محدود رہتا اور معاملے کو اسی طرح چلانے کی کوشش کرتا۔ ایسی صورت حال میں نوکر شاہی میں آنے کے بعد بھی پڑھی ہوئی نصابی کتب میں درج مشہور شاعر بھوشن کی شاعری کے ان بندوں کی یاد آنے لگتی ہے جن میں شیواجی کو اورنگ زیب کی طرف سے عزت و تعظیم نہ دیے جانے پر شیواجی کے ردعمل کی بھرپور للکار ہے۔ وقت بدل گیا تھا اور لوک چند فوری حساب کتاب کے بجائے مستقبل میں نمٹ لینے پر زیادہ یقین رکھتے تھے۔ اس لیے ایسی شان میں گستاخی کرنے والے کے لیے بھی ہلکے پھلکے نمستے پر ٹرخانے والے کا جواب وہ بہت نرمی سے مسکرا کر دیتے۔ صرف انھیں قریب سے جاننے والے ہی اس کڑکتی ہوئی بجلی کی کوند کو محسوس کر پاتے جو سیکنڈ کے معلوم نہیں کتنے ہزارویں پل کی سرعت سے ان کی آنکھوں کو خیرہ کرتے ہوئے غائب ہو جاتی۔ منھ سے نکلی ان آوازوں میں بھی اتنا خفیف فرق ہوتا کہ صرف سمجھنے والے ہی سمجھ پاتے کہ وہ بظاہر دکھائی دیتی لاپروائی کے پیچھے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ نمستے نامی رسم نبھانے والا جان بوجھ کر ایسا کر رہا ہے یا اپنی بیوقوفی سے ہی صحیح شکل نہیں پہچان پا رہا ہے۔

دوسری صورت حال آس پاس بیٹھے لوگوں کے لیے تب کشمکش کی ہوتی مگر لوک چند جی محظوظ ہوتے تھے۔ اس لیے نوکر شاہی کے سنہری اصول کے مطابق سبھی لوگ لطف اٹھاتے تھے، یعنی راجہ ہنستا تو سب ہنستے۔

اس صورت حال کے مطابق منھ میں لوک چند سے بھی زردے والا پان ٹھونسے ہوئے کوئی مصاحب دروازے سے داخل ہوتے ہی لوک چند کے چرنوں کی طرف لپکتا۔ راہ کی تمام رکاوٹوں سے نہ گھبرانے والے بہادر کی طرح راستے میں پڑنے والی کرسیوں اور ان پر بیٹھے اونچے درجے کے لوگوں کو بلاتا، جھنجھوڑتا، اس بڑی رکاوٹ کے سامنے پہنچ جاتا جسے میز کہتے ہیں اور جس کے پیچھے وہ بے کل اپنی پوزیشن بدل بدل کر اسی طرح اپنی طرف متوجہ کر رہے ہوتے ہیں جس طرح ہندی فلموں کی ہیروئن اپنے نیم عریاں جسم کی نمائش کر کے ہیرو کی توجہ کا مرکز بننا چاہتی ہے، اور ہیرو کی طرح وہ بھی ہیروئن کو حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔

میز کے سامنے کھڑے ہو کر وہ کئی امکانات پر غور و فکر کرتا ہے۔ ایک خیال کے مطابق اسے میز پر چڑھ کر دوسری طرف کود جانا چاہیے اور قدموں کی دھول لیتے ہوئے واپس اسی عمل سے گزرنا چاہیے۔ دوسرے خیال کے مطابق یوں ہو سکتا ہے کہ وہ جمناسٹک نام سے جانی جانے والے اس طریقے کا سہارا لے جس کے درشن زیادہ تر ہندوستانیوں کو ٹیلی ویژن پر ہوتے رہتے ہیں اور جس میں تمام دوسرے کھیلوں کی طرح ہر اولمپک سے پہلے میڈل جیتنے کے منصوبے باندھے جاتے ہیں اور ہر اولمپک کے بعد ان منصوبوں کو بستۂ خاموشی میں باندھ کر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ اگلے اولمپک میں پھر کھولنے پر یہ اسی طرح چہچہاتے ہوئے نکلیں۔ یہاں پر اس راستے کو اپنانے والے کو ہندوستانی اور مغربی امتزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے اس طرح کی کسرت کرنی پڑتی ہے کہ اس میں دونوں رنگ برقرار رہیں۔ وہ پہلے میز کے سامنے کھڑے ہو کر سامنے کی طرف جھکتا ہے اور ہاتھ ادھر ادھر پھینک کر پیر چھونے کی کوشش کرتا ہے۔ پیر چونکہ میز کے نیچے ہیں اور وہ بھوک چند کے پان ٹھسے منہ سے ''غوں... غوں...'' جیسی آوازوں کو ''بس ہو گیا... بس ہو گیا...'' جیسا سمجھ جانے سے انکار کر دیتا ہے، اس لیے اب وہ میز پر پیٹ کر لیٹ والی پوزیشن بناتے ہوئے ڈنڈوت کرنے لگتا ہے۔ ہوائی جہاز کی شکل میں لیٹا ہوا اس کا جسم دھیرے دھیرے غوطہ خوری کی شکل میں آ جاتا ہے۔ جس میں پیچھے دونوں پیر اوپر اٹھ جاتے ہیں اور دونوں ہاتھ اور سر نیچے جھک جاتے ہیں۔ اس پوری اٹھا پٹک کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے وہ چرن مل جاتے ہیں جو کئی دنوں سے نہ بدلے جانے والے گندے نائلون کے موزوں میں لپٹے سڑے ہوئے چوہے جیسی بدبو چھوڑتے جوتوں سے باہر آ چکے تھے اور اب جنہیں چھو کر کسی بھی چمچے کو اپنے آنے والے برسوں کی کامیابی کا پورا یقین ہو جاتا ہے۔

پیر چھونے کا ایک طریقہ اور بھی ہے۔ بھوک چند کی میز کے داہنے، بائیں کرسیوں پر بیٹھے چمچوں نے میز اور دیوار کے بیچ دونوں طرف کا چپہ چپہ گھیر رکھا ہے۔ پر اپنے ارادے کا پکا، آخری مقصد کا خواہش مند ان تمام قدغنوں کو توڑتا ہوا، سب کو دھکیلتا ہوا، پیروں کو کچلتا ہوا وہ کمیشن ہی جس کی زندگی کا واحد مقصد ہو، ایسے افسروں کی خریدی کرسیوں کی مضبوطی کا امتحان لیتا ہوا، کہیں نہ کہیں سے راستہ نکال لیتا ہے اور بھوک چند کے چھوئے جانے لائق پیروں تک پہنچ جاتا ہے۔

آج بھی آنے والے اپنی اپنی عقیدت کے مطابق ان تمام تبادلوں میں سے کسی ایک کا سہارا

Scanned with CamScanner

لیتے جا رہے تھے۔ وہ آتے، اور میز پر لگے ہوئے پکوڑیوں اور پانوں کے ڈھیر کے بیچ ایک دو لفافے اور رکھ دیتے، پھر پیر چھونے کا عمل شروع کرتے اور اس کے بعد ہی منصب داری اور حیثیت کے مطابق کرسی لے لیتے۔ کرسیاں بھری ہوئی تھیں، اس لیے کئی بار انھیں ایک طرف کھڑا ہونا پڑتا۔ ایسے میں وہ باتیں کرتے کرتے کنکھیوں سے پورے کمرے کا جائزہ لیتے رہتے اور جیسے ہی کوئی کرسی خالی ہوتی، اس پر جھپٹ پڑتے۔ کسی بڑے منصب دار کے آنے پر چھوٹے منصب دار اپنی کرسی خالی کر دیتے۔ بڑا منصب دار ہاتھ اور منھ کے اشاروں سے "رہنے دو، رہنے دو" کہتا ہوا اس پر بیٹھ جاتا۔

"ہم بھی ہیں دربار کے" یہ ثابت کرنے کے لیے کچھ لوگوں نے منھ میں گنجائش سے زیادہ ہی پان ٹھونس لیے تھے۔ کمرے میں گھسنے کے بعد مالک کے تئیں وفاداری ظاہر کرنے کے لیے وہ لوگ میز پر پڑے پانوں میں سے دو ایک بیڑے اور منھ میں ڈال لیتے۔ پان کے چھینٹوں کی خوبصورتی سے پہلو میں بیٹھے لوگوں کو شرابور کرتے ہوئے زبان اور ادب کا ایسا حیرت انگیز رشتہ پیش کرتے جسے دیکھ سن کر بڑے سے بڑا ادیب بھی بغیر واہ واہ کیے نہ رہ سکے۔ ان کی زبان استعاراتی اور غیر استعاراتی آوازوں کے درمیان جھولتی رہتی۔ بغیر جملہ ادا کیے مختلف آوازوں کی بنیاد پر بہت کچھ کہہ ڈالتی۔ مثلاً کوئی ایک صاحب اپنی ٹھوڑی پر بہہ رہی پیک کو پونچھتا ہوا منھ پینتالیس ڈگری کے اینگل میں تھوڑا اوپر اٹھاتا ہوا کہتا:

"صا... غوں... غوں... اب آپ... ووں... غوں... غوں... اب... غوں... ٹھیک ہو... غوں..."

بھوک چند یا کمرے میں بیٹھے لوگوں کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی کہ اس غوں... غوں... جملے کے پیچھے بولنے والے کی اس دفتر کی موجودہ حالتِ زار کے لیے فکر جھلک رہی ہے اور ساتھ ہی اس کو یہ اطمینان بھی ہے کہ اب اس دفتر کے سنہرے دور کا آغاز ہونے جا رہا ہے۔ اس لیے پورا جملہ وہ سمجھ جاتے ہیں کہ "صاحب، آپ آ گئے ہیں، اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کے جواب میں بھوک چند بھی اپنا منھ تھوڑا اوپر اٹھاتے جس سے پیک کی پچکاری سیدھے سامنے والے کے منھ پر نہ پڑے بلکہ تھوڑی فضا میں چکر لگاتے ہوئے تمام حاضرین و سامعین کو نظر آئے۔ پھر غوں... غوں... سے ملی جلی گفتگو جیسی کوئی چیز ان کے منھ سے بھی پھوٹتی... "ہاں...

Scanned with CamScanner

غوں... غوں... آ گیا... اب غوں... غوں... ہو... غوں"...

ان آوازوں کی کڑیاں جوڑنے میں بھی سامعین کو کوئی زیادہ وقت نہیں ہوتی۔ وہ جملہ پورا کر لیتے ہیں "ہاں اب میں آ گیا ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

آج تک جو سناٹا بابوؤں کے کمرے میں چھایا تھا وہ آج شروع ہوتے ہوتے ٹوٹ گیا۔ ایک مرتبہ پھر بابوؤں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ آج فرق صرف اتنا تھا کہ کوئی بابو ان تین گھنٹے کے بیچ کے دوران دفتر سے دور نہیں گیا۔ چائے کی دکانوں پر بھی وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ ان کے لیے چائے سموسے میز پر آتے رہے۔ وہاں آتے رہے۔ فرش پر پان کی پیک تھوکی جاتی رہی۔ 'فوری' یا 'اشد ضروری' کی مہر لگے کاغذ پن کر ناک یا کان کھجاتے رہے اور بابو لوگ ایک دوسرے کی دلجوئی کرتے رہے۔ مگر پھر ایک ابتدائی صدمے سے جانبر ہو کر دفتر میں پھر سے ضروری کام ہونے لگے۔

کوئی زور سے ہنستا تو بڑے بابو کنکھیوں سے دیکھنے لگتے۔ کوئی ہنستا کھلکھلاتا تو بڑے بابو کا چشمہ ناک پر سرک آتا۔

مشکل کی اس گھڑی میں بڑے بابو کو پرانا وقت بڑی شدت سے یاد آ رہا تھا جب سب بابو کتنی عزت کرتے تھے، اپنے سے اونچے عہدیداروں کی۔ اسی ہیبت پر بھی رہ جاتے تھے، مجال تھی کہ کوئی بابو ان کی موجودگی میں اونچی آواز میں بول دے، ہنسنے کی بات تو دور رہی۔ آج مشکل گھڑی میں ان کا رول دوہرا ہو گیا تھا کہ سامنے بیٹھے بابو چہرے پر اپنے بابو پن جانچیں اور نظم و ضبط نام کے لفظ کی اہمیت ان کے دلوں میں کچھ اس طرح بیٹھ جائے کہ وہ اقتدار کی منتقلی سے قبل بڑے بابو کی طرف دیکھ کر آنکھ مٹکانا یا ہوائی فقرے اچھالنا بند کر دیں۔

صبح سویرے مانگی گئی دعاؤں اور تمناؤں کی طرح بڑے بابو کی یہ خواہش بھی بیچ بیچ سازشوں کی چٹانوں سے ٹکرا کر ٹوٹتی جا رہی تھیں۔ بڑے بابو دل میں ہر گز رہے کوئی تصوراتی سنجیدہ حل اس مسئلے کا تلاش کرنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ زبان و ادب اور جمالیاتی شعور سے بھرپور نعرہ ان کے کانوں سے ٹکراتا "خوب یاد آتا تھا سالا ہوا ہمیں... اب ہو گئی چھٹی بند۔"

بڑے بابو مسئلے میں اور گہرے ڈوب جاتے۔ پر ان کے ذہن پانے کا سلسلہ زیادہ دیر نہ چل پاتا۔ بابو لوگ بحث سے ایسے بچتے کہ اور کہیں پہنچے نہ پہنچے ہنسی بڑے بابو تک ضرور پہنچ جائے۔

Scanned with CamScanner

بڑے بابو چشمہ ناک پر سرکا کر چاروں طرف دیکھتے۔ تب تک ہنسنے والے بابوؤں کی ناکوں میں اچانک کچھ سنجیدہ قسم کے مسئلے پیدا ہو جاتے۔ وہ فائلوں میں آنکھیں گڑا لیتے۔ آنکھ کے سی ٹی ڈاکو بڑے بابو اچھا مانتے ہیں، پر مشکل یہ ہے کہ بابو لوگ فائلوں میں آنکھیں ضرور گڑا دیتے ہیں مگر ان کے ہونٹوں پر خاص طرح کی مسکراہٹ تیرتی رہتی ہے۔

بابوؤں میں ہر دفتر میں دو گروپ ہوتے ہیں۔ یہاں بھی تھے۔ مطمئن گروپ میں وہ بابو تھے جنھیں کیمپ کلرک یا پری آڈٹ کلرک بننے کا موقع ملا تھا۔ انھی جگہوں پر وہ سب کچھ حاصل ہوتا تھا جسے بابوؤں کی زبان میں ترماں کہا جاتا ہے۔ اسسٹنٹ انجینئروں سے متعلق تیم کیمپ کلرکوں کو ہر پے منٹ میں ایک فیصد اور ڈویژنل اکاؤنٹنٹ سے جڑے پری آڈٹ کلرک کو آدھا فیصد ملتا ہے۔ باقی پورے دفتر میں ایک فیصد بنتا تھا، اس لیے فطری بات تھی کہ بابو لوگ کیمپ یا پری آڈٹ کلرک بننے کے لیے مارا ماری کرتے رہتے تھے۔ دوسرا گروپ غیر مطمئن لوگوں کا تھا جن میں وہ لوگ شامل تھے جنھیں سوکھی جگہ پر رکھا گیا تھا۔

بڑے بابو کو افسوس اس بات کا تھا کہ پھبتیاں کسنے والوں میں مطمئن گروپ کے لوگ بھی تھے، بلکہ وہی بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔ اپنے کو موجودہ تبدیلی میں غیر جانبدار دکھانے کا یہ سب سے آسان طریقہ تھا جسے شاید بابوؤں نے ملک کے سیاستدانوں سے سیکھا تھا۔

وقتے وقتے سے لالہ بابو کو بڑے صاحب کے کمرے میں طلب کیا جاتا رہا۔ آج تو نعیم رشید چپ شکل کی اپنے کمرے میں جا بیٹھا تھا۔ بڑے بابو، دواں چہرہ لیے جاتے اور حکم نوٹ کر کے واپس آ جاتے۔ اگر وہ کسی بابو کو حکم پاس کر دیتے اور پھر فائل میں سر گڑا لیتے۔ انھیں پتا تھا کہ رشید بابو انھیں صرف بے عزت کرنے کے لیے اور دفتر میں اپنی حیثیت جتانے کے لیے بلا رہا تھا۔ پر افسر تو افسر ہے، وہ ہر بار بھاگتے ہوئے جاتے اور ڈانٹ کھا کر اپنے چہرے سے ذلت کے چھینٹے جھاڑتے چلے آتے۔ افسر کی انھوں نے ہمیشہ عزت کی ہے، اور شکلا تو اس بدلے ہوئے ماحول میں وہ بھی چیز ہو گیا تھا۔

ہر بار بڑے بابو جب اٹھ کر جاتے یا واپس لوٹتے، انھیں لگتا کہ بابوؤں کو کھلکھلانے کی پوری آزادی بھی یہ دو دن میسر رہی ہے۔ کئی بار کسی بابو کو دیکھ کر انھیں دھوکا ہوتا کہ وہ کسی نوٹ کو ہیٹ سے

اشتہاری کیلنڈر کو دیکھ رہے ہیں۔

بابو روز کی طرح چہک چہک کر باتیں کر رہے تھے، ہنسی مذاق کر رہے تھے، دوسروں نے قہقہے لگا رہے تھے اور قہقہوں کے ساتھ اس بات کو ثابت کرنے میں لگے تھے کہ اور کچھ ہو نہ ہو، اپنا صاف ستھرا دل بے فکری کی حالت کے معاملے میں کسی طرح کم نہیں تھا۔ بڑے بابو کی مشکل یہ تھی کہ انہیں مراقبہ ورزش نے اپنے کو نشانہ بنا کر لیا گیا محسوس ہوتا تھا۔ چاروں طرف سے آنے والے شور و غل کی آوازیں ان کے کان تک پہنچتے پہنچتے اپنی آواز بدل دیتی تھیں اور بڑے بابو کے کان میں داخل ہوتیں تو بھی اس طرح کا شریانی اثر مرتب کرتیں۔

"سالا کیسا چکنا جنٹلمین بنا بیٹھا ہے۔ اب پتا چلے گا۔"

"چھوٹے نے مجھے کیمپ کلرک بنوایا تو کیسا احسان جتایا تھا، سب سے بتاتا پھرتا تھا، پر یہ نہیں بتاتا تھا کہ روز شام کو جب سبزی کا تھیلا مجھے تھما دیتا ہے، اس کے ساتھ پیسہ کبھی نہیں دیتا ہے۔ اب پتا چلے گا۔"

"خوب ملائی کاٹ رہا تھا، کوئی نہیں جانتا تھا، اب پتا چلے گا۔"

"اب پتا چلے گا" کچھ اس طرح ہر جملے کے ساتھ چسپاں ہو گیا تھا کہ وہ جہاں بھی جاتے پیچھا، بڑے بابو کو ستاتا یہ جملہ ٹیپ کی طرح ان کی ٹیک بن گیا "اب پتا چلے گا" ہر طرف سنائی دیتی۔ تعجب تو ہوا جب کیشیئر بابو نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے پوچھا، "بڑے بابو، صاحب شوکت کی ریٹرنڈ بھیجے ہیں یا ریٹرن کلوز؟"

بڑے بابو کے کان تک جو جملہ پہنچا اس کی ٹیپ تھی "اب پتا چلے گا" پر۔

اپنے مزاج کے خلاف بڑے بابو جھنجھلائے اور اپنے رویے کے برعکس خوب تلخ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا، "کیا پتا چلے گا؟ کسی کے باپ کی نوکری کرتے ہیں کیا؟"

کیشیئر بابو نے آج تک اس رویے پر کبھی بڑے بابو کو نہیں دیکھا۔ بڑے بابو کی آواز غیر ضروری طور پر کچھ اونچی ہو گئی تھی۔ وہ تھوڑا جھینپ گئے اور انہوں نے کیشیئر بابو کو پھر سے سوال دہرانے کو کہنے کی کوشش کی، پر اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ دو آوازیں ایک ساتھ آئیں۔

"بھیا جی تو پیچھے ہی ہے۔ صرف اونچا سنائی دینے لگا ہے... آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

Scanned with CamScanner

"مہاشور اتری لوکل ہیڈ ہے، کیشیئر بابو۔"

[illegible] بابو کے سامنے پھیلی فائل کے کھلے ہوئے اوراق میں چھپی مشکل اور مشکل تر ہوتی گئی۔ وہ تیرہویں بار اسے پڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس مرتبہ بھی اس کے سارے الفاظ دھندلے لگ رہے تھے۔

بڑے صاحب کے چپراسی نے دفتر کے کمروں میں گھوم گھوم کر اطلاع دینی شروع کر دی کہ شام ساڑھے چار بجے بڑے صاحب اپنے کمرے میں میٹنگ کریں گے۔ سارے افسران اور باقی سبھی کو اس میں شریک ہونا ہے۔

بابوؤں نے جھنجھلانا شروع کر دیا۔ پانچ بجے کون سا وقت ہے میٹنگ کرنے کا۔ صبح دس بجے سے چائے سموسے کھاتے کھاتے، اپنے چیمبروں کی طاقت کا مظاہرہ کرتے کرتے، اور کاغذوں کو جہاز یا ناؤ بناتے بناتے بابو اس وقت تک بری طرح تھک جاتے تھے۔ سرکاری قواعد کے مطابق دفتر پانچ بجے تک ہوتا ہے، پر ہر سرکاری اصول کی طرح یہ اصول بھی توڑنے کے لیے بنا تھا۔ اس لیے چار بجے کے بعد بابوؤں کے جانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ بھنی بیویوں سے کترائے اور جھگڑا کر کے نکلے ہوئے بابوؤں کو اچانک گھر کسی سنہرے خواب کی طرح پکارنے لگتا۔

ہر نیا بڑا صاحب آنے کے بعد میٹنگ کرتا ہے۔ میٹنگ افسروں اور بابوؤں کو یہ بتانے کے لیے ہوتی ہے کہ انھوں نے بہت حرام خوری کر لی۔ اب چونکہ نئے صاحب تشریف لا چکے ہیں، اس لیے انھیں کام بھی کرنا پڑے گا۔ بولنے والا دفتر میں وقت کی پابندی، ایمانداری، دونوں پر جلد از جلد کارروائی اور دفتر میں آنے والے عام لوگوں کے ساتھ اخلاق کے رویے پر زور دیتے تھے۔ مقرر اور سامعین کے درمیان اس میٹنگ کے دوران ون ڈے کرکٹ میچ چلتا رہتا ہے۔ مقرر باؤنسر، گگلی اور یارکر کی جھڑی لگا دیتا ہے۔ سامعین جانتے ہیں کہ سرکاری نوکری میں وکٹ تو گرتا ہی نہیں، اس لیے وہ وکٹ کی فکر چھوڑ کر گیند بازی کے زبردست حملوں سے اپنا جسم بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ دراصل جو بھاری بھرکم امیدیں اور تمنائیں مقرر ان سے کرتا ہے، ان سے کچھ بنتا بگڑتا تو ہے نہیں، صرف کچھ دیر کے لیے سننے والوں کو وہ امیدیں اور تمنائیں تھوڑا غمگین کر دیتی ہیں جو ان سے وابستہ کی جاری ہوتی ہیں۔ پر سنتے سنتے سامعین کا دل بھی تھوڑی دیر کے لیے بے چین ہو جاتا ہے کہ وہ اب

تک وقت سے دفتر نہ آ کر، رشوت لے کر یا عوام کو دھتکارتے ہوئے افسر و دیگر سرکاری کارندوں پر رکھ کر سوتے اور پکوڑے کھا کر کتنا گھناؤنا جرم کر رہے تھے۔ بعض کمزور دل والے نوکر شاہی کے پرزوں کی تو آنکھیں بھی نم ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی کسی مدراسی فلم کا منظر ابھر آتا ہے۔ وزیر مقرر رہے دفتر میں آنے والے عوام سے افسروں اور بابوؤں کی بدسلوکی کا ذکر کیا کہ سامنے بیٹھے سننے والوں میں سے چند نے سسکیاں بھریں۔ مقرر کا جوش بڑھتا ہے اور وہ وقت سے دفتر آنے کی اہمیت والے ایجنڈے کو چھانٹ لیتا ہے۔ سامنے بیٹھے سامعین میں سے کئی لوگوں کے منہ لٹک جاتے ہیں۔ کچھ جوشیلے قسم کے مقررانہ جوش میں آ جاتے ہیں کہ انھیں لگنے لگتا ہے کہ اب تک بہت ہوا، پر اب ان کی تحریر فیتے کو پٹری پر لا ہی دے گی۔ وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ان کی قیادت کی ضرورت ان کے ڈیپارٹمنٹ کو بھی اور ملک کو بھی ہے اور اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ خیالات انھیں اور بولنے پر اکساتے ہیں اور وہ بولتے بولتے جھاگ چھینکنے لگتے ہیں۔

سامعین میں سے زیادہ تر لوگ ایسے منظر ناموں سے کتراتے ہوئے حقیقت پسند مصوری کے قدروں کی طرح اپنا دھیان مقرر کی تقریر سے زیادہ غیر متعلق موضوعات پر لگاتے رہتے ہیں۔ ادھر مقرر نے بیماری کی تان چھیڑی، ادھر کھسر پھسر شروع ہوئی: ''اب سالا کمیشن بڑھے گا۔'' مقرر نے عوام کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی اپیل جاری کی کہ یک بیک ہوئے دوسرے دن میں، سنسکرت کے ڈراموں کے مسخرے جیسی بانیوں کی طرح جنھیں سامنے بیٹھے ناظرین بخوبی سن سکتے ہوں سرگوشی کی: ''بیٹا! آپ جو کچھ بھی لائے، اس سے ہاتھ جوڑ کر کہیں آپ ہی کے بھیجا تھی۔''

ایسا تو چند دورہ اور والی ماتحت والے رخصتی ملنے والوں نے اگر کسی بڑے صاحب کی بکل سٹاف میٹنگ دیکھی ہوتی تو ان کی سمجھ میں آجاتا کہ سب سے کم دیر تک ٹکنے والی چیز اس دنیا میں بڑے صاحب کی تقریر کا اثر ہے۔ باہر نکلتے نکلتے ماتحت اپنی فائل، قمیض یا چپل جس طرح جھاڑتے ہیں، اس سے اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا کہ بڑے صاحب کا کوئی ذرہ بھی ان سے چپکا رہ گیا ہو۔

ساڑھے چار بجے بڑے صاحب، یعنی ہوت پیدا یا وصی کا کمرہ اسٹاف میٹنگ کے لیے تیار کر دیا گیا۔ کرسیاں جو آڑی ترچھی تھیں، انھیں طریقے سے لگا دیا گیا۔ چاپلوس ماتحتوں اور

Scanned with CamScanner

والوں نے پورے کمرے میں پان اور چھالیہ کے دونے پھینک رکھے تھے۔ انھیں پھر اسی دم پھینک آیا۔ کمرے میں کرسیاں کم تھیں اس لیے دفتر کے دوسرے کمروں سے ٹین، پلاسٹک، لکڑی، جس چیز کی بھی کرسیاں چار پیروں پر کھڑی تھیں، لا کر لگا دی گئی تھیں۔ دو یا تین پیروں والی کرسیاں اس لیے چھوڑ دی گئی تھیں کہ انھیں بیلنس کرنے کے لیے اینٹیں لانی پڑتیں اور چپراسی اس بیگار کے لیے پرجوش نہیں تھے۔ سب سے پیچھے دو تین بنچیں لگا دی گئیں۔ سب کچھ کسی پارسی تھیٹر کے ناٹک کی طرح رونما ہوا۔ ساڑھے چار بجتے بجتے جھوک چند اُپادھیائے گمبھیر ہو گئے۔ اس کے دربار کمرے کو کسی میدان جنگ کی طرح درہم برہم کر کے چھوڑ گئے تھے۔ چپراسیوں نے کمرے کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ جھوک چند نے کمرے سے ملحقہ باتھ روم میں جا کر خوب کلیاں کیں۔ پان تھوکنے کی کوشش کی۔ فرق صرف اتنا آیا کہ ان کے ہلکے سڑے مسوڑھوں اور پیلے دانتوں کے علاوہ ہونٹوں کے کوروں تک سے پان صد آنے لگی کہ ان پورے غیر حساس علاقے میں پان کی واحد حس ہی جڑ دی تھی۔ منھ دھو کر جھوک چند سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے قطعی فیصلہ کیا کہ وہ میٹنگ میں آنے والے ماتحتوں کے کسی بات کا جواب نہیں دیں گے اور پوری میٹنگ کے دوران پان نہیں کھائیں گے۔ پہلے فیصلے پر تو وہ میٹنگ شروع ہونے سے لے کر ختم ہونے تک جمے رہے مگر دوسرا فیصلہ انھوں نے تقریر شروع کرنے سے پہلے ہی توڑ دیا۔ منھ دھو کر آنے کے بعد پانچ سات منٹ تک وہ خلا میں گھورتے رہے کرسی پر چپ چاپ ماتحتوں کو دیکھتے ہوئے یا سامنے رکھے ہوئے پرانے اخباری خبروں کو چاٹتے ہوئے پان کی طلب کو دبانے کی کوشش کرتے رہے مگر دیر تک وہ اپنے حوصلے کو برقرار نہیں رکھ سکے۔ انھوں نے پان سے بھرا لفافہ اٹھایا اور وہیں میز پر رکھ دیا، پھر لفافہ اٹھایا اور دو بیڑے نکال کر اپنے منھ میں ٹھونس لیے۔

پانچ بجتے ہی کمرہ دھیرے دھیرے بھرنے لگا۔ ماتحت اندر گھستے رہے اور آداب یا سر ہلا کر سلیوٹ کرتے رہے۔ اپنے ارادے کے مطابق جھوک چند نے کسی کو جواب نہیں دیا۔ وہ لگاتار خلا میں گھورتے رہے اور اپنے ماتحتوں کو یقین دلاتے رہے کہ بہت سے سنجیدہ مسائل ہیں جن پر ان کا فوری دھیان دینا ضروری ہے، سلام و نمستے جیسی حقیر باتوں میں وہ اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتے۔ وہ خلا میں گھورتے رہے اور ان لوگوں کے نام اپنے ذہن میں درج کرتے رہے جو ان کی بے خودی کا مدعا تھا

Scanned with CamScanner

کر مخبر نسخے وغیرہ کیے بیٹھے جا رہے تھے۔

دس پندرہ منٹ میں کمرہ پوری طرح بھر گیا۔ بھوگ چند نے طائرانہ سی اپنی نظریں لوگوں پر ڈالیں۔ کمرے میں دو ہندوستان تھے۔ ایک میں صاف ستھرے کپڑے پہنے، چکنے گالوں اور ماتھے کو کے تیوروں والے افسر تھے جو بھوگ چند کے داہنے بائیں بیٹھے تھے۔ دوسرے ہندوستان میں بیٹھے بابو لوگ تھے، جن کی قمیصوں کے کالر گندے تھے، ٹھوڑیوں پر بالوں کے گچھے تھے اور جن کے پیٹ اور گال دونوں ہی پچکے ہوئے تھے۔

بھوگ چند نے داہنے، بائیں اور سامنے ہر طرف دیکھا۔ کچھ لوگوں نے ان کے منہ سے نکلے الفاظ نوٹ کرنے کے لیے قلم ہاتھوں میں لے کر ڈائری کے ورق کھول رکھے تھے۔ ایسے لوگوں کے چہروں کا معائنہ کرتے وقت ان کی نگاہوں میں کچھ چمک آ گئی۔ جو لوگ بغیر کاغذ قلم کے تھے، انھوں نے اپنی طرف اٹھتی نگاہوں میں ایک تپش سی محسوس کی۔ ان میں سے کچھ نے اپنے قلم نکالے اور ڈائری کی کمی پوری کرنے کے لیے اپنے ہاتھ کی فائل اٹھا کر اس کے اوپر ہی تجریدی آرٹ کے نمونے بنانے لگے۔

بھوگ چند نے اپنی تقریر اسی طرح شروع کی جس طرح کوئی بڑا صاحب کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے گئے جس طرح کسی فتنے کے ماتحت جھیلتے ہیں۔

سب سے پہلے بھوگ چند نے بتایا کہ وہ اس دفتر کے لیے نئے نہیں ہیں۔ "نئی تو ہماری" بڑے بابو نے سوچا، "پچھلی بار ترقی لے گئے تھے بچو، اس بار نہیں بچو گے۔" سینئر ڈرافٹسمین جو بیچ سے اپنے سامنے رکھے کاغذ پر جوتے، ران اور چوہے کی تصویر ختم کرتے ہوئے پینسل سے طرح دے رہے تھے۔

پھر بھوگ چند نے پولیس کی زبان استعمال کرتے ہوئے چاپلوسی بھرے لہجے میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ یہاں پر تعینات سبھی افسروں اور دیگر لوگوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انھوں نے ہوا میں تیرتی ریلی سنا کر بغیر وقت ضائع کیے بنا کسی تمہید کے، جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ یہاں موجود سارے بدمعاشوں کی نس نس سے واقف ہیں اور انھیں جو کچھ کہنا ہو کہہ دیا جائے۔

اس کے بعد وہ اس موضوع پر آ گئے جو ہندوستانی نوکرشاہی میں سب سے زیادہ دلچسپ ہے

کے لیے سب سے کارآمد مانا جاتا ہے۔ انھوں نے "زندگی میں ایمانداری کی افادیت و اہمیت" جیسے موضوع پر بولنا شروع کیا اور تب تک بولتے چلے گئے جب تک انھیں یہ احساس نہیں ہو گیا کہ اچانک ان کے سامنے بیٹھے سامعین کے بیچ کھانسنے، کھنکھارنے یا جسم کے مختلف حصوں سے مختلف قسم کی آوازیں آنے کا مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ یہ صورت حال جان بوجھ کر پیدا کی گئی تھی یا دیر تک ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے رہنے کا نتیجہ تھی، یہ جاننے کے لیے ان کی بے چین آنکھیں کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ جس حصے پر ان کی نگاہیں پڑتیں، وہاں سناٹا چھا جاتا تھا مگر دوسرے حصے میں پہنچتے ہی پچھلی طرف سے پھر سے آوازیں اسی ترنگ ہوا میں بکھیرنے لگتیں۔

اس کے بعد بھوک چند نے جلدی جلدی وقت کی پابندی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے بتایا کہ سرکار نے بہت سوچ بچار کرنے کے بعد دفتروں کے کھلنے کا وقت دس بجے مقرر کیا ہے۔ یہ وقت انگریز جیسی عقلمند قوم نے طے کیا تھا اور اسی لیے اس کے راج میں سورج کبھی نہیں ڈوبتا تھا۔ چونکہ عام آدمی کو بھی یہ وقت معلوم ہو گیا ہے، اس لیے وہ ٹھیک دس بجے دفتر آ جاتے ہیں، اور اسی لیے افسران اور بابوؤں کو بھی ٹھیک دس بجے دفتر پہنچ جانا چاہیے۔ ان لوگوں کو نہ صرف وقت پر دفتر آنا چاہیے بلکہ وہاں بیٹھ کر کام بھی کرنا چاہیے۔ پھر انھوں نے دن بھر چائے پینے اور سموسے کھانے سے ہونے والے نقصانات پر بھی روشنی ڈالی۔ دوسرے تمام صلاح مشوروں کی طرح اس مشورے کو بھی سننے والوں نے سنجیدگی سے لیا اور ان کے لٹکے چہروں نے مقرر کو مطمئن کر دیا کہ دوسرے دن سے اس دفتر میں لوگ وقت سے آئیں گے، اور نہ صرف وقت سے آئیں گے بلکہ وہاں بیٹھ کر کام بھی کریں گے۔ اس کے علاوہ دفتر میں آ کر وہ جو کچھ کریں، کم سے کم سموسے نہیں کھائیں گے۔

اور بھی بہت سے موضوعات تھے جن پر دیر تک اور تفصیل سے بھوک چند بولنا چاہتے تھے۔ وہ بولتے بھی مگر انھیں لگا کہ اچانک کمرہ شاستریہ سنگیت کے اسٹیج میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ولمبت اور درت دونوں میں ناک، گلے اور جسم کے رونگٹے رونگٹے سے اتنی آوازیں نکلنے لگیں کہ ان کے جیسے گنی آدمی کے لیے بھی یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ اس میں کتنا فطری ہے اور کتنا جان بوجھ کر یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ دن بھر سموسے پکوڑے کھاتے رہنے سے پیدا شدہ ہواؤں کی زد میں پورا ماحول تھا اور یہ ہوا میں پوری دنیا کا چکر کی تیزی کے ساتھ گھوم رہی تھیں۔ بھوک چند نے کئی بار سوچا کہ یہ ساری تقریر بعد

کریں۔ وہ سب صرف ماحول کی آلودگی پر لیکچر دیں اور "صحت مند جسم میں صحت مند دماغ" پر ہی سامعین کی معلومات میں اضافہ کریں۔ مگر یہ موضوعات ان کے سرکاری فرائض کی فہرست میں شامل نہیں تھا اس لیے انھوں نے اپنے اوپر قابو رکھا اور اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنی تقریر کا اختتام کچھ یوں کیا کہ اب وہ آ گئے ہیں، اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔

تقریر ختم ہوتے ہی زیادہ تر سننے والے نکل بھاگے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی کانجی ہاؤس کا گیٹ ٹوٹ گیا ہو اور کئی دن سے اس میں بند بھوکے پیاسے جانوروں کو اچانک آزادی اور ہری گھاس دکھائی دینے لگی ہو۔ بابو لوگ اس قدر تھک چکے تھے کہ اپنی عادت کے خلاف، بغیر دھکم پیل کیے، بغیر کسی کو گالی دیے، بغیر اونچی آواز میں بولے، بغیر قہقہے لگائے، بس دفتر کے گیٹ سے کسی نہ کسی طرح باہر نکل گئے۔ انھیں ڈر لگ رہا تھا کہ بڑے صاحب کا چپراسی انھیں ایک بار پھر اندر نہ بلا لے اور ایک بار پھر تقریر کا سلسلہ شروع نہ ہو جائے۔ وہ اپنی سائیکلوں، سکوٹروں، رکشوں، پیروں، غرض یہ کہ جو بھی سواری ملی اس پر بھاگ نکلے۔

دفتر بند ہونے کا وقت ہو گیا۔ دفتر میں تالا لگانے کے لیے باہر چوکیدار اونگھتے ہوئے ان چاپلوس صاحبوں کے جانے کا انتظار کر رہا تھا جو میٹنگ ختم ہونے کے بعد ایک بار پھر بڑے صاحب کو گھیرے ہوئے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس مرتبہ سبھی کھڑے تھے اور ان کی جی حضوری کر رہے تھے۔ نہ جانے کہاں سے جادو کی طرح ان کے ہاتھوں میں پان کے پتے آ گئے تھے جن میں سے نکال نکال کر پان وہ وقفے وقفے سے بڑے صاحب کو پیش کرتے جا رہے تھے جنھیں بڑے صاحب اپنے پہلے سے پھولے ہوئے گالوں میں ٹھونستے جا رہے تھے۔ خاص طور سے وہ لوگ جو چوک گئے تھے یا جنھیں اندیشہ تھا کہ ان کا سلام پوری طرح قبول نہیں ہوا ہے، وہ بڑھ بڑھ کر اپنی وفاداریوں کی علامت کے طور پر پان پیش کرتے جا رہے تھے۔

کملا کانت ورما جس بڑے دفتر کے ہال نما کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، اس کے برآمدوں اور دروازوں پر ایک جملہ موٹے موٹے الفاظ میں لکھا تھا: "براہ کرم تبادلوں کے بارے میں بات نہ کریں۔" وہاں موجود ہر شخص صرف تبادلوں کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ کسی کو کسی کا تبادلہ کروانا تھا اور کسی کو کسی کا رکوانا تھا۔ اس کمرے میں کھچا کھچ لوگ بھرے تھے اور سامنے ایک گھومتی ہوئی کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کو ایک ساتھ مخاطب کر رہے تھے۔ سامنے والا شخص اپنے چہرے پر گہری مسکراہٹ لیے صبر و ضبط اور ہمدردی کی ایسی تصویر بنا بیٹھا تھا جیسے انسان کے روپ میں بھگوان ہو۔ ایک ساتھ کئی لوگوں کی باتیں سن رہا تھا، بیچ بیچ میں انھیں ہنسا رہا تھا اور خود بھی قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ ایک ساتھ کئی لوگوں کی درخواستیں پڑھتا، ان پر کچھ لکھتا اور اپنے پی اے کو پکڑا دیتا۔ تقریباً سبھی کو ایک جملہ سننے کو ملتا:

"ہو جائے گا... لکھ دیا ہے... آپ گھر جائیے۔ آرڈر پہنچ جائے گا۔"

کام کے بعد پی اے کے ہاتھوں میں پہنچتے ہی کاغذ دوسرے پی اے کے پاس پہنچتے۔ پی اے کے ہاتھ اور ہونٹ ساتھ ساتھ چل رہے ہوتے۔ وہ ہاتھوں کے کاغذوں کو تہہ لگا کر ایک فائل میں رکھتا جاتا اور اس کے ہونٹ جو کچھ بدبداتے رہتے، اس کا مطلب یہ نکالا جا سکتا ہے کہ "آپ صاحب نے کہہ دیا ہے، اب گھر جا کر موج کرو، آرڈر خود ہی پہنچ جائے گا۔" پر درخواست دینے والے جانتے تھے کہ آرڈر ایسے نہیں پہنچتا، وہ پہلے بھی ایسے جملے سن چکے تھے، اس لیے وہ وہیں منڈلاتے رہتے۔

کملا کانت جی یہ منظر کئی بار دیکھ چکے تھے۔ وہ سارے شور شرابے سے بے خبر صرف ایک ہی مقصد کو لے کر چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے۔ وہ کسی طرح اس جگہ پر بیٹھنا چاہتے تھے جہاں سے گھومتی ہوئی کرسی تک اپنی بات پہنچا سکیں... ان کا مخاطب اور ان کی دسترس میں ہو۔ کرسی والے کے اصول سے

مطابق جیسے ہی کوئی کرسی آگے خالی ہوتی، اس پر وہ جھپٹ پڑتے۔ اس دوڑ میں ان کے علاوہ بھی کئی لوگ تھے اس لیے مقابلہ برابری پر رہی تھی۔ کوئی اپنی درخواست ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوتا کہ یہ لوگ فوراً متوجہ ہو جاتے۔ جیسے ہی ان کا ایک قدم آگے بڑھتا پیچھے سے کوئی جھپٹ کر ان کی کرسی ہتھیا لیتا۔ ایک آدھ مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ درخواست دہندہ گھومتی کرسی کو مصروف دیکھ کر واپس اپنی کرسی پر بیٹھا تو اس نے اپنے کو کسی کی گود میں پایا۔

پرانی کہاوت ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ کملا کانت پوری طرح اس پر یقین رکھتے تھے اور انھیں بھی تین گھنٹے کے صبر کا میٹھا پھل ملنے والا تھا کہ کمرے میں ہنگامہ ہو گیا۔

ہوا یوں کہ گھومنے والی کرسی کے سامنے دو کاغذ ایک ساتھ پہنچے۔ اس نے دونوں پر لکھ دیا کہ آرڈر جاری کر دیے جائیں، پر چونکہ ایک کاغذ والے کی نگاہیں دوسرے کاغذ پر پڑ گئیں۔ یہ تو شور وغل سے معلوم ہوا کہ ایک کاغذ کسی کو کسی جگہ پر ایک سال اور رکھنے سے متعلق تھا اور دوسرا اسی جگہ پر تعینات شخص کو ہٹا کر دوسرے کو وہاں تعینات کرنے کی سفارش تھی۔ پہلے کاغذ کے ساتھ دو لوگ تھے اور دوسرے کے ساتھ تین۔ ان پانچوں نے ایک ساتھ زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ ایک بار تو کمرے میں بیٹھے سب سہم کر چپ ہو گئے اور گھومنے والی کرسی کے چہرے سے بھی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

گھومنے والی کرسی نے سمجھانے کی کوشش کی کہ دونوں اپنی جگہ ٹھیک ہیں، چلو دونوں کو وہیں رکھ دیتے ہیں۔

ایک لمحے کو لگا کہ معاملہ سلجھ گیا ہے۔ دونوں گروہوں کی آوازیں دھیمی پڑ گئیں۔ پھر پتا لگا کہ ایک گروپ وہ جو پہلے سے اس جگہ قابض تھا جس کے لیے جھگڑا ہو رہا تھا، یہ احساس ہو گیا کہ ان کو اس جگہ پر کسی دوسرے سے حصے داری کرنی پڑے گی۔ اس گروپ کے تین لوگ تھے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں، کانوں اور ناک جیسے عضو کا کشادہ دلی کے ساتھ استعمال کیا اور کمرہ پھر ایک دم چل پوں سے بھر گیا۔ دوسرا گروپ جس میں دو لوگ تھے اور جس نے احسان کرنے کے انداز میں، کہ چلیے آپ ساتھ ہو تو مان لیتے ہیں، اپنی آوازیں دھیمی کر لی تھی، فوراً ہی چوکنا ہو گیا۔ اس نے اپنے علاوہ ان پارلیمانی نظام سے متاثر ایک ایسے حل کو تلاش کر لیا جس کے مطابق اگر آپ کے پیچھے زیادہ لوگ ہیں تو طاقت

Scanned with CamScanner

ہے تو آپ کوئی بھی سیاہ و سفید کر سکتے ہیں۔ اس گروپ کے دونوں جنگجوؤں کے پھیپھڑے بڑے زیادہ ہی مضبوط تھے، اس لیے دوسرے گروپ کے ان سے بھی بڑے جنگجو جب چلاتے چلاتے کھانسنے کھنکھارنے لگے، تب بھی وہ چلاتے رہے، اور تب تک چلاتے رہے جب تک گھومنے والی کرسی پر بیٹھے محترم، جنہیں وہ مستری جی کے لقب سے مخاطب کر رہے تھے، اچانک اپنی کرسی سے اٹھ کر اندر کی طرف نہیں کھسک گئے۔

مستری جی کے اندر کھسکنے کی وجہ بظاہر کسی فوری اندیشے کا حل نکالنا تھا مگر جب وہ کافی دیر تک باہر نہیں آئے، تب لوگوں کی سمجھ میں آگیا کہ وہ چاہتے تھے کہ مسئلہ اپنا حل خود تلاش کر لے۔ یہ وہ نایاب نسخہ تھا جس کے بل پر ہمارے ملک کے بعض اونچے طبقے والے لوگ سالہا سال سرکاریں چلاتے ہیں۔ کسی مسئلے کے پیدا ہونے پر شتر مرغ کی طرح گردن ریت میں گڑا لینے سے کچھ وقت کے بعد مسئلہ خود ہی اپنا حل تلاش کر لیتا ہے۔ مگر یہاں یہ نسخہ نہیں چلا اور مستری جی کو باہر نکلنا پڑا۔

ہوا یہ تھا کہ دونوں گروپ کا بحث مباحثہ اس نقطۂ عروج پر پہنچ گیا جہاں تشدد کی امید ایسے موقعوں پر کی جا سکتی ہے۔

ایک گروپ نے جو کہ اس جگہ پر بیٹھا تھا، چونکہ یہ اعلان کر دیا کہ اگر اسے اس جگہ سے ہٹایا گیا تو وہ اس کی برادری کے جو ہزاروں لاکھوں ووٹر تھے، وہ چپ نہیں بیٹھیں گے اور آنے والے انتخابات میں مستری جی کو اس بے انصافی کا سبق ضرور سکھائیں گے۔

دوسرے گروپ نے اس سے بھی اونچی آواز میں اعلان کیا کہ بہت ہو چکی لوٹ۔ آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ ایک ہی آدمی کیوں اس جگہ پر رہے؟ اگر دوبارہ وہاں ان کے آدمی کو ہی رکھا گیا تو آنے والے چناؤ میں مستری جی کا نقصان ہو جائے گا جہاں ان کی برادری کی اکثریت ہے۔

کمرے میں بیٹھے ہر آدمی کو معاملہ سنگین لگا ہے اور اپنی اپنی عادت کے مطابق لوگ تجاویز پیش کرنے لگے۔

ایک تجویز یہ آئی کہ دونوں کو وہیں رکھ دیا جائے اور کرسی کا علاقہ برابر کر دیا جائے۔ ایک آدمی آدھا علاقہ چھوڑے، دوسرا باقی۔ اس تجویز کو پہلے سے تعینات والے گروپ نے ٹھکرا دیا۔

دوسری تجویز آئی کہ چھ مہینے تک بھی پہلے سے مقرر والے گروپ کو رہنے دیا جائے، بیچارے کو کئی لڑکیوں کی شادی کرنی ہے۔ اسے دوسرے گروپ نے نامنظور کر دیا۔ اسے بھی تو وہاں پہنچ پائے تھے۔

یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔ تجویزیں آتی گئیں اور نامنظور ہوتی گئیں۔ منتری جی آنے والے حالات کے اندیشوں میں گھرے کوئی حل تلاش کرنے کی کوشش میں چپ رہے۔ لوگ کرسیوں پر پسر گئے۔ پی اے نے آنے والی انتخابی مہم میں کارآمد ثابت ہونے والے لوگوں کے لیے چائے منگا دی۔ چائے دوسروں نے ٹھکرا دی اور کارآمد لوگوں کے لیے اور چائے آ گئی۔ کچھ لوگ باہر گئے اور ان کی جگہ پر دوسرے لوٹ آئے۔ سب کچھ اسی طرح چل رہا تھا جس طرح راج کاج میں چلنا چاہیے۔

ملاقات اس طرح کی صورت حال کئی مرتبہ جھیل چکے تھے۔ ابھی نہیں معلوم تھی دیر چلے گا۔ انھوں نے سوچا جھپکی لے لیں۔ وہ شاید جانے کتنی دیر تک سونے کا سپنا دیکھتے رہے۔ جیسے ہی انھوں نے دیکھا کہ جس کمرے میں وہ بیٹھے تھے، وہ ایک میدان جنگ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ لوگ بحث کرنے کے لیے صرف منہ ہی نہیں بلکہ ہتھیاروں کا بھی استعمال کر رہے ہیں۔ کوئی کسی کے خاندان کی خواتین کے بارے میں قصیدے پڑھ رہا ہے تو کوئی دوسرے کے جسم پر کرسیاں پھینک کر توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میدان جنگ کے ایک بانکے کو جب کوئی کرسی نہیں ملی تو اس نے ملاقات کی کرسی اٹھانے کی کوشش کی۔ ملاقات نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ کمرہ واقعی اس دھما چوکڑی کی وجہ سے اپنی اصل ہیئت کھو چکا تھا۔ ہر طرف درہم برہم تھی۔ ٹوٹی ہوئی کرسیاں ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہی تھیں۔

ہوا یہ تھا کہ دونوں جانب کے بحث مباحثے سے تنگ آ کر کچھ لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ منتری جی پر اکیلے دونوں گروپوں کا حق نہیں بنتا ہے، انھوں نے بھی انتخابات میں منتری جی کے پسینے پر اپنا خون بہایا ہے۔ اس لیے اگر ان دونوں سے متعلق آج کوئی نتیجہ خیز صورت حال سامنے نہیں آتی ہے تو دونوں جانب کے لوگ انتظار کریں اور بیٹھیں۔ دوسرے لوگوں کے کاغذ پر آ جانے تک منتری جی ان لوگوں کا بھی بھلا کر دیں گے۔

Scanned with CamScanner

ایسے موقعوں پر جو ہو سکتا تھا وہی ہوا۔ دونوں جانب کے جنگجوؤں میں صبح ہوٹل اور احبوں سے دوسرے لوگوں کے خلاف محاذ کھول دیا۔ ان میں سے ایک گروپ پچھلے سات دن سے راجدھانی میں پڑا تھا اور اسے اب جا کے منتری جی سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ دوسرا دس دن سے زیادہ دھوپ میں تپنے کے بعد یہاں تک پہنچا تھا۔ یہ بات دوسری ہے کہ یہ دھول اس گروپ نے شہر کے سب سے عالیشان ہوٹل میں چھانی تھی۔ اس گروپ کے ایک شخص کو چھوڑ کر، جس کی جیب سے اس ہوٹل کا بل ادا ہو رہا تھا باقی دونوں جانب کے لوگوں کو کوئی خاص فکر لاحق نہیں تھی کہ یہ معاملہ اگلے چھ دن تک اور کھنچ جائے، پر ان دونوں کے کمزور پڑتے ہی بل والا انھیں کچھ ایسی چیزیں یاد دلا دیتا جس سے ان کی آوازیں پھر تیز ہو جاتیں۔ دونوں گروپ ڈٹ گئے کہ پہلے ان کا فیصلہ ہو جائے۔ دوسروں کا تقاضا اس پر تھا کہ یہ دونوں چپ چاپ بیٹھ جائیں اور پہلے اور سب کا کام ہو جائے تب ان کی بات کی جائے۔

منتری جی رات کو دورے پر جانے والے تھے اور پھر اگلے کچھ دنوں تک ان کے درشن نہیں ہوتے، اس لیے کوئی بھی اپنے معاملے کو بعد کے لیے نہیں ٹالنا چاہتا تھا۔ بحث کا خاتمہ اس جنگ کے بعد ہو سکتا تھا، اور یہی ہوا۔

مگر اس جنگ کا ایک فائدہ بھی ہوا کملا کانت کو۔ جب آنکھیں کھولیں تو منتری جی اپنے اندر والے دروازے سے نکل کر کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

منتری جی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی نہ جانے کہاں سے ان کا چپراسی، اسٹینو وغیرہ آ کر موجود ہو گئے۔ انھوں نے کرسیاں ٹھیک کر دیں۔ لوگ پھر ان پر بیٹھ گئے اور ان کے ہاتھوں میں پھر کاغذ لہرانے لگے۔

کملا کانت نے ایک کرسی جھپٹ لی جس پر بیٹھا آدمی ہاتھ میں اپنا کاغذ لے کر کھڑا ہو گیا تھا اور یہ منتری جی کے ٹھیک پہلو میں تھی۔ کھڑے آدمی کو لگا کہ ابھی نمبر دیر میں آئے گا، اس لیے وہ واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی پر نہیں، کملا کانت کی گود میں بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر اس امید میں بڑبڑاتا رہا کہ کملا کانت کرسی چھوڑ کر اٹھ جائیں گے، پر بے شرمی کی اس لڑائی میں کملا کانت جیت گئے۔ وہ آدمی اٹھ کر میز پر پوری طرح جھک گیا اور تب تک جھکا رہا جب تک اس کا کاغذ منتری جی کے ہاتھ سے پی اے تک نہیں چلا گیا۔ پھر وہ پی اے کی طرف چلا گیا۔

اس درمیان دونوں جنگی بیڑے پھر سے اپنے پرانے اعدادات دہرانے لگے جن کے مطابق پچھلے انتخابات میں انھوں نے منتری جی کے لیے پناخوں پیسہ ایک کر دیا تھا، پر اس مرتبہ لگتا ہے منتری جی ان کے علاقے میں نہیں گھس پائیں گے۔ ٹھیک ہے، اب ملاقات الیکشن میں ہوگی۔ انھوں نے دربار سے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو، مگر اپنی کرسی پر جمے بیٹھے رہے۔

منتری جی دوسروں کے کاغذات پر دستخط کرتے رہے اور دونوں جنگجو گروپوں کو ہنسانے کے لیے لطیفے سناتے رہے جس پر ان کے پی اے اور چپراسی تو خوب ہنسے مگر لڑنے والوں نے ہنسنے سے انکار کر دیا۔ آخر میں منتری جی نے اپنے پی اے کے کان میں کچھ کہا، جس پر اس نے اپنے پیروکاروں کے کانوں میں کچھ کہا، پیروکاروں نے اپنے ساتھ آنے والوں کے کانوں میں کچھ کہا، پھر دونوں گروپوں کے ایک ایک آدمی نے منتری کے کان میں کچھ کہا اور پھر منتری نے اپنے پی اے کے کان میں کچھ کہا۔ کافی دیر تک وہ صورت حال جاری رہی جسے زبان کے سیدھے سادے کانا پھوسی کہتے ہیں۔ اس دوران لوگ اپنے کاغذ بھی بڑھاتے رہے، اور منتری جی ان درخواستوں پر دستخط بھی کرتے رہے۔ ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا کہ کانا پھوسی کرتے ہوئے منتری جی نے درخواست دہندہ کے ہاتھ پر دستخط کرا دیے۔ پھر دونوں میں سے ایک اور منتری جی نے اس کے کاغذ پر بھی دستخط کر دیے۔

کانا پھوسی ہمارے ملک کی قومی روایت ہے۔ پارلیمنٹ سے لے کر ڈیوڑھی تک اس کی خوبصورتی دکھائی دیتی ہے۔ کانا پھوسی شروع ہوئی اور کملا کانت نے اطمینان کا سانس لیا۔ انھیں لگا کہ اب معاملہ طے ہو گیا ہے اور انھیں کچھ کہنے کا موقع مل جائے گا۔ معاملہ سچ مچ طے ہونے کے کگار پر تھا۔ منتری کا پی اے دونوں گروپ کے لوگوں کو اندر ایک کمرے میں لے کر چلا گیا۔

کملا کانت کچھ مایوس ہو گئے۔ دراصل اندر کے کمرے میں وہ جانا چاہتے تھے۔ اندر کا کمرہ چھوٹا تھا، پر بڑے فیصلے وہیں ہوتے تھے۔

منتری جی تیزی سے کاغذوں کا نپٹارا کرنے لگے۔ کملا کانت سمجھ گئے کہ وہ اب اندر کمرے میں جانے کے لیے اٹھیں گے۔ وقت کم تھا اور "مت چوکو چوہان" کی طرز پر انھوں نے کچھ تیر چھوڑے۔ یہ تیر منھ، انگلیوں اور آنکھوں کی مدد سے کچھ اس طرح چھوڑے گئے کہ وہ تجریدی آرٹ کے نمونوں کے لیے ایک پُراسرار ماڈل پیش کر سکتے تھے۔ تھوڑا کہا، زیادہ سمجھنا ورنی بار منھ سے

Scanned with CamScanner

کچھ نہ کہنا، صرف آنکھوں اور انگلیوں سے مطلب ادا کر دینا۔ منتری جی اور کمل کانت کے درمیان جو گفتگو ہوئی اگر اس کی تعریف ممکن ہے تو اسی طرح کی جائے گی۔ ایک دوسرے سے ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر بیٹھے دونوں فریقوں کی بات چیت کچھ اس طرح تھی:

کمل کانت نے کاغذوں پر دستخط کرتے ہوئے منتری جی کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے جو کچھ دیواروں سے کہا، اس کا مطلب سمجھنے والوں کے لیے صاف تھا، کہ خادم آپ سے الگ نہیں ہے۔ جیسا حکم دیں گے، تعمیل ہوگی۔

منتری جی نے سامنے پڑے کاغذ پر، آرڈر سے کچھ زیادہ سب لکھا اور وہی تاثر قائم رکھا جو کمل کانت کے کمرے میں داخلے، دوران کی موجودگی کو نظر انداز کرنے والا تھا۔ انھوں نے قلم چلاتے چلاتے ہوئے ہمیں نہ جانے کسے مخاطب کیا کہ پچھلے انتخابات میں اطلاع دینے کے باوجود ووٹ انھیں نہیں دیے اور اب درشن دے رہے ہیں۔

کمل کانت نے سمجھا معصوم دشمنوں کو کوسا جنھوں نے بار بار کوشش کے باوجود انھیں منتری جی سے ملنے نہیں دیا تھا اور منتری جی کی سیوا کی بے پناہ خواہش اپنے دل میں لیے ہوئے ہر بار انھیں واپس لوٹنا پڑا تھا۔

کمل کانت نے انڈین ریلویز اور روڈ ویز کے ٹائم ٹیبلوں کو پڑھنا شروع کر دیا۔ انھوں نے بتایا کہ فلاں دن جب فلاں ٹرین سے وہ منتری جی کی کوٹھی کے لیے روانہ ہوئے تو ٹرین اپنی عادت کے مطابق کتنے گھنٹے لیٹ تھی اور ان کے پہنچنے کے دس منٹ پہلے منتری جی اپنی کوٹھی سے انتخابی مہم والے علاقے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ منتری جی کے چہرے پر کوئی تاثر نہ دیکھ کر انھوں نے پھر بتانا شروع کیا کہ فلاں تاریخ فلاں شخص کے ساتھ وہ روڈ ویز کی بس سے وقت پر گھر سے روانہ ہوئے لیکن جیسا کہ منتری جی جانتے ہیں کہ روڈ ویز کی کوئی بس راستے میں بغیر مسافروں کے دھکا لگائے منزل پر نہیں پہنچتی، یہ بس بھی راستے میں ایک بار پنکچر ہوئی، ایک بار اس کا بریک فیل ہوا اور ایک بار ایسی پوزیشن میں پہنچ گئی جسے منتری جی چاہیں تو الٹنا کہہ سکتے ہیں۔ ان مراحل سے گزر کر جب وہ ان کی کوٹھی پر پہنچے تو وہ صرف چار منٹ پہلے ہوائی اڈے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔

اس عمر بھری داستاں کی تفصیلات کے باوجود ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اگلے کاغذ پر اور لب

Scanned with CamScanner

آواز نکلنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ زبان کے تحت الجھاؤ میں ڈوبے ہوئے تھے اور ایک بار بھی سر اٹھا کر کملا کانت کی طرف دیکھا تو ان کی زبان، ادب کا ستیاناس ہو جائے گا۔

کرسی پر منتری جی کے پچھلے حصے نے کچھ ایسی حرکتیں کیں کہ کملا کانت سمجھ گئے کہ شاید اب وہ اٹھنے ہی والے ہیں۔ کمرے میں موجود لوگوں میں بھی ہل چل مچ گئی۔ وہ سارے گھومنے والی کرسی کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔

وقت کم تھا۔ کملا کانت نے اب منہ کے ساتھ ہاتھوں اور انگلیوں کا بھی استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ابلاغ کا یہ طریقہ زبان کی حدوں کو توڑنے کے لیے ہوتا ہے۔ ادب میں ابھی تک اس کا استعمال نہیں ہو سکا ہے، اس لیے بار بار ابلاغ کے مسئلے کی بات ہوتی رہتی ہے۔

کملا کانت نے کہنیاں مضبوطی کے ساتھ منتری جی کے سامنے میز پر ٹکائیں۔ اپنے منہ کو گول گھمایا، آنکھوں میں خاص طرح کی چمک پیدا کی اور اپنی انگلیوں کو ایک دوسری پر اس طرح رگڑا کہ اس سے سکوں کے کھنکنے کی آواز آنے لگی۔ ان ساری علامتوں کے ساتھ انھوں نے زبان و ادب کا ایک اور جملہ استعمال کیا: "میں آپ سے الگ تھوڑے ہوں۔ جو حکم دیں گے، تعمیل ہوگی۔"

جس وقت یہ جملہ کہا گیا، منتری جی کے سر، کندھوں، ہاتھ، سامنے کی میز اور کرسیوں پر ہر طرف لوگ لدے ہوئے تھے۔ وہ ایک ساتھ بول رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مختلف رنگوں، شکلوں اور جھنڈیوں جیسے کاغذ لہرا رہے تھے۔ اس مچھلی بازار میں لوگوں کی بھیڑ کے بیچ میں اتنی مضبوطی سے اپنی جگہ بناتے ہوئے کہ ان کی کہنی پر ٹکے سر میں موجود آنکھیں سامنے بیٹھے منتری جی کی آنکھوں سے مکالمہ کر سکیں، ان کی انگلیاں اس طرح کی حرکت کرتی رہیں کہ منتری جی کی آنکھوں کو کسی بینک میں نوٹ گننے کا دھوکا ہو سکے اور گول گول گھومتے ہوئے ہونٹوں سے نکلا جملہ شور شرابے اور شور کے بیچ بھی آواز پیدا کر سکے کہ سامنے والا سن بھی لے اور اس سے ناطہ ہونے کا دھوکا بھی پیدا کر سکے۔ انھوں نے جو آخری جملہ کہا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منتری جی نے اپنے پی اے کے کانوں میں کچھ کہا۔ پی اے کملا کانت کی طرف بڑھا، پر تب تک کملا کانت چھوٹے کمرے کی طرف بڑھ چلے تھے۔ جب وہ چھوٹے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اندر بیٹھنے کے لیے جگہ تجویز کر رہے تھے، تب پی اے نے ان کے کان میں کہا کہ وہ اس کمرے میں بیٹھ جائیں، جسے کملا کانت نے بڑی کوششوں سے منظور

Scanned with CamScanner

کرلیا اور جواب میں پی اے کے کان میں کچھ ایسا کہا کہ وہ خوش ہو گیا۔ مسکراتا ہوا پی اے واپس گیا اور کمال کانت نے ایک صوفے پر آٹھویں آدمی کے طور پر اپنا وجود ٹکایا۔ وہ انڈین ریلویز کی اس فلاسفی پر یقین رکھتے تھے جس کے مطابق کسی سیٹ کو اگر آپ اپنی پیٹھ سے کھسکا دیں تو وہ کھنچ کر اتنی بڑی ہو جاتی ہے کہ آپ اس پر بیٹھ بھی سکتے ہیں۔

کمرے میں پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگ دونوں جنگجو گروپوں کے تھے۔ ساری تلخیاں ختم ہو گئی تھیں اور وہ لوگ ہنس ہنس کر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ دراصل پورے کمرے میں صرف دو ہی لوگ تناؤ کی صورت حال سے دوچار تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے تبادلے ہونے والے تھے اور جن کی بنا پر تھوڑی دیر پہلے مارا ماری ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ جو لوگ تھے، وہ مست تھے۔ مستی ان کے چہروں سے پان کی پیک یا منہ سے کھٹی ڈکاروں کی شکل میں نکل رہی تھی۔ وہ پچھلے کچھ دنوں سے اس تناؤ میں مبتلا دو لوگوں کو چر رہے تھے اور مست تھے۔ دراصل وہ ایک ایسی مخلوق تھے جن کا جنم ہی دوسروں کی سیوا کے لیے ہوتا ہے۔ سال بھر طرح طرح کے دکھیارے ان کی پناہ میں آتے رہتے ہیں، جن میں کسی کو تبادلہ کروانا ہوتا ہے، کسی کو تبادلہ رکوانا ہوتا ہے، کسی کا لائسنس یا پرمٹ اٹکا پڑا ہوتا ہے، تو کسی کو کسی مقدمے میں مدد چاہیے ہوتی ہے۔ وہ ان تمام دکھیاروں کا دکھ درد دور کرتے ہیں اور مست رہتے ہیں۔

یہ مست لوگ ایک ہی پیشے سے وابستہ تھے، اس لیے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ وہ کئی بار ایک ساتھ کسی معاملے کی پیروی کے لیے اس چھوٹے کمرے میں بیٹھے تھے۔ دراصل وہ ان وکیلوں کی طرح تھے جو الگ الگ مقدموں میں ایک دوسرے کے خلاف یا ساتھ کھڑے ہوتے ہیں اور پھر باہر کچہری کی کینٹین میں ساتھ ساتھ چائے پیتے ہیں اور گپیں لڑاتے ہیں۔ مست لوگ ایک دوسرے سے مذاق کرنے لگے اور قہقہے لگانے لگے۔

مست لوگوں کی مستی سے ان کے دونوں موکل دکھی ہو گئے۔ جب کوئی قہقہہ لگتا، وہ لوگ گھبرا کر اپنے پیروکاروں کو دیکھتے۔ انہیں لگتا کہ قہقہوں کی جھیل میں ان کے پیسے اور امیدیں ڈوبتی جا رہی ہیں۔

کمال کانت اس وقت تک آرام سے اپنے صوفے پر بیٹھنے کی جگہ بنا چکے تھے مگر انہیں اچانک لگا

کہ یہ جگہ میرے بیٹھنے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اگرچہ کمرہ چھوٹا تھا مگر اس میں بھی سب سے آخر میں بیٹھنا مناسب نہیں تھا۔ انھیں کسی نہ کسی طرح منتری جی کے پاس والے صوفے پر جگہ چاہیے تھی۔

کمرہ واقعی چھوٹا تھا۔ ایک چھوٹا سا دیوان منتری جی کے لیے دیوار سے بالکل قریب رکھا گیا تھا۔ اس کے سامنے ایک سنٹر ٹیبل تھی اور ٹیبل کے دونوں طرف ایک لمبا صوفہ رکھا تھا۔ اس صوفے پر آرام سے تین تین لوگ بیٹھ سکتے تھے، پر جس صوفے پر کملا کانت بیٹھے تھے، اس پر آٹھ لوگ بیٹھ چکے تھے۔ سامنے والے پر بھی سات لوگ تھے۔ کمرے میں آنے پر پتا چلا کہ ان دو جنجھوؤں کے علاوہ اور بھی کئی لوگ تھے جن کے فیصلے اس چھوٹے کمرے میں ہو سکتے تھے اور وہ پہلے سے وہاں تھے۔

کملا کانت کو محسوس ہوا کہ منتری جی کے آنے سے پہلے انھیں دیوان کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔ وہ اٹھے اور باہر آ گئے۔

باہر کملا کانت کو منتری جی کا چپراسی دکھائی دے گیا۔ وہ کملا کانت کو جانتا تھا اور کملا کانت اسے جانتے تھے۔ کملا کانت نے تپاک سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کے بال بچوں کا حال چال پوچھا۔ ہر ہندوستانی کی طرح اس نے بھی اپنے خاندان کی ذمے داری بھگوان پر ڈال رکھی تھی۔ اس نے اس سے اوپر کی طرف نظر اٹھا دی۔ کملا کانت نے دونوں لڑکوں کے لیے مٹھائی کھانے کو سو روپے کے نوٹ دیے۔ اس نے نوٹ اطمینان سے اپنی اچکن کی جیب میں رکھتے ہوئے یہ معلومات فراہم کی کہ اس کے تین لڑکے ہیں۔ کملا کانت نے اسے بتایا کہ بچے تو بھگوان کی دین ہوتے ہیں اور اس بات کی شکایت بھی کی کہ اس نے تیسرے بیٹے کے جنم کے بارے میں پچھلی ملاقات پر نہیں بتایا تھا۔ چپراسی نے بتایا کہ پچھلی ملاقات پر، جو تین سال پہلے ہوئی تھی، وہ کملا کانت کو انھیں بتایا تو تھا کہ اس کی بیوی امید سے ہے۔ کملا کانت نے اپنی یادداشت کمزور ہونے کی شکایت کی اور ایک سو کا نوٹ نکال کر چپراسی کو تھما دیا۔ چپراسی نے اپنے منہ سے میرے بیٹے کے لیے بھی مٹھائی خریدنے کی حامی بھری اور پیسے جیب میں رکھ لیے۔

اس کے بعد چپراسی نے جو کمال دکھایا، اسے دیکھ کر یوں بھی شرط لگا سکتا تھا کہ سیکریٹریٹ میں آنے کے پہلے وہ ضرور کسی سرکس میں کام کرتا رہا ہوگا۔ اس نے اس ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے کمرے

Scanned with CamScanner

میں منتری جی کے دیوان کے ٹھیک پہلو میں ایک کرسی رکھ دی۔ اس کی وجہ سے یہ ضرور ہوا کہ اس سے دو لوگوں کے پیروں کی انگلیاں کچل دیں۔ ایک نے کرسی کی مضبوطی کی جانچ کی اور تھوڑی دیر تک ہوا میں اس طرح لہراتا رہا کہ یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کسرت دکھا کر کمرے میں بیٹھے لوگوں کا انٹرٹین کر رہا ہے یا پھر صوفوں کے اوپر بیٹھے کچھ لوگوں کو ان کے نیچے دھکیل کر وہاں کچھ جگہ بنانا چاہتا ہے۔

کرسی نصب کرنے سے زیادہ مشکل تھا اس پر کملا کانت کو نصب کرنا۔ کرسی جیسے ہی رکھی گئی، اس پر بیٹھنے کے لیے دو لوگ لپکے۔ کملا کانت پیچھے رہ گئے اور آگے بیٹھے ہوئے ایک صاحب اس پر بیٹھ گئے۔ کملا کانت نے بے بسی کے انداز میں چپراسی کو دیکھا۔ اس کی جیب میں مٹھائی کے لیے پڑے تین نوٹ کچھ اس طرح پھڑپھڑائے کہ چپراسی کی زبان پر سرسوتی کا واس ہو گیا۔ چپراسی نے اس شخص کو غلیظ گالیاں دیں۔ اس کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص دو ہی جملوں کی مار سے سہم کر واپس صوفے پر آ گیا۔ وہ منتری جی کے حلقے میں ضرور تھا مگر چپراسی تو سیکریٹریٹ کی عمارت کا اٹوٹ انگ تھا۔ جب منتری جی نہیں تھے تب بھی وہ یہیں تھا اور جب منتری جی نہیں رہیں گے تب بھی وہ یہیں رہے گا۔

کملا کانت نے کرسی پر بیٹھ کر ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ منتری جی نے چپراسی سے کرسی حاصل کرانے میں جتنا سمے لیا اس سے ان کا رتبہ بڑھ گیا تھا۔ کمرے میں بیٹھی ہوئی آنکھیں، رشک، تعریف و حسد کے ملے جلے جذبات سے دیکھ رہی تھیں۔ کملا کانت کو لگا کہ یہ سب حقیر لوگ ہیں جن سے آنکھیں ملانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لیے وہ سامنے والی دیوار کو گھورنے لگے اور ان کا دماغ ایک الگ طریقے کا موڈ کھوجنے میں غرق ہو گیا۔

کمرہ کسی پارسی تھیٹر کا منظر پیش کر رہا تھا جس میں کردار خود کلامی والے اصول کے مطابق زور زور سے اور حقیقت نگاری کی تشکیل کی امید پر زور زور سے بول بول کر کہہ رہے ہوں کہ بولنے والے کے علاوہ اسٹیج پر موجود کوئی کردار نہیں سن رہا ہے۔ کمرے میں گھسے ہوئے لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے، زور زور سے بول رہے تھے اور الگ الگ موضوعات پر بول رہے تھے۔ ایک دوسرے کو کاٹتی اور اچھلتی ہوئی یہ آوازیں، دیواروں سے ٹکراتیں، صوفوں پر رینگتیں، زمین پر چت پڑ جاتیں اور ان کانوں تک پہنچ ہی جاتیں جن کے لیے وہ بولی گئی ہوتیں۔ اس پورے ماحول میں صرف کملا کانت مایوس، بے تعلقی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ بھیڑ میں ان کا کوئی پیروکار نہیں تھا اس لیے شخص وہاں

Scanned with CamScanner

جیسے سبھی لوگ اونگھتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی گفتگو پر دھیان دینا بھی اوچھا پن تھا، اس لیے وہ صرف سامنے تکتے رہتے اور گفتگو میں صرف انھی امور کو سمیٹتے رہے جس میں مستری جی کے آنے والے چند نوٹ تک راجدھانی اور اس کے باہر کے اوروں کی خبریں پوشیدہ تھیں۔

کمرے میں مستری جی داخل ہوئے اور جیسا کہ ہوتا تھا ہوا، آوازیں دم توڑ گئیں۔ لوگ کھڑے ہو گئے۔ اس کمرے کے متعلق تفصیلات بیان کرتے وقت یہ کہا جاتا کہ اس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ اس میں مستری جی نہ صرف داخل ہو گئے بلکہ بغیر ہاتھوں پر اٹھائے، اپنے پاؤں سے چل کر دیوان تک پہنچ بھی گئے اور بیٹھ گئے۔

"ہاں... بتائیے!"

یہ مستری جی کا تکیہ کلام تھا۔ انھیں جاننے والے جانتے تھے کہ اس کا کوئی مطلب نہیں ہے، اس لیے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔

مستری جی نے دیوان پر پڑے تولیے کے ٹکڑے سے اپنے چہرے سے کسی تصوراتی چیز کو پونچھنا شروع کر دیا۔ کمرے میں بیٹھے لوگوں میں سے کچھ کھانسے کھنکارے، کچھ نے اپنے جسم کے بچے حصوں کو ہلا کر اطمینان کیا کہ ہوا میں لٹکے ہوئے نہیں ہیں اور فرنیچر یا کمرے میں آنے والی کسی چیز پر ٹکے ہوئے ہیں۔ جن کے کام تھے، انھوں نے بیچارگی سے اپنے منشی یا کارندوں کی طرف دیکھا اور کئی طرح طرح کے اشاروں سے بولنے پر اکسانے کی کوشش کی۔ مستری جی نے تولیہ واپس دیوان پر رکھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر کہا:

"ہاں... تو بتائیے"

کسی نے کچھ نہیں بتایا۔

تھوڑی دیر تک کمرہ بے معنی باتوں سے گونجتا رہا۔ لوگوں نے مستری جی کو علاقے میں بارش کے بارے میں بتایا، سڑکوں کی مرمت میں ہونے والی تاخیر پر اپنے غصے کا اظہار کیا، فصل کے دام کے متعلق اپنی اپنی معلومات پر تبادلہ خیال کیا۔ مستری جی دلچسپی سے سنتے رہے اور بیچ بیچ گفتگو میں اپنی شرکت پر زور دیتے ہوئے چھوٹے ٹکڑے لگاتے رہے۔

سبھی جانتے تھے کہ مستری جی دنیا کی تمام چیزوں میں بغیر دلچسپی کے دلچسپی دکھا سکتے تھے۔

Scanned with CamScanner

مستری جی بھی جانتے تھے کہ لوگ یہاں بارش، فصل، کیڑوں یا سڑکوں پر باتیں کرنے نہیں آئے تھے۔ وہ بیچ بیچ ٹیپ کی طرح کہتے رہے:

"اور بتائیے... صاحب!"

کسی نے کچھ نہیں بتایا اور یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ کوئی بھی پہلے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ سب کو امید تھی کہ دوسرے چلے جائیں گے اور صرف وہ رہ جائیں گے تب اپنی بات کہنے کا موقع انھیں ملے گا اور وہ اپنی بات کہیں گے۔

طے تھا کہ ایک وقت آسانی سے نہیں آنے والا تھا۔

مستری جی نے بائیں جانب بیٹھے شخص کو دیکھا اور مسکرائے۔ مستری جی کے دائیں بیٹھے اور سامنے بیٹھے لوگوں کے لیے بھی یہی عمل دہرایا۔ انھیں بھی "کوئی ادھار نہیں رکھنا چاہیے" کے اصول کے مطابق اپنے دانت دکھا دیے۔ پھر مستری جی نے کملا کانت ورما کی طرف دیکھا۔ کملا کانت پہلے ہی مسکرا دیے، اس لیے مستری جی نہیں مسکرائے۔ وہ اٹھے اور اس چھوٹے کمرے سے بھی چھوٹے ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ یہ چھوٹا کمرہ اس چھوٹے کمرے کا اٹیچڈ باتھ روم تھا اور نئے آرکیٹیکچر کی طرح اہم کمرے کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔

مستری جی نے جاتے جاتے اپنے جسم کے نہ جانے کس حصے سے کون سا اشارہ کیا کہ ان کے پیچھے پیچھے کملا کانت بھی اٹھ کر دوسرے اور چھوٹے کمرے میں چلے گئے۔

دراصل اس کھیل میں بولنے سے زیادہ اشاروں کی اہمیت تھی۔ کملا کانت پرانے کھلاڑی تھے اس لیے وہ ایک ساتھ سامنے والے کے ہاتھ، ناک، آنکھ، کان، زبان سب پر نظر رکھتے تھے۔ مستری جی نے اٹھتے وقت اپنے سر کو جیسے جھٹکا اور پھر ہوا میں لہرایا، اسے صرف کملا کانت ہی سمجھ سکتے تھے۔

اندر واش بیسن اور کموڈ کے بعد جو جگہ بچی تھی، وہ بس اتنی تھی کہ اس میں کملا کانت اور مستری جی ایک دوسرے سے لگ کر جسم سمیٹ کر کھڑے ہو سکیں۔ سامنے کے واش بیسن پر لگے شیشے میں ان کے چہرے کچھ بگڑے ہوئے سے نظر آ رہے تھے۔ اس کمرے میں بھی وہ دونوں ڈیل کر رہے تھے، اس لیے کملا کانت بیچ بیچ میں آئینے میں دیکھ کر لگتا کہ ان کے علاوہ بھی کمرے میں کوئی ہے۔

Scanned with CamScanner

تھوڑی دیر کے لیے سہم جاتے مگر مستری جی کے لیے یہ کمرہ پرانا گوشۂ گفتگو تھا، اس لیے وہ بڑے آرام سے بات کر رہے تھے۔

دونوں مذاکرات کاروں کے درمیان جملے انتہائی مختصر اور سرگوشی کے ساتھ ادا ہو رہے تھے۔ کثر ایک ہی جملے کو بار بار دہرایا جاتا۔

''میں آپ سے باہر تھوڑے ہی ہوں۔ جو حکم دیں گے، ہو جائے گا۔''

''کبھی جو موقعے پر غائب ہو جائے اس کا کیا بھروسا؟''

''جو حکم دیں گے، ہو جائے گا۔''

''پر موقعے پر غائب ہو گئے۔''

''میں آپ سے باہر تھوڑے ہوں۔ جو حکم...''

تھوڑی دیر میں چھوٹا غسل خانہ بازارِ اسٹاک ایکسچینج میں تبدیل ہو گیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بولیاں اونچی آواز کی جگہ نیچی آواز میں لگ رہی تھیں:

''پچیس۔''

''نو۔''

''پچیس۔''

''میں آپ سے باہر تھوڑے ہوں... چلیں دس..''

''بائیس۔''

''جو حکم دیں گے، بعد میں کر دیں گے... دس، اس بار۔''

''اس بار حکم... بیس سے کم نہیں۔''

ایک آواز جوشیلی ہو کر ڈانٹ رہی تھی، دوسری عاجزی سے گڑگڑا رہی تھی۔

دونوں آوازیں ایک دوسرے کو تول رہی تھیں، پرکھ رہی تھیں، اور دکانداری کے اصولوں کے مطابق بیسٹ بارگین کرنا چاہ رہی تھیں۔

اچانک جوشیلی آواز نے اپنے ہاتھ کو کچھ اس طرح سے جھٹکا جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس نے اپنے اوپر سے مکھی اڑائی ہے اور یہ بھی کہ گڑگڑاتی ہوئی آواز اب دفع ہو جائے۔

Scanned with CamScanner

کملا کانت نے مان لیا کہ کوئی مکھی اڑائی گئی ہے۔

"بارہ کر دیں سر۔ اگلی بار جو حکم دیں گے ہو جائے گا۔"

"بیس سے ایک کم نہیں۔"

مستری جی نے اس بار دکانداری کا وہ داؤ کھیلا جس سے کملا کانت یک دم چت ہوتے ہوتے بچ گئے۔ انھوں نے پیروں اور دھڑ کو اس طرح ہلایا کہ وہ اب چلنے والے ہیں۔ دکانداری کا پرانا اصول دہرایا گیا کہ دینا ہو تو لو ورنہ ہم دکان بڑھاتے ہیں۔ کمرے میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ مستری جی کچھ کر سکتے مگر ان کے قدم کچھ یوں ڈگمگائے جس سے کچھ ایسا لگا کہ وہ کموڈ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کا ہاتھ بھی اپنے پاجامے کے ازار بند کی طرف جانے لگا تو کملا کانت گھبرا گئے۔ انھیں لگا کہ مستری جی کہیں کموڈ پر بیٹھ نہ جائیں۔ انھوں نے گھبرا کر مستری جی کو تقریباً گھسیٹ لیا۔

"ایک موقع اور دیں سر۔ آپ سے الگ تھوڑے ہی ہوں... بارہ کر دیں... پھر آگے اور دیکھ لیں گے..."

"اٹھارہ سے کم نہیں۔ نہیں دینا ہے تو..."

مستری جی پھر کموڈ کی طرف چلے۔

"چلو سر آپ کی بھی بات رہ جائے اور میرے بچوں کے پیٹ پر بھی لات نہ پڑے... پندرہ کر دیتے ہیں۔"

"آپ بھی بجنس صاحب، بنیوں کی طرح بات کرتے ہیں۔ چلیے سولہ ٹھیک ہے۔ اس کے بعد تو موقع پر آپ دکھائی نہیں دیں گے۔"

"نہیں نہیں... آپ بھی سر مذاق کرتے ہیں۔ آپ سے الگ کب رہا ہوں میں۔ وہ تو..."

کملا کانت نے ایک بار پھر انڈین ریلویز اور روڈویز کو کوسنا شروع کر دیا جنھوں نے پچھلی مرتبہ چاہتے ہوئے بھی انھیں مستری جی کی سیوا کا موقع نہیں دیا تھا۔ پر مستری جی نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں روک دیا۔

کملا کانت نے سودے کی دوسری شرائط بھی، مثلاً انھیں کب تک تیار کرنے کا آرڈر مل جائے

Scanned with CamScanner

کام کے بدلے میں طے شدہ رقم کہاں پہنچائی ہوگی، یہ بھی طے کرنے کی کوشش کی مگر مستری جی کو دیر ہو رہی تھی۔ باہر بیٹھے ہوؤں کو طرح طرح کی باتیں بنانے کا موقع مل رہا تھا، اس لیے وہ کملا کانت سے یہ کہہ کر کہ وہ شام کو ان کی کوٹھی پر آئیں گے، دفتر کی صدر ڈیوڑھی کی طرف بڑھ گئے۔

کملا کانت سیدھے سر اٹھائے چھوٹے کمرے سے باہر نکل آئے۔ انھیں اس طرح مستری جی کے پیچھے اندر جاتے پھر باہر آتے ہوئے دیکھ کر بیٹھے ہوئے لوگوں نے حسد سے دیکھا۔ ان میں سے کچھ نے انھیں بڑی عزت سے نمسکار بھی کیا، مگر کملا کانت بغیر دائیں بائیں دیکھے باہر آگئے۔

باہر چپراسی کھڑا تھا۔ کملا کانت نے اس مرتبہ پھر اسے دونوں لڑکوں کی پڑھائی کے لیے دس دس کے نوٹ دیے۔ چپراسی نے یاد دلاتے ہوئے پھر بتایا کہ اس کا ایک لڑکا اور بھی ہے۔ کملا کانت نے پھر جیب میں ہاتھ ڈالا، پر اس درمیان بات چیت میں چپراسی نے انکشاف کیا کہ رات میں صاحب کی کوٹھی پر اس کی ڈیوٹی نہیں ہے۔ کملا کانت نے جیب سے ہاتھ نکال لیا۔ وہ کچھ بڑبڑائے، جس کا صاف مطلب چپراسی نے یہ نکالا کہ وہ پرلے درجے کا مورکھ ہے، اگر کچھ دیر بعد یعنی رات کی ڈیوٹی کے بارے میں بتاتا تو کملا کانت اس کے تیسرے لڑکے کی مٹھائی کے پیسے نہ مارتے۔

چپراسی سے نپٹنے کے بعد کملا کانت نے پی اے کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ پی اے برابر کے کمرے میں آج ملے ہوئے کاغذوں کی چھٹائی کر رہا تھا اور انھیں الگ الگ فائلوں میں لگاتا جاتا تھا۔ اس کے ارد گرد چھوٹی سی بھیڑ تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے کاغذوں پر مستری جی نے آرڈر تو جاری کر دیے تھے مگر انھیں یقین نہیں تھا کہ کاغذ اپنی منزل تک پہنچیں گے۔ وہ پی اے سے کہہ کر اپنے کاغذوں کو لفافوں میں رکھوا رہے تھے اور ان پر لکھے گئے پتوں کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لے رہے تھے کہ لفافے صحیح منزل پر پہنچ جائیں گے۔

کملا کانت بھیڑ میں ایک ایسی جگہ کھڑے ہو گئے جہاں سے پی اے کے سر اٹھانے پر ان کی آنکھ سے آنکھ مل سکتی تھی۔

پی اے نے کاغذوں کو نپٹاتے ہوئے سر اٹھایا اور اس کی آنکھیں کملا کانت کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ آنکھوں کا آپس میں نہ جانے کن مکالموں کا تبادلہ ہوا کہ پی اے نے ایک دم سے

Scanned with CamScanner

ہڑبڑاہٹ دکھاتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ آدھا اٹھتے اٹھتے وہ واپس کرسی پر گر گیا۔ پر اس کی ہڑبڑاہٹ نے لوگوں کو احساس دلا دیا کہ کملا کانت کوئی اہم شخصیت ہیں۔ بھیڑ نے تھوڑی جگہ بنا دی اور کرسیوں پر بیٹھے لوگوں میں سے ایک کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھیں سر۔"

کملا کانت بیٹھ گئے۔

"دیکھ رہے ہیں سر، دم مارنے کی فرصت نہیں۔"

"بھئی، سرکار تو آپ لوگوں کے بل پر چل رہی ہے۔ منسٹر لوگوں کے پاس کہاں وقت ہے..."

کملا کانت نے پچھلے کئی سالوں سے مختلف پی اے لوگوں کے سامنے کہے گئے جملوں کو پھر سے دہرایا۔ ہر پی اے کی طرح یہ پی اے بھی خوش ہو گیا۔

"ارے... نہیں سر۔ ہم تو خادم ہیں۔ جو حکم ہوتا ہے بجا لاتے ہیں۔"

اس جملے کی مذمت میں کئی آوازیں ابھریں۔ جتنے لوگ اپنے کاغذوں کے انتظار میں کھڑے تھے، سب نے یک آواز ہو کر اعلان کیا کہ سرکار تو پی اے صاحب ہی چلا رہے ہیں۔ منتری جی تو سیدھے سادھے آدمی ہیں، ان سے کسی کاغذ پر لکھوا لو۔ لکھا ہوا ہوتا تبھی ہے، جب پی اے صاحب چاہتے ہیں۔

پی اے نے بہ مشکل کچھ کہنے کی کوشش کی، پر ایک معمر شخص نے اسے جھڑک دیا۔ جب اس نے کہا تو پی اے نے مانا کہ واقعی سرکار چلانے میں اس کا بھی بڑا کنٹری بیوشن ہے۔

بات چیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ پی اے کی انگلیاں کچھ اور تیزی سے چلنے لگیں۔

"بس سر... تھوڑے سے کاغذ رہ گئے ہیں۔"

"نہیں نہیں... آپ آرام سے نپٹا لیجیے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔"

کملا کانت آرام سے کرسی پر پسر گئے۔ انہیں پتا تھا کہ انہیں جلدی ہو بھی تو کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کمرے میں موجود زیادہ تر لوگ منتری جی کے انتخابی حلقے سے تھے۔ پی اے انہیں چھوڑ کر کملا کانت سے باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ اطمینان سے باتیں کرنے کے لیے بھیڑ کا چھٹنا بھی ضروری تھا۔

Scanned with CamScanner

تھوڑی دیر میں صاف ظاہر ہو گیا کہ مجمع آخر تک نہیں چھٹنے والا۔ جتنے لوگ جاتے تھے، اس سے زیادہ اس میں جڑتے جا رہے تھے۔

اچانک پی اے اٹھا اور کمرے کے ایک کونے میں چلا گیا۔ اس نے آواز دے کر مجمع میں سے ایک آدمی کو اپنے پاس بلا لیا۔ کملا کانت سمجھ گئے کہ اب انھیں بات کرنے میں آسانی ہوگی۔

دراصل پی اے نے لوگوں کو نپٹانے کے گر منتری جی سے ہی سیکھے تھے۔ اس نے کسی کو ایک کونے میں نپٹایا، کسی کو دوسرے کونے میں لے گیا۔ کوئی دروازے پر کھڑا کھڑا نپٹ گیا، کسی کو اس کی کرسی سے نہیں اٹھنے دیا گیا اور وہیں اس کا کام تمام کر دیا گیا۔ پی اے اس وقت دربار ہوٹل کے کسی ویٹر کی طرح گشت کر رہا تھا۔ کمرہ ہلدی گھاٹی یا پانی پت جیسا کوئی میدان تھا اور اس کے ہاتھ، کان، ناک اور آنکھیں ہتھیاروں کی طرح چل رہی تھیں۔

اسی دھما چوکڑی میں کملا کانت کو بھی موقع مل گیا۔

وہ دونوں تھوڑی دیر کے لیے ایک کونے میں غائب ہو گئے۔

کملا کانت نے ایسے موقع کے لیے ایک لفافہ پہلے سے جیب میں تیار کر رکھا تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے اسی کو نکالا اور پی اے کی آنکھ بچا کر اس کی اوپری جیب میں اسے سرکا دیا۔ انھوں نے پی اے کو بتایا کہ وہ عمر میں ان سے چھوٹا ہے اور یہ ان کا حق بنتا ہے کہ اس کی بیوی کو جو کملا کانت کی بہو ہوئی، دیوالی پر ساڑی پہنائیں۔ چونکہ وہ جلدی میں ساڑی لانا بھول گئے اور عورتوں کو اپنی پسند کی ساڑی خریدنے کا موقع دینا چاہیے اس لیے وہ ساڑی کی قیمت دے رہے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ لفافہ سیدھے بہو کے ہاتھ میں پہنچ جانا چاہیے۔ پی اے نے بھی بتایا کہ اس کی بیوی کئی بار کہہ چکی ہے کہ بھائی صاحب بہت دنوں سے گھر نہیں آئے۔ اس بار میں تو خود ان کو گھر آنے کو کہا۔ اس کا بہت ارمان ہے کہ وہ انھیں اپنے ہاتھ کی گرم گرم پکوڑیاں کھلائے۔ کملا کانت نے وعدہ کیا کہ اگلی بار راجدھانی آئے تو ضرور اس کے گھر آئیں گے اور بہو کے ہاتھ کی گرم گرم پکوڑیاں بھی کھائیں گے۔

کملا کانت نے بتایا کہ منتری جی سے تو بات ہو گئی ہے، پر اب آرڈر کرانا تو پی اے کے ہی ہاتھ میں ہے۔ شام کو وہ منتری جی کی کوٹھی پہنچ رہے ہیں۔ پی اے سے معذرت کی کوشش ہو تو اسے

کسی ضروری کام سے کسی اور جگہ جانا ہے۔ کملا کانت کو اچانک کچھ یاد آیا۔ انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا۔ ان کی بیوی کو پی اے کے لڑکے کی شرارتیں خوب یاد تھیں۔ انھوں نے بچے کے لیے سوپ خریدنے کو کہا تھا، پر کملا کانت کو وقت نہیں ملا، اس لیے اس کی قیمت لفافے میں رکھ کر لے آئے تھے۔ پی اے نے لفافہ جیب میں رکھتے ہوئے بتایا کہ لڑکا بھی آنٹی کو کتنا یاد کرتا ہے۔ بہرحال، کملا کانت جی کا مسئلہ ہے تو پی اے اپنا ضروری کام چھوڑ کر بھی منتری جی کی کوٹھی پر پہنچ جائے گا۔ منتری جی رات دس بجے والی گاڑی سے باہر جا رہے ہیں، اس لیے کملا کانت آٹھ بجے تک کوٹھی پر آجائیں۔ پی اے وہیں ملے گا۔

اس کے بعد سیکریٹریٹ نام کی اس عمارت میں کرنے کے لیے کچھ نہیں بچا۔ وہ باہر نکل آئے۔ باہر بجلی کے کھمبے اور بڑے درخت کے نیچے مٹیالی رنگ کی پتلون، ہری قمیص اور کالا چشمہ میں کھڑے شخص نے انھیں دیکھ کر ایک پیلے رنگ کے رومال سے اپنا منھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ وہ اس گندے رومال سے یہ حرکت نہ بھی کرتا تب بھی کملا کانت وہیں جاتے، پر چونکہ ملے جلے ہوتی اور رنگ برنگے جھنڈے والا شخص بچپن میں جاسوسی فلموں کا بہت شوقین تھا، اس لیے اس نے پوری سنجیدگی سے لائن کلیئر کا اشارہ دیا۔

"بور تو نہیں ہوئے رائے صاحب! منتری جی نے..."

"شش... شش..." کملا کانت رائے نے دھیرے سے انگلی ہونٹوں پر رکھی اور ایک طرف کو بڑھ گئے۔ اس بار اس کی گردن میں ایک بھورے رنگ کا رومال تھا۔ اشارہ صاف تھا۔ چپے چپے پر دشمن کے آدمی بکھرے ہوئے تھے، اس لیے وہاں بات کرنا ٹھیک نہیں تھا۔

کملا کانت نے دائیں، بائیں منظر نامے کا جائزہ لیا۔ بجلی کے درخت کے نیچے کھانے پینے کی اشیا پر تبادلۂ خیال کے ذریعے قومی یکجہتی جیسے اہم موضوع پر سیمینار ہو رہا تھا۔ چھولے بھٹورے، ڈبل روٹی اور ریوڑی گجک سے لے کر فروٹ سلاد جیسی ملک کے مختلف حصوں میں پائی جانے والی ڈشیں وہاں اس گھنے درخت کے سائے تلے سرو ہو رہی تھیں۔ قومی ثقافتی سرمایہ یعنی مکھیاں، دھول اور پیڑ پر بیٹھے پرندوں کی بیٹ ان کھانے کی اشیا میں وافر مقدار میں تھیں۔ ان سارے پکوانوں کو بھکوسنے کے لیے بابو، چپراسی، دلال اور فقیر جھوک میں تھے اور پیچھے کے لیے گندگی اور منافع خوری جن کی زندگی کا واحد

Scanned with CamScanner

متعدد ہو سکتے وہ مدار تھے۔ ان میں دشمن کے جاسوس کون ہیں، یہ جاننا کملا کانت کے لیے تھوڑا مشکل تھا، وہ یہ ضرور جان گئے کہ ان میں سے دشمن کے جاسوس کون نہیں ہیں۔ وہ یوں کہ سامنے ایک آدمی اس طرح اخبار پڑھ رہا تھا کہ اس کا آدھا چہرہ چھپا رہے۔ اس نے انھیں دیکھ کر اخبار اپنی ناک تک چڑھا لیا۔ کملا کانت سمجھ گئے کہ اخبار پڑھنے والا آدمی دھورو لال یادو ہے۔

معاملہ کافی پر اسرار تھا۔ آگے آگے جھورا رومال گردن میں ڈالے للن رائے، ان سے دس قدم پیچھے کملا کانت ورمن، ان سے دس قدم پیچھے دھورو لال یادو۔ تقریباً پچیس گز آگے جا کر پلیٹ فارم کے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے للن رائے ایک گلی میں مڑ گیا۔ جس جگہ گلی ختم ہوتی تھی، وہاں کی دیواروں پر بڑی فراغت کے ساتھ چھوٹے باتھ روم کی حاجت پوری کی۔ وہاں سے آگے جانے کی گنجائش نہیں تھی، اس لیے للن رائے کھڑے ہو گئے۔ دھیرے دھیرے کملا کانت اور دھورو لال بھی قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ للن رائے نے جھورا رومال جیب میں ڈالا، کالا چشمہ آنکھوں سے اتار کر جیب میں رکھا اور بڑبڑاتے ہوئے دو تین جملے کہے۔ ان جملوں کے مطابق اس مرتبہ بڑے شاطر دشمن سے پالا پڑا ہے۔ چپے چپے پر چھپے ان کے آدمی ان پر نگاہیں رکھے ہوئے ہیں۔ دشمن کا کوئی ایجنٹ یہاں پر بھی پیشاب کرنے آ سکتا ہے اور انھیں فوراً اس علاقے سے نکل بھاگنا چاہیے اور ریلوے اسٹیشن کے گیٹ نمبر تین پر ملنا چاہیے۔ اس کے بعد للن رائے واپس مڑے اور تیز قدموں سے واپس چل دیے۔ اب ان کا چشمہ ان کی آنکھوں پر تھا اور گردن پر نیلا رومال آ گیا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے باقی دونوں بھی گلی سے نکل بھاگے۔

اسٹیشن کی چائے کی دکان پر للن رائے اور دھورو لال نے جو خبریں دیں، ان میں سے کچھ کملا کانت کے لیے حیران کن تھیں اور کچھ تشویشناک۔ پہلی خبر یہ تھی کہ اپنے کیمپ کا ایک سپاہی پالا بدل کر دشمن کے پالے میں چلا گیا ہے۔ رضوان الحق نے پہلے دن ہی رگھو چرن کو شکل سے خراب سمجھا تھا اور دوسرے دن دفتر کھلنے سے پہلے ہی رگھو چرن اسے لے کر بلوک چند کے یہاں گیا تھا۔

"جانے دو سالے کو..." کملا کانت نے کہا۔ "ایک بار تبادلہ ہو کر بعد مرغ مسلم لے کر ادھر آ جائے گا۔"

Scanned with CamScanner

دوسری خبر اچھی تھی۔ ان دونوں نے منتری کے پی اے کو شک سے گھر کا پتا معلوم کر لیا تھا۔

کمل کانت نے اتنی اہم تحقیق پر سلن رائے کی پیٹھ ٹھونکی۔ پھر انھوں نے انھیں بتایا کہ کس طرح سے منتری جی کی آنکھیں انھیں دیکھتے ہی بھر آئیں اور کتنی دیر تک وہ ان کا ہاتھ تھامے بیٹھے رہے۔ جب انھوں نے کہا کہ ورما جی، آپ کا تبادلہ تو دھوکے میں ہو گیا۔ بدمعاش بلوک چند نے مجھ سے جھوٹ بول کر فائل پر دستخط کروا لیا تو ان کی آنکھیں ٹپ ٹپ چونے لگیں۔ منتری جی تو اسی وقت تبادلہ روکنے کا آرڈر ٹائپ کرا رہے تھے، پر وہ تو ٹائپ رائٹر میں کچھ گڑبڑی آ گئی۔ آج رات منتری جی نے کوٹھی پر بلایا ہے، وہیں آرڈر کی کاپی مل جائے گی۔

"تب تو گرو جی، ہو جائے آج..." سلن رائے نے کلکاری ماری۔ خبر نے انھیں گرو گمبھیر جاسوس سے ویسی دوبارہ صحافی بنا دیا۔ ان کی خواہش تھی کہ جب قلعہ فتح ہو ہی گیا ہے تو پھر جشن بھی لگے ہاتھوں منا لیا جائے۔ وہ احمد حانی میں اس طرح کے کاموں کے سلسلے میں آتے رہتے تھے، اس لیے یہ بھی جانتے تھے کہ کس سطح پر جشن کہاں منایا جاتا ہے۔ انھوں نے دو تین ہوٹلوں کا نام لیا مگر کمل کانت نے ان کی حوصلہ شکنی کی۔ منتری جی آج ہی دورے پر نکل جائیں گے، اس لیے انھیں فوراً ان کی کوٹھی پر پہنچنا تھا۔

سلن رائے اور دھوروال یادو بھی حکم نامے کی ترقی کے منظر کے چشم دید گواہ بننا چاہتے تھے مگر کمل کانت کی رائے تھی کہ دشمن بڑا چوکنا ہے، پورے شہر میں اس کے ایجنٹ بکھرے ہوئے ہیں۔ ضروری تھا کہ سلن رائے اور دھوروال جیسے سمجھے ہوئے جاسوس شہر کا چکر لگاتے ہوئے ہوٹل پہنچیں۔ وہ بادرست منتری جی کی کوٹھی جا رہے ہیں۔ وہاں سے آرڈر لے کر ہوٹل آ جائیں گے۔

اس کے بعد سلن رائے نے کالا چشمہ آنکھوں پر چڑھا لیا، اپنے رنگ برنگے رومالوں کو تہ کر کے جیب میں رکھا اور ایک رکشے پر بیٹھ گئے۔ دھوروال یادو نے بھی ایک اخبار خریدا اور دوسرے رکشے پر بیٹھ کر اسے الٹا پڑھنے لگے۔ جیسا کہ طے تھا، کمل کانت ورما نے منتری جی کی کوٹھی کے لیے ایک تیسرا رکشا طے کر لیا۔

کمل کانت منتری جی کی کوٹھی پر جب پہنچے تو وہاں صرف اتنے لوگ تھے کہ آسانی سے اسے ویران کہا جا سکتا تھا۔ دراصل اس کوٹھی کی رونق یا ویرانی سے ہی پتا چلتا تھا کہ منتری جی کوٹھی میں

ملاقاتیں دینے یا کہیں دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ ایجنٹوں، ملاقاتیوں اور کام کرنے والوں کی ایک بھیڑ تھی، جو منتری جی کے کوٹھی میں داخل ہوتے ہی نہ جانے کہاں سے پانچ سات منٹ کے اندر ہی نمودار ہو جاتی تھی۔ اسی طرح منتری جی کا کوٹھی کے باہر نکلتے ہی یہ بھیڑ پھر یکا یک کسی تہ خانے میں سما جاتی۔ کوٹھی سونی پڑی تھی۔ اس کا مطلب، منتری جی ابھی نہیں آئے ہیں۔

گیٹ پر ایک سنتری اکتاہٹ اپنے چہرے پر لیے کھڑا تھا۔ اسے پار کرنے کے بعد ایک مالی پھلواری میں کام کرتا دکھائی دیا۔ دن بھر کی تھکن کے بعد وہ کہیں بیٹھ کر سستانا چاہتے تھے۔ برآمدے میں کچھ کرسیاں پڑی تھیں، وہ ادھر ہی بڑھ گئے۔

کرسی پر ایک چپراسی نیم خوابی کی حالت میں پڑا تھا۔ اس نے آنکھیں آدھی کھول کر کملا کانت کی طرف دیکھا۔ کملا کانت نے بھی بے پروائی دکھاتے ہوئے اسے تاڑا۔ آدمی کام کا نہیں، اس لیے انھوں نے اس سے باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی اور دل ہی دل میں خوش ہوئے کہ ان کی اندر کی جیب میں پڑے لفافوں میں ایک کم ہونے سے بچ گیا۔

یہ ایک بڑی سی کوٹھی تھی جس میں بہت سارے کمرے تھے۔ بہت بڑا لان تھا، پیچھے ڈھیر سارے سرونٹ کوارٹرز تھے۔ لوگوں کو اس کی طاقت کا احساس تھا اس لیے وہ چھوٹے بڑے گروہوں میں اس کے گلیاروں، برآمدوں اور کمروں میں آہستگی سے باتیں کرتے تھے۔ یہاں تمباکو کھانے پر کوئی پابندی تو نہیں تھی لیکن تمباکو تبھی کھا سکتے تھے جب کوٹھی کا مالک تمباکو کھاتا تھا۔ زیادہ تر اہم فیصلے یہیں ہوتے تھے اس لیے سمجھدار لوگ سگریٹ نہیں جلاتے تھے۔ وہ صرف منتری جی کے موڈ، موجودگی، غیر موجودگی، دوستوں دشمنوں کی وہاں موجودگی جیسی باتوں کا پتا لگاتے رہتے تھے اور صحیح وقت پر صحیح چوٹ کرنے کے ارادے سے یہاں فوراً نمودار ہوتے۔

اس کوٹھی میں رہنے والے بدلتے رہتے تھے۔ کئی مرتبہ یہ تبدیلی بڑی جلدی جلدی ہوتی تھی اور کئی بار برسوں برس تک ایک ہی شخص اس میں رہتا چلا جاتا۔ ہر تبدیلی کے ساتھ کوٹھی کے پردے، فرنیچر وغیرہ بدل جاتے۔ جیسے ہی یہ شخص اس کوٹھی میں رہنے کے لیے آتا، وہاں پہلے رہنے والوں کے جمالیاتی شعور، چیزوں کے انتخاب پر ناک بھوں چڑھاتا۔ سرکار کا ایک ڈپارٹمنٹ ان کوٹھیوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس کا بڑا افسر ہنس کر رہنے والے کو بتاتا کہ کوٹھی کے قالین، فرنیچر، پردے اسی کی

پسند اور حیثیت سے بہت کمتر درجے کے ہیں؛ کوٹھی کو فوراً نئے سامان کی ضرورت ہے۔ کوٹھی کا نیا مالک فوراً اس سے اتفاق کرتا۔ محکمے کے دو سے دو افسر نئے مالک کی بیوی کو بازار لے جاتے اور اس کی پسند کے صوفے اور قالین خریدے جاتے۔ پردوں کے کپڑے اور صوفوں کے کور درزی کو سلنے کو دیے جاتے۔

اس پوری کارروائی کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ آنے والے چند دنوں تک اخباروں میں چھپتا رہتا کہ فلاں منتری نے اپنی کوٹھی اور دفتر کی سجاوٹ پر عوام کی گاڑھی محنت کی کتنے لاکھ کمائی کو بے دردی سے خرچ کیا۔ یہ معلومات بھی انھیں دیکھ بھال کرنے والے محکمے سے ہی ملتی تھی۔ بہت سے لوگوں کو تو نئے شخص کے آنے کی خبر بھی اسی خبر سے ملتی۔ یہ خبریں اتنے تواتر سے چھپتیں کہ محکمہ موسمیات کے بلیٹن کی طرح انھیں بھی لوگ سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے۔

فرنیچر کے ساتھ کوٹھیوں کے چپراسی، پی اے بھی نئے مالکوں کے ساتھ بدل جاتے۔ صبح ہونے والی بھیڑ کی بولی اور لطیفوں کو سن کر بتایا جا سکتا تھا کہ کوٹھی میں رہنے والا کس علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ کچھ معاملوں میں جمہوریت نے یکسانیت بھی پیدا کر دی تھی۔ مثلاً ہر علاقے کا دلال کرتا پاجامہ پہنے ہوتا تھا، ہر محکمے کا افسر قمیض پتلون پہنتا تھا اور ہر علاقے کا کسان مڑا تڑا کرتا اور پھٹی بنیائن پہنتا تھا اور منتری کے سامنے اپنی درخواست رکھتے وقت ہکلاتا تھا۔

اس کوٹھی میں رہنے والا بھوجپوری علاقے کا تھا، اس لیے ہر تیسرا آدمی کھینی ملتا ہوا دکھائی دے جاتا تھا۔ کمل کانت کے بازو میں بیٹھے چپراسی نے اپنی ہتھیلی پر رگڑ کر کھینی لی اور دوسرے ہاتھ سے بجانے کے انداز میں، بے آواز، ہاتھ کو ہتھیلی پر مارا تو ہوا میں تیرتے ہوئے تمباکو کے ذرات نے انھیں ایک دم چوکنا کر دیا۔ چپراسی نے رگڑنے کے بعد اپنا دایاں ہاتھ ان کے سامنے بڑھا دیا۔ کمل کانت گھبرائے کہ کہیں انھیں لینا نہ پڑے۔ انھوں نے جھٹ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور تب تک سوتے رہے جب تک انھیں یہ یقین نہیں ہو گیا کہ چپراسی نے پوری کھینی دانتوں کے بیچ دبا لی ہوگی۔ ایک بار وہ پھنس چکے تھے۔ ان کے محکمے کے ایک پرانے منتری جی کھینی کھانے کے اتنے شوقین تھے کہ ان کا پی اے ہر دس پندرہ منٹ کے بعد کھینی بنا کر لاتا اور ان کے سامنے پیش کرتا۔ وہ پھر وہاں موجود ہر شخص کے سامنے کھینی بڑھا دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی مرد کھینی نہیں کھا سکتا تو اس کی

Scanned with CamScanner

مرد تھی پرفنکار۔ ایسے مردوں کے بارے میں ان کے پاس بہت سارے لطیفے تھے جنھیں وہ خوب مَل کر سنایا کرتے تھے۔ ان لطیفوں پر سب سے زیادہ کھینی نہ کھانے والوں کو ہنسنا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ کملا کانت کا کام اتنا رُکا کہ انھوں نے بھی کھینی کھالی۔ کام تو ہو گیا، پر کافی دیر تک وہ ان مستری جی کے لطیفے سن کر روتے رہے۔ ان کا سر چکراتا رہا اور اپنے اوپر پوری طرح سے قابو رکھنے کی کوشش کرتے کرتے آخر میں وہ بھی مستری جی اور ان کے چمچوں کی طرح شاندار قیمتی سرکاری قالین پر تھو تھو کر کے تھوکنے لگے۔

بہرحال خطرہ ٹل چکا تھا، اس لیے کملا کانت نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ بے دلی سے اس چپراسی کو دیکھتے رہے جو کھینی منہ میں دبا کر پھر اونگھنے لگا تھا۔ اچانک انھوں نے دیکھا کہ چپراسی کی مونچھوں کا بایاں حصہ کچھ پھڑپھڑایا۔ پھر داہنے حصے نے بھی ویسی ہی حرکت کی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور تیز تیز سانس لیں۔ جنگل میں جیسے جانور ہوا سونگھ کر آنے والی آفت کا پتا لگا لیتے ہیں، کچھ کچھ ویسا ہی ردعمل تھا اس کا۔ اس نے سست، کاہل اور نیند میں ڈوبے چوپائے کی طرح اپنا جسم توڑا اور ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔

کملا کانت سمجھ گئے مستری جی آنے والے ہیں۔

چپراسی کی طرح دوسرے لوگوں کے بھی ردعمل ہوئے۔

سنتری اچانک چوکنا ہو گیا اور کسی تصوراتی گائے کو ہانکنے لگا۔

مالی نے ایک دم سے لان میں گھاس، پتوں وغیرہ کی تلاش شروع کر دی اور یہ پکا ارادہ کیا کہ آج وہ انھیں کھود کر ہی دم لے گا، چاہے آدھی رات ہی کیوں نہ ہو جائے۔

کوٹھی کے کیمپس میں نہ جانے کہاں سے بھیڑ نظر آنے لگی۔

کملا کانت بھی برآمدے سے نکل کر لان میں آ گئے اور ایسی جگہ پر کھڑے ہو گئے جہاں مستری جی کی نظر کار سے اترتے ہی سیدھی ان پر پڑے۔

اس کوٹھی کے لیے یہ عام بات تھی۔ لوگ ہوا سونگھ کر بتا سکتے تھے کہ مستری جی کب جانے والے ہیں، کب آنے والے ہیں۔ پورے شہر میں پھیلے ہوئے دلالوں اور درخواست گزاروں کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ اب مستری جی کوٹھی پہنچ رہے ہیں۔ ان کے پہنچنے کے چند منٹ پہلے ایک [illegible]

Scanned with CamScanner

اس سے چند قدم پہلے رکتے۔ پھر پچھڑ گئے اور چھوٹے دلال اور ملاقاتی اترتے۔ مدعا قائم رکھنے کا کرایہ چکاتے اور دلال چپکتے ہوئے گیٹ کے اندر چلے جاتے۔ کچھ دو کاریں آتیں۔ بڑے دلال منتری کو ڈیٹ پر کار روانہ اندر لے جانے کی کوشش کرتے۔ جن کے رعب میں منتری آ جاتا، وہ اندر کار سمیت چلے جاتے اور جن کے رعب میں منتری نہ آتا، وہ کار سڑک پر آڑی ترچھی کھڑی کر کے اندر بھاگتے۔ انھیں صرف یہ دیکھنا ہوتا کہ کار اس طرح کھڑی کی جائے کہ سڑک پر آنے والے ٹریفک میں ضرور رکاوٹ پڑے۔

اس پورے منظر نامے میں رفتار کی بڑی اہمیت تھی۔ لوگ بھاگتے ہوئے آتے اور اندر گھس جاتے۔ دھیمی رفتار والے رکشوں سے اترتے، رکشے ان کے حوصلے پست نہ ہو جائیں، یہ سوچ کر وہ اپنی رفتار تیز کرتے۔ جس کا کام ہوتا، اسے چھوڑ کر دوڑتے ہوئے اندر چلے جاتے۔ جس کا کام ہوتا، وہ بھی آٹھ ہزار جیسے رکشے والے کو تھما، اندر بھاگتا۔ اندر کے لوگ ان سے بھاگ کر ملاقاتیوں سے کمرے میں جاتے، پھر وہاں سے بھاگ کر گیٹ پر آ جاتے۔ لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر ملک کو ترقی کرنی ہے تو تیز رفتاری ضروری ہے

اس درمیان چار سفید کاریں، ریڈ لائٹ جلاتی بجاتی تیز رفتاری سے گیٹ پر پہنچتی۔ منتری تیزی سے گیٹ کھولتے اور کار اسی تیز رفتاری سے اندر گھستی۔ پورٹیکو میں پہنچ کر ڈرائیور زور سے بریک مارتا اور سب سمجھ جاتے تھے کہ منتری جی آ گئے ہیں۔ ایک چپراسی کود کر اگلی سیٹ سے اترتا اور پیچھے کا دروازہ کھولتا، ادب سے کھڑا ہو جاتا۔ منتری جی بھی تیزی کے ساتھ اتر کر اندر کی طرف چلتے۔ اگر کوئی پردیسی، جو اس ماحول سے پوری طرح ناواقف ہو، اس منظر کو دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ ملک کے سامنے کوئی بہت ہی سنگین صورت حال پیدا ہو گئی ہے اور اندر کوئی ہنگامی اجلاس منعقد ہونے والا ہے جس میں اگر منتری جی بروقت نہ پہنچے تو کوئی اہم فیصلہ بیچ ادھر میں اٹک جائے گا۔

یہ بات اور ہے کہ اس پردیسی کو حیرت ہوتی جب وہ یہ دیکھتا کہ اتنی تیز رفتاری سے آنے کے بعد منتری جی بڑی تمکنت سے بیچوں بیچ صوفے پر پالتھی مار کر بیٹھ گئے ہیں اور آرام سے دو گلاس خس پانی پینے کے بعد وہ تیوں ان چمچوں سے گھرے ہوئے، بغیر کسی ہڑبڑاہٹ کے تبادلوں، کوٹوں، پرمٹوں اور ٹھیکوں کی درخواستوں پر احکامات جاری کر رہے ہیں۔

آج بھی یہی ہوا۔ جیسے ہی منتری جی کی کار پورٹیکو میں رکی وہ جھپٹتے ہوئے چپراسی نے دروازہ کھولا۔ ملاکانت نے اپنے آپ کو ایک ایسی جگہ مرکوز کرنے کی کوشش کی جہاں سے منتری جی کو اترتے ہی سیدھے وہ دکھائی دے جائیں، پر ان کی یہ چھوٹی سی خواہش پوری ہونے سے پہلے روند دی گئی۔ روندنے والے پاؤں ان کے ارد گرد ہی کھڑے تھے۔ پر کار رکتے ہی وہ سب لپک کر اس کے چاروں طرف اس طرح کھڑے ہو گئے کہ منتری جی کی تیزی کو برقرار رکھنے کے لیے ان کے ہی قدموں کو دھکم دھکا کرنا پڑا۔

منتری جی کو یہ دھینگا مشتی پسند تھی۔ اگر کسی دن ان کی کار رکنے پر بھیڑ ان کے کار کے دروازے پر دھینگا مشتی نہ کرتی تو وہ اداس ہو جاتے۔ انھیں لگتا کہ ان کے جانے کے دن قریب آ گئے ہیں۔ ان کے محافظ اس بات سے بخوبی واقف تھے، اس لیے کا دکا لوگوں کو بھی کھینچ کھانچ کر منتری جی کے راستے سے تصوراتی بھیڑ کو ہٹانے کے لیے ہاتھ پیر چلاتے۔

آج بھی منتری جی بھیڑ کے بیچ سے دھکم دھکا کرتے ہوئے اپنی بیٹھک کی طرف بڑھے۔ چالیس پچاس آدمیوں کی بھیڑ میں سے ہر کوئی اپنا چہرہ دکھانے کو بیتاب تھا۔ لوگوں کے ہاتھوں میں درخواستیں لہرا رہی تھیں۔ چند کے ہاتھوں میں ہار بھی تھے۔ کچھ لوگ پیر چھونے کے لیے لپک رہے تھے۔ چپراسیوں اور گن مین نے کچھ لوگوں کا کالر پکڑ کر پیچھے کھینچا، کچھ کو کہنیوں سے رگیدا اور ہاتھوں کا گھیرا بنا کر منتری جی کو برآمدے کی طرف لے چلے۔ سب کچھ اتنا درہم برہم تھا کہ منتری جی خوش ہو گئے اور ایک چوڑی مسکراہٹ ان کے چہرے سے چپک گئی۔

ملاکانت کی سمجھ میں آیا کہ وہاں کھڑے رہنے سے کچھ ہونے والا نہیں تھا، اس لیے وہ بھی گھسٹتے ہوئے بھیڑ کا حصہ بن گئے۔

اندر بیٹھک میں سکریٹریٹ والا ڈراما شروع ہو چکا تھا۔ منتری جی ایک دیوان پر پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ بڑے سے کمرے میں کئی صوفہ سیٹ اور کرسیاں پڑی تھیں۔ لوگوں نے ان کی طاقت کا امتحان لینا شروع کر دیا۔ ہر کرسی کے ہینڈل پر ایک آدمی اور ہتھوں پر دو دو لوگ ٹکے ہوئے تھے۔ صوفوں کے اسپرنگوں سے شاید برسوں کی بری چیخیں اٹھ رہی تھیں اور کئی مرتبہ تو ایسا لگتا تھا کہ کوئی کرسی یا صوفہ دو ٹکڑے ہو کر رہ گیا ہے۔

مستری جی جس دیوان پر بیٹھے تھے، اس کے سامنے کا ایک قالین پوری طرح سے بھر گیا تھا۔ اس پوری بھیڑ کا مقصد ایک ہی تھا — ہوا میں لہراتے ان کے ہاتھ سے لکھے فل اسکیپ کاغذ کسی طرح سے مستری جی کے ہاتھوں تک پہنچانا! مستری جی کا غذ پڑھنے کی کوشش میں اہل میں تو شنی رہی آدمیوں کے درمیان چلا کر بیں آدمی سے مدد کرنا، اور ان سے کاغذ کے حاشیے پر چند لکھوا کر پلٹ کی کوشش میں باہر پہنچانا۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے جب وہاں لوگ جو جدوجہد کر رہے تھے، اسے کسی بھی صف میں شکست کا کرسی کی طرح بھی دیکھا جا سکتا تھا۔

ہوتا یہ تھا کہ جیسے ہی مستری جی کے ہاتھ سے ایک کاغذ سرکتا، سامنے بیٹھے لوگوں میں سے تین چار ایک ساتھ اٹھ کر ان کی طرف لپکتے۔ ان کے علاوہ صوفوں پر بیٹھے لوگوں میں سے کئی کچھ بھی جرأت کرتے۔ بیچ میں بیٹھے کھڑے لوگوں کے ہاتھوں، پیروں، انگلیوں کا جمپ شیٹ فارم کی طرح استعمال کرتے ہوئے وہ جس طرح مستری جی کے سامنے پہنچتے، اسے ہوا میں تیرنے سے کر رسی پر چلنے تک کچھ بھی نام دیا جا سکتا تھا۔

ایک کاغذ مستری جی کے ہاتھوں میں پہنچ جاتا۔ دوسرے کاغذ والے اپنے بائیں جھک کر کھڑے ہو جاتے۔ ایک دو سامنے ہی اکڑوں بیٹھ جاتے۔ آخر یہ طے کرنا مشکل ہوتا کہ کاغذ کس کا ہے۔ اگر مستری جی کا قلم رکھتے ہی کاغذ کا مالک جھپٹ کر نہ جھپٹتا تو زیادہ اندیشہ اس بات کا ہوتا کہ مستری جی سامنے اکڑوں بیٹھے کسی دوسرے آدمی کو کاغذ تھما دیں۔

کما کانت ایسی جگہ کی تلاش میں لگ گئے جہاں کھڑے ہو کر وہ مستری جی سے ان کی آنکھیں ملا سکیں۔ جلد ہی انھیں ایسی جگہ مل بھی گئی۔ وہ خوش ہوئے۔ پر ان کی خوشی اس دنیا کی مانند بے ثبات ثابت ہوئی۔ کسی سخت دل، بے وفا محبوب کی طرح مستری جی کی آنکھیں ان کی آنکھوں سے ٹکرائیں ضرور اور انھوں نے ہر بار ان بیچارے عاشق کی طرح اپنے پورے دانت دکھا دیے مگر ان کی تمام آنکھوں میں جان پہچان اور تعارف کی دھند ایک بار بھی نہیں دکھی۔ وہ غمگین ہو گئے۔ انھیں ہندی فلموں کے ہیرو کی طرح ایک کامیڈین کی سخت ضرورت تھی جو انھیں ہیروئن کے حرم تک لے جائے۔ انھوں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ تلاش بے سود ثابت ہوئی۔ کہاں گیا ان کا کامیڈین؟

وہ دوبارہ برآمدے میں آ گئے۔ جس پی اے کی بیوی بچوں کے لیے اتنے فکرمند تھے، وہ بہت کہیں نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ انھوں نے پوری کوٹھی کا چکر لگایا۔ زیادہ تر لوگ اندر بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ باہر دروازے کے پاس کچھ چپراسی اور سپاہی کھڑے تھے۔ کار میں سامان رکھا جا رہا تھا۔ انھیں یاد آیا کہ مستری جی کو آج رات کہیں باہر جانا ہے۔ وقت بہت کم تھا۔ انھوں نے چاروں طرف دیکھا۔

''اپنے کوشک صاحب کہاں ملیں گے؟''

جس چپراسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انھوں نے پوچھا تھا، اس نے پیک سے زمین پر تھوک دیا۔

کملا کانت گھبرا کر اچھل پڑے۔ یہ وہی چپراسی تھا جس کے بیوی بچوں کا حال انھوں نے نہیں پوچھا تھا۔ انھوں نے اس بری گھڑی کو یاد کیا جب ان کے دل میں ایک خفیف سی بات آئی تھی۔ یہ موقع نہیں تھا جب وہ اس کے بچوں کے بارے میں سوچتے۔ انھوں نے پھر چاروں طرف دیکھا۔ وہ خوش ہو گئے۔ وہ چپراسی بھی وہاں تھا جس کے دو لڑکوں کو مٹھائی کھانے کے لیے کملا کانت نے دن میں سیکریٹریٹ میں دس دس روپے دیے تھے۔ اگرچہ کملا کانت نے اس کے تیسرے لڑکے کے لیے کچھ نہیں دیا تھا پھر بھی آدمی شریف نکلا۔ اس نے ترس کھانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

''کوشک بابو اس پیچھے والے برآمدے میں ہیں۔''

کملا کانت پیچھے کی طرف لپک لیے۔ کوٹھی کچھ اس طرح بنی تھی کہ اس کے چاروں طرف برآمدے تھے۔ برآمدوں کی بھول بھلیوں میں کملا کانت کوشک بابو نامی اس پی اے کو تلاش کر رہے تھے جسے تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے اس ڈرامے میں مڈل مین کا کردار ادا کرنا تھا اور ان کے ٹھہرے ہوئے کام کو پھر سے بنوانا تھا۔ وقت کم تھا اور مستری جی کبھی بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ہوائی اڈے کے لیے گھر سے روانہ ہو سکتے تھے۔

کملا کانت تقریباً دوڑنے لگے۔ برآمدوں میں بھی لوگ کچھ کچھ بھرے ہوئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں ابھی اندر مستری جی کے کمرے میں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ بیچ بیچ میں ان میں سے کچھ اندر جا کر مستری جی کو اپنی صورت دکھا آتے تھے۔ یہ لوگ چار چار پانچ پانچ کے جھنڈ میں کھڑے ہو کر دبی آواز میں کھسر پھسر کر رہے تھے جس میں اگر سرگوشی سے زیادہ آواز نکل پڑتی تو سے

سرگرمی کا نام دیا جا سکتا تھا۔ بہت ڈویژن میں بدلیاں ہو رہی تھیں جس میں منتری جی کو بہت سی اہم مکمل مل سکتا تھا۔ منتری جی نے اپنے سیکریٹری کو کمرے میں بند کر کے اس پر چنچل اٹھا لی تھی، بہت سارے تبادلے تھے جن پر احکامات منتری جی نے جاری کرائے تھے مگر ڈائریکٹوریٹ کی طرف سے اس پر عمل درآمد نہیں ہو رہا تھا؛ منتری جی کے ضلع کا پولیس کپتان ان کے کارکنوں کو جیل میں ڈالنے کی چال چل رہا تھا... وغیرہ۔

کملا کانت کو یہ سب باتیں غیر دلچسپ لگ رہی تھیں۔ دانت کے درد میں تڑپتے مریض کی طرح ان کا دھیان دنیا کی کسی چیز کی طرف نہیں تھا۔ لوگوں سے بچتے ہوئے، انھوں نے اپنے پیسے کو تلاش ہی کر لیا۔

کوشک بابو ایک کمیٹی کے ممبر میں دو لوگوں سے باتیں کر رہے تھے اور ان کی باتیں واقعی سرگرمی کے زمرے میں آتی تھیں۔ کملا کانت تقریباً ان سے سٹ کر کھڑے ہوئے تھے لیکن پتہ نہیں پا رہے تھے۔ کوشک بابو نے انھیں دور سے شور شاید ہوتا تو وہ اب تک ان کے بیچ میں گھس گئے ہوتے۔ کھڑے کھڑے ان کا صبر جواب دے رہا تھا۔ ان لوگوں کی کھسر پھسر ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

”اچھا...“ کوشک بابو نے یہ کہا جیسے کسی نتیجے پر پہنچے ہوں اور پھر کھسر پھسر شروع ہو گئی۔

کملا کانت کو لگ رہا تھا کہ دن بھر کی ان کی محنت پر پانی پھر گیا۔ ایک بار منتری جی نکل گئے تو پھر سے پوری قواعد کرنی پڑے گی۔

بڑی مدت بعد کھڑے لوگوں میں کچھ ہل چل ہوئی۔ کملا کانت بے چین سے ہو گئے۔ ”صاحب نکل رہے ہیں۔“

”ابھی کیسے نکلیں گے؟“ کوشک بابو نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھیں تھوڑا۔

”ہمارا کام ہو گیا ہے؟“ کملا کانت منمنائے۔

”تمہارا کوئی کام نہیں ہوتا۔ جب منتری جی پہنچیں گے تبھی اس کا کام ہو گا۔“

اس کا کوئی جواب کملا کانت کے پاس نہیں تھا۔ وہ تب تک بے یار و مددگار سے کھڑے رہے جب تک سامنے چل رہی سرگوشی اونچی آواز میں ”اچھا... چلتے رہیے... کام ہو جائے گا... بے فکر رہیے۔“ جیسے اطمینان بخش الفاظ میں بدل نہیں گئی۔

"آ گئے! کہاں رہ گئے تھے آپ؟"

کملا کانت نے مسکراتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ شام سے اب تک کیا کر رہے تھے، لیکن ان کے آگے پہنچتے ہوئے کوشک بابو تب تک اس کمرے کے دروازے کے اندر گھس گئے جس میں منتری جی کا دربار اپنے آخری مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔

منتری جی کھڑے ہو گئے تھے اور کمرے میں بھرے لوگوں نے ان کے لیے راستہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ یہ راستہ بنانا اس طرح تھا جس میں ہر آدمی دوسرے کو بغل میں دھکیلتا ہوا خود کو منتری جی کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ اس دھکا پیل میں منتری جی دو قدم آگے ایک قدم پیچھے چل رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ کاغذوں پر دستخط کرنے سے لے کر اپنا پیر چھونے والوں کو آشیرواد دینے تک کا کام کرتے جا رہے تھے۔

کوشک بابو ان تک پہنچ گئے۔ منتری جی نے انھیں دیکھا اور انھیں یاد آیا کہ انھیں جہاز پکڑنا ہے۔

"کوشک جی، آپ میرا جہاز چھڑوائیں گے۔ اب تک کہاں تھے؟"

"نہیں سر، ابھی تو کافی وقت ہے۔ سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا ہے۔"

"بھئی مجھے ہڑبڑاہٹ پسند نہیں ہے۔ بعد میں اخبار والوں کو مسالا ملتا ہے کہ میری وجہ سے جہاز لیٹ ہو گیا۔"

"جہاز عوام کا ہے۔ آپ بھی عوام کا کام کر رہے ہیں۔ تھوڑا انتظار کرے گا تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔"

"نہیں بھئی، مجھے یہ سب پسند نہیں ہے۔ میرے آئیڈیل تو پنڈت نہرو رہے ہیں۔ وقت کی پابندی تو کوئی ان سے سیکھے..."

کوشک کو پتا تھا کہ منتری جی اب کون سا قصہ سنائیں گے۔ منتری جی کے پاس الگ الگ موضوعات پر الگ الگ قصے تھے۔ اس نے اتنا وقت منتری جی کے ساتھ گزارا تھا کہ اگر وہ درمیان میں قصہ بتاتے بتاتے بھول جاتے تو وہ خود قصہ یاد دلا دیتا تھا۔ آج بھی منتری جی بتا رہے تھے کہ کس شہر کی میٹنگ میں انھوں نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا تو انھوں نے گھڑی کی بندھی

پنڈت جی کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ سب نے کسی سے صحیح وقت نہیں پوچھا؛ جیسے ہی پنڈت جی منچ پر چڑھے تھے، ویسے ہی ان کے قدم آگے بڑھے۔ اس اعلان کے ساتھ منتری جی نے اپنی گھڑی ملائی۔

کوشک جھوم جھوم کر یہ قصہ سنتا رہا۔ اس نے صرف تین سو سترہویں بار منتری جی کو یاد دلایا کہ میٹنگ ختم ہونے کے بعد پنڈت جی کو انھوں نے یہ جملہ سنایا تو انھوں نے خوب زور زور سے قہقہے لگائے۔ منتری جی نے تعریفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور زور سے ہنسے۔ ان کے ارد گرد کھڑے خوشامدی، ملاقاتی اور مریدین بھی زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ لوگ بھول گئے کہ منتری جی کو ہوائی جہاز پکڑنا تھا ورنہ انھیں دیر ہو رہی تھی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، پلک جھپکتے ہوا اور اس کھیل کے ماہر جانتے تھے کہ ایسا صرف کوشک ہی کر سکتا تھا اور اسی لیے منتری جی پچھلے تین سالوں سے اسے اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔

منتری جی ملاقاتیوں کے بیچ سے ہو کر اپنی کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ ایک ساتھ مسکراتے، ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے اور فریادیوں کے کاغذوں پر کچھ لکھتے جانے کا کام کرتے جا رہے تھے۔ ان کے محافظ اور چپراسی لوگوں کو دھکا دیتے ہوئے ان کے لیے راستہ بنا رہے تھے۔ اسی درمیان کوشک نے منتری جی کے کان میں کچھ کہا۔ منتری جی چلتے چلتے کچھ بدبدائے جسے کوشک کے علاوہ جن لوگوں نے سنا، انھیں لگا کہ منتری جی اپنے کسی پسندیدہ دیوتا کا جاپ کر رہے ہیں۔ کوشک نے چلتے چلتے ہی کملا کانت کے کانوں میں کچھ کہا اور منتری جی کے کار میں بیٹھتے ہی دروازہ بند کر کے ڈرائیور کی بغل والی سمت کا دروازہ کھول کر کار میں گھس گیا۔

کملا کانت نے کار کے چلنے کا انتظار نہیں کیا۔ وہ بھیڑ کو دھکیلتے دیتے ہوئے باہر نکل آئے۔ کام ہو گیا تھا، پر جب تک آرڈر ہاتھ میں نہ آ جائے، راجدھانی میں کام ہوا نہیں مانا جاتا۔

دوسرے دن صبح صبح کملا کانت کوشک کے گھر پہنچ گئے۔ کوشک ابھی سویا ہوا تھا۔ اس کی بیوی نے دروازہ کھولا۔ اس نے اجنبیت سے انھیں دیکھا اور دروازہ اٹکا کر کھڑی رہی۔ کملا کانت نے "جی... جی..." کرتے ہوئے بتایا کہ وہ تو گھر کے آدمی ہیں۔ کوشک صاحب اگر سو رہے ہیں تو وہ انتظار کر لیں گے۔ دروازے کی آڑ میں کھڑی عورت کے نہ ہٹنے پر انھوں نے کچھ مذاقیہ انداز میں کہا کہ کل بھابی کی سالگرہ کے لیے انھوں نے کوشک کو جو روپے دیے تھے، بھابی آج ہی ان سے ملی

چھوٹی ساڑی لے آتے۔ نہیں تو مردوں کا کیا بھروسا، کہیں اور خرچ کر ڈالیں۔

اس پر عورت کے چہرے پر کچھ تناؤ سا چھا گیا، اور وہ ایک کنارے ہٹ گئی۔ کملا کانت نے تجسس سے اور جو جگہ انھیں خالی دکھائی دی، اس پر اصولوں سے قبضہ کر لیا۔

عورت ایک گلاس پانی لے آئی۔ اس کے چہرے کا تناؤ اب تک ختم ہو گیا تھا۔

"میں تو چائے پیوں گا بھورانی۔"

چہرے پر تناؤ پھر کھنچ گیا۔

"کل غلطی سے میں نے صرف ساڑی کا پیسہ کوشک صاحب کو دیا۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ تمھاری دیدی نے پینٹ کوٹ اور بلاؤز کے لیے جو پیسے دیے تھے، وہ تو میری جیب میں ہی رہ گئے۔"

کملا کانت نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا۔

"رہنے دیجیے بھائی صاحب، یہ انھیں گے تو ناراض ہوں گے۔" عورت نے ایک قدم پیچھے ہٹنے کا ناٹک کیا۔

"ابھی تم مجھے ڈانٹ کھلاؤ گی۔ گھر جا کر تمھاری دیدی سے کیا کہوں گا؟ ساڑی کے پیسے دے آیا اور پینٹ کوٹ اور بلاؤز کوشک بھائی کے ذمے چھوڑ آیا؟ نا بابا... مجھے نہیں کھانی ڈانٹ..." وہ قہقہہ مار کر ہنسے۔

چہرے کا تناؤ ختم ہو گیا تھا۔ عورت نے لفافہ ہاتھ میں تھامتے تھامتے کہا، "آپ مجھے ڈانٹ کھلوائیں گے۔" اور چائے بنانے چلی گئی۔

کملا کانت پھر کھل کر ہنسے اور تب تک ہنستے رہے جب تک ان کی ہنسی کا مقصد پورا نہیں ہو گیا۔ قہقہوں سے کوئی نیند کی جھنجھلاہٹ لیے کوشک اندر کمرے سے ادھر نکل آیا۔

"اٹھ گئے کوشک صاحب؟ رات دیر سے سوئے شاید۔ مستری جی کا چلن سیٹ ہو گیا تھا کیا؟"

کوشک نے اپنے کرتے کی آستین سے آنکھوں کی کیچڑ صاف کی اور ٹھنڈے لہجے سے جو خبر دی اس کے مطابق وہ روز دس بجے کے بعد اٹھتا ہے، مستری جی کا چلن ہی کل رات دیر سے آنا اور سرکاری دفتر دس بجے کے بعد ہی کام کاج شروع کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

"مشری جیر کملا کانت کے لیے تھوڑی تکلیف دہ تھی۔ اسی درمیان کوشک کی بیوی چاے لے کر آ گئی۔ انھوں نے اپنی تکلیف کا اظہار کیے بغیر چاے لے لی اور چہکتے ہوے کہا: "بھئی کوشک صاحب، ہمارے لیے تو جہاں آپ ہیں، وہیں دفتر ہے، اور آپ جب اٹھ گئے تبھی سرکاری کام شروع ہو گیا۔"

کوشک پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بغیر اپنی جھنجھلاہٹ چھپائے آستین سے کیچڑ صاف کرتا رہا اور کملا کانت "سشری کامیابی کی سب سے بڑی سیڑھی ہے" کے اصول کے مطابق چاے سڑکنے کے ساتھ اخبار بھی پڑھنے لگے۔

"میں ابھی فریش ہو کر آتا ہوں،" یہ بتاتے ہوے کوشک اندر چلا گیا۔

اسی بیچ بڑے وزیر کوٹ کے پیسوں کی چمک سے پکوڑیاں بھی بن کر آ گئیں۔

کوشک جب غسل خانے سے نکل کر واپس آیا تو دفتر کے کام شروع کرنے کا وقت ہو گیا تھا۔

"ہاں سر، بتائیں، کیا کرنا ہے... کیسے کرنا ہے؟"

کملا کانت نے کچھ نہیں بتایا۔ انھیں پتا تھا کہ راجدھانی میں بات کی شروعات ایسے ہی ہوتی ہے۔

کوشک نے اخبار کا ایک ورق لے کر اس پر آنکھیں گڑا لیں۔ خبریں دیکھتے دیکھتے اس نے کہا:

"کیسے کرنا ہے... کیا کرنا ہے؟"

"کرنا یہ ہے... کمبھ یک دم سر پہ ہے... سارا کام پچھڑ رہا ہے۔ بعد میں میلے میں کچھ ہو گیا تو آپ لوگ میری گردن پکڑیں گے۔ میرا تبادلہ ہو جائے۔ میں فوراً بھاگوں۔ اب تک تو پانٹون پلوں کا ٹینڈر کھل جانا چاہیے تھا۔ سڑکوں کا کام بھی شروع ہو..."

کوشک نے کمبھ میلے کے کاموں کی فہرست میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ اس نے پھر اخبار میں سر گڑا لیا۔

کملا کانت سمجھ گئے کہ انھوں نے جلد بازی کر دی۔ سوال پوچھا گیا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی ہمسفر سامنے سے گزر رہا ہو۔ انھوں نے بھی اپنی نگاہیں اخبار میں گڑا دیں اور پڑھتے رہے

خبروں کو پھر سے پڑھنے لگے۔

"ہاں تو سر جی، کیا کرنا ہے؟"

اماکانت نے کچھ بھی نہیں بتایا کہ کیا کرنا ہے۔ انھیں اچانک اخبار پڑھی ہوئی خبر بے حد اہم لگنے لگی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے اسے پھر سے پڑھتے گئے۔

"کیا ہو گیا سر؟ کوئی خاص خبر؟"

"نہیں... ایسا کچھ خاص نہیں۔" اماکانت نے اخبار سے سر اٹھایا۔ اب سوال کوشک پر آیا۔

"صاحب سے کچھ بات ہوئی آپ کی؟"

"ہوئی تھی ہوئی، اڈے جاتے وقت مل جائے گا آپ کا آرڈر بھی۔ پریشان کیوں ہیں؟"

"نہیں، پریشانی کچھ نہیں... بس کئی دن ہو گئے راجدھانی میں پڑے پڑے... مجھے ایک دم سر پر آ گیا ہے اور..."

کوشک نے کبھی کا تھا شروع ہوتے ہی آنکھیں موند لیں۔ کچھ شروع ہوتے ہی سب اور بھی تم جانتے ہیں تنخواہیں شروع ہوئیں، پانی کا ٹینڈر ہی نکلا یا میلے کے علاقے میں بجلی بھی تم نہیں شروع ہوئی تو آگے کام کیسے ہو گا... یہ ساری باتیں وہ کچھ چوتھی بار بھی راج بھاشا اور اماکانت کے منھ سے اور دس بار کوشک جیسے جوانوں کے منھ سے سن چکا۔ اماکانت بھول جاتے تو وہ یاد دلاتا کہ ابھی چھتیس گڑھ کی طرف کی زمین کو ہموار کرنے کا کام بھی شروع نہیں ہوا۔ ہماری ممبر وزیروں سے آنے والی گاڑیاں پارک میں ہو گئی؟ پر اماکانت انھیں بھولے۔ انھیں اور بھی بہت سی چیزیں یاد تھیں لیکن کوشک کا صبر ٹوٹنے لگا۔ وہ اب سیدھی بات پر آ گیا: "صاحب نے راستے میں کہا تھا کہ آپ سے سیکریٹریٹ میں بات ہوئی ہے۔ مجھے آپ سے بتائیں کہ کیا بات طے ہوئی ہے؟"

اماکانت نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ سب کچھ طے نہ کر رہے ہے۔

"بات یہ ہے کوشک صاحب... میں نے تو کہہ دیا، ہم آپ سے بات کر چکے ہیں، جو طے ہوگا وہ ہو جائے گا۔"

"آپ کو یاد کا کون سمجھتے... آپ تو جانتے ہیں۔ مجھے جھارکھنڈ میں ابھی..."

بھی ہم تو آپ کو پناہی ماتے سمجھتے رہے۔" کوشک مستری جی کی غیر موجودگی میں ہمیشہ "ہم" کہتا تھا جس سے سامنے والا اسے اور مستری جی کو ایک جان ہی سمجھے۔

کملا کانت نے چونک کر دیکھا۔ کمبخت میں وصف سے باتیں کر رہا ہے۔ کل دن میں تو اس موضوع پر بات ہو چکی تھی۔ کچھ اور بڑھانے کا ارادہ ہے کیا؟ انھوں نے ایک مرتبہ پھر تفصیل سے ناردرن ریلویز اور روڈویز کے ٹائم ٹیبل کے بے معنی پن پر روشنی ڈالنی شروع کردی۔ جب وقت کی پابندی نہیں کرنی تو چھاپتے کیوں ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ کس طرح وہ ہر بار مستری جی کو چند منٹوں کے فرق سے مس کرتے رہے۔ ایک بار تو پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ انتخابی حلقے میں جا کر ہی مستری جی کے چرن کملوں پر عقیدت کے پھول نچھاور کر آئیں لیکن وہ تو واقف کو کال ہو گیا۔ انھوں نے تو کہا تھی کہ آپ ہو آئیے، مستری جی گاڑھے وقت میں کتنا کام آتے ہیں، نہیں جائیں گے تو دشمنوں کو کہنے کا موقع مل جائے گا کہ جب کام پڑا تو منھ چھپانے لگے، لیکن میں نے ہی سوچا کہ ایسی حالت میں واقف کو چھوڑ کر جانے میں کچھ الٹا سیدھا ہو گیا تو کسے منھ دکھائیں گے۔ اور پھر مستری جی کو اگر پتا چل گیا کہ ان حالات میں آئے ہیں تو ضرور ڈانٹیں گے۔

کوشک کو چونک کا کر کمرے میں مکھیاں زیادہ ہو گئی ہیں۔ وہ اخبار کو مگس کش کی طرح استعمال کرتے ہوئے ان کا قلع قمع کرنے لگا۔ کملا کانت جب یہ تفصیلات بیان کر رہے تھے کہ کیسے ایک بار کڑی دھوپ میں وہ مستری جی کے بنگلے پر پہنچے اور یہ معلوم ہوا کہ وہ ابھی ابھی نکل گئے ہیں تو انھیں غش آتے آتے بچا، کوشک نے مکھی مار مہم روکتے ہوئے دھیرے سے کہا:

"اندر جاتے۔ میں تو ہوتا ہی۔ ٹھنڈا پانی پلا دیتا۔"

کملا کانت نے پتلیاں بند کر کے آنکھیں موند لیں۔ کمبخت پوری چمڑی ادھیڑے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ انھوں نے دل ہی دل میں حساب لگایا، مستری جی کے علاوہ اگلی بار اسے کتنا دینا پڑے گا؟ وہ تب تک آنکھیں موندے رہے جب تک کوشک کی بیوی کی آواز نہیں سنائی دی۔

"آپ تو بھائی صاحب سو گئے۔ پکوڑیاں ٹھنڈی ہو گئیں۔ میں تو گرم لے آئی۔" اس نے ٹھنڈی پکوڑیوں کی پلیٹ سے ہٹا کر گرم پکوڑیوں کی پلیٹ سامنے رکھ دی۔

"بس کرو بھابی۔ صبح صبح کتنا کھا لیا۔"

Scanned with CamScanner

کمال ثاقب نے دوسری پلیٹ کو ہاتھ لگاتے ہی کہا اور سوزی کا قتل ہو جائے گا۔

"ہاں تو مرزا جی، واپس جانے کا کیا پروگرام بنایا؟"

"ہمارا پروگرام تو آپ کے حکم پر ہے کاشف جی۔ جب آپ چاہیں گے، اپنی روانگی ہو جائے گی۔" ملک ثاقب نے قہقہہ لگایا پر کاشف نے پیالے سے نکال کر دیا کہ ملک ثاقب کا جسم ولی یہ خنجر تھا جس پر خون جما تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ سے خنجر کو کھول کر جسم میں لگا دیا۔

ملک ثاقب کو چونکہ یہ پوری کارروائی بڑی دلچسپ لگتی تھی۔ جس سے ایک ماہر شکاری تھے۔ یہ ٹیک کی تعریف کی اور بار بار جانے پر افسوس کا اظہار کیا اور ایک بار تھوڑی دور پر بیٹھی عورتوں کی طرف اشارہ کیا۔ کاشف نے ہاتھ کا خنجر زمین پر پھینک دیا۔

"ہاں تو مرزا جی، کیا حکم ہے؟"

مرزا جی یعنی ملک ثاقب چپ چاپ بیٹھے رہے۔

"مرزا جی دفتر بھی جانا ہے۔"

"آج تو منسٹری بھی بند ہے، آپ کیا کہتی ہیں؟"

"اتنی فرصت کہاں..." کاشف نے تفصیل بتانا شروع کی، "منسٹری کی رات میں تو دس بجے دفتر جانا ہوتا ہے اور رات آٹھ بجے تک وہیں رکنا پڑتا ہے۔" اس کی بیوی نے گلہ کرتے ہوئے کہا، "کیا کریں جی ہم کو دفتر میں اپنا سر بھی کھجانے کی فرصت نہیں۔ وہاں بھی ہر کسی کی ضرورت ہے۔" اس پر ملک ثاقب نے کہا کہ صحت کی کمزوری کا کوئی جواب نہیں، کاشف کو اتنی چھوٹ نہیں دینی چاہیے۔ کاشف اور اس کی بیوی کے تو ملک ثاقب نے کاشف کی بیوی کو بتایا کہ سرکار کا کام تو کاشف صاحب کے سہارے چلتا ہے۔ منسٹری کو تو چاہیے کہ کس قدر مصروف رہتے ہیں یہ تو ان کے پیچھے ہیں جس کی وجہ سے سرکار میں یہ کام ہو رہا ہے اور عوام کو تھوڑی بہت راحت مل رہی ہے۔

کاشف کا من پسند موضوع شروع ہو گیا تھا۔ وہ کرسی پر سیدھا بیٹھ گیا اور اس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ منسٹر تو پرانے مہربان ہیں اور کچھ بھی پوچھتے ہیں۔ کام وہ ہی کرتا ہے اور سرکاری کام سے ہی پہچان بنی ہے۔ پر سب ملک ثاقب جیسے دوستوں کی مہربانی اور آشیرباد سے ہے۔

کملا کانت نے یہ تو مانا کہ وہ بزرگ ہیں اور ان کی نیک خواہشات ہمیشہ کوشک کے ساتھ ہیں، پر اگر کوشک میں اتنی خوبیاں نہ ہوتیں تو یہ منتری جی اس پر اتنا اعتماد کرتے؟ اب اس نے بتایا ہے تو ہی سے یہ جانے۔ کون شخص اعتماد کیے بغیر پی اے کو سودا سونپنے کا حکم دے گا؟

سودا سنتے ہی کوشک کی بیوی کو لگ گیا کہ اب کچھ گمبھیر سرکاری کام کا وقت آ گیا ہے۔ اس نے اچانک دیکھا کہ دوسری بار کی پکوڑیاں بھی ٹھنڈی ہو گئی ہیں۔ وہ تیسری بار گرم پکوڑیاں لانے کے ارادے کا اعلان کرتے ہوئے اٹھی۔

"سر جی، سودا کیا چیز ہے؟ صاحب تو مجھے کہہ گئے تھے کہ آپ میں لے کر آئیں گے۔"

"آپ بھی کوشک صاحب، خوب مذاق کرتے ہیں۔" کملا کانت اس اصول کے مطابق چلے کہ اپنے مخالف کو چت کرنے کے لیے دلیل سے زیادہ مفید لطیفے ثابت ہوتے ہیں۔

کوشک نے اس سے بھی تیز قہقہہ لگایا۔ ان کا اس بات پر یقین تھا کہ اگر آپ مخالف سے تیز آواز میں ہنس سکتے ہیں تو آپ اسے زیادہ آسانی سے زیر کر سکتے ہیں۔

"منتری جی نے خود مجھ سے کہا تھا۔"

"مجھے بھی لینے کو بولا۔"

"سودا۔"

"نہیں۔"

ایک بار پھر سناٹے کی کھینچا تانی شروع ہو گئی۔ کملا کانت نے ری پلے کی طرح سیکرٹریٹ میں منتری جی اور ان کے درمیان ماتھر روم میں پیش آنے والے واقعات کی ایک پوری جائزہ رپورٹ دہرانا شروع کی۔ کوشک نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے ہی وہ تفصیل سے گزر کر تیس سے سو روپے پر سودا طے ہونے پر پہنچے، کوشک نے آنکھیں کھول دیں۔

"سر جی، مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔"

کملا کانت نے غلیش کی رفتار کو اتنا تیز ماننے سے انکار کر دیا جس میں ایک رات میں پچیس فیصد مہنگائی بڑھ جائے۔ کوشک نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ مہنگائی تو اس سے بھی زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ دن دونی رات چوگنی والی کہاوت، کوشک کے مطابق، دانشوروں نے

مہنگائی وری ذہن میں رہتے ہوئے پیدا کی ہے۔

مہنگائی کا اگرچہ تو وشنت کی بیوی بھی بحث مباحثے میں شریک ہوئی۔ ہمارے معاشرے میں مانا جاتا ہے کہ مہنگائی کا تعلق صرف اور صرف چولہے ہانڈی سے ہے، اس لیے جیسے ہی اس کے کان میں بحث کا یہ حصہ پڑا، وہ تلی پکوڑیاں آنچ سے اتار کر میز پر چھوڑ کر وہاں پہنچ گئی۔

"اب بھائی صاحب، مہنگائی کی کیا بات کریں... ہر طرف آگ لگی ہے۔ کل تو مولی ڈیڑھ روپے کی دو تھی آج آپ کے آنے کے پہلے وہی مجھے سوا دو کی دے گیا سبزی والا۔ سوا ایک پیسہ کم کرنے کو راضی نہیں ہوا۔"

کملا کانت نے لوکی کے اس تازہ بھاؤ کی تفصیل میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ انھوں نے اس تفصیل میں پوشیدہ جذبات کو فوراً محسوس کر لیا۔ وشنت جس مہنگائی کی بات کر رہا تھا، وہ دراصل متوسط طبقے کی نہیں، اس کی اپنی مہنگائی تھی۔ سارا چارا اپنے لیے تنگ رہا ہے۔ انھوں نے سوچا کہ رمیش پر تھوک دیں، پر گھونٹ کو منھ بنانے کے بعد وہ تھوک نگل گئے اور مسکرانے لگے۔

ایک بار پھر وہی بحث چھڑ گئی جو ایسے موقعوں پر چھڑا کرتی ہے۔ کملا کانت نے وشنت کو بتایا کہ وہ انھیں گھر کا آدمی سمجھیں کہ وہ اس سے باہر تھوڑے ہی ہیں، کہ وہ ہمیشہ وشنت سے اپنے چھوٹے بھائی جیسا ہی پیار کرتے رہیں گے، کہ وہ منتری وشنت ہی کی نہیں جانتے کہ صد ہا تو آتے جاتے رہتے ہیں اور وشنت ایک ابدی حقیقت ہے۔ اس لیے ان کے لیے تو وشنت کا حکم سر آنکھوں پر، اور سب سے آخر میں یہ کہ کیسا کا مشورہ ہو تاکہ ان کا تبادلہ ہو گیا۔ ابھی تبادلہ نامے کی تاریخیں بھی طے نہیں ہوئی ہیں، ملنے کی بات تو دور رہی۔ آج کل تحصیلدار تنخواہ پا رہے ہوتے ہیں کہ صرف مرضی و سلام کرتے ہیں۔ جیسے ہی ان کا تبادلہ ہوا، جنھوں نے ایڈوانس دیے تھے انھوں نے واپسی کا تقاضا کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب وہ واپس جائیں گے تو پھر کچھ نہ کچھ وشنت کے لیے ہی کریں گے۔

وشنت نے ان کا مستقبل میں کچھ کرنے کا ارادہ اسی طرح سنا جس طرح عام آدمی ووٹ لینے کے قریب آنے والی تقریروں میں اپنی حالت زار سدھرنے کے خواب اور اعلانات سنا کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

اس نے بھی تفصیل سے بتایا کہ وہ تو ہمیشہ سے ہی کملا کانت جی کو بڑا بھائی سمجھتے رہے۔ جب پچھلے الیکشن میں وہ منتری جی کے بلانے پر بھی نہیں آئے تب ہی مخالفین نے کس قدر منتری جی کے کان بھرنے کی کوشش کی تھی کہ کملا کانت اس افواہ کی وجہ سے اپنا منہ نہیں دکھا رہے ہیں کہ منتری جی اس الیکشن میں ہارنے والے ہیں اور اگر جیتے بھی تو پارٹی انھیں منتری نہیں بنائے گی۔ وہ تو کوشک ہی تھا جس نے منتری جی کے دل میں ان کی طرف آئی نفرت کو نکال پھینکا اور ان کی وفاداری پر کوئی شک وشبہ نہ کیا جائے اس کے لیے بھرپور کوشش کی۔ کل بھی کملا کانت جی کو دیکھ کر منتری جی نے کوشک کے کان میں کہہ دیا تھا کہ انھیں جانے کو بول دیا جائے، پر کوشک نے ہی اس کی خوشامد کی تھی کہ ایک بار کملا کانت جی کی بھی سن لیں۔ منتری جی کے دربار میں وہ ہمیشہ کملا کانت جی کی بڑائی اور بھلائی کا دھیان رکھتا ہے، ان کے فائدے کی بات کرتا ہے، مگر وہ کیا کرے، مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ آدمی کا جینا مشکل ہو گیا ہے۔

مہنگائی کی رٹ پر بات ختم ہوتے ہی کملا کانت کو ایک بار پھر یاد آیا کہ کوشک ان کا چھوٹا بھائی ہے اور چھوٹے بھائی کی گرہستی میں مدد کرنا اس کا فرض نہیں بلکہ اس کا حق ہے۔ وہ کہیں بھاگے تو جا نہیں رہے تھے، ہمیشہ دیتے ہی تھے۔ کوشک کو اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا، پر مہنگائی سارے رشتے گڈمڈ کرے پڑتی تھی۔

کملا کانت کی سمجھ میں آ گیا کہ کسی پچھڑے علاقے کی انتخابی مہم میں سرگرداں عوام کی طرح کوشک بھی ہوشیار ہو گیا ہے اور اب صرف تسلی سے بات آگے نہیں بڑھنے والی۔ انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور وہ جملہ کہہ گئے جس کا کوشک کو انتظار تھا:

"ہاں تو بتائیے کوشک صاحب، کیا کرنا ہے؟ کیسے کرنا ہے؟"

"کیا کرنا ہے؟" کے جواب میں کوشک نے جو بتایا اس سے ایک بار وہی لمبی بحث چھڑ گئی جس میں کملا کانت کو بار بار بتانا پڑا کہ وہ تو گھر کے آدمی ہیں اور کہیں بھاگے تھوڑے ہی جا رہے ہیں اور کوشک کو ہر بار بڑھتی ہوئی مہنگائی کی یاد آتی رہی۔ کافی چخ چخ کے بعد یہ طے ہوا کہ کوشک کو کملا کانت منسٹر سے سوا لاکھ کے علاوہ پچاس ہزار اور دیں گے۔

"کیسے کرنا ہے؟" پر کملا کانت کے بار بار یہ کہنے کے باوجود کہ وہ ان لوگوں سے الگ نہیں

Scanned with CamScanner

ہیں اور جو طے ہوا ہے، کر دیں گے۔ ایک بار آرڈر مل جائے تو سب ہو جائے گا۔ کوشک نے صاف کہہ دیا کہ منتری جی کہہ گئے ہیں کہ پہلے سارا پیسہ کوشک کے پاس پہنچا دیا جائے۔ پھر وہ محکمے کے سیکرٹری کو فون کر کے آرڈر جاری کرنے کے لیے کہیں گے۔

کملا کانت تھوڑی دیر میں ہی سمجھ گئے کہ پیسہ جذباتیت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اس لیے انھوں نے دیر تک یہ دہائی نہیں دی کہ وہ ان لوگوں سے الگ قسم کے ہیں، باہر والے نہیں ہیں، گھر کے آدمی ہیں۔ یہ طے ہوا کہ وہ دوپہر لنچ کے وقت سارا پیسہ لے کر کوشک کے گھر آ جائیں گے اور کوشک بھی دوپہر میں تھوڑی دیر کے لیے دفتر چھوڑ کر گھر آ جائے گا۔

کملا کانت جب کوشک کے گھر سے نکلے، ان کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ راجدھانی روانہ ہونے سے پہلے جتنا سوچ کر چلے تھے، تقریباً اتنے میں ہی معاملہ طے ہو گیا تھا، بلکہ تھوڑا کم ہی ہو گیا تھا۔ انھوں نے پندرہ سے بیس لاکھ میں معاملہ نپٹانے کی سوچ رکھی تھی اور بات سولہ لاکھ میں بن گئی۔ پچاس ہزار کوشک کو دینے پڑ رہے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کوشک کو خوش رکھنا منتری جی کو خوش رکھنے سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ انھوں نے حساب لگایا۔ وہ دس لاکھ ساتھ لے کر چلے تھے، باقی ساڑھے چھ لاکھ کا انتظام راجدھانی میں کرنا تھا۔ راجدھانی میں بہت سے ایسے لوگ تھے جن سے ان کے ایسے تعلقات تھے کہ وہ اس رقم کا انتظام کر سکتے تھے، پر معاملہ اتنا نازک تھا کہ وہ ہر کسی کے پاس اس خبر کے ساتھ نہیں جا سکتے تھے کہ ان کا تبادلہ رک رہا ہے۔ انھیں زیادہ دیر تک سر کھپانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ان کے دو مہرے وہاں موجود تھے۔ ان میں دھرم پال یادو تو بہت کام کا نہیں تھا، اس سے کوشک کے ہاتھ پیر تو دبوائے جا سکتے تھے پر پیسے کا انتظام نہیں کرایا جا سکتا تھا۔ اس کے مقابلے میں ملکھ راج زیادہ کار آمد ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ راجدھانی کے چپے چپے کو جانتا تھا اور انھیں پوری امید تھی کہ وہ شہر میں اس رقم کی کہیں نہ کہیں سے جگاڑ ضرور کر دے گا۔ کوشک کے گھر سے نکل کر کملا کانت ملکھ راج اور دھرم پال یادو کی تلاش میں نکل پڑے۔

کمرے میں وہی موضوع چل رہا تھا جو ایسے کسی کمرے میں چل سکتا تھا یعنی زمانے کو کوسا جا رہا تھا۔ چونکہ یہ بھرے پیٹ اور اگھائے لوگوں کا مجمع تھا، اس لیے باتیں زمانے میں آگ لگانے والی مہنگائی کو لے کر نہیں ہو رہی تھیں۔ زمانے کا ایک دوسرا پہلو آج کی تشویش کا موضوع تھا۔ لوگ اس بات سے دکھی تھے کہ رشوت لینے دینے جیسے معاملے میں اخلاقیات کا احساس ختم ہوتا جا رہا ہے۔

اوسط ہندوستانی کی طرح ہر شخص کے پاس تجربات کا نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا اور اوسط ہندوستانی کی ہی طرح ہر شخص اس خزانے کو لٹانے کے لیے بے چین تھا۔ کئی پیڑھیاں وہاں جمع تھیں اور اس طرح کئی پیڑھیوں کے تجربات وہاں جمع تھے۔

پرانے لوگوں نے ایسی ایسی کہانیاں سنائیں جن پر نئی پیڑھی کے لوگوں کی آنکھیں محاورے کے مطابق پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مثلاً "یہ زمانہ تھا صاحب، ایک بار نوٹ گن آئیے، پھر بے فکر ہو جائیے۔ یہ نوٹ گنوانے والے کی ذمے داری ہو جاتی تھی کہ آپ کے گھر آپ کا کاغذ پہنچ جائے۔"

"ارے صاحب، نوٹ گننے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ آپ ایک بار زبان ہلا دیجیے، پھر آپ کا کام ختم۔ کام کرنے والے کو پتا ہے کہ کام ختم ہو جانے کے بعد مال اپنے آپ پہنچ جائے گا۔"

"بھائی، پرانے لوگوں کی وفاداری کی بات ہی کچھ اور تھی۔ میرے پڑوس میں ایک ریٹائرڈ ڈپٹی صاحب رہتے ہیں۔ ان سے سنے پرانے قصے۔ ایک مرتبہ کسی تھانے سے جلدبازی میں انھیں اپنی روانگی ہونی پڑی۔ شراب کا ٹھیکیدار اپنے کسی رشتے دار کے یہاں باہر گیا ہوا تھا۔ اس سے ہر مہینے سو روپے ملتے تھے۔ انھوں نے مان لیا کہ اس مہینے کا پیسہ بٹے کھاتے میں گیا۔ لیکن صاحب، پرانے لوگوں کی کیا بات۔ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ گھر کے سامنے ایک رکشہ رکتا ہے اور ایک نوجوان اترتا ہے۔ ڈپٹی صاحب برآمدے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ چشمہ نیچے کرکے نوجوان

Scanned with CamScanner

کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیسی پیچیدہ باتیں۔ کیسے بچے؟ کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ وہ تو جب ذرا ہوش آیا تو کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی شراب سے تشبیہ دے رہا ہے جس کے اوپر سود چڑھا قرض چھوڑ کر ڈپٹی صاحب چل بسے تھے۔ وہاں کا تشبیہ ادیب جب تک زندہ رہا، انھیں تلاش کرتا رہا اور آخر میں مرتے مرتے یہ ذمے داری سونپ گیا کہ وہ ڈرونڈ جی کی امانت انھیں سونپ کر باپ کا قرض چکا دے۔ کتب کے باوجود بیٹے نے اپنا دھرم سمجھا اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے پتا لگا لیا کہ دادا جی ترقی پاتے پاتے ڈپٹی ایس پی ہو گئے تھے اور پھر ریٹائر ہو کر اسی شہر میں رہ گئے ہیں۔ ڈپٹی صاحب نے وہ روپوں کا دیا ہوا لفافہ دیکھا۔ تو اس میں ملکہ وکٹوریہ کی فوٹو والا کڑک نوٹ ملا۔ آج کل کا کاغذ تو تھا ہی نہیں کہ گل سڑ جاتا..."

سامعین نے سنسکرت ناٹکوں کے کرداروں کی طرح "دھنیہ دھنیہ!" کے نعرے لگائے۔ جو تشبیہ ریٹائرڈ فرماں برداری پر نثار ہو رہے تھے تو کچھ اس کی اخلاقی قدروں کی داد دے رہے تھے۔ دونوں موضوعات پر لوگوں کے سامنے ڈھیر سارے تجربات تھے اور کچھ دیر تک کمرے میں ایک ساتھ ہی سب بولتے رہے۔ کبھی کسی رشوت دینے والے کی ایمانداری کا تذکرہ کرنے پر چھایا جاتا تو کبھی رشوت لے کر روز میں یوں کر کے فرماں بردار بیٹا جوتے ... رت پر رکھ دیتا۔

کر چونکہ کوشک صاحب کا تقرر ان میں ... قصے کو کسی نہ کسی کام سے وہاں موجود تھے اس لیے لازمی تھا کہ جب انھوں نے ایک قصہ چھیڑا تو سب چپ ہو گئے۔ قصے کی تمہید بھی اس طرح تھی کہ انھوں نے بھی زمانے کے زوال پذیر ہوتے جانے پر تھوڑا سا تاسف جتایا اور پھر سیدھے قصے پر آ گئے۔

"سب مجھ سے نام مت پوچھیے گا، پر مجھے سیتا پور کے ایک تعلقہ دار نے یہ آپ بیتی سنائی تھی۔ ہوا یوں کہ ایک کسان کی اپنے پڑوسی تعلقہ دار سے ٹھن گئی۔ تھوڑی زمین کا معاملہ اور زیادہ ناک کا سوال ہو گیا۔ مقدمے بازی۔ نچلی عدالتوں سے ہوتا ہوا مقدمہ ہائی کورٹ پہنچ گیا۔ جن جج صاحب کے یہاں مقدمہ تھا ان کی شہرت یہ تھی کہ چاندی کی جوتی سے چمک کر اٹھو تو ... سیتا پور کے تعلقہ دار نے ملنے کی جگت بھڑائی اور ان تک پہنچ کر ایک ... سستی کا زمانہ تھا۔ اس وقت ایک ... ان کے جیسوں کا ... برابر تھے۔ روپیہ ... کے بعد بے فکر ہو کر بیٹھ گئے۔ ایک ...

Scanned with CamScanner

نی پڑی خبر ملی کہ دوسرے فریق نے بھی کسی وکیل کے ذریعے ایک لاکھ بھجوائے ہیں۔ بچارے کسان کا تو نون نہیں۔ بھاگتے پڑتے پہنچ گئے جج صاحب کی کوٹھی پر۔ بڑی مشکل سے ملاقات ہوئی۔ بولے، حضور، مائی باپ، حاکم کچھ اور رقم لے کر آیا ہے قبول کی جائے۔ جانتے ہیں جج صاحب نے کیا جواب دیا؟ جج صاحب نے کہا کہ اب تو دونوں پلڑے برابر ہیں۔۔۔ ناؤ کیس ول بی ڈسائیڈڈ آن میرٹ۔“

زور کا قہقہہ لگا اور ایک بار پھر لوگوں نے انگریز بہادر کے راج کی تعریف کی کہ تب کے جج صاحبان اتنی منصف طبیعت کے ہوتے تھے۔ آج تو رشوت خور بھی بے ایمان ہو گئے ہیں۔

ادھر ہائی کورٹ والا قصہ سناتے وقت کوشک کی نگاہ جس چہرے پر گڑی تھی، اس پر پہلے سے ہی مردنی چھائی ہوئی تھی۔ قصہ ختم ہوتے ہوتے وہ اور مرجھا گیا۔ مرجھائے چہرے والے نے مدری اندر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ دونوں پلڑوں کو برابر کرنے کے لیے کتنا نذرانہ رکھنا پڑے گا۔ بات پھیل چکی تھی کہ ملاقات نے تبادلہ رکوانے کے بیے میں دس ہزار خرچ کیے تھے۔ اس سے آرڈر نکلواتے وقت دس دیے تھے، اسی طرح بھی گیارہ بارہ اور دینے پڑیں گے۔ لوگوں کے قہقہوں کے درمیان اس دکھی اداس چہرے نے جس کا نام بھوک چند اپادھیائے تھا، ان کا ساتھ دینے کی کوشش کی لیکن ہنسی کو دیکھ کر دھوکا ہوا کہ وہ رو رہے ہیں۔

کوشک کا کمرہ کئی دنوں تک سونا رہنے کے بعد آوردوں سے بھنبھنا رہا تھا۔ منتری جی آج تیسرے پہر لوٹنے والے تھے اس لیے تمام فریادی اور ان کے پیروکار لوٹ آئے تھے۔ یہ لوگ صوبے کے الگ الگ علاقوں سے آئے تھے۔ وہ اپنے اپنے علاقوں کی بولیاں بول رہے تھے۔ فریادی دھوتی بنیان سے لے کر سفاری سوٹ تک میں تھے، پیروکار کھادی کے کرتے پاجاموں میں۔ عموماً فریادی کے لباس اور اعتبار کا اثر پیروکاروں کی پوشاک پر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دھوتی بنیان والے کا پیروکار ملگجے پاجامے کرتے میں تھا تو سفاری سوٹ پہنے اور نمبروں والا بریف کیس لیے ہوئے فریادی کا پیروکار کڑک کلف لگا پولیسٹر کھادی کا کرتا پاجامہ زیب تن کیے تھا۔

کمرے میں نیا داخل ہونے والا ہر شخص پہلا سوال ایک جیسا ہی کر رہا تھا، اس لیے ہر تھوڑی دیر بعد کوشک جیسے ہی نو وارد سواری کی طرف اپنی گردن بڑھاتا تو اس کا تھوبڑا دیکھے بغیر سوال سے

Scanned with CamScanner

پہلے جواب دے دیتا:

"صاحب منٹ بیٹے تک آ جائیں گے!... نہیں۔ جج کے یہ گھر نہیں جائیں گے... سیدھے یہیں بخیریت آئیں گے..."

آنے والوں میں زیادہ تر کو وہ چہرے سے پہچانتا تھا۔ چپراسی کار بھی پرانے تھے۔ برسوں سے وہ انھیں دیکھ رہا تھا۔ پہلے وہ اس منتری کے ساتھ تھا جب بھی یہ وہاں آتے تھے، آج ان منتری کے ساتھ ہے اور یہاں بھی وہ آ رہے ہیں۔ ان کا پورا نام تو شاید ہی کسی کو یاد ہو لیکن شرما جی، ورما جی، خان صاحب یا ترپاٹھی جی جیسے سرنیم سبھی کو یاد تھے۔ اس کی کامیابی کا راز بھی یہی تھا کہ اس نے کبھی کسی ترپاٹھی کو ورما جی کہہ کر نہیں پکارا۔ ہاں اس نے اپنی آسانی کے لیے کچھ ترتیب ضرور مقرر کر رکھی تھی جیسے سارے برہمن اس کے لیے پنڈت جی تھے اور جب اسے کسی کے بارے میں شک ہوتا، وہ سر، جناب کہہ کر پکارتا اور تب تک سر، جناب وغیرہ کے لقب پر ہی زور دیتا جب تک سامنے والے کو پکارنے لائق کوئی حل نکل جاتا۔

"آرام سے بیٹھیے پنڈت جی، صاحب سیدھے یہیں آئیں گے۔"

"لنچ وغیرہ کہاں کرتے ہیں..."

کوشک نے جسے بیٹھنے کے لیے کہا تھا وہ کچھ وی آئی پی نظر آ رہا تھا، کیونکہ کوشک نے اسے بیٹھنے کی دعوت دینے کے ساتھ ہی اپنی پیٹھ کو کرسی سے کچھ اونچا کرنے کی کوشش کی تھی اور تھوڑی ہی تھا کہ پنڈت جی نے ہوا میں ہاتھ اس طرح ہلایا جیسے اگر تھوڑی دیر بھی ہوئی تو کوشک کھڑا ہو جائے گا۔

پنڈت جی کے ساتھ اس وقت بارہ لوگوں کی بھیڑ تھی۔ ان میں سے کچھ فریادی نظر آ رہے تھے اور کچھ ان کے چوبدار۔ وہ جو بیوروکریسی کے پیچھے کی سیڑھیاں چڑھنے کی ترکیب سے رہے تھے۔ وہ الگ الگ عمر کے تھے، پر سب کی پوشاک ایک سی جیسی تھی۔ کھدر کا لمبا کرتا اور تنگ مہری پائنچے والے پاجامے۔ جوان شاگردوں کی خاص انداز میں تراشی ہوئی داڑھیاں تھیں اور ادھیڑ عمر والوں کے چہروں پر وہ دو تین دن تک داڑھی نہ بنانے سے اگی ہوئی کھچڑی کھونٹیاں تھیں۔ کچھ کے کندھوں پر کھادی کے تھیلے جھولتے لٹکے تھے اور کچھ کے ہاتھوں میں چمڑے کے بریف کیس تھے

ٹھیک تھے۔ ہاں ایک قدر مشترک یہ کہ سب کے جھولوں میں نامے تھے جن پر الگ الگ قسم کی درخواستیں تھیں۔

شاگردوں کو ہلکے پھلکے شکار خود کرنے کی اجازت تھی۔ وہ اپنے جھولوں میں چھوٹے موٹے تبادلے یا کوٹے پرمٹ کی درخواستیں رکھے ہوئے تھے۔ کسی سپاہی یا کسی پٹواری یا کسی میونسپل کارپوریشن کے منشی کے تبادلے ان کے علاقے میں آتے تھے۔ اسی طرح مٹی کے تیل کے کوٹے یا سستے غلے کی دکان کے کینسل ہوئے لائسنس کی بحالی کی لڑائی وہ خود لڑ لیتے تھے۔ پنڈت جی کسی تجربہ کار استاد کی طرح اکھاڑے کے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کو پدرانہ شفقت بھری نظروں سے نہارتے رہتے تھے۔ صرف جب کوئی چیلا سامنے بیٹھے افسر کی عدم برداشت اور درشت روائی کے تازیانے سے گھبرا کر ان کی طرف مایوسی سے دیکھتا، تبھی معاملے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دخل اندازی کرتے۔ انھوں نے اپنے چیلوں کو سکھا رکھا تھا کہ مقدمہ کمزور ہو تو وکیل کی آواز کا تار چڑھاؤ دلیل پر بھاری پڑ جاتا ہے۔ ان کے چیلے اتار میں کم چڑھاؤ میں زیادہ یقین رکھتے تھے، اس لیے اکثر کسی چیلے کے کمزور پڑتے ہی سارے کے سارے اتنی زور زور سے چلانے لگتے تھے کہ نوے فیصد معاملات میں سامنے بیٹھا افسر گھبرا کر کچھ نہ کچھ لکھ دیتا تھا۔

آج چونکہ کوئی بڑا کام تھا، اس لیے پنڈت جی اپنی پوری فوج لے کر آئے تھے۔

چیلوں نے پنڈت جی کے واسطے کرسی خالی کرنے کے لیے پورے کمرے پر دھاوا بول دیا۔ کمرے میں کرسیاں کم تھیں اور سبھی بھری ہوئی تھیں۔ چیلے نادر شاہ کی فوج کی طرح جھپٹے۔ انھوں نے کرسی پر بیٹھے لوگوں کا طرح طرح سے امتحان لیا۔ کرسیوں کے ہتھے، پائے اور ان پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے ہاتھ کندھے... سبھی کچھ کو اکھاڑنے کی بھرپور کوشش کی۔

امتحان شوکت چندرا پانڈے کا بھی ہوا مگر وہ اس صورت حال سے گزرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اس سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ خود اعتمادی قائم رکھتے ہوئے سامنے والے کو چیونٹے، کیڑے مکوڑے کی حیثیت سے ہی دیکھنا چاہیے۔ اس لیے جب ایک چیلے نے ان کی کرسی جھنجھوڑتے ہوئے انھیں آگاہ کیا، "پنڈت جی ہیں، پنڈت جی،" تو انھوں نے دروازے کے اوپر کونے میں جالا بناتی ہوئی مکڑی کو پوری دلچسپی سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اور جب دوسرے چیلے نے کوشش کی، تب تک

Scanned with CamScanner

امپریل اسے ہیں۔ اب تک وہ چالاو دیکھنے میں اتنے محو ہو چکے تھے کہ اگرچہ وہ آگے نہ بڑھ گیا ہوتا تو وہ جاننے کے پورے عمل کے بارے میں اس کی معلومات میں اضافہ کرتے تھے۔

وہاں کرسیوں پر بیٹھے چند لوگوں میں اتنی خود اعتمادی نہیں تھی۔ ایک تو چیلوں کو جھپٹتے دیکھ کر ہی گھبرا کر کھڑا ہو گیا، اس کی کرسی پر پنڈت جی براجمان ہو گئے۔ دوسرے نے آدھا کھڑا ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی تو اسے پتہ چلا کہ اس کی کرسی کھینچ دی گئی تھی اور اگر بروقت اسے پتہ نہ چل جاتا تو وہ اب تک ذلت والی پوزیشن میں ہوتا۔ اس کی کرسی پر ایک چیلا بیٹھ چکا تھا۔ تیسرے انتہائی کمزور خود اعتمادی والے شخص کو شکست کا احساس دلا دیا گیا اور دو چیلے اس کی کرسی آدھی آدھی شیئر کرنے لگے۔

"ارے ستاپے کوشک جی،" پنڈت جی نے کوشک سے کہا لیکن اس کے سننے کی پرواہ کیے بغیر چاروں طرف نظر گھماتے ہوئے اس شخص کو تلاش کرنے لگے جس کے کام کے لیے وہ چیلوں کی تگڑی فوج لے کر چڑھائی کرنے آئے تھے۔ اس کمرے کے ماحول سے بے چین، ساری سوٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لیے ہاتھ میں لیے بیگ کو … شروع کر دیا۔

"ارے کپور صاحب، ادھر آ جائیے۔"

پنڈت جی نے پاس بیٹھے چیلے کو اشارہ کیا۔ چیلے نے اپنی … سے وہ ادھیڑ عمر، خود اعتمادی سے عاری … اسے بے فکری سے … گیا۔ وہاں کپور صاحب نامی شخص سے تعارف ہوا۔

"کوشک جی، تمہیں نہیں پہچانتے؟ ارے بھئی کپور صاحب ہیں۔ کل کے اخبار میں پڑھا سمجھیت تھا۔ وہ … کی کمپنی کے ساتھ مل کر کار کی فیکٹری لگا رہے ہیں۔ کل ای میں تو پی ایم آ رہے ہیں۔ سی ایم بھی جائیں گے ہی۔ مجھ سے بولے، پی ڈبلیو ڈی منسٹر سے خیر، فنکشن تو ہونا ہے تو انہیں مہمان خصوصی بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا، چلیے ابھی طے کر دیتے ہیں۔ آپ منتری جی کو … نہیں کریں گے۔ میں سوچتا تھا کہ منتری جی صبح والی فلائٹ سے آ رہے ہیں۔ کپور صاحب، جلدی تو نہیں ہے؟ تھوڑی دیر انتظار کر لیں۔"

"جلدی تو نہیں ہے، پر شام کو مل لیتے ہیں کوٹھی پر...."

Scanned with CamScanner

کپور صاحب اور پنڈت جی کی آنکھوں نے آپس میں جو باتیں کیں، اسے دیکھ کر کوئی بھی سمجھدار آدمی کہہ سکتا تھا کہ منتری جی کے ساتھ کپور صاحب کی ملاقات کنجی پر ہی ہونا مناسب تھی، لیکن کوشک نے اشارہ دیکھتے ہی یکسر انکار کر دیا۔ اس نے سامنے پڑے کاغذوں پر کچھ لکھتے لکھتے کہا

"آج تو منتری جی خالی نہیں ہیں۔ دس بجے تک تو کمٹمنٹ ہے، پھر حلقے کے ایک آدمی کے لڑکے کے جنم دن میں... وہاں سے ایک شادی..."

"آپ بھی کوشک صاحب... آپ کو پتا ہے کپور صاحب کتنی مشکل سے ہمارے صوبے میں کارخانہ لگانے کے لیے تیار ہوئے۔ خود سی ایم نے دسیوں بار انھیں فون کیا، ان کے گھر گئے، مجھے لگایا، تب کہیں جا کر ہم لوگ کپور صاحب کو تیار کر پائے کہ وہ اس صوبے میں کارخانہ لگائیں، اور آپ کے منتری جی کو فرصت نہیں ہے کہ..."

"پر آج تو کمٹمنٹ ہے..."

"ہو چکی صوبے کی ترقی..."

"پھر جنم دن..."

"اسی سے جڑے ہوئے ہیں..."

"وہاں سے شادی..."

"بھاڑ میں گئی شادی... یہاں صوبے کی ترقی کا سوال ہے اور آپ کو جنم دن اور شادی کی پڑی ہے۔" پنڈت جی اپنے اس روپ میں آ رہے تھے جس کے لیے وہ صوبے کی راجدھانی میں مشہور تھے۔

اس درمیان ان کے چیلوں نے گرو کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ گرو نے نہ جانے کیا پیغام نشر کیا کہ چھوٹے سے کمرے میں گھمسان کا رن چھڑ گیا۔

چیلوں کی فوج کسی دور وسطی کے طریقۂ جنگ کے تحت کام کرتی تھی۔ ایک تجربہ کار سپہ سالار کی طرح پنڈت جی پہلے اپنی پیدل فوج کو آگے بڑھاتے تھے۔ پیدل فوج کا مطلب ان سپاہیوں سے تھا جو صرف اپنی آواز کا استعمال کرتے۔ پیدل سپاہی ناکام ہو جاتے تو گھڑ سوار آگے بڑھتے تھے۔ یہ طرح طرح کے ہتھیاروں سے لیس دشمن پر ٹوٹ پڑتے۔ آخر ان کا سب سے زیادہ زور

Scanned with CamScanner

تو چھوڑنے والے ان کے جوتے چپل ہوتے۔

پنڈت جی کے پاس توپ خانہ بھی تھا، پر اس کا استعمال وہ مجسٹریٹ یا لیجسلیٹو اسمبلی کے احاطے میں نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے بہت سے چیلوں کو لائسنس والے ہتھیار دلوا رکھے تھے، اور ان کے بہت سے چیلے کاغذی خانہ پری میں یقین نہیں رکھتے تھے، اس لیے بلا لائسنس ہتھیار رکھتے تھے۔ ان کے وہ چیلے جن کے پاس لائسنس والے ہتھیار تھے، وہ قومی یکجہتی کی جیتی جاگتی مثال تھے، اس لیے ان کے لائسنس بھی ناگالینڈ، یو پی سے لے کر ہریانہ تک نہ جانے کن کن صوبوں کے بنے ہوئے تھے۔ پنڈت جی کے مخالفین ان کے توپ خانہ بریگیڈ پر قتل، اغوا کے الزامات لگاتے رہتے تھے، لیکن پنڈت جی نے اعلان کر رکھا تھا کہ عوام کی عدالت سب سے بڑی عدالت ہے اور جب تک وہ وہاں مقدمہ نہیں ہارتے تب تک انھیں مجرم نہیں مانا جا سکتا اور عوام کی عدالت میں وہ پچھلے پچیس سال سے تو جیت ہی رہے تھے۔

آج بھی پہلا حملہ اس کی پیدل فوج نے کیا۔ ایک ساتھ پھیپھڑوں کی طاقت کا الگ الگ عرض وطول میں استعمال کرتے ہوئے کئی چیلے چیخے۔

"بابو لوگوں نے اس ملک کا ستیاناس کر رکھا ہے..."

"پنڈت جی یہاں کہاں سے لوگوں کی خوشامد کر کے صوبے کی ترقی کے لیے آئیں اور ان کے پاس ملنے کا وقت..."

"وقت کیسے نہیں ہے... ووٹ لینے کا وقت ہے... ترقیاتی کاموں..."

"سالے... ...ادر..."

کوشک نے گھبرا کر چاروں طرف مدد کے لیے دیکھا۔ اس کا تجربہ بتاتا تھا کہ ایسے موقعوں پر سامنے بیٹھے لوگ اندھوں، گونگوں اور بہروں کا رول ادا کرنے لگتے ہیں۔ اس نے منمنانا شروع کر دیا:

"شام کو میٹنگ ہے..."

"جس میں نئی کیبنٹ، صوبے کی ترقی..."

"پھر شادی..."

"شادی کی ماں کی... صوبہ ایسے ہی پچھڑا رہے گا..."

Scanned with CamScanner

''بڑھوتے۔''

''ہڈی کا تاج نہیں ہے کیا؟ .. اسی طرح ہوگا انڈسٹریلائزیشن؟ ایسے ہی لگیں گے کارخانے؟''

''پر میں نے منع کب کیا پنڈت جی؟... میں تو کہہ رہا تھا کہ کیبنٹ جانے سے پہلے آپ ٹوئی پر کر لیں۔ میری بات تو پوری سنتے نہیں آپ لوگ، بس چڑھنے لگتے ہیں۔''

کوشک کے اس بدلے ہوئے رویے کے پس پردہ نہ تو صوبے کے غیر ترقی یافتہ ہونے کا دکھ تھا، نہ اس کو دور کرنے کی کوئی خواہش تھی، بلکہ اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی تھی اور مستقبل قریب میں دی جانے والی جھڑکی کی آہٹ اس نے سن لی تھی۔ چاروں طرف بچاؤ کے لیے نظریں دوڑاتے وقت اس نے پنڈت جی کے ایک چیلے کو ہاتھ میں چپل الٹتے پلٹتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے تجربے نے اسے بتا دیا تھا کہ چپل میں کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ مخالف سمت سے اب اپنی پیدل فوج کی مدد سے تو سورماؤں کو میدان میں اتارے جانے کا وقت آ گیا ہے۔

کوشک کے رویے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ کمرے کا ماحول بھی پچھلی حالت پر لوٹ آیا۔ ہاتھ میں چپل لے کر الٹ پلٹ کر دیکھنے والے کو یقین ہو گیا کہ اس کی چپل میں کوئی خرابی نہیں ہے، اس لیے اس نے اسے واپس پہن لیا۔ چھپکڑوں کی زور آوری دکھانے والے چیلے سرگوشی کرنے لگے۔ پنڈت جی جو پہلے اس کامیاب دور میں صرف مسکرا رہے تھے پہلو میں بیٹھے ہوئے کچھ وہم کی مخلوق کے چہرے پر اپنے لیے عزت و وقار دیکھا اور کچھ غیر یقینی صورت حال سے جیتے تاثرات کو دیکھ کر تھوڑے ڈرے ڈرے رویے سے زیادہ چوکنا ہو اٹھے اور کھل کر مسکرانے لگے۔

''ارے میں جانتا تھا کہ کوشک صاحب تو گھر کے آدمی ہیں۔ ملاقات تو ہوگی ہی۔ تم لوگ بیکار چیل پوں مچا رہے ہو۔'' پنڈت جی نے چیلوں کی طرف دیکھ کر مصنوعی غصے کو دکھاتا۔ ''پھر ان کے منتری جی بھی صوبے کی ترقی کے لیے کتنے فکرمند رہتے ہیں!''

پنڈت جی اپنے پسندیدہ موضوع پر آ گئے۔ دیر تک وہ صوبے کے پچھڑے پن کا رونا روتے رہے۔ جب انھوں نے بتایا کہ صوبے میں سڑکیں نہیں ہیں تو ان کے چیلوں نے کچھ ٹھیکیداروں کی درخواستیں آگے بڑھا دیں جن پر کوشک نے متعلقہ انجینئروں کے نام کچھ لکھ دیا۔ پنڈت جی نے اد

Scanned with CamScanner

دیہی کسان کے علاقے میں غریبوں کو مٹی کا تیل نہیں مل رہا ہے۔ اس پر ان کے ایک چیلے نے فوراً اپنے تھیلے میں سے ایک درخواست نکالی جس میں ان کے کسی آدمی کو مٹی کے تیل کی دکان کا لائسنس جاری کرنے کی سفارش تھی، لیکن پھر یہ سوچ کر درخواست انھوں نے واپس جھولے میں رکھ دی کہ یہ تو پالیسی ڈیویلپمنٹ منسٹر کے پاس لے جانا ہے۔ تیل کی دکان کی درخواست دوسرے منسٹر کے کمرے میں دی جانی تھی۔

کمرے میں اس موضوع پر تبادلہ خیال ہونے لگا جو کرپشن کے بعد سیکریٹریٹ کا سب سے مرغوب اور پسندیدہ موضوع تھا، یعنی صوبے کا غیر ترقی یافتہ ہونا۔ سب کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا اور سبھی کہنے کے لیے بے قرار تھے، اس لیے جلدی ہی وہ وقت آ گیا جب سبھی لوگ چٹکلے کہنے لگے۔

کسی آدمی نے سیتا پور کے متعلق ایک قصہ سنایا تھا، شکلا نے اس سے پر زور اصرار کیا۔

"ارے بھائی، اپنے پنڈت جی کو وہ قصہ سناؤ... ارے وہی جس میں فیصلہ ... پر ہوتا ہے..."

کمرے میں قہقہے لگے۔ پنڈت جی نے ساتھی سے دیکھا۔ سیتا پور والا قصہ شروع ہوتا اس سے پہلے ہی دروازہ کھل گیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر ... میں سب اٹھانے لگے۔ متعلقے کا فیصلہ ... اس کے لیے انھیں اور کتنا خرچ کرنا پڑے گا۔ انھوں نے ... میں ... تھے۔ ... تھی کہ ملاقات نہیں ہو سکی ... ملاقات کے ... نے کی ... تھی۔ ... سب لوگ چندر ... کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو ... پان کی دکان پر رضوان الحق نظر آنے ... لپک پڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ... اخبار کے پیچھے اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کی لیکن تھوڑی دیر میں ہی انھیں پتا چل گیا کہ ... کوئی ... نہیں۔ رضوان الحق نے ... میں ... ہوتا تھی جیسے ہی وہ "مصیبت ٹلی" والے انداز میں پان کی دکان کے پیچھے سے ... تو جانے کہاں سے نکل کر رضوان الحق نے "...." ... بات اور ... "بڑے صاحب" ... سنا دی۔

"... صاحب، پان ... "

"ہاں، یہ اچھی بات ہے۔ کھانا کھانے کے بعد ٹہلنے نکلتا ہوں... مجھے پان کھانے کی عادت ہی نہیں۔ آپ کیسا لیں گے؟ سادہ... یا زردہ...؟"

بھوک چند نے مری ہوئی آواز میں جو کچھ کہا، وہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ سادے یا زردے والے پان کی جگہ کوئی رسی گلے کا بھی آرڈر ہو سکتا تھا۔ وہ چپ چاپ رضوان الحق کو پان والے کو زردے والے پان کا حکم سناتے دیکھتے رہے۔ جب وہ زردے کی خوبیاں بیان کر رہا تھا تو وہ پیچھے کچھ دور سے آنے جانے والی بسوں کے نمبر پڑھ رہے تھے اور یہ اندازہ لگا رہے تھے کہ یہ کمبخت کب ٹلے گا اور کب وہ سامنے کھڑی لکھنؤ والی بس پر لپک کر چڑھ جائیں گے۔

رضوان الحق نے توقع سے بھی زیادہ تیزی سے … کیا۔ جس دن انھوں نے چھٹی لی، اسی دن رات کو رضوان الحق کے یہاں سے کتابوں سے … بیٹھا تھا۔ انھیں دن کی پوری خبر تھی۔ دن میں دفتر میں کملا کانت ورما کے کمرے میں جو میٹنگ ہوئی، اس میں رضوان الحق بھی موجود تھا۔ انھوں نے پہلے تو سب سے کہا کہ چپراسی کو ڈانٹ کر واپس جانے کو کہا، پھر یہ سوچ کر کہ دشمن کے کیمپ کا ایک آدمی ٹوٹ کر آیا ہے، کچھ تو معلومات ہی دے گا، سب رکھ لیے۔ دوسرے دن صبح رشبھ چرن رضوان کو لے کر ان کے بنگلے پر آیا تو بھوک چند کی شرطیں پکی ہو گئیں۔ رضوان سے ہی کملا کانت کے لکھنؤ جانے اور مہمات … کی ساری خبریں ملی تھیں۔ یہی رضوان آج ان کے اوپر جاسوسی کر رہا ہے۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ آج کملا کانت کے گدی پر قابض ہونے کے بعد رضوان اپنی ساری وفاداریاں ان کے دربار میں پیش کر آیا تھا اور اب یہاں سے سیدھے وہ ان تمام معلومات کے ساتھ کملا کانت کے گھر جائے گا کہ بھوک چند لکھنؤ روانہ ہو گئے ہیں۔

"بڑے صاحب، لکھنؤ جا رہے ہیں کیا؟"

"نہیں... نہیں..." بھوک چند نے گھبرا کر اپنی نگاہ لکھنؤ والی بس سے ہٹائی۔

پان بیچتے بیچتے انھوں نے رضوان الحق کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تولا۔ کتنا پتا ہے اس بدمعاش کو؟ کیا یہ جانتا ہے کہ کملا کانت نے راجدھانی میں اپنا … ہے؟ اس کی ناک کا بال تھا یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کو معلوم نہ ہو کہ کملا کانت لکھنؤ سے چل چکا ہے اور اب ادھر آنا … پہنچنے والا ہوگا۔ چونک بھوک چند کا ماتھا ٹھنکا۔ ایسا تو نہیں کہ کملا کانت ادھر آ ہی چکا ہو۔ انھوں نے آنکھیں

جھنکاتے ہوئے سامنے والے کو تو... ان کی نگاہوں کے وار نے رضوان حق کو تھوڑا گڑبڑا دیا۔

جہاں تک یہ معاملہ ہے، بھوک چند کو پتہ تھا کہ لکھنؤ جانے والی بسیں لاری اڈے سے چلتی ہیں اور جانے کتنا وقت لگتی ہیں۔ یہ ابھی تو بس سے زیادہ ضروری تھا کہ کملا کانت کے ان سوالوں کو یہاں سے دفع کیا جائے۔ انہوں نے آتے ہی سے سمجھ لیا ہوگا، میری بگی چال کے بارے میں معلوم کرنے گئے ہیں۔ یہاں تو بہانہ تھا۔

"اصل میں واقف کے ایک میرے بھائی ہیں بریلی میں۔ ان کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ ان کی طبیعت کچھ سیریس ہے۔ واقف بنارس میں ہیں۔ میں نے کہا، ویکلی جاؤ، پر صاحب لیڈیز کہاں مانتی ہیں۔ مجھے ہی جانا پڑ رہا ہے۔ کام تو آپ جانتے ہی ہیں، استعفیٰ ہو چکا ہے۔ پر وہ بڑی مشکل سے تاکہ سارا فضل یک طرف، جورو کا بھائی ایک طرف..." ہنسی کا دورہ تھمتے ہی بھوک چند نے ہی طریقوں سے اشارہ دیا کہ وہ چلا جائے، مگر اس نے جو کچھ کہا، اس کا مطلب یہ تھا کہ ہاتھ سے خبر نکل جاتی ہے کہ وہ بڑے صاحب کو گاڑی میں چڑھا کر ہی گھر کا رخ کرے۔ پھر گھر جلدی جا کر رضوان حق کرے گا بھی کیا؟ لیلیٰ، یعنی رضوان حق کی بیوی، آج کل یہاں ہے نہیں۔ کسی کی بیوی یہاں ہے یا نہیں، اس میں بھوک چند کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں تھی، اس لیے وہ چپ چاپ رضوان حق کو بریلی والی بس میں اپنا سامان چڑھاتے دیکھتے رہے۔ لکھنؤ والی بس روانہ ہو گئی تھی۔ تیوری پر گراب کیا بھی کیا جا سکتا تھا! غنیمت تھی کہ انہوں نے ساتھ کو رانے بریلی میں بتایا، بنارس جاتی ہیں لکھنؤ والی بسیں راستے بریلی ہو کر جاتی تھیں۔ تھوڑی مشکل ضرور ہوئی، پر راستے بریلی اتر کر پھر لکھنؤ کی بس پکڑ لیں گے۔

بھوک چند نے کنڈکٹر سے ٹکٹ خریدتے ہوئے رضوان حق کو دیکھا۔ لکھنؤ والی بس حرکت کر رہی تھی۔ کمبخت اگر چلا جائے تو وہ سامان اتار کر اس بس میں چڑھ سکتے ہیں، پر رضوان حق انہیں بس میں بیٹھا کر، آخری بار پان کھلا کر جب اترا، جب تک لکھنؤ کی بس جا چکی ہوئی تھی ۔۔۔ بھوک چند کے صبر کا پیمانہ اتنا لبریز ہو گیا تھا کہ اپنی بردباری برقرار رکھتے اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بھی ان کے منھ سے نکل ہی گیا: "کملا کانت کب آئے؟"

"جی... جی... جی..." اس کا جواب سننے سے زیادہ بھوک چند کی دلچسپی رضوان حق کا چہرہ

Scanned with CamScanner

دیکھنے میں تھی۔ انھیں زیادہ دیر یہ حرکت بھی نہیں کرنی پڑی تھی۔ جلد ہی بس چل پڑی۔

کمرے میں زور کا قہقہہ لگا، تب جوگ چند کو پتا چلا کہ بیتال پورہ کے زمیندار کا قصہ ختم ہو گیا تھا۔ وہ مقدمے کے میرٹ پر دیے جانے والے فیصلے کے تیوں سے ہی کس قدر لطف اندوز ہو رہے تھے کہ بیان سے باہر۔ ہندوستانی دیس کی پرانی روایت یہاں بھی زندہ تھیں۔ لوگ غیر حقیقی تصورات میں رہتے تھے۔ مقدمے کا فیصلہ میرٹ پر بھی ہو سکتا ہے، یہ بھی ہنسنے کے لیے بہت تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو جوگ چند بھی ہنستے، پر یہاں تو انھیں یہ لگ رہا تھا کہ قصہ ابھی تک بیچ میں ہی سنایا جا رہا ہے۔ پتا نہیں یہ اس کا وہم تھا یا حقیقت کہ انھیں قصے کے دوران لگاتار کوشک کی آنکھیں اپنے اوپر گڑی نظر آ رہی تھیں۔

کوشک کمرے میں بیٹھے بیٹھے جو معلومات بیچ بیچ میں لوگوں کو فراہم کر رہا تھا، اس کے مطابق منتری جی دس بجے ہوائی اڈے پر پہنچیں گے اور وہاں سے سیدھے سیکریٹریٹ آئیں گے۔ اس کے بعد ان کی خبریں مبہم تھیں۔ کسی کو اس نے بتایا کہ شام کو کابینہ میٹنگ چار بجے سے ہے، کسی کو چھ بجے سے۔ کیبنٹ سے متعلق اور دوسرے معاملات وغیرہ کی خبریں کچھ اس طرح گڈمڈ ہو گئی تھیں کہ وہاں موجود کوئی بھی آدمی وثوق سے ان کے وقت، جگہ یا مصروفیات کے بارے میں تعین کرنے سے قاصر تھا۔ جوگ چند کے لیے ضروری تھا کہ منتری جی کا صحیح پروگرام انھیں معلوم ہو، تبھی اگلے مورچے کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔ اتنی بھیڑ میں کوشک سے براہِ راست کسی قسم کی معلومات حاصل کرنا نہایت مشکل تھا۔ وہ صرف اس کے سامنے بیٹھے مسکرا سکتے تھے یا بیتال پورہ والے قصے پر ہنسنے کی کوشش کر سکتے تھے مگر اس سے تو کام نہیں چل سکتا تھا نا۔ وقت کم تھا، اگر دو تین دن کے اندر کلکٹر کی چٹھی بھیجے اس کی آخری تاریخ میں ہولی تو پھر ان کی وہی مشکل ہوتے ہوتے ناممکن ہو جائے گی۔ یہاں بیٹھے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا، وہ باہر نکل آئے۔

کمرے کے باہر چوڑی گیلری کا برآمدہ تھا۔ برآمدہ ایک وسیع و عریض عمارت کو سانپ کی کنڈلی کی طرح اپنی جیبت میں لیے ہوئے تھا۔ باہر تیز دھوپ تھی اور اندر ایئرکنڈیشنڈ کمرے کی ٹھنڈک پچھواں طرح نکلی۔ جوگ چند تیزی سے ڈائرکٹر کی طرف بھاگے۔ پھر وہ جس کمرے میں گھسے، وہ بہت چھوٹا تھا اور اس میں دو بوڑھے بابو فائلوں پر کچھ کھٹ کھٹ کر رہے تھے۔ کمرے میں ایک چھوٹی سی

تپائی پر جوٹھے کپ، گلاس اور پلیٹیں پڑی تھیں۔ ایک کونے میں ایک واٹر کولر تھا جس کی ٹونٹی سے پانی کی پتلی سی دھار بہہ رہی تھی۔ دونوں بابوؤں کے سامنے میز چار کرسیاں پڑی تھیں جن پر اس وقت کوئی بیٹھا نہیں تھا۔ جیسا کہ اس عمارت کا دستور تھا، بھوک چند بغیر کسی تکلف کے ایک پر بیٹھ گئے۔ مگر خلاف دستور ایک بات ہوئی۔ بابوؤں میں سے ایک انھیں دیکھ کر مسکرایا۔ خلاف دستور دوسری بات یہ ہوئی کہ اس بابو نے انھیں چائے کے لیے پوچھا۔

بھوک چند بغیر کسی طرح کی حیرت کا اظہار کیے چہرے پر مسکراہٹ لائے اور بابو کو تولتے رہے۔ وہ کم و بیش اس عمارت کے مستقل مسافر تھے اور یہ طے تھا کہ بابو ان سے کہیں نہ کہیں ٹکرایا ضرور ہے، پر کہاں؟ انھوں نے اپنے ذہن پر زور ڈالا۔

بابو نے جس چپراسی کو چائے کے لیے کہا تھا، اس نے اس تشفی سے انھیں نجات دلا دی۔

یہ تو وہی چپراسی تھا جو اندر کوشک کے بلانے پر آ جا رہا تھا۔ وہ جس کمرے میں گھسے تھے، وہ منتری جی کے اسٹاف کا ایک کمرہ تھا۔ منتری جی چونکہ بہت ہی اہم منتری جی تھے، اس لیے ان کے اسٹاف کو دو کمرے ملے ہوئے تھے۔ ایک میں کوشک کا راج پاٹ پھیلا ہوا تھا اور دوسرے میں باقی اسٹاف بیٹھتا تھا۔ کوشک کا کمرہ منتری جی کے کمرے سے ملا ہوا تھا اور بہت ہی اہم شخصیات کو چھوڑ کر، دوسرے سارے آنے والوں کو منتری جی سے ملنے سے پہلے اس کے کمرے سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ اس کا کمرہ منتری جی کی غیر موجودگی میں ملاقاتیوں کے لیے ویٹنگ روم کا کام بھی دیتا تھا۔ اس چھوٹے کمرے میں بھی بھوک چند دو بار آئے تھے، پر آج باہر کی گرمی کی مار نے ان کی یادداشت کو بھی اس طرح پگھلا کر رکھ دیا تھا کہ انھیں اپنی یادوں کو سمیٹنے میں کچھ دیر لگی۔

چیف منسٹر لوگ جب کابینہ بناتے ہیں تو کچھ کیبنٹ منسٹر مقرر کرتے ہیں۔ ان کیبنٹ منسٹروں کی مدد کے لیے کچھ اسٹیٹ منسٹر یا ڈپٹی منسٹر مقرر کر دیے جاتے ہیں۔ یہ جونیئر منسٹر اپنے سینئر منسٹروں کی مدد کے لیے قرار دیے جاتے ہیں، پر کیبنٹ منسٹر اپنی مدد آپ کا نعرہ لگاتے ہوئے اس میں اس قدر یقین کرنے لگتے ہیں کہ وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتے، لہٰذا اکثر ریاستوں میں یہ حکم جاری ہو جاتا ہے اور چھوٹے منسٹروں کے پاس فائلیں پہنچتی ہی نہیں ہیں، سیدھے بڑے منسٹر کے پاس چلی جاتی ہیں۔ چھوٹے منسٹر شروع شروع میں افسران پر رعب گانٹھنے کی کوشش کرتے ہیں، جو چیف منسٹر

Scanned with CamScanner

کے پاس روتے گاتے جاتے ہیں اور آخر میں ہار کر اپنے کمرے میں، دکھی ہو کر، اپنے وزیروں، مصاحبوں اور چمچوں کے بیچ گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کر اپنے منسٹر یا چیف منسٹر کو کوستے رہتے ہیں۔ ان کے گرد بیٹھنے والوں کا جماؤ بھی کم نہیں ہوتا کیونکہ فائلیں بھلے ہی ان کے پاس نہ پہنچیں، چائے سموسوں کی ترسیل میں کبھی کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی۔ کئی بار سرکاری خزانہ خالی ہونے کی دہائی دے کر چیف منسٹر یا کیبنٹ منسٹر چائے سموسوں کی ترسیل کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں، پر اسٹیٹ منسٹر چائے سموسے بند ہوتے ہی "سموسہ نہیں تو فائل نہیں" کا ایسا احتجاجی شور برپا کرتے ہیں کہ چیف منسٹروں کو یہ زیادہ فائدہ مند سودا لگنے لگتا ہے کہ اسٹیٹ منسٹروں کو چائے سموسوں کی سپلائی لائن پھر سے جوڑ دی جائے۔

اسٹیٹ منسٹروں کی ہی طرح چھوٹے موٹے بابوؤں کا بھی ایک دبا کچلا طبقہ ایسا ہوتا ہے جو اسسٹنٹ پی اے کا کام کرتا ہے اور پی اے لوگوں کو ملائی کھاتے دیکھ کر ان کی ہنڈیاں پھوڑنے کے فراق میں رہتا ہے۔ یہ لوگ بھی ملک کے ان بدقسمت لوگوں میں ہوتے ہیں جو کام کرنے کے لیے بے چین رہتے ہیں، پر ان کے آقا انھیں کام نہیں دینا چاہتے۔ یہ لوگ صبح سویرے دفتر آ جاتے ہیں اور رات تک وہیں جمے رہتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے منتری جی کے اردگرد کا چکر بھی لگاتے ہیں۔ کئی بار مکھیوں کی طرح اڑا دیے جانے کے بعد چراغ کے جن کی طرح "کام... کام..." چلانے لگتے ہیں۔ اس پر بھی بات نہیں تھی کیونکہ جن کے پاس تو یہ آپشن بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی اسے کام نہ دیتا تو وہ اسے کھا جاتا۔ لیکن ان بدقسمت بابوؤں کے پاس ایسی کوئی تدبیر نہیں ہوتی۔

بنوک چند سمجھ گئے کہ وہ ایک ایسی ہی بدقسمت مخلوق کے پاس بیٹھے ہیں جس کے روئیں روئیں سے "کام... کام..." کی آوازیں آ رہی ہیں اور کام ہے کہ پاس پھٹک ہی نہیں رہا۔ پر اس دلچیدرے نے انھیں چائے پلانے کے لیے کیوں سوچا؟ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے، انھیں یہ جو سوال پوچھنے چاہیے تھے، پر وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ کمرے میں موجود دوسرا بابو کتنا دکھی تھا۔ اس موقعے پر انھوں نے وہی کیا جو عام طور پر ہندوستانی کرتے ہیں۔ وہ چائے پیتے پیتے مسکرانے لگے۔

بابو نمبر ایک بھی مسکرایا اور اس نے چائے کی ایک پیالی بابو نمبر دو کے آگے بڑھا دی۔ بابو نمبر دو بھی مسکرایا۔ بنوک چند سمجھ گئے کہ دونوں ہی دکھی ہیں۔ اب بات آسان ہو گئی۔

دونوں بابوؤں نے ایک دوسرے کو مخاطب کیا تو بات اور آسان ہو گئی۔ دونوں بابو برہمن

تھے۔ بُوک چند بھی برہمن تھے، اس لیے تینوں نے ایک دوسرے کو ''پنڈت جی'' کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا۔ اس مخاطبت کی گہرائی سے پھوٹتے ہوئے جو چشمے ہوتے ہیں وہ رستے بہنے لگے۔ انھوں نے اجنبیت کے سارے دھندھیا چل دھو دیے اور جب وہی چپراسی جو تھے برتن اٹھانے آیا تو اسے محسوس ہوا کہ بُوک چند بھی اس کمرے کا اتنا ہی حصہ ہیں جتنے یہ دو بابو۔

اس کے بعد بُوک چند نے عیب جوئی اور حسد جیسے ہتھیاروں کا ایک ساتھ استعمال کیا، جن کے بارے میں ان کا تجربہ تھا کہ یہ کبھی خالی نہیں جاتے۔ آج بھی ان کا وار کارگر ثابت ہوا۔ انھوں نے کوشک کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو پوچھا جس کا مطلب یہ جاننا تھا کہ اس کمرے میں بیٹھنے والا شخص بھی کیا ان میں سے ہی ہے۔

جواب میں جو اطلاعات موصول ہوئیں، ان کے مطابق وہ شخص، یعنی کوشک، ان میں سے ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ شخص لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے اپنے نام کے آگے کوشک لگاتا ہے۔ اس کی اقدار، اس کے خیالات ایسے ہیں کہ وہ برہمن کیسے ہو سکتا ہے؟ چونکہ یہ تینوں یوپی کے ہیں اور وہ پنجاب کا ہے، اس لیے فطری بات ہے کہ وہ نیچ اور لالچی ہے۔ اس لیے وہ دونوں انھیں منھ نہیں لگاتے اور ان کے صحیح مشورے کے مطابق بُوک چند کو بھی اسے منھ نہیں لگانا چاہیے۔

کوشک کہانی سننے کے بعد بُوک چند نے صرف اتنا کہا، ''تبھی تو...''

اس چھوٹے سے جملے کے بہت سے معنی نکالے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں بابوؤں نے اس کا وہی مطلب نکالا جو وہ چاہتے تھے یعنی ''تبھی تو کوشک کے طور طریقے ایسے ہیں۔''

اس کے بعد کی گفتگو سرگوشی میں تبدیل ہو گئی۔ یہ سرگوشی کچھ کچھ پارٹی آفس میں کی جانے والی خود کلامی کی طرح تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہاں پورا ہال اسے سنتا تھا، یہاں کمرے میں چونکہ صرف تین ہی کردار تھے، اس لیے صرف وہی سن رہے تھے۔ بیچ بیچ میں چپراسی کمرے میں آ جاتا تھا تو وہ بھی سن لیتا تھا، مگر اسے سن کر خاموش رہنے کی عادت تھی۔ اس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ تبھی بولتا ہے جب وہ بولنا چاہتا ہے۔ وہ نہ بولے، اس کی ترکیب دونوں بابو جانتے تھے۔ انھوں نے کچھ نکے بندھے جملے ٹکڑوں میں کہے اور نتیجہ جب وہ تینوں اٹھے تو بُوک چند کو چپراسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنا ہی پڑا، ''اور، بچے کیسے ہیں اپادھیائے جی؟''

اپادھیائے جی نے دونوں ہاتھ جوڑے اور آنکھیں موند کر سر آسمان کی طرف تان دیا، جس کا مطلب صاف تھا کہ اوپر بھگوان ہے جو ان کے بچوں کی دیکھ بھال کرتا ہے اور اسی دیکھ بھال کے لیے وہ بنوک چند جیسی مخلوق کو وسیلہ بنا کر بھیج دیتا ہے۔

بنوک چند نے ان افسروں کی شان میں کچھ قصیدے پڑھے جنھوں نے دفتر میں چپراسی کی جگہ پر بھی کسی شودر کو نہیں گھسنے دیا اور بتایا کہ اسی طرح وہ اپنے دفتر میں تو جمعدار کی نوکری بھی صرف برہمنوں کو ہی دیتے ہیں؛ یہ بات اور ہے کہ اس کے دفتر میں کوئی برہمن چپراسی یا جمعدار اپنا کام خود نہیں کرتا اور اپنی تنخواہ کا چوتھائی دے کر دوسروں کو کام پر رکھ لیتا ہے۔

"مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔"

بنوک چند نے سر ہلا دیا۔ اپادھیائے نے مہنگائی کی وجہ سے اتنی بڑی قربانی دی تھی کہ برہمن ہو کر چپراسی کا کام کر رہا تھا اور اس نے اپنی جگہ کسی شودر کو نہیں رکھا تھا اور اس لیے اس کے بچوں کو مٹھائی کھانے کے لیے بنوک چند کو دوبارہ جیب میں ہاتھ ڈال کر دس کے دو نوٹ نکالنے پڑے۔

اپادھیائے خوش ہو گیا اور اس نے پھر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ وہ دل کا نہیں بھگوان کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس بات کا بنوک چند نے برا نہیں مانا۔ بھگوان خوش نہ ہوتا تو وہ اس کمرے میں کیسے آتے؟ وہ اس کمرے میں نہ آتے تو اپادھیائے کو بیس روپے کیسے ملتے اور اس کی ان دونوں دکھی بانہوں سے ملاقات کیسے ہوتی؟ انھوں نے بھی چپراسی کی طرز پر دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور بیوشبر یک کو لے کر باہر نکل گئے۔

باہر بھی دھوپ میں تیزی تھی مگر سیکریٹریٹ کے برآمدوں سے گزرنے میں پہلے جیسی گھبراہٹ نہیں ہوئی۔

"آیئے، کہیں چائے پیتے ہیں۔"

بنوک چند نے تبسم کر بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے کچھ فاصلہ قائم رکھتے ہوئے چل رہی تھی۔ اس کے چہرے سے اجنبیت پوری طرح ٹپک رہی تھی کہ اگر کوئی تیسرا دیکھتا تو اسے لگتا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔

"کہیں چائے پی جائے۔"

Scanned with CamScanner

بھوک چند نے اپنی چال دھیمی کی لیکن بابو نے اپنی چال اور دھیمی کر دی۔ مطلب صاف تھا کہ بابو نہیں چاہتا تھا کہ وہاں سے گزرنے والا کوئی شخص یہ سمجھے کہ وہ دونوں ساتھ جا رہے ہیں۔ بھوک چند نے اپنی چال بڑھا دی۔

سیکریٹریٹ کی راہداریاں کسی بھول بھلیوں سے کم نہیں تھیں۔ بھوک چند سیکڑوں بار یہاں آئے تھے اور ہر بار کی طرح آج بھی راستہ بھول گئے۔ وہ کچھ ٹھٹھک کر باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہے تھے کہ ان کے پیچھے سے بابو انھیں کہنی مارتا ہوا آگے نکل گیا۔ وہ اس کے پیچھے لپک لیے۔ دونوں جب باہر نکل آئے تبھی بابو ان سے مخاطب ہوا۔

"ہاں سر، بتائیں، کیا حکم ہے؟"

"کہیں بیٹھ کر چائے پی جائے۔"

"کہاں چلیں؟"

بھوک چند نے سیکریٹریٹ کی کینٹین کی طرف اشارہ کیا۔ بابو نے چہرے پر خوف طاری کرتے ہوئے کہا، "سر جی، یہاں دیواروں کے بھی آنکھ کان ہیں۔"

"پھر؟" کے جواب میں بابو نے جس ریستوران کا نام لیا، وہ راجدھانی کے اکلوتے پانچ ستارہ ہوٹل کا حصہ تھا۔ بھوک چند ایک لمحے کو تو گھبرا گئے، انھوں نے بابو کو نظروں سے تولا، وہ اس فیصلے پر پہنچے کہ بابو اس لائق تو نہیں ہے کہ اسے کسی پانچ ستارہ ہوٹل میں لے جایا جائے، پر یہ ہے کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ اندر دونوں بابوؤں سے جو باتیں ہوئی تھیں، اس سے یہ امید بندھی تھی کہ بابو کسی ایسے شخص کو جانتا ہے جو چیف منسٹر کے بہت قریب ہے، اور اتنا قریب ہے کہ ان کے منتری [illegible] کی چیف منسٹر سے منوا سکتا ہے۔ یہ بابو علی بابا کے کھل جا سم سم کی طرح کوئی منتر جانتا تھا اور اسی منتر سے ان کی قسمت کا تالا کھل سکتا ہے، اور اس منتر کو جاننے کے لیے انھیں اسے پانچ ستارہ ہوٹل لے جانا پڑے گا، فرار کا کوئی راستہ نہیں۔ اس لیے وہ بابو کو لے کر پارکنگ کی طرف بڑھے جہاں ان کی کار کھڑی تھی۔

Scanned with CamScanner

کمرہ کوئی بڑا نہیں تھا لیکن چیخ رنگوں کے غلاف چڑھے صوفہ سیٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ کمرے میں دو کھڑکیاں تھیں اور دو دروازے۔ ان پر بھی تیز رنگ کے پردے لٹک رہے تھے۔ خوشحالی ابھی اس گھر کے مکینوں کی زندگی میں نئی نئی آئی تھی، اس لیے دروازوں اور کھڑکیوں کے دونوں طرف ایک ایک کیل گاڑ کر اور ان میں اسپرنگ باندھ کر پردے لٹکا دیے گئے تھے۔ ایک کو چھوڑ کر باقی سارے اسپرنگ ڈھیلے پڑ گئے تھے، اس لیے پردے لٹک کر زمین میں لتھڑ رہے تھے۔ فرش پر گہرے سرخ رنگ کا ایک قالین بچھا ہوا تھا جس نے صوفوں سے گھری زمین کو چھوڑ کر سارے فرش کو ڈھانک رکھا تھا۔ جیسا کہ راجد ھانی کے ایسے کسی کمرے میں ہونا چاہیے تھا، یہاں بھی پورا کمرہ ٹھساٹھس بھرا ہوا تھا، اور اس ٹھساٹھس بھرے کمرے میں ہوک چند بھی تین کے لیے بنے ایک صوفے پر پانچویں سوار کے روپ میں بیٹھے تھے، اور وہی سب کر رہے تھے جو دوسرے لوگ کر رہے تھے۔

یہ لوگ زور زور سے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ ایسے مقام اور موقعوں پر باتیں کم کی جاتی ہیں، خود بخود زیادہ ہوتی رہتی ہیں۔ یہاں باتیں زبان سے زیادہ پھیپھڑوں سے کی جاتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ لوگ اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے شخص سے ہی باتیں کریں، کمرے میں ٹھنسے ہوئے لوگ دائیں بائیں آڑو بازو، سامنے پیچھے غرض یہ کہ کسی بھی سمت میں بیٹھے شخص سے مخاطب ہو سکتے ہیں۔ بات کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ آپ جس سے مخاطب ہیں اسے جانتے بھی ہوں؛ یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک وقت میں ایک ہی شخص کو مخاطب کیا جائے۔ آوازیں کسی گیند کی طرح آڑی ترچھی ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی ایک کونے سے دوسرے کونے میں اچھل رہی تھیں۔ اکثر گیند اچھالی کسی کے لیے جاتی تھی، اسے لپک کوئی اور لیتا تھا، اور پھر وہ اپنے طریقے سے کسی تیسرے کے لیے اچھال دیتا تھا۔

Scanned with CamScanner

افسر کے لیے یہ شرمناک مانا جاتا ہے کہ وہ محض کرتا پاجامہ پہنے ہوؤں کے ساتھ عمومی طور طریقہ اپنائے یا جیسے ہو ۔۔۔ اپنے کمرے میں یا دفتر کے گھر میں وہ ان کے سامنے پسر سکتا ہے۔ اس کے روزمرہ کی چٹکلوں پر پھیکی ہنسی کھا کر قہقہہ لگا سکتا ہے، سامنے والے کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی "یس سر... جی سر..." کے انداز میں سر ہلا سکتا ہے، پر عام جگہ یعنی پبلک پلیس پر سنجیدگی اس کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔ آج بھی اس کمرے میں کچھ لوگ باوجود اس گہما گہمی کے خاموش، غیر جانبدارانہ انداز میں بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں دیواروں پر، پنکھوں پر یا پردوں پر ٹنگی ہوئی تھیں۔ صرف غور سے کسی کے چہرے پر آنکھیں ٹکانے سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ کمرے میں چل رہی حرکات و سکنات کو نہ دیکھنے کا دکھاوا کرنے والی ان کی آنکھیں کمرے میں ہو رہی ساری باتوں، واقعات اور اس چیز پر جمی ہوئی تھیں جو ان کے اپنے مطلب کی تھی۔ کچھ نہ سننے کا تاثر پیدا کرنے والے ان کے کان ہر دلچسپی کا حظ پکڑ رہے تھے۔ قہقہوں پر غیر جانبدار رہنے والے ہونٹ دھیمے سے جھکنے پر پھڑپھڑاتے نظر آتے تھے۔ یہ افسر لوگ تھے۔ غیر جانبدار انداز سے کمرے میں بیٹھے لوگوں میں کچھ چند بھی تھے جو مستقل یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ اس کمرے میں اپنی خوشی سے نہیں بلکہ دھکیل کر لائے گئے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے پہلو میں بیٹھے کرتے پاجامے میں ملبوس شخص کو بھی اس طرح نظرانداز کر رہے تھے جیسے کہ وہ اسے جانتے ہی نہیں، جبکہ گھوڑے جیسے بے ڈھنگے، کھچڑی بالوں اور کچھ بچی مونچھوں والے، سفید کھادی کا کرتا پاجامہ پہنے ہوئے یہ شخص اگر نہ ہوتا تو وہ اس کمرے میں داخل ہی نہیں ہو سکتے تھے۔

یہ شخص انھیں کچھ ہی گھنٹے پہلے ملا تھا اور راجدھانی کی تاریخ اور جغرافیے کے بارے میں انھیں ایسی انمول معلومات فراہم کی تھیں جنھیں سن کر وہ حیرت زدہ ہو گئے تھے۔ اگر وہ افسر نہ ہوتے اور اس کمرے میں اپنے اوپر سنجیدگی طاری کرنے کی مجبوری نہ ہوتی تو اب تک وہ دو تین مرتبہ اس کے پیر چھو چکے ہوتے یا ہاتھ جوڑ کر اپنے پان بھرے منھ کو چلاتے ہوئے یہ ضرور کہتے کہ "شکرگزار ہوں گرو!" یہ سارے عمل ہوٹل سے اس گھر تک آنے کے دوران وہ کئی بار دہرا چکے تھے۔

اس نادرِ روزگار شخصیت سے ان کی ملاقات اس پانچ ستارہ ہوٹل میں ہوئی تھی جہاں وہ سیکریٹریٹ سے بابو کو لے کر پہنچے تھے۔

Scanned with CamScanner

ہوٹل جاتے وقت راستے میں بابو نے جو بتایا، وہ اگر ترتیب وار لکھا جائے تو کچھ اس طرح کے جملے بنیں گے: بابو انھیں شرما جی سے ملوائے گا۔ شرما جی اپنے ہی آدمی ہیں اور بابو تب سے انھیں جانتا ہے جب وہ راجدھانی میں نئے نئے آئے تھے اور بابو کے گھر کے پاس سبزی کا ٹھیلا لگاتے تھے۔

انھیں دنوں شرما جی کی آنکھ ایک ایسی خاتون سے لڑ گئی جو اس وقت کچھ نہیں تھی، پر آج پورے ملک میں اسے اس صوبے کی "منی چیف منسٹر" کہا جاتا ہے۔

اُن دنوں وہ خاتون بھی گردش میں تھی۔ اس کا پتی بے روزگار تھا۔ خاتون خوبصورت تھی اور بہت زیادہ بلند حوصلہ (ambitious) بھی۔

شرما جی نے اسے ادھار سبزیاں دیں، اس کی خوبصورتی کی تعریف کی اور اس کے بلند حوصلوں کو بھی بھڑکایا۔

راجدھانی میں اگر کوئی خوبصورت عورت ہو اور وہ بلند حوصلہ بھی ہو تو سیدھے سیاست کا رخ کرتی ہے۔

آج کی منی چیف منسٹر، جن کا نام سُمن ہے اور جنھیں لوگ بھابھی جی کے نام سے پکارتے ہیں اور جو اس وقت خوبصورت اور جوان دونوں تھیں، سیاست کی طرف بھاگیں۔ اور بقول بابو کے شرما جی جاتے پیچھے تو سبزی والے تھے لیکن زمینی حقائق پر ان کی اتنی مضبوط پکڑ تھی کہ ان کے بتائے ہوئے گُروں سے سمن صرف سیاست کی طرف بھاگیں ہی نہیں بلکہ سیاست کے اندر اتنی تیز دوڑیں کہ محاورے کی زبان میں دیکھنے والے دانتوں تلے انگلی دبائے دیکھتے رہ گئے۔

یہ خبریں بابو نے بٹوک چند کو ہوٹل پہنچتے پہنچتے راستے میں دی تھیں۔ راستے میں ہی ایک پی سی او کے پاس کار رکوا کے وہ اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد باہر آ کے کار میں بیٹھتے بیٹھتے اس نے بتایا، "شرما جی سے بات ہو گئی۔ قسمت اچھی تھی جو گھر میں مل گئے۔ مصروف تھے پر میں نے اصرار کیا تو مان گئے۔ آدھے گھنٹے میں ہوٹل پہنچ جائیں گے۔"

آدھے گھنٹے میں تو نہیں، ایک گھنٹے میں شرما جی ان لوگوں کے پاس پہنچ گئے۔ وہ لوگ جس جگہ پر بیٹھے تھے، وہاں سے اندر داخل ہونے کا دروازہ بابو کے سامنے پڑتا تھا۔ بٹوک چند کی پیٹھ اُدھر تھی۔ چائے پیتے پیتے اس نے دیکھا کہ بابو کا چہرہ کھل اٹھا۔ مطلب صاف تھا کہ اندر داخل ہونے والے

Scanned with CamScanner

دروازے پر شرما جی ظاہر ہو چکے تھے۔ بھوک چند نے گھوم کر دیکھا۔ راجدھانی کی مخصوص پہچان یعنی کھادی کے کرتے پاجامے، بے ترتیب گھنگھریالے بالوں والا چالیس پینتالیس سال کا ایک شخص ہاتھ میں سیور فون لیے ریستوران میں داخل ہو رہا تھا۔ وہاں کے کام کرنے والے اسے سلام کر رہے تھے اور وہ اپنے ہاتھوں سے ان کے سلام کا کچھ ایسے جواب دے رہا تھا کہ اگر کوئی چاہے تو یہ بھی سمجھ سکتا تھا کہ اس کی دلچسپی ان مکھیوں و ذرّات میں تھی جو اس ایئر کنڈیشنڈ ہال میں تھیں ہی نہیں۔

شرما کی شخصیت میں کچھ مقناطیسی اثر ایسا تھا جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس نے بیٹھتے ہی بے تکلفی سے پوچھا، "اور اپادھیائے جی، کیا حال چال ہے؟... مسٹر رندھاوے کا نسخہ یہ دکھا ہی دیا... آپ جیسے بھلے آدمی اس کی مار میں آ گئے۔"

بھوک چند عرف اپادھیائے جی نے آنکھیں جھپکائیں اور اس کی طرف دیکھا۔ نوکرشاہی کا اصول ہے کہ اگر سامنے والا شخص کارآمد نہ ہو تو اس کے ساتھ بے تکلف نہیں ہوا جا سکتا، اور اگر وہ کام کا ہے تو اس کے آگے پوری طرح بچھ جانا چاہیے۔

ابھی اس بات کا فیصلہ ہونا باقی تھا کہ گھوڑے جیسے منہ والا، سفید براق جیسی کھادی کے کرتے پاجامے میں ملبوس اور کھانے اگلتے جسم کی چغلی کرنے والی ہلکی سی توند والا، شرما نام کا یہ شخص کس حد تک کارآمد ثابت ہوگا۔

بیٹھتے بیٹھتے شرما نے ان اطلاعات کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیا۔ وہ تو اسے بابو سے بھی مل سکتی تھیں جب وہ اسے پی سی او سے فون کرنے گیا تھا۔ اس سے ابھی تک اتنی بے تکلفی نہیں کی جا سکتی تھی۔ بھوک چند صرف ہلکے سے مسکرائے اور شرما کو تولتے رہے۔

"ارے یہ سسرا کانسٹبل بڑی اونچی کھوپڑی کا ہے۔ آپ سیدھے سادے آدمی ہیں۔ منسٹر نے سب سے پہلے کوشک کو پکڑا۔ اس نے تو اس پی ڈبلیو ڈی منسٹری کے بیڈروم میں گھس پیٹھ کر رکھی ہے۔ ارے آپ نہیں جانتے اس کوشک کے بچے کو... وہی کوشک جو آپ کے منسٹر کا پی اے ہے۔ سالا منسٹر کے کچن سے لے کر بیڈروم تک کا انتظام کرتا ہے۔ اسی نے ساری گڑبڑ کی۔ آپ تو اپنا آرڈر لے کر چلے گئے اور ادھر للّو بھائی آ کر بیٹھ گئے راجدھانی میں۔ اپنے منسٹر کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ ہر طرح کی کمزوری ہے وہاں... اب آپ سے کیا چھپانا، کوشک کرتا ہے سارے

Scanned with CamScanner

انتظام۔ کتنا پرمٹ ہو سب، ہمیں سب پتا ہے۔"

شرما پانی پینے کے لیے رکا۔ بھوک چند نے اسے ایک بار ٹوکنے کی کوشش کی لیکن اب ان کو اپنی آنکھوں پر شک ہونے لگا تھا۔ تنی معلومات بابو پی سی او سے نہیں دے سکتا تھا۔ اس نیتا کے سامنے بچ بچ سکتا تھا۔ انھوں نے ہونٹ پھیلائے اور پان سے رنگے کتھئی دانتوں کی نمائش کی۔ "اب یہاں آپ سے کیا چھپا رہ سکتا ہے؟"

بابو کو لگا کہ یہاں تو دونوں فریقوں میں براہ راست گفتگو کی گنجائش بن رہی ہے۔ "اب تیرا کیا ہوگا کالیا" والے انداز سے وہ بھی اسٹیج پر کود پڑا۔

"راجدھانی میں دن بھر کیا ہوتا ہے، سب کی رپورٹ شام تک شرما جی کو پہنچ جاتی ہے۔ اسی لیے تو میں نے کہا کہ ایک بار شرما جی کے دربار میں بات پہنچ جائے، پھر بے فکر ہو کر ہم لوگ گھر بیٹھیں۔ شرما جی سب دیکھ لیں گے۔"

شرما جی نے ہوا میں ہاتھ سے مکھی مارنے کی کوشش کی۔ بھوک چند نے چاروں طرف مکھی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ سامنے ایک بیرا آ کر کھڑا ہو گیا تب ان کی سمجھ میں آیا کہ شرما کی یہ خاص ادا ہے جسے اس ہوٹل کے بیرے بھی پہچانتے ہیں۔

بیرا صرف "یا" نہیں، شرما سے اپنی زبان، آنکھ اور ٹھوڑی کے اشاروں سے جتنا کچھ سمجھا، اس سے زیادہ وہ اپنی پنسل سے کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھتا رہا۔ بھوک چند کی سمجھ میں صرف اتنا آیا کہ انھیں پوری کارروائی کے بعد کافی کچھ بھگتان کرنا پڑے گا، پر اب انھیں کھل نہیں رہا تھا۔ جس طرح کی خبریں شرما کے پاس تھیں اور جتنے یقین کے ساتھ وہ راجدھانی کے بڑے لوگوں کے نام لے رہا تھا، اس سے بھوک چند کو لگا کھانے پینے کی اشیا کی جو لمبی فہرست بیرے نے نوٹ کی تھی، وہ تنی لمبی نہیں تھی جتنی اس کی پنسل چلتے وقت لگ رہی تھی۔

"اس مہینے میں کملا کانت کا تبادلہ کرانے کا کیا مطلب؟ ارے آپ کو تو مارچ اپریل میں ہی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ اب تک تو فصل پک کر تیار ہو گئی، اب کٹنے کا وقت آیا ہے تو آپ ڈگری کر کسان کو دکھا رہے ہیں کہ بھئی کھیت تمھارا نہیں ہے۔ ایسے میں تو کسان لڑے گا ہی۔ کیوں بھائی، میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" اس نے بابو کی طرف دیکھا۔

Scanned with CamScanner

بابو کا دھیان میز پر رکھنے والی پلیٹوں کی طرف تھا جنھیں بیرا دھیرے دھیرے میز پر سجا رہا تھا۔ شرما کو اپنی طرف مخاطب ہوتے دیکھ کر وہ سٹپٹا گیا۔ پھر منھ میں تھوک نگلتے ہوئے اس نے کہا، "ارے شرما جی، ہم بھی تو کسان آدمی ہیں۔ کون سالا فصل پکنے کے بعد ہمارے کھیت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے گا۔ سالے کی آنکھ نکال کر... اس میں ڈال دیں گے۔" بابو پانچ ستارہ ہوٹل سے خوفزدہ تھا۔ اگر سیکریٹریٹ ہوتا تو وہ اس اعضائے خاص کے نام بھی لے لیتا۔

بنوک چند نے کھنکھار کے کرسی پر کروٹ بدلی۔ بابو کو لگا اس نے شرما کے مطلب کی بات کہہ دی تھی۔ وہ پھر سے پلیٹیں گھورنے لگا۔

"یہی تو ہم بھی کہہ رہے ہیں۔ لڑائی میں ہمیں دشمن کی طاقت اور کمزوری کا برابر خیال رکھنا چاہیے،" کسی تجربہ کار، ماہر فوجی افسر کی طرح شرما نے صلاح دی۔ "اب آپ دیکھیے کہ پورے صوبے کو معلوم تھا کہ اس مرتبہ بارہ سالہ کمبھ لگنے والا ہے۔ چھوٹے چپراسی، میٹ بھی لاکھ دو لاکھ گھر لے آئیں گے۔ ایک درجن سے زیادہ ایگزیکٹو انجینئر دوڑ میں تھے۔ یہاں راجدھانی میں کھلی بولی ہو رہی تھی۔ پتا نہیں آپ اس بولی میں تھے یا نہیں؟" اس نے بنوک چند کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

بنوک چند نے آنکھیں جھکا لیں۔ یہ کمبخت جتنا جانتا ہے، اس میں اپنی طرف سے کچھ جوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے پلیٹ میں سے ایک پنیر پکوڑا اٹھایا اور منھ میں ڈال لیا۔ بابو کے لیے یہ اشارہ تھا۔ اس نے اپنی پلیٹ بھرنی شروع کر دی۔

"آپ سیدھے آدمی ہیں۔ آپ نہیں رہے ہوں گے، یا رہے بھی ہوں گے تو کسی صحیح آدمی کے پاس نہیں پہنچے ہوں گے۔ ہمارے پاس تو آئے نہیں۔ ایک چڑی مار آیا تھا بھگی جی کے پاس۔ لگا سودے بازی کرنے۔ ہم نے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ ارے ہم کوئی بنیا بقال تو ہیں نہیں کہ دکان کھول کر بیٹھے ہوں۔ ہم تو تعلقات بناتے ہیں اور پھر زندگی بھر ان کو نبھاتے ہیں۔"

بنوک چند نے اپنی پلیٹ بھر لی۔ اب تک کی گفتگو سے انھیں دو پیغام ملے تھے۔ شرما جب "ہم" لفظ کا استعمال کرتا تھا تو اس کا مطلب خود سے اور بھگی جی سے تھا۔ بھاگی جی وہی تھے جنھیں لوگ صوبے کی منی چیف منسٹر کہتے تھے اور جن کے بارے میں بابو نے انھیں بتایا تھا۔

پیغام یہ تھا کہ شرما کو صرف ایک ہی بار پے منٹ نہیں کرنا ہوگا، وہ زندگی بھر کا تعلق بناتا تھا یعنی نوکری کے باقی سال بھی اسے کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا۔

شرما نے اپنی پلیٹ میں کچھ نہیں لیا۔ سیدھے ہاتھ ڈال کر ڈونگے میں سے دو رس گلے نکالے اور گپ گپ منہ میں ڈال لیے۔ خوبصورتی یہ تھی کہ چاشنی اس کے ہاتھوں اور ہونٹوں سے چاروں طرف ٹپکی، پر اس کے سفید اجلے کرتے پاجامے پر ایک بوند نہیں گری۔ ہوک چند کے سامنے دو متبادل تھے۔ وہ شرما کے بڑے بڑے میلے ناخنوں والے ہاتھ کو چاشنی میں ڈوبنے اور پھر جوٹھی چاشنی کو چاروں طرف گرتے دیکھ کر اپنی طبیعت میں پیدا ہوئی گھن کو اپنے چہرے سے ظاہر کرتے یا پھر شرما کی اس چابکدستی پر کہ شیرے کی ایک بوند بھی اس کے سفید کپڑوں پر نہیں پڑی، گہرے تعریفی انداز میں مسکراتے۔ انھوں نے دوسرے متبادل کو چنا۔ دھیمی دھیمی مسکراہٹ چہرے پر لیے وہ انتظار کرتے رہے کہ کھانے کی کن اشیا پر شرما اب حملہ آور ہوگا۔ پر اس نے اپنی ہتھیلی الٹی کر کے اپنے منھ پر لگے ہوئے شیرے اور رس کی ٹپکتی لہروں کو پونچھا اور پھر دونوں ہاتھوں کو میز پوش سے پونچھ ڈالا۔

"میں نے کہا تھا بڑے صاحب، آپ سیدھے آدمی ہیں۔ آپ ہم لوگوں کے پاس آئے نہیں، اس سیتاپور والے فراڈ کے ساتھ گھومتے رہے..."

ہوک چند خاموشی سے شرما کو پانی پیتے دیکھتے رہے۔ سالا پورا گھاگ ہے۔ جانتا سب ہے، پر میرے منھ سے سننا چاہتا ہے۔

"ملاقات نے صحیح تالے کی صحیح چابی پکڑی..."

پھر انھوں نے اپنی اس کہاوت کی تشریح کی۔ راجدھانی میں الگ الگ تالے تھے اور ان کو کھولنے کے لیے الگ الگ چابیاں تھیں۔ صحیح چابی لگ جانے پر تالا کھل جاتا تھا۔ پی ڈبلیو ڈی منسٹری نامی تالے کی چابی کوشک نامی پی اے تھا۔

"پر گرو جی، آپ بھی کم نہیں نکلے۔ سالے کو ان ہی کے داؤں سے پٹخنی دے دی۔ کوشک سے ہی اس کا تبادلہ کروا دیا..."

اس مرتبہ شرما نے انھیں سیدھا آدمی نہیں کہا تھا اور انھیں کملا کانت کے برابر رکھا تھا اس لیے ہوک چند نے کرسی پر قدرے پہلو بدلا، پر چہرے پر وہی مسکراہٹ قائم رکھی جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ

Scanned with CamScanner

سامنے والا کہتا رہے، سننے والا سن بھی رہا ہے، نہیں بھی سن رہا ہے، اتفاق بھی کر رہا ہے اور مصلحت کوشی بھی۔ ضروری نہیں کہ ہر بات پر اتفاق رائے ہو۔

''ہمیں سب پتا ہے سرکار بہادر، کیا کیا ہوا؟ پہلے وہ آیا، آرڈر لے گیا۔ پھر آپ آئے، آپ کا آرڈر ہو گیا۔ پھر وہ آیا اور اپنا آرڈر کرا کے لے گیا۔ ہمیں تو صاحب، یہ کھیل پسند نہیں ہے۔ اپنا تو ایک اصول ہے، ایک بار تعلق بناتے ہیں تو پھر پوری زندگی اسے نبھاتے ہیں۔ اگر ہم نے کسی سے کروڑ کا آرڈر لے لیا تو پھر آپ پچیس پچاس کچھ بھی دیں، ہم تو نہیں بدل سکتے۔ کیوں صاحب، ٹھیک کہہ رہے ہیں نا؟''

بھوک چند نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف مسکراتے رہے اور اسے تولتے رہے۔ جو اعداد و شمار اس کے منھ سے نکلے تھے، وہ سچ تو نہیں تھے، پر سچ سے کافی قریب تھے۔ اپنے منھ سے وہ کسی دی ہوئی رقم کا اندازہ نہیں دینا چاہتے تھے۔ ان کی جگہ جواب دیا بابو نے، جو اب تک سامنے ہی کھڑے کھڑے ان تمام چیزوں کا نظارہ کر رہا تھا اور میز پر رکھے سارے ٹھیکوں سے بے نیاز دل ہی دل میں کچھ گن کر منھ میں نگل ڈال ڈال کر ہاتھوں میں چھپنے دیتے تک رہا تھا۔ شرما کی بات کا جواب اس نے دیا مگر مخاطب کیا بھوک چند کو: ''مرد کی بات تو ایک ہوتی ہے پنڈت جی۔ یہ کیا کہ زیادہ پیسہ دیکھ کر زبان بدل گئی!''

کچھ دیر تک دونوں نے مردانگی اور رشوت کے قریبی تعلق پر تبادلۂ خیال کیا۔ اس کے مطابق جس طرح مرد کی زبان ایک ہوتی ہے، اسی طرح اگر آپ نے کسی سے پیسے لے لیے تو پھر آپ بدل نہیں سکتے۔ اگر آپ نے مخالف سے زیادہ پیسے لے کر پہلے والے کا کام بگاڑ دیا تو آپ مرد نہیں ہیں۔ شرما چونکہ مرد تھا اس لیے وہ زندگی بھر کے لیے تعلق بناتا تھا۔

بھوک چند مسکراتے رہے اور سنتے رہے۔ ان کی دلچسپی زندگی بھر کے تعلق میں نہیں تھی۔ کمیشن ملنے کے بعد وہ تعلقات کی تجدید کر سکتے تھے۔ اب وہ وقت آ گیا تھا کہ ان کا دخل اندازی کرنا ضروری ہو گیا۔

''یہ تو آپ کی شان میں گستاخی ہو جائے گی شرما جی۔ میں تو خود ایک بار کسی سے رشتہ قائم کر لیتا ہوں تو زندگی بھر نبھاتا ہوں۔ آپ آزما کر دیکھ لیجیے، پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''

Scanned with CamScanner

"سو تو ہے۔ آپ کو دیکھتے ہی مجھ کو لگ گیا تھا کہ آپ سیدھے آدمی ہیں۔ آپ سے خوب پٹے گی۔ تعجب ہے کہ ابھی تک آپ سے ملاقات کیوں نہیں ہوئی؟"

"سب وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ جب تک لکھا نہ ہو، کچھ نہیں ہوتا۔" بٹوک چند نے چھت کی طرف نگاہیں اٹھا دیں۔

"ہاں، یہ تو ہے صاحب۔ جب تک قسمت میں نہیں لکھا ہوتا، انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ آج بدھ تھا، اس لیے آج صاحب میرے کمرے میں آ گئے۔ میں نے سنتے ہی کہا کہ بس شرما جی ہی اس مشکل سے نجات دلا سکتے ہیں۔ جب تک لکھا نہ ہو—" بابو نے بھی چھت کی طرف دیکھنے کی کوشش کی، پر اوپر جاتے جاتے اس کی نگاہیں اس خوبصورت عورت کے چہرے پر اٹک گئیں جو ان کے درمیان ان کے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی تھی اور وہ وہیں قسمت لکھنے والے کو تلاش کرنے لگا۔

"چلیے صاحب، قسمت کو آج ہی منظور تھا تو آج ہی سہی۔ اب مل گئے ہیں تو کچھ نہ کچھ اچھا ہی ہوگا۔ اب بتائیے کہ کیا کرنا ہے... کیسے کرنا ہے؟"

بٹوک چند خوش ہوئے کہ اتنی لمبی چوڑی تمہید کے بعد وہ اس نکتے پر آ گئے ہیں جہاں سے کام کی باتیں شروع ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے وہی کیا جو انھیں ایسے موقعے پر کرنا چاہیے تھا اور جس کی امید شرما کر رہا تھا۔ انھوں نے معنی خیز نظروں سے بابو کی طرف دیکھا۔ بابو جو ابھی تک کنکھیوں سے خوبصورت عورت کی طرف دیکھ رہا تھا، اب پوری طرح اس کو گھورنے لگا۔ صاف تھا کہ وہ کوئی اشارہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے ساری زمین جوتی بوئی تھی اور اب جب فصل کاٹنے کا موقع آیا تو اس سے امید کی جا رہی تھی کہ وہ وہاں سے چلا جائے۔ اس نے اشارہ سمجھنے سے انکار کر دیا۔

"پنڈت جی، آپ حضرت گنج سے دو ایک ڈھیا پان لگوا لاؤ۔ صاحب کی گاڑی لے لو... نہیں تو میری گاڑی لیتے جاؤ۔" اب شرما نے دخل اندازی کی۔

"ابھی یہاں سے نکلیں گے تو باہر کہیں کھا لیں گے۔" بابو نے دھیمے لہجے میں مخالفت کی۔

"نہیں... نہیں... لے آؤ۔ سر گھنٹہ بھر ہو گیا پان کھائے۔ ہم تو صاحب بنارس کے ہیں۔ رکھ لکھنؤ میں رہ لیں، پر پان کے بنا من نہیں مانتا۔" شرما ہنسا۔ بابو بھی ہنسا، پر بے دلی سے، اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے باہر جاتے ہی بٹوک چند نے جیب سے پانوں کی ڈبیا نکالی اور شرما کے

Scanned with CamScanner

آگے بڑھا دی۔ شرما نے دو بیڑے نکالے اور منہ میں ٹھونس لیے۔

"پان بڑھیا ہیں پنڈت جی۔"

"یہی تو ایک چیز ہے صاحب، جس کا ہمیں شوق ہے۔ شراب ہم چھوتے نہیں... سگریٹ ہم پیتے نہیں... ایک چیز کے سہارے زندگی کاٹ رہے ہیں۔"

دونوں نے ایک ساتھ قہقہے لگائے۔ جھوک چند نے بھی دو بیڑے پان منہ میں ٹھونسے۔ اب میدان صاف ہو گیا تھا اور بات کی جا سکتی تھی۔

"ہاں تو بتائیے صاحب، کیا کرنا ہے... کیسے کرنا ہے؟"

"کیا کرنا ہے؟" اسے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ "کیسے کرنا ہے؟" اسی پر بحث ہونی تھی۔ سامنے والے کو کتنی معلومات ہے، اس پر "کیسے کرنا ہے" طے ہونا تھا۔ اب تک کی گفتگو سے یہ تو صاف ظاہر تھا کہ شرما جانتا ہے کہ کیسے کملا کانت نے اپنا تبادلہ مبیدہ ڈویژن میں کرایا، پھر جھوک چند نے اسے ہٹا کر خود کو وہاں تعینات کر لیا، اور فوراً راحد کملا کانت نے پھر اپنا تبادلہ رکوا لیا۔

یہ تو پوری راحد خانی کو معلوم تھا۔ اس میں پیچ یہ تھا کہ لین دین کتنے کا ہوا، یہ اسے معلوم ہے کہ نہیں؟ بیچ بیچ میں اس نے جو رقمیں بولی تھیں، وہ سچ کے قریب تھیں، پر سچ نہیں تھیں۔ اس کا مطلب ہے، اس پر سودے بازی ہو سکتی ہے۔

سودے بازی اسی پر شروع ہوئی۔ شرما نے جو رقم کملا کانت کی طرف سے خرچ کی گئی بتائی، وہ دراصل رقم سے زیادہ تھی۔ جواب میں جھوک چند نے جو اپنا خرچہ بتایا، وہ ان کی خرچ کی ہوئی رقم کا تہائی تھا۔ یہ کام کا اصول تھا۔ اس میں دونوں فریق ایک دوسرے کو تولتے ہیں، آگے پیچھے ہوتے ہیں، پھر کسی ایک رقم پر سودا طے کر لیتے ہیں۔

"پچیس۔ دیکھیے بھائی جی تو اب چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ ڈالتی نہیں ہیں۔ اس سے کم کہوں گا تو میرا گھر میں گھسنا بھی بند ہو جائے گا۔"

"میرے لیے تو آپ ہی سب کچھ ہیں شرما جی۔ پانچ ٹھیک رہے گا۔"

"پچیس۔"

"پانچ۔"

Scanned with CamScanner

''کیا بیوپاروں والی باتیں کرتے ہیں پنڈت جی۔ پانچ دس کے لیے بھابھی جی کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈالتیں۔''

''میرے لیے تو آپ ہی بھائی صاحب ہیں اور آپ ہی بھابھی جی۔ میں جتنا کر سکتا ہوں، آپ سے عرض کر دیا۔ اس کے بعد گردن پکڑیں گے تو ایک دو اور کر دوں گا، پر اس کے آگے تو ہاتھ جوڑ لوں گا۔''

''ایسے تو بات نہیں بنے گی بڑے صاحب۔ اس سے زیادہ تو کمل کانت ورما کو خبر کر دی جائے تو وہی پہنچ جائے گا، جبکہ اس کے لیے کرنا کچھ نہیں ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ سیدھے آدمی ہیں، آپ کے ساتھ ایک تعلق بن رہا ہے، زندگی بھر چلے گا، مگر آپ کاروباری بات کر رہے ہیں...''

بین الاقوامی ڈپلومیسی کی طرح اس قسم کی سودے بازی میں بھی صبر و تحمل سب سے زبردست فیصلہ کن جزو ہے؛ دونوں فریق اسے جانتے تھے، اس لیے دونوں نے بیچ بیچ میں بات ختم ہونے کا اعلان کیا، دونوں نے، اٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن نہ تو بات ختم ہوئی اور نہ ہی کوئی اٹھا۔

بات تبھی ختم ہوئی جب، بابو پان لے کر ہال میں داخل ہوا۔ بھوک چند نے پانوں کی ڈبیا اٹھا کر جیب میں رکھ لی۔

''بڑی دیر لگا دی'' بابو کے لائے پان کے بیڑوں میں سے دو اٹھا کر منہ میں ٹھونستے ہوئے شرما نے کہا۔ ''تمباکو نہیں لائے کیا؟''

''لائے ہیں۔ ہمیں پتا نہیں کیا کہ آپ ایک سو بتیس نمبر کھاتے ہیں!''

بابو نے پان کے پتے میں لپٹی تمباکو ان کے آگے بڑھا دی۔ ''ارے ہم جانتے ہیں، آپ کا کوئی کام سالا نہیں ہوتا۔ ای لو سالا آپ کا منتری بے وقوف ہے، آپ کو کام نہیں دیتا۔ سارا کام کوشکوا سے کراتا ہے...''

''اب آپ کو ہمارا بھی کچھ بھلا کرانا ہے شرما جی۔ پہلے صاحب کا کام ہو جائے، پھر ہمارا بھی کچھ خیال کیجیے گا۔ بھابھی جی سے یا تو ہمارے منتری جی کو ڈنٹوا دیجیے یا پھر سی ایم کے یہاں لگوا دیجیے ہمیں۔ آپ کا ایک آدمی وہاں بھی ہونا چاہیے۔''

''کریں گے... کریں گے... اس بار بھابھی جی سے کہیں گے، تاکہ آپ کو سی ایم کے

یہیں ہی لکھوا دیں۔" شرما نے پھر ہاتھ سے مکھی جیسی چیز مارنے کی کوشش کی۔ تبھی ویٹر بل لے کر حاضر ہو گیا۔ بل شرما نے اٹھانے کی کوشش کی۔ بابو نے بھی کچھ اسی طرح کا دکھاوا کیا کہ اگر بل اس نے نہیں چکایا تو اس کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہو جائے گی۔ بھوک چند کو معلوم تھا کہ بل چکانا انھی کو ہے، اس لیے ان دونوں کی مضبوط گرفت سے انھوں نے آسانی سے بل اپنی طرف کھینچ لیا اور جیب سے پرس نکال کر روپے گننے لگے۔

"پھر؟"

بابو کے اس سوال کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس کا رول ختم ہو گیا تھا اور ڈرامے کے دوسرے کردار سٹیج سے اس کے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔

"پھر؟"

اس مرتبہ بھی کسی نے جواب نہیں دیا۔ شرما اٹھا اور ہال کے باہر کی طرف چل دیا۔ بھوک چند نے ویٹر کے واپس لائے ہوئے نوٹوں کی گنتی کی۔ اس میں سے دس کا ایک نوٹ طشتری میں رکھ کر ویٹر کو جانے کا اشارہ کیا۔ ویٹر کے جانے کے بعد اپنی جیب سے کچھ اور نوٹ نکالے اور پچھلے والے نوٹوں میں ملا کر بابو کی طرف بڑھا دیا۔ بابو کو اس کے سوال کا جواب مل گیا۔ اس نے کھیسیں نکالیں اور نوٹ جیب میں رکھ لیے۔

جب وہ لوٹ کر باہر نکلے باہر پوری طرح اندھیرا چھا گیا تھا۔

"آپ کو کہاں چھوڑ دیں؟" بھوک چند نے بابو سے پوچھا۔ بابو نے جس جگہ کا نام لیا، وہ ان کی منزل سے بالکل مخالف سمت میں تھی۔

"ٹیکسی کا پیسہ دے دیجیے، چلے جائیں گے۔" شرما نے اپنی اندر کی جھنجھلاہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔

بھوک چند نے جیب سے ایک نوٹ نکالا اور بابو کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بابو نے پھر اپنے دانت نکال دیے۔

"دیکھیے شرما جی، میرا بھی دیکھیے گا۔ اور نہیں تو سی ایم کے یہاں ہی رکھوا دیجیے۔ ایک بار بھابھی جی چاہ رہی ہیں تو۔۔" بابو گڑگڑایا۔

Scanned with CamScanner

"دیکھیں گے... دیکھیں گے .. کچھ نہ کچھ کریں گے۔" شرما نے ہاتھ سے تصوراتی قسم کی کوئی مکھی سی اڑائی۔

"اپنی گاڑی کو کہیے ہمارے پیچھے آئے۔" شرما اپنی کار کی طرف بڑھا۔ جنوک چند نے اپنے ڈرائیور کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود شرما کی کار کا دروازہ کھول کر اسی میں بیٹھ گئے۔

ہندوستانی ہونے کا ایک فائدہ ہے۔ آپ کبھی بھی فلسفی ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے موقعے، وقت یا ساتھی کی رکاوٹ نہیں ہوتی۔

کار چلی تو شرما بھی فلسفی ہو گیا۔ اس کے فلسفی ہونے کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو ان کی آج کی ملاقات تھی جس کے بے دار بار صرف اور صرف قسمت کا ہی قائل ہوتا جا رہا تھا۔

"اب دیکھیے پنڈت جی، جب لکھا تھا تبھی ملاقات ہوئی۔ پچھلے سال آپ سیتا پور والے سالے فراڈ کے ساتھ گھوم رہے تھے تو ہمیں پتا چل گیا تھا۔ ہم نے سوچ بھی کہ آپ بھلے آدمی ہیں، آپ کو بلا لیں، پر بھابھی جی نے کہا، شرما، سب وقت وقت کی بات ہے۔ جس دن لکھا ہوگا، اس دن ہو جائے گی ملاقات۔ تو آج ہو گئی صاحب۔"

فلسفی ہونے کی دوسری وجہ کچھ ایسی تھی کہ جنوک چند ہکا بکا رہ گئے، ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس پر ہنسیں یا اداس ہو جائیں۔

"آج میں آپ کو بھابھی جی کے پاس لے جا رہا ہوں۔ ایک زمانہ تھا بھابھی جی میرے پاس لوگوں کو لے کر آتی تھیں۔ سب وقت وقت کی بات ہے صاحب۔"

شرما نے سانس لی تو جنوک چند کار کے شیشے سے باہر جھانکنے لگے۔ کہاوت ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ یہاں دیوار تو نہیں تھی، پر دو کانوں والا ڈرائیور کار چلا رہا تھا۔ کچھ بھی کہنا خطرے سے خالی نہیں تھا، اس لیے سب سے آسان راستہ تھا کہ وہ باہر جھانکنے لگتے، اور وہ یہی کرنے لگے۔

فلسفیانہ حملہ اکثر سننے والوں کو خاموش کر دیتا ہے۔ یہاں تو فلسفیانہ حملے نے شرما ہی کو سلا دیا۔ شرما کی نیند تب ٹوٹی جب کار اس مکان کے باہر رکی۔ اس آنکھیں جھپکاتے ہوئے دیکھا تو جنوک چند بنفس نفیس اس کے پہلو میں براجمان تھے۔

Scanned with CamScanner

کمرے میں بیٹھے لوگوں میں جن موضوعات پر بات چیت ہو رہی تھی وہ راجدھانی کے لوگوں کے سب سے پسندیدہ موضوعات تھے۔ تبادلے اور لائسنس یہ دونوں راجدھانی کے ادب و ثقافت کا حصہ تھے۔ قومی لیڈروں کے گھروں، وزیروں کے ٹھکانوں، پارٹی دفتروں اور سیکریٹریٹ کے کمروں میں چوبیس گھنٹے انھی موضوعات پر سیمینار منعقد ہوتے رہتے تھے۔ سیاسی جماعتوں کے منشوروں میں بڑے بڑے وعدے بڑی بڑی باتیں لکھی جاتی تھیں، پر اس کے قاری جانتے تھے کہ لکھی ہوئی باتیں مستند نہیں ہوتیں۔ انتخابات ہوتے ہی چوراہوں پر کاغذ کے ان منشوروں کی دھجیاں اڑتی ہیں۔ نیتا ہوتے ہی دوبارہ اقتدار میں آتے ہی وہ تبادلوں کے کاروبار میں لگ جاتے ہیں اور جو نیتا تبادلے کرا سکتا ہے یا لائسنس دلا سکتا ہے، اس کے یہاں سب سے زیادہ بھیڑ لگتی ہے۔ بھابھی جی عرف منی چیف منسٹر کے یہاں آج کل سب سے زیادہ بھیڑ لگ رہی تھی، کیونکہ آج کل سب سے زیادہ تبادلے وہی کرا رہی تھیں۔

بھوک چند افسر تھے، اس لیے بھیڑ میں بیٹھے دوسرے افسروں کی طرح منھ لٹکائے بیٹھے تھے۔ سبھی کسی نہ کسی دلال کے ساتھ یہاں پہنچے تھے۔ سب کا کوئی نہ کوئی کام تھا، پر چونکہ یہ افسر تھے، اس لیے ماتمی صورت بنائے رکھنے کے لیے مجبور تھے۔ دلال چہک رہے تھے؛ افسر منھ لٹکائے ہوئے تھے۔

بھابھی جی چیف منسٹر کی کوٹھی پر کسی میٹنگ کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ میٹنگ ختم ہوتے ہی یہاں پہنچیں گی، یہ خبر لے کر بیچ بیچ میں لوگ آ رہے تھے اور اندر جاتے جا رہے تھے۔

خبریں دینے والے نوجوان لڑکے تھے جو اندر سے یک دم نمودار ہوتے اور کمرے میں بیٹھے ایک دو لوگوں سے ہاتھ ملاتے، ایک دو لوگوں کے پیر چھوتے، ایک دو لوگوں کو سب سے الگ کر دیتے اور انتہائی مصروف ہونے کے باوجود بیچ بیچ میں یہ اطلاع بھی کرتے رہتے کہ بھابھی جی بس آ رہی ہیں... وہ تو چیف منسٹر سے بڑی امپارٹنٹ میٹنگ رہی، نہیں تو آن کب کی نکل آئی ہوتیں۔

ان لڑکوں میں کچھ باتیں حیرت انگیز طور پر مشترک تھیں۔ پچیس تیس کی عمر، بے ہودہ حد تک کلف سے کڑکڑاتے کرتے پاجامے پہنے، ہاتھوں میں سیل فون لیے، ملکی ذہنی بڑھاپے سے بے نیاز، ایک ہی جیسی مصروفیت میں ڈوبے لگتے تھے۔ وہ تیزی کے ساتھ کمرے میں گھستے،

Scanned with CamScanner

اس وقت سیل فون پر باتیں کرتے رہتے اور پھر اسی تیزی کے ساتھ کمرے میں ایک چکر لگاتے ہوئے اندر چلے جاتے۔

یہ لڑکے بھاجپا کے کارکن تھے۔ پارٹی کے پرانے نیتا جب چیف منسٹر اور بھاجپا کے درمیان کسی خاص قسم کے رشتے کو جوڑتے یا اشارہ کرتے تو یہی لڑکے ان کی ٹھکائی کرنے کے کام آتے تھے۔ وہاں بیٹھے اگر صرف فون پر بات نہ بن پاتی تو یہ جا کر اسے اس کے کمرے میں سمجھا آتے۔ پارٹی کی مرکزی قیادت اگر صوبے کے جھگڑے سلجھانے کے لیے کوئی وفد میں بھیجتی تو یہ لڑکے اسے بتاتے کہ کس طرح پرانی قیادت نے ان کارکنوں کو نظر انداز کیا ہے اور کس طرح بھاجپا نے ہی ان کارکنوں کو پہچانا ہے اور انھیں اہمیت دینا شروع کیا ہے۔ اکثر یہ فیصلہ بھی یہی لڑکے کرتے کہ مرکزی قیادت سے صوبے کا کون سا لیڈر رہے گا اور کسے ملنے سے روکا جائے گا۔

دہشت ہی برسرِ اقتدار پارٹی کی خاص طاقت تھی اور یہ لڑکے اسی دہشت کو قائم رکھتے تھے۔

جوگ چند کے سامنے کچھ اندیشے تھے۔ کافی دیر سے انھیں لگ رہا تھا کہ کمرے میں آنے والے لڑکوں کا رویہ شرما کے ساتھ کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جس کی تعریف کرنا کچھ مشکل ہے۔ ہر بار آنے والا لڑکا شرما کو نمستے ضرور کہتا ہے اور کچھ اس کے پیر بھی چھوتے ہیں، لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ شرما کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا جملہ ادھورا رہ جاتا ہے اور "ہاں... ہوں..." سے زیادہ کوئی جواب نہیں ملتا۔ ایک بار ایک لڑکے کو شرما نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس نے اس کے کان میں کچھ کہنا شروع ہی کیا تھا کہ لڑکے نے جیب سے فون نکالا، شرما کی طرف بڑھا دیا اور جیسے ہی شرما نے پاس میں رکھا، لڑکا اٹھا اور آگے بڑھ گیا۔

اچانک شرما اٹھا اور اندر کی طرف بڑھا۔ جوگ چند کا دل دھڑکنے لگا۔ اس دربار میں شرما کی حیثیت کا اندازہ اسی سے ہوتا کہ گھر کے اندر اس کا داخلہ ہوتا ہے یا نہیں۔ جس خود اعتمادی کے ساتھ شرما اندر جا رہا تھا، اس سے یہ تو صاف ظاہر تھا کہ وہ اس گھر کے اندر جاتا رہا ہے۔ جوگ چند کو لگا کہ ان کی مہم کی کامیابی شرما کی اس حرکت میں پوشیدہ ہے۔ شرما اندر چلا گیا تو انھوں نے لمبی سانس لی۔

دو ہی منٹ بعد شرما باہر آ گیا۔ ایک مضبوط لڑکا اسے اپنی بانہوں میں بھر کر لایا تھا۔ شرما جوگ چند کو دیکھ کر مسکرایا، ان کی جان میں جان آئی۔ لڑکا دوستانہ انداز میں گلے میں بانہیں ڈالے شرما کو لا رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

پتا نہیں انھیں کیوں لگا کہ شرما جو وہاں پایا جانا گھسیٹنا جیسا لگا تھا اور اس کی مسکراہٹ کھسیانی جیسی تھی۔
بنوت چند گھبرائے۔ رفتار بڑھی۔ بڑھتا ہوا شرما ان کی بغل میں چپک گیا۔

"ہمیں میں شرما جی... بھابھی جی آنے والی ہیں.. کیا ہے کہ ان کی سی ایم کے یہاں میٹنگ پڑ گئی نا... نہیں تو آج کہیں جانے والی نہیں تھیں۔"

بنوت چند کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ کون سی صورت حال ٹھیک ہے۔ دعوت کی تھی۔ لڑکا دوستانہ انداز میں شرما کو وہاں تک لایا تھا یا پھر غیر ضروری اچھوت چیز کی طرح وہاں پھینک گیا تھا؟ پانچ ستارہ ہوٹل کا بل کتنے کا تھا؟ انھوں نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ پھر اس سالے کو ختم ہوا اور ڈرامہ اور ٹیکسی کا کرایہ الگ سے دیا۔ سب بیکار ہو گیا۔ خیر، یہاں تک آ تو گئے ہی ہیں۔ اب باقی اوپر والے کے ہاتھ۔ انھوں نے چھت کی طرف دیکھا جہاں پنکھا چل رہا تھا۔ اس پر اندرونی انتشار جیسا تھا تو وہ تنا ہی گھوم رہا تھا کہ انھیں دکھائی نہیں پڑا۔ وہ کمروں کی آوازوں سے دور ہو کر اس کو تلاش کر رہے تھے۔

کمرے کی آوازیں ایک لمحے کی خاموشی میں ڈوبیں اور پھر اور زیادہ تیزی سے جھنجھنانے لگیں۔

بھائی صاحب، یعنی بھابھی جی کے پتی دیو، کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ وہی لڑکے تھے جو بار بار کمرے میں آ جا رہے تھے۔ کھچا کھچ بھرے کمرے میں بیچ والے صوفے پر جگہ خالی ہوئی اور اس کے بیچوں بیچ اتنی جگہ بن گئی جس پر بھائی صاحب بیٹھ گئے۔ یہ منظر صرف راجدھانی کے انھی کمروں میں ہوتا تھا جہاں تین کی جگہ والے صوفے پر سات لوگ بیٹھے ہوں اور پھر کسی کے وہاں سے سنجیدہ ہوئے آٹھویں سیٹ بھی بھر جائے۔

"گرمی ہے... میں اندر ہاتھ منہ دھو کر آ رہا ہوں" بھائی صاحب نے بغیر کسی سے مخاطب ہوئے کہا۔ مطلب یہ اطلاع سبھی کے لیے تھی۔ سب نے سر ہلا دیا۔

"آج گرمی کچھ زیادہ ہے بھائی جی۔"

"گرمی نہیں، امس ہے۔"

تھوڑی دیر میں بحث ہوئی کہ گرمی زیادہ ہے یا امس۔

Scanned with CamScanner

"اسی لیے تو آج نکلنے کا کہیں من نہیں تھا۔ انھوں نے تو انکار کر دیا تھا کہ نہیں جائیں گی نہیں۔ وہ تو کسی کام لوٹے دوپہر بعد دلی سے، اور سے ڈاکٹروں کی کار حاضر۔ پہلے تو منع کر رہی تھیں، پھر میں نے کہا تو مان گئیں۔ میں نے کہا، بیچارے دو دن بعد دلی سے لوٹے ہیں، دیکھ تو لیجیے کچھ صلاح مشورہ کرنا ہوگا۔ تب گئیں۔ بس ابھی واپس آیا ہوں۔ اندر ہاتھ منھ دھو کر آ رہی ہیں۔"

"گرمی بھی خوب ہے۔"

"اُمس ہے صاحب، ہر وقت نہانے کا من کرتا ہے۔"

بھائی صاحب بھابھی جی کے بارے میں اور بہت معلومات فراہم کرنے لگے۔ بولتے وقت ان کی آنکھیں چالاک بلی کی طرح اپنے حلقوں میں گھوم رہی تھیں۔ ایک بار انھوں نے تقریباً پورے کمرے کا معائنہ کر لیا تھا، اب دوسری بار پھر ان کی نظریں کمرے میں بیٹھے لوگوں کے چہروں پر چپک رہی تھیں، مگر اس بار کچھ رک رک کر۔ ان کی آنکھوں کی چمک اور غیر جانبداری سے ہی کمرے میں بیٹھے شخص کی حیثیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

جوگ چند کا دل پھر ڈوبنے لگا۔ پہلی بار تو لگا تھا کہ شرما کے چہرے پر سے پھسلتی بھائی صاحب کی نظریں کچھ دعا سلام کی سی تھیں۔ شرما نے بھی یہی کچھ سمجھ لگائی تھیں، لیکن دوسری بار جب سلوموشن میں آنکھیں گھومیں تو معاملہ کافی کچھ ٹھنڈا اور سرد مہری والا لگا۔ ہو سکتا ہے ان کا وہم ہو۔ انھوں نے ایک مرتبہ پنکھے کی طرف دیکھا اور تیزی سے گھوم رہی کسی ان دیکھی طاقت سے دعا کی کہ یہ ان کا وہم ہی ہو اور شرما نام کی اس مخلوق کا بھابھی جی کے اوپر ویسا ہی اثر ہو جیسا ابھی بیان کیا تھا، یا کم از کم تب تک تو یہ اثر قائم رہے جب تک ان کا کام نہ ہو جائے۔

جوگ چند کی دعا سنی گئی یا نہیں، اس پر سوچنے کا لمحہ بھی آ گیا۔

بھابھی جی کمرے میں داخل ہوئیں تو سبھی لوگ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ بھائی صاحب نے بھی اپنے کو تھوڑا سا اٹھایا، پر انھیں کچھ یاد آ گیا اور پھر انھوں نے دھم سے صوفے پر خود کو گرا سا دیا۔

بھابھی جی جب تک کھڑی رہیں، کمرے میں ایک شخص کو چھوڑ کر سبھی کھڑے رہے۔ اس درمیان ان کے ذہنی کارکن اندر سے ایک کرسی لے آئے اور جو کمرہ پوری طرح سے بھرا نظر آ رہا تھا، اس کے بیچوں بیچ ایسی جگہ بنا دی گئی جہاں کرسی رکھی جا سکے۔ اس کے بعد میں ایک اسٹول بھی آ گیا

Scanned with CamScanner

جس پر ایک ٹیلی فون رکھ دیا گیا۔ بھابھی جی نے کمرے میں موجود سبھی لوگوں پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔ کچھ لوگوں کے نمستے کا ہاتھ جوڑ کر جواب دیا، کچھ سے وہ مسکرائیں، کچھ کے جواب میں سر ہلا اور کچھ کو سرد مہری سے دیکھا گیا، اور پھر وہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔ باقی سب لوگ بھی بیٹھ گئے۔

بوک چند کا حوصلہ کچھ بڑھا۔ شرماتی کی طرف دیکھ کر بھابھی جی مسکرائیں۔

اس کے بعد کمرے میں وہی سب کچھ شروع ہوا جس کے لیے بوک چند تیار ہو کر آئے تھے۔

صوبے میں تبادلہ سب سے بڑی صنعت تھی۔ لاکھوں کی تعداد میں سرکاری ملازمین تھے۔ سرکار عوام سے جتنی دولت لوٹتی تھی، اس کا بڑا حصہ یہ ملازمین سرکار سے لوٹ لیتے تھے۔ سرکاری خزانے کی لوٹ مار سے پیٹ نہیں بھرتا تھا، اس لیے باقی وقت میں یہ عوام کو براہ راست لوٹتے تھے۔ زیادہ تر محکموں میں تو سرکار کو لوٹنے کا صرف پہلی تاریخ کو ہی موقع ملتا تھا، اس لیے مہینے کے باقی دن یہ عوام کے فراق میں رہتے تھے۔ لوٹنے کے لیے اپنے گھر سے دور نہیں جانا چاہتے تھے۔ اس لیے جب کبھی ان کا تبادلہ کسی ایسی جگہ ہو جاتا جہاں سے ان کا گھر بارہ گھنٹے سے زیادہ دوری پر ہوتا تو یہ بے چین ہو جاتے۔ انہیں ایسی جگہیں چاہیے تھیں جہاں عوام کو لوٹنے میں زیادہ محنت نہ کرنی پڑے اور جو ان کے گھر کے بھی قریب ہو۔ ایسی جگہیں کم تھیں اور امیدوار زیادہ، اس لیے ان جگہوں پر پہنچنے کے لیے مدد کرنے کو بھابھی جی اور ان جیسے سینکڑوں لوگ راجدھانی میں موجود تھے۔

آج بھی ایسے امیدواروں کی بھیڑ کمرے میں بھری تھی اور بھابھی جی ان کے اس دکھ درد میں برابر کی شریک تھیں۔

بھابھی جی ابھی تک منسٹری کے کسی ایسے عہدے پر نہیں رہی تھیں جہاں انہیں کاغذ نپٹانے کا تجربہ ہو، مگر جس تیزی اور پھرتی کے ساتھ وہ کاغذ نپٹا رہی تھیں، اسے دیکھ کر بوک چند کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اٹھیں اور ان کے پیر پکڑ لیں۔ یہاں پیر پکڑنا خطرناک ہو سکتا تھا، اس لیے وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔

ملاقاتیوں سے نپٹنے کا ان کا طریقہ بڑا ہی پیچیدہ تھا اور زیادہ تر موجود لوگوں کی پکڑ سے باہر تھا۔ بوک چند جیسے کچھ اور لوگ جو کمرے میں موجود تھے اور جن کا اس طرح کی صورت حال سے نپٹنے کا پرانا تجربہ تھا، وہی ان کے نپٹنے کے طریقے کی باریکی کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔

زیادہ تر لوگ تو کام لے کر آئے تھے، اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی پیروکار بھی لائے تھے۔ پیروکار

اور سوال بھابھی جی سے مخاطب ہوتے۔ پیروکار اس انداز سے بھابھی جی سے سرگوشی کرتا کہ انھیں چھوڑ کر پورا کمرہ اسے سنتا۔ کمرے میں بیٹھے دوسرے لوگ تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کرتے جیسے انھوں نے کچھ سنا ہی نہیں اور بھابھی جی یہ ظاہر کرتیں کہ جیسے انھوں نے سب کچھ سن لیا ہو۔ دراصل یہ ایک ایسی صورت حال ہوتی جس کے لیے کسی ہندی شاعر نے کہا ہے کہ وہ نہیں بولے گا شبد بولتے ہیں۔ یہ سارے الفاظ اگر حتمی طور پر کوئی مطلب کی بات بولتے تو بھابھی جی پیروکار کو قریب آنے کا اشارہ کرتیں۔ پیروکار آس پاس کے ان کے قریب بیٹھے لوگوں کو دھکیلتا ہوا وہاں پہنچ جاتا اور بیٹھ جاتا۔ دھکیلے جانے والا شخص اگر اپنے جسم کو ہٹانے سے انکار کر دیتا تو بھابھی جی کے سامنے کی زمین پر بیٹھ جاتا یا پھر آس پاس بیٹھے کسی شخص کی گود میں اس طرح بیٹھ جاتا کہ دیکھنے والے اسے صوفے جیسی کسی چیز پر بیٹھا مان لیں۔

اس کے بعد گفتگو شروع ہوتی۔ پیروکار اپنے منھ سے کچھ کہتا، بھابھی جی آنکھوں سے کچھ جواب دیتیں۔ پیروکار انگلیاں گھمانے لگتا، بھابھی جی دیوار کا سہارا لے لیتیں۔ بیچ میں بھائی صاحب کود پڑتے۔ پیروکار اپنا موڈ بدل دیتا۔ یک ساتھ دونوں کو مخاطب کرنے لگتا۔ بھابھی جی سیل فون سننے لگتیں۔ بھائی صاحب کسی ملاقاتی سے انتخابی حلقے کا حال پوچھنے لگتے۔ یہ دور چلتا رہتا۔ فریادی دھکیلا ہوا سا کبھی اپنے پیروکار کو دیکھتا، کبھی بھابھی کو دیکھتا، کبھی بھائی صاحب کو دیکھتا۔ کمرے کی زندگی چلتی رہتی۔

جن پیروکاروں سے گفتگو بامقصد ہوتی، انھیں لے کر بھائی صاحب اندر چلے جاتے۔ کچھ کو کسی ذاتی کارکن کے حوالے کر دیا جاتا جو انھیں لے کر کسی اور کمرے میں چلا جاتا۔ اندر کمرے بھر جاتے تو پیروکاروں اور فریادیوں کو لے کر یہ کارکن باہر دالان، گیراج، پیشاب گھر، سڑک، جہاں جگہ ملتی چلے جاتے۔ پورا ماحول ہندی شاعر کی خوش فہمی کی وہ جنت ہو جاتا جہاں بات نہ ہونے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی اور جہاں لوگ آنکھ کے سہارے، اختلافات حل بیٹھ کر سلجھا لیتے تھے۔

جبکہ چندر شرما کسی طرف سے کسی پیش رفت کا انتظار کر رہے تھے، مگر شرما آرام سے صوفے پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ سیاست سے لے کر موسم تک کسی بھی مسئلے پر کوئی جملہ اچھال دیتا۔ پھر کمرے کے کسی کونے میں کوئی اس جملے کو اچک لیتا اور جواب میں چہکتا، جس کے جواب میں کوئی

Scanned with CamScanner

تیسرا، چوتھا ایسا کھلتا جس کا پہلے والے سے کوئی تعلق ہو، یہ ضروری نہیں تھا۔

شرما کا یوں ساکت و جامد رہنے کی صورتِ حال کے پیشِ نظر جوگ چند نے خاموشی سے صوفے کی پشت پر سر ٹکایا اور اونگھنے لگے۔

کمرے میں زندگی روز کی طرح آرام سے چلتی رہتی۔ مگر خشخشی داڑھی اور ابھری ہڈیوں والے چہرے والا نوجوان جو اپنی آنکھیں نیچی کیے اپنی داڑھی میں کچھ ٹٹول رہا تھا، اس پر بھائی صاحب کی نظر نہ پڑ جاتی۔

"آپ کا تعارف؟"

بھائی صاحب نے جس لہجے میں سوال پوچھا، اس میں وہ شیرینی غائب تھی جسے ابھی تک وہ اپنی آواز میں گھول کر کمرے میں بیٹھے لوگوں سے باتیں کر رہے تھے۔

سوال جس سے پوچھا گیا تھا، اس نے پہلی بار لب بند کر، چشمہ اتار کر پونچھا، پھر بھائی جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا:

"آپ لوگ ان کو نپٹا لیں... پھر بات کریں گے۔"

"کیا بات کریں گے؟"

"آپ فرصت میں ہو جائیے..."

"نہیں پہلے آپ اپنا نام بتائیے۔"

کچھ دیر تک "پہلے آپ... پہلے آپ" کا کورس چلا۔

"آپ ہیں کون؟ کہاں سے آئے ہیں؟" اس بار بھائی جی نے سختی سے پوچھا۔

"انٹرویو..."

جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ایک رنگی داڑھی چیخ پڑی۔

"کہاں ہے انٹرویو؟ یہی تو بھائی جی پوچھ رہی ہیں۔ کون افسر ہے تاکہ اس کو دی جائے؟ نام اور فون نمبر لکھوا دیجیے نا۔ اس دربار میں آئے ہیں تو ہو جائے گا۔"

ڈاڑھیل جسے مخاطب کیا جا رہا تھا، تھوڑا گھبرایا۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ جس دنیا سے آیا تھا، وہاں اس طرح کی صورت حال سے اس کا سابقہ ابھی تک نہیں پڑا تھا۔

Scanned with CamScanner

''انٹرویو... انٹرویو تو میں دوں گا۔ سی جی خالی ہو جائیں تو میں ان کا انٹرویو لوں گا۔''

تھوڑی دیر تک ماحول مکدر رہا۔ مطلب، ذلیل کسی اخبار سے آیا تھا۔ آج کل صوبے اور ملک سے چھپنے والے اخبار اور رسالے بھابی جی کی تصویروں والی خبریں رو رو کر چھاپ رہے تھے۔ کچھ میں ان کے انٹرویو بھی چھپے تھے۔ شروع شروع میں تو بھابی جی کو بڑی مسرت ہوتی تھی۔ اپنی تصویر چھپا اخبار یا رسالہ لے کر باتھ روم چلی جاتیں اور اندر دیر تک اس پر فدا ہوتی رہتیں۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ اخبار والوں کا نام سنتے ہی بھڑکنے لگیں۔ وہ تو خیر منی چیف منسٹر تھیں، جو اصلی چیف منسٹر تھے وہ بھی بھڑکنے لگے۔ کئی پریس کانفرنسوں میں یہ ہوتا کہ کوئی صحافی سوال پوچھتا کسی کمرے میں، پر جواب ملتے ملتے پتا چلتا وہ باہر برآمدے میں فرش پر پڑا اس بات کا اندازہ لگا رہا ہے کہ اس کی کتنی پسلیاں اپنی جگہ سلامت ہیں۔

منی چیف منسٹر یعنی شریمتی جی کو یہ آسانی تھی کہ وہ اس کارروائی کو اپنے ذہنی کارکنوں کی مدد سے سوال پوچھے جانے سے پہلے ہی اپنے انجام کو پہنچا دیتیں۔

آج بھی یہی ہوا۔ بھابی جی کے ذہنی کارکنوں نے اس ذلیل صحافی کے اردگرد گھیرا تنگ کر دیا۔ ان کی کارروائی طے شدہ تھی۔ اس لیے کسی اشارے کی ضرورت نہیں تھی، پر کوئی دوسرا اشارہ نہیں مل رہا تھا، جس کی وجہ سے کارروائی شروع ہونے میں دیر ہو رہی تھی۔

بھابی جی نے بھائی صاحب کی طرف دیکھا۔ شہر کے سارے صحافیوں کو وہ لوٹ چکے تھے۔ ویسے بھی اس شہر میں کوئی مائی کا لال نہیں بچا تھا جو کسی اخبار کے لیے کام کرتا ہو اور اس نے ان کا جوتا یا لفافہ نہ قبول کیا ہو۔

لفافہ اور جوتا بھابی جی کے دربار کا ہی وردہ تھا۔ یہاں بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ محاورہ چیف منسٹر کے دربار سے نکلا ہے۔ یہاں کے زیادہ تر ذہنی کارکنوں کو چیف منسٹر کے دربار تک پہنچنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے وہ اسے بھابی جی کی ہی ایجاد مانتے تھے۔

چیف منسٹر کی رائے میں وہ راجہ دو کوڑی کا ہوتا ہے جو خوش ہونے پر کسی کو کچھ دے نہ سکے، اس لیے انھوں نے لفافے اور جوتے کا چلن اختیار کیا تھا۔ صحافی بھی ان کی رعایا تھے، اس لیے انھیں بھی لفافے اور جوتے ملتے رہتے تھے۔ لفافے کثر رات میں دیے جاتے تھے جبکہ جوتے کسی کی

Scanned with CamScanner

یہاں کا ذکر بھی ڈال سکتے تھے بشرطیکہ صحافی چیف منسٹر کے بارے میں پوچھ لے۔

تب بھی وہ موقع تھا جب [illegible] میں سے کسی ایک کا انتخاب کیا جاتا۔ [illegible] تھی۔

"کس اخبار سے آئے ہیں آپ؟" [illegible] صاحب [illegible] تھوڑی دیر کے لیے اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

"ارے تو آپ [illegible] لیجیے بڑے لیڈروں کا، ہم تو چھوٹے موٹے کارکن ہیں۔" [illegible]

"آپ کی پارٹی تو کارکنوں کی پارٹی ہے۔ آپ کے لیڈر کہتے ہیں [illegible] ہیں۔ آپ سے زیادہ [illegible] ..."

"پر میں تو بہت چھوٹی کارکن ہوں..."

"ہم تو چھوٹے کارکنوں سے ہی بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"پر میں کس لائق ہوں؟"

"یہاں تو لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ ہی کام چلا رہی ہیں۔"

"آپ بھی مذاق کر رہے ہیں۔ میں تو بہت چھوٹی..."

[illegible]

صحافی: آپ اپنا وقت برباد نہ کریں اور پارٹی کے کسی بڑے لیڈر کا جا کر انٹرویو لیں۔

دوسرا فریق جس میں اکیلا صحافی تھا، یہ کہتا تھا کہ موجودہ پارٹی اقتدار میں ہے اور چونکہ یہ کارکنوں کی پارٹی ہے اور شرمیلی بی بی خود مان رہی ہیں کہ وہ اس پارٹی کی ادنیٰ کارکن ہیں اور یہ پورا صوبہ جانتا ہے کہ وہ کس قدر اہم اور فعال کارکن ہیں، اس لیے پوری دنیا ان کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہے اور اس لیے ان کا انٹرویو لینا نہایت ضروری ہے۔

اور جیسا کہ ایسے موقع پر ہوتا آیا ہے کہ دونوں فریقوں میں سے نہ تو کوئی جھکا اور نہ ہی یہ طے ہو پایا کہ کون کیا ہے۔

"آپ کب سے سیاست میں ہیں؟" صحافی نے بحث ختم کرتے ہوئے، اپنی ڈائری اور قلم سنبھالا۔

"دیکھیے، میں کہہ چکی ہوں میں انٹرویو نہیں دوں گی۔"

"آپ کے بھائی بھی سیاست میں ہے؟"

"مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔"

ادنیٰ کارکن ہوتے ہوئے، معاملہ کچھ نازک تھا۔ کسی ایسے اخبار کے نامہ نگار کے ساتھ کس طرح پیش آیا جائے جس کے اخبار کا نام تک مشکل ہے جو ادا ہی نہ ہو سکے، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"آپ کے پاس کوئی عہدہ نہیں ہے، پھر آپ کے پاس اتنی بھیڑ کیسے رہتی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میں تو عام سی کارکن ہوں۔"

"پھر آپ کے پاس اتنی بھیڑ...؟"

"میں جا رہی ہوں۔ آپ نہیں چاہتے کہ میں یہاں بیٹھوں۔ میں جا رہی ہوں..."

"آپ کا گھر ہے... آپ کیوں جائیں گی... آپ کی پارٹی میں اور کتنے کارکنوں کے یہاں اتنی بھیڑ ہوتی ہے؟"

بی بی جی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کمرے میں ہڑبونگ مچ گئی۔ دور دور سے لوگ بڑی آس لیے آکر آتے تھے۔ ان سارے صحافیوں کا کیا، پیچھے میں نہ پوچھتے ہیں۔ باہر نکلے ہوئے

... سے صداقت اور بیوقار کی کھڑکی دروازوں سے جھانکنے لگے۔ ''مادام صاحبہ دو چار چھ چیلیں... ٹھیک ہو جائے گا... بڑے آئے ہیں انٹرویو لینے والے۔'' ذلیل صحافی بھونچکا سا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے دنیا کی بڑی بڑی ہستیوں کا انٹرویو لیا تھا۔ اس انٹرویو سے کیسے نپٹا جائے، اس کے بارے میں نہ تو صحافت کی تعلیم حاصل کرنے والی یونیورسٹی میں کچھ پڑھایا گیا تھا اور نہ ہی اپنے پیشے کے دوران اب تک اس نے سیکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں ایک بات آئی کہ اسے ابھی پتا نہیں چلے گا۔ کسی کال سے فائدہ اٹھایا۔

''آپ کی پارٹی نہیں چاہتی کہ کارکنوں کا انٹرویو لیا جائے؟''

''میں کچھ نہیں جانتی... میں جا رہی ہوں...''

معاملہ بے حد نازک تھا۔ بھابھی جی نازروپ جانتی تھیں کہ بھابھی جی اپنے ہی گھر میں باہر کی بات سے اندر نہیں جا سکتیں اور کسی غیر ملکی اخبار کے نامہ نگار کو گھر میں بیٹھا نہیں جا سکتا۔

اس لمحے جو کچھ رونما ہوا اسے دیکھ کر ہوٹ چندر کی باچھیں کھل گئیں۔ چونکہ شرما تھا، وہ صحافی کے سامنے ڈٹ گیا اور اس سے مخاطب ہوا۔ ''اگر آپ کے پاس اتنا ہی وقت ہے تو آپ نے بھابھی جی سے آپ کی سب سے بڑی دلیل ہے، جیسے پوچھا۔ تمام کارکنوں کا انٹرویو... ہم کیوں پارٹی کے کارکن ہیں۔ لیجیے ہمارا انٹرویو۔ بیچاری لیڈیز کو پریشان کر رہے ہیں۔ پوچھیے کیا پوچھنا ہے؟''

شرما خواتین کے لیے ہمیشہ لیڈیز کا لفظ ہی استعمال کرتا تھا۔ خواتین ایک ہو یا دس اس کے لیے ہمیشہ لیڈیز ہی ہوتی تھیں۔

صحافی تھوڑا گھبرایا، مگر چونکہ اس نے خود ہی کارکنوں کے انٹرویو کی بات کی تھی اور وہ شخص سامنے کھڑا ہو کر اپنے پھیپھڑوں کا بھرپور استعمال کر رہا تھا، وہ اپنے کہنے کے مطابق کارکن تھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھنے کی کوشش کی تو شرما نے مسکرا کر بھابھی جی کی طرف دیکھا۔ بھابھی جی نے کمرے میں موجود دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اب صحافی کے علاوہ سبھی مسکرا رہے تھے۔

سب کو پتا تھا کہ شرما سے انٹرویو لے کر کوئی جیت نہیں سکتا۔ صحافی نے ایک بار پھر بھابھی جی کی طرف دیکھا۔

"آپ اتنی کنٹروورشیل کیوں ہیں؟"

"اس لیے کہ ہم لیڈیز ہیں" شرما صفائی کے وکیل کی طرح اپنے موکل کی طرف سے بولتے وقت واحد متکلم کی طرح بول رہا تھا۔ "ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ ہم لیڈیز ہیں اور سیاست میں آ گئے ہیں، ارے صاحب، سیاست میں اپنے بل بوتے پر آگے بڑھ رہے ہیں تو کیسے آپ برداشت کریں گا' بتائیے نا... بولیے..."

صحافی چڑ کر کہتا ہے — انٹرویو کس کا ہو رہا ہے؟

"پر خواتین تو بہت ہیں سیاست میں۔ اور کوئی اس طرح کنٹروورشیل کیوں نہیں ہوتا؟"

"کون نہیں ہوتا؟ کس پر آپ لوگوں نے انگلی نہیں اٹھائی.. ارے آپ نے ممتا میا کو نہیں چھوڑا... بھابھی جی کی کیا بساط ہے..." شرما کی آواز رندھ گئی۔ وہاں بیٹھے لوگ جانتے تھے کہ وہ اب رونے کا۔ صرف دو لوگ نہیں جانتے تھے۔ ایک تو ہوک چند، جو شرما کے ڈائیلاگ کم سن رہے تھے، ان کا اثر بھابھی جی کے چہرے پر زیادہ ڈھونڈ رہے تھے اور اس بات پر خوش تھے کہ اس کے ہر لفظ سے بھابھی جی کے چہرے پر اسے مراسم، دکھ، غرور اور ... کے رشتے پھوٹ رہے تھے۔ دوسرا شخص وہ صحافی تھا جو یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ انٹرویو کس کا ہو رہا ہے۔

"آپ لوگ لیڈیز کو بڑھتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے۔ ارے صاحب، ہم تو جانتے ہیں آپ لوگوں کو، بڑے ترقی پسند بنتے ہیں۔ ارے ہماری پارٹی تو بھارتیہ سنسکرتی کی پجاری ہے۔ ہمارے ہاں تو کالی داس کہہ گئے ہیں کہ عورت کا کیا مقام ہے..." اس کے بعد شرما نے سنسکرت، اردو، جو بھی جو بھی یاد تھا سنانا شروع کر دیا۔ اس کے خیال سے سنسکرت میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ کالی داس نے لکھا تھا اور اردو میں غالب کے علاوہ کوئی شاعر نہیں تھا، اس لیے ہر اشلوک سے پہلے وہ کالی داس کا نام لیتا تھا اور ہر شعر کے آخر میں چچا غالب کو یاد کرتا تھا۔ وہ اتنا تیز بول رہا تھا کہ صحافی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اگلا سوال کہاں داغے۔

بولتے بولتے شرما کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ اس نے ان سوالوں کے جواب دینے شروع کر دیے جو ابھی اس سے پوچھے ہی نہیں گئے تھے۔

"اب آپ پوچھیں گے کہ اس دربار میں اتنے لوگ یوں اکٹھے ہیں؟ ارے صاحب، ہم تو

جانتے ہیں آپ لوگوں کو۔ کارکن وہیں تو جائے گا جہاں اس کی پوچھ ہوگی۔ ورنہ کوئی رامدحانی میں جو دارالوں والی عزت دیتا ہو؟ جیسے شاستریوں کی کوٹھیوں پر۔ کوئی ننگا ان کا پانی کو نہیں پوچھے گا یہاں ہمارا احترام کیا جاتا ہے، عزت ملتی ہے، اس لیے آتے ہیں ہم صاحب، آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟''

شرما پورے موڈ میں آ گیا تھا اور اب ان الفاظ کا دھڑلے سے استعمال کر رہا تھا جن کی اسے خود ہی میں ازجیل صحافی کو سب سے کم امید تھی۔ شرما کا اصول تھا کہ دشمن پر جب حملہ کرو تو اسے سنبھلنے کا موقع مت دو۔ اس نے اپنے پھیپھڑوں والے سے انجن میں تبدیل کیا اور مسلسل سے جھانسے دیتے ہوئے غیر بری چڑھائی پر سرپٹ دوڑا، پھر پٹڑی بدلتے ہوئے ڈیزل انجن سے پیچھے لگ گیا اور جب تک اس موضوع پر پہنچا، جہاں سے اس کا تعلق تھا وہ بجلی کے انجن پر کود کے چڑھ گیا۔

ہندوستانی تہذیب کی بات کرنی تھوڑی مشکل ہے لیکن اگر اس کے استعمال کی تعریف بیان کرنی ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ الگ الگ موقعوں پر اس کا الگ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ آپ عورتوں کو گھر کے اندر بند رکھنا چاہتے ہیں تو اس سے مفید کوئی تہذیب نہیں۔ آپ ان کی برابری کی حمایت کرنے والے ہوں، تب بھی اس سے دھاردار کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ شرما اور اس کی پارٹی ہندوستانی تہذیب کی سب سے بڑی علمبردار تھی اور کسی بیرونی اخبار کا نامہ نگار اس کا سب سے بڑا دشمن ہو سکتا تھا، اس لیے شرما نے رونے کے لیے یہی پہلو چنا۔

''ارے ہماری بھارتیہ سنسکرتی سے بڑھ کر عورت کو کون اہمیت دے گا؟ مغرب والے! ارے، آپ نے تو عورت کو سوداگری بنا دیا ہے۔ آپ نے تو چیز کو بازار کی طرح بیچتے ہیں۔ ارتھ شاستر کا ایک اصول ہے...''

غوث چند پانی پی رہے تھے، ٹھسکا لگا کر گلاس ان کے ہاتھ سے چھوٹتے بچا۔ یہ شخص اتنے مشکل الفاظ استعمال کر رہا ہے!

''بلکہ میں تو غیر ملکی نہیں ہوں...'' صحافی بڑبڑایا۔

''پر نامہ تو غیر ملکی اخبار کے لیے کرتے ہیں۔''

''اس سے کیا؟''

Scanned with CamScanner

"اس سے بہت کچھ ہے۔ آپ لوگ بدیسی پیسے پر پلتے ہیں۔ آپ کیا جانیں بھارتیہ سنسکرتی میں کیا لکھا ہے؟ ہمارے ہاں کہا گیا ہے کہ..."

شرما نے موسلا دھار سنسکرت کے شلوکوں کی بوچھار کر دی۔ ویدوں، پرانوں، اپنشدوں سے کان دن جھنجھنا رہے تھے۔ پنڈت جوگ چندر اپادھیائے کے پتا سنسکرت کے پنڈت تھے اور پڑھاتے بھی تھے۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا بچوں کو شت پہلو تعلیم سے ہمکنار کرنا۔ جوگ چندر انجینئرنگ کالج تک پہنچ گئے، تب بھی گھر نے پر کوئی بھروسا نہیں تھا کہ اب سنسکرت کی کسی ترکیب کے بارے میں پوچھ لیں۔ ننھی چھوٹ انھوں نے ضرور دے دی تھی کہ اب جنیو ہاتھ میں لے کر جوتے نہیں پہنتے تھے۔ پرانے جنیو پیٹھ پر پڑے رہتے تھے کہ جوگ چندر کو ان کے خالی ہاتھ میں بھی جنیو نظر آتا تھا۔

اس لیے آج شرما کے منہ سے سنسکرت کے شلوک سن کر جوگ چندر حیران تھے۔ وہ گھبرا کر بیچ میں چاروں طرف دیکھنے لگے، کہیں ان کے سورگ واسی پتا تو نہیں سن رہے ہیں۔ اتنی گڑبڑی ہوئی اور ناخالص سنسکرت بولنے والے شخص کے ساتھ وہ یہاں تک آ گئے ہیں، یہ جان کر تو ان کے پتا شری ان کی پیٹھ تھپتھپانے سے رہے۔ انھوں نے چہرہ تھوڑا ایسا کر لیا کہ اگر پکڑے جائیں تو پتا جی سے کہہ سکیں کہ وہ تو اس احمق مورکھ، سنسکرت کے قیود سے بچانے تک نہیں، اس کے ساتھ یہاں تک آنے کی بات تو دور رہی۔

شرما کو جاننے والے لوگ اس لمحے کا انتظار کر رہے تھے جب سے رونا تھا، اور وہ لمحہ بھی آ گیا۔

شرما نے سنسکرت کی ایسی کی تیسی کی، پھر وہ اردو کے میدان میں کود پڑا۔ سنسکرت اگر اس کے لیے ماں، اس تھی تو اردو چچا غالب۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ... صحافی اردو تھوڑی بہت جانتا تھا ... نے سب آدی اردو کی کوشش کی۔ شرما کو معلوم تھا کہ اردو میں "ج" کو "ز" کہا جاتا ہے۔ جیسے ہی اس نے اردو کہا، صحافی چونک پڑا۔

"بھائی صاحب، زرو نہیں... جرو..."

"اب آپ مجھے اردو سکھائیں گے؟ مجھے لگتا آپ مجھے بھارتیہ سنسکرتی بھی سکھانے لگیں گے۔

ارے صاحب، آپ جیسے لوگوں نے ہماری سنسکرتی کا بنٹا دھار کیا ہے۔ آپ لوگ لیڈرز کو سیاست میں بڑھتے نہیں دیکھ سکتے۔ گوسوامی جی نے ٹھیک ہے کہ غیر ملکی اخبار کا نامہ نگار ایودھیا میں " کرسچن جی کے بارے میں بھگوان رام سے اوٹ پٹانگ سوالات پوچھنے لگا..."

شرما نے سب پر ایک فاتحانہ نظر دوڑائی۔ ہڑک چند کا دل چاہا دوڑ کر اس کے قدموں کو چوم لے۔ کمرے میں موجود سارے سامعین صحافی کی طرف دیکھ رہے تھے، بولو میاں، اب جواب دو۔

"غیر ملکی اخبار کا نامہ نگار ایودھیا میں..."

وہ اس دھوبی کی بات کر رہے تھے جس نے جب سیتا راون کے قبضے سے نکل کر واپس رام جی کے پاس آئی تھیں، اس وقت ایک دھوبی نے اپنی بیوی کے کردار پر شک کرتے ہوئے رام جی پر طعنہ سا تھا کہ وہ رام جی نہیں ہے جو اغوا کی گئی سیتا کو دوبارہ اپنے حرم میں رکھ لے۔

"ذرا یہ تو بتائیے وہ سالا دھوبیا کون تھا؟ بتائیے... بڑے آئے ہیں انٹرویو لینے۔ اس زمانے میں آپ لوگوں نے سیتا میّا کو نہیں چھوڑا اور اب بھابھی جی جیسی ستی سادھوی ناری پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ ارے آپ بھابھی جی پر نہیں، بھارتیہ سنسکرتی پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔"

شرما جی کی آواز رندھ گئی۔ اس نے دو تین بار 'بھابھی جی... سیتا میّا... بھارتیہ سنسکرتی...' جیسے الفاظ ادا کیے اور پھر منھ پھاڑ کر رونے لگا۔

کمرے میں ایک ساتھ کئی باتیں رونما ہوئیں۔ سامعین تھوڑی دیر کے لیے چپ ہوئے۔ صحافی کو لگا کہ دنیا کا سب سے بڑا الّو وہی ہے۔ لگا وہ یہاں آتے ہوئے اپنی کہانی کی قسط معاف کروانے آئے۔ ایک کسان کو لگا کہ کتھا کا وہ حصہ آ گیا ہے جب جے جے کار کا نعرہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ یک دم سے الرٹ ہوا اور اس نے جے کار لگایا: "بول سیتا میّا کی..."

"ہارسالے کا..." ایک زمینی کارکن نے للکارا۔

"جے... جے... بول سیا رام چندر کی..."

"ہارسالے کا بھین... انٹرویو لینے آیا ہے..."

اس کے بعد جو کچھ ہوا، اسے مختصراً صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ صحافی نام کی اس مخلوق کو پہلے کمرے سے نکال کر لان میں پھینکا گیا، اور پھر پھینکنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ ڈھلتا ڈھلکتا سڑک پر

Scanned with CamScanner

پہنچ گیا۔ لان تک اس کی نوٹ بک، قلم اور کیمرا ساتھ تھے، پر جب وہ سڑک پر پہنچا تو ہاتھوں یک سر غائب ہو گئے۔ اس کی حالت تو جو کچھ دیا چھوڑ کر جائے سکندر جیسی تھی جو اس دارِ فانی سے رخصت ہوتے ہوئے خالی ہاتھ ہی گیا تھا۔ اتنا ضرور ہوا کہ اس کی نوٹ بک کچھ بچی کھچی حالت میں اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ قلم دو ٹکڑوں میں بٹ چکا تھا۔ اس کی ٹوپی بھی اس کے نزدیک آ گری۔ ظاہر تھا کہ قلم کا نچلا حصہ کسی پڑھنے لکھنے والے کارکن کے ہاتھ لگ گیا تھا اور اس یقین کے ساتھ کہ اس کا صحیح مستحق اسی کے پاس ہے اور اگر سے اس کے اصلی مالک کو دے دیا گیا تو وہ پھر کہیں خرافات کرے گا، اس نے اس حصے کو اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔

کیمرے کے بارے میں اگر اس وقت صحافی سے بھی پوچھا جاتا تو وہ پورے یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ سے وہاں سے لے کر آیا بھی تھا کہ نہیں۔ وہاں موجود کوئی شخص نہیں بتا سکتا تھا کہ کیمرہ کہاں گیا۔

کمرے کا ماحول پھر پرانی ڈگر پر لوٹ آیا۔ فرق صرف اتنا آیا کہ قومی ورثے میں ملی ہوئی اخلاقیات کے مطابق کچھ ابھی رونما ہونے والے واقعات پر لوگ اپنی ماہرانہ رائے دے رہے تھے۔

”ان سالوں سے بات نہیں کرنی چاہیے۔ ان کو تو شروع میں ہی جوتا...“

”ہاں بھائی جی، ان کو سو جوتے مارنے چاہئیں، پر سو کے بعد گنتی بھول کر پھر ایک سے شروع کرنی چاہیے۔“

کچھ دیر اس پر تبادلہ خیال ہوا کہ گنتی کہاں بھولنی چاہیے۔ قوم سے ورثے میں ملے عادات و اطوار کے مطابق یک رائے پر اتفاق نہ ہو سکا۔ اس نکتے پر بھی اتفاق نہ ہو سکا کہ جوتا کس نسل کا ہو

”بھائی، اپنے گاؤں کا چمڑا دھا سب سے اچھا ہے۔ تھوڑا سا تیل چڑھا دو اور پھر دیکھو۔“

”عجیب ٹیکنیک ہو یار۔ اب چمڑے والا کون پہنتا ہے جی۔ ارے ملٹی نیشنل والے اتنے بڑھیا جوتے بنا رہے ہیں...“

”پر ہم تو سودیشی والے ہیں۔“ بہرحال اس پر بھی کوئی ہم آہنگی نہ بن سکی۔ سودیشی نعرہ اچھا تھا لیکن کوئی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس طرح کے صحافیوں کے لیے جوتے مارنے کے طریقے

Scanned with CamScanner

کامیاب ترین بنانے کے لیے ایک عدد جمہوری دھارا جائے۔

ایک نکتے پر اتفاق رائے ہو گیا۔

''شرما جی نے کمال کر دیا۔ سالا زندگی بھر یاد کرے گا۔'' کئی لوگوں نے یہ جملہ دہرایا کہ ''شرما نے کمال کر دیا۔''

بھابھی جی نے بھی مہر تصدیق ثبت کر دی۔

''ارے انہیں کے تیوروں میں بیٹھ کر ہی تو ہم نے سیاست سیکھی ہے۔ ان کا کمال تو ہم خوب جانتے ہیں۔''

شرما نے صحافی کو کھدیڑنے کے بعد، جو کامیابی تھی، اسے دیکھ کر بجوک چند کو اپنے سورگ واسی پتا، سنسکرت کے استاد کی یاد آ گئی۔ وہ کسی کو بھی صحیح تلفظ کے ساتھ شلوک پڑھتے دیکھ کر ''شاباش... شاباش'' کہنے لگتے۔ ان کا دل بھی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی شاباشی دیں۔

صحافی کو کمرے سے باہر پھینکنے کا کام جب انجام کو پہنچا اس وقت دوسرا تماشا ہو رہا تھا۔

شرما کی رندھی آواز چہکنے لگی اور اس کے آنسو ہندی فلموں کی ہیروئن کے آنسوؤں کی طرح نہ جانے کہاں کھو گئے جس کا پریتم اچانک پیڑوں کے جھرمٹ سے نکل کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ رونا دھونا بھول کر مسکراتے ہوئے گانا گانا شروع کر دیتی ہے۔

جس وقت اٹھے ہوئے صحافی کو کمرے کے باہر پھینکنے میں اور آتے ان کا حوصلہ بلند کرنے میں مشغول تھے، شرما چپکے اپنی جگہ سے اچھلا اور اس کرسی کے بغل میں پڑے صوفے پر بیٹھ گیا جہاں بھابھی جی بیٹھی تھیں اور مہذب ہونے کے تمام تاثرات اپنے چہرے پر اوڑھے تمام کارروائی دیکھ رہی تھیں۔

بجوک چند نے شرما کو اٹھ کر جاتے اور بیٹھتے تو دیکھا، پر دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہو رہی تھی، یہ دیکھنے اور سننے میں کمرے کے اندر ہو رہے شور و غوغا نے ایک رکاوٹ بنا رکھی تھی اور سب کچھ تھیٹے کے سینما ہال میں چل رہی تھرڈ کلاس فلم کی طرح تھا۔ ناٹک مکمل نا سمجھ کی ناک پر چھونا جمانا کہ آپ کے سامنے ''واہ چھے...'' کی مکار ہوتا ہوا کوئی تماشائی کھڑا ہو جاتا۔ کھڑے ہو کر آپ ناک کے قریب چپکے دیکھ کر اگلی صورت حال کا تصور کر لیتے۔ پچھاڑی کے بیچ میں ہیرو ہیروئن کی طرف تیزی سے جھپٹتا تو

Scanned with CamScanner

دوستی آگے کا تماشائی "دیوراجہ..." جیسی کوئی چٹکی کستا اور آپ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے کہ دونوں کے بیچ عشق و محبت سے متعلق کوئی گفتگو ہوئی ہوگی۔

ایسا ہی کچھ اندازہ ونوک چند کو بھی ہو رہا تھا کہ شرما اور بھابھی جی کے درمیان بھی سے متعلق کوئی بات ہو رہی ہے۔

شرما نے کچھ کہا اور ونوک چند کی طرف دیکھا۔ بھابھی جی نے بھی ان کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور مسکرائیں۔

"ارے ادھر آئیے نا پنڈت جی، اتنی دور کہاں بیٹھے ہیں؟"

شرما چپ ہوا تو ونوک چند اٹھ کر بھابھی جی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے انتہائی مہذبانہ انداز سے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ بھابھی جی مسکرائیں۔

"ادھر بیٹھیے بڑے صاحب، وہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ شرما جی نے یہاں کسی کو بتایا نہیں۔ آپ کو تو اندر بیٹھنا چاہیے تھا۔ آپ لوگ تو سرکار چلاتے ہیں۔ ہم تو مانتے ہیں کہ سرکار کو سرکار چلانے والوں کا پورا آدر کرنا چاہیے، تبھی سرکار ٹھیک سے چل سکے گی۔ ادھر بیٹھیے۔"

کمرے کی اتھل پتھل نے بیٹھنے کی جگہ بھی بنا دی تھی اور کام کی بات کرنے کا موقع بھی۔

"شرما جی نے سب بتا دیا۔ آپ کا منتری ہے ہی بڑا بدمعاش۔ یہی لوگ تو ہماری سرکار کی بدنامی کا باعث ہیں۔ بے چارے جی ایم تو سب کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں، پر ان بدمعاشوں کے ساتھ کتنے دن سرکار چلا پائیں گے۔ میں نے تو جی ایم سے بھی کہہ دیا ہے کہ اگر صاف ستھری سرکار چلانی ہے تو ایسے لوگوں کو ہٹانا پڑے گا۔ دیکھیے کب تک یہ لوگ بنے رہتے ہیں سرکار میں۔"

ونوک چند بیٹھے سے تھوڑا اچکے۔ وقت کم تھا۔ پارٹی ہائی کمانڈ اور جی ایم میں ان کی کوئی دلچسپی نہیں بن پا رہی تھی۔ صحافی کو ان سے سڑک کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ کب یہ صورت حال ختم ہو جائے اور کب لوگ کمرے میں واپس آ جائیں، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

"جی میڈم، آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ ہمارا تو ڈپارٹمنٹ منتری نے چوپٹ کر دیا ہے۔ کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ مسئلہ میرا یہ ہے کہ میرا ایک ہفتے میں دو مرتبہ تبادلہ..."

"ارے وہ تو بات ہو گئی ہے نا بھابھی جی سے۔ آپ نشاخاطر رہیں، کل آرڈر مل جائے گا نا۔"

Scanned with CamScanner

کل بلایا ہے صبح کوٹھی پر۔ بی جمعہ بھلا میں آپ جیسے بڑے افسر سے کیا بتیائیں گی؟"

"ہاں، بڑے صاحب۔ کل آئیں صبح صبح جمعہ نہیں ہوتی۔ آپ جیسے افسروں کو جمعہ میں حصہ ہونا پڑے، مجھے تو نہیں جچتا۔ میں تو مانتی ہوں کہ سرکار سرکار چلانے والوں..."

بلونت چند خوشی سے جھوم اٹھے۔ کتنی بڑی ہستی اور کتنی منکسر مزاج۔ "ہیں ہیں" کرتے ہوئے انھوں نے بھابھی جی کے چرنوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کیا کرتے ہیں!... کیوں نرک میں ڈالتے ہیں صاحب... آپ تو عمر میں بھی بڑے ہیں... میں تو کہتی ہوں کہ سرکار سرکار چلانے والوں کی قدر..."

جب بھابھی جی سے نرمی کا رنگ صوفی کو جتا کر کمرے کے اندر داخل ہو رہے تھے، بلونت چندا ہاتھ پکڑے تر، انھیں کمرے کے باہر لے جا رہا تھا۔

"سب وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔"

غسل خانے میں گھستے ہوئے جب شرما نے تیسری بار یہ جملہ دہرایا تو بنوک چند سمجھ گئے کہ اب پھر سے رستے والا فلسفی پن اس پر طاری ہونے والا ہے۔

شرما کو بنوک چند اپنے ساتھ پکڑ لائے تھے۔ منی چیف منسٹر عرف منی کے گھر سے باہر نکلنے پر شرما اپنی گاڑی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے اور اس کے دروازے پر ہاتھ ٹکا کر اس نے پوچھا، "اب؟"

اس "اب" کے کئی مطلب نکالے جا سکتے تھے۔ ایک مطلب تو یہ تھا کہ اب اپنے اپنے راستے ناپے جائیں یعنی صرف کل کے لیے کوئی طے کر لیا جائے۔

بنوک چند نے دوسرا مطلب نکالا۔ انھوں نے جو مطلب نکالا، اس کے مطابق ابھی کچھ طے نہیں تھا، اور اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ انھیں طے کرنا تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔ اور انھوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ شرما کو رات بھر کے لیے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ جدائی میں کسی کو رات بھر کے لیے اکیلا چھوڑنے کا مطلب تھا کہ صبح وہ آپ کو پہچاننے سے انکار کر دے۔ انھوں نے کس کر شرما کی کلائی تھام لی: "ارے شرما جی، ابھی آپ کے ساتھ بھرپور ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے۔ آپ اتنے پیچھے ہوتے دکھ رہے ہیں کہ من کر رہا ہے کہ آپ کے جیب پکڑ لوں۔ بی ایم (ایس ایم) لیکچر دیا آپ نے کہ سالے پترکار کی بولتی بند ہو گئی۔ آئیے، کچھ دیر ہمارے ساتھ سنگت کیجیے۔"

"یہاں کون سا آپ کا گھر ہے پنڈت جی! ابھی کبھی نہائے آئے تو آپ کے یہاں بیٹھیں گے۔ پسینے سے بدن چپچپا رہا ہے۔ گھر جا کر نہا دھو لیں گے تب کہیں چین پڑے گا۔"

"گھر نہیں ہے تو کیا ہوا؟ ہوٹل تو ہے۔ وہیں چلیے شرما جی۔"

اس کے بعد تھوڑی دیر تک دوستانہ نوک جھونک چلی ہوئی۔ فارمیلٹی نام کا ایک لفظ تھا جس سے

بارے میں شرما بار بار کہہ رہا تھا کہ وہ اسے پسند نہیں ہے۔ بھوک چند کے مطابق انہیں بھی یہ لفظ نہایت ناپسند تھا۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس میں فارمیلٹی یعنی ظاہرداری جیسا کچھ بھی نہیں۔ چار پانچ گھنٹے ساتھ رہ کر شرما تو اب گھر کا آدمی ہو گیا ہے اور گھر کے آدمی کے ساتھ کیسی ظاہرداری!

''ارے بڑے صاحب، پہلے اپنی گاڑی کا کچھ انتظام تو کر لوں۔'' شرما کار سے باہر نکلا اور گیٹ پر کھڑے سنتری سے اس نے اشارے میں کچھ کہا۔ مطلب صاف تھا کہ وہ سنتری کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے صبح وہاں آنا ہی ہے، رات بھر اس کی گاڑی یہیں کھڑی رہے گی۔ سنتری کیا کہہ رہا ہے، اسے سننے کے لیے وہ نہیں رکا اور واپس بھوک چند کی کار کی طرف آ گیا۔

بھوک چند نے شرما کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کار میں گھسیٹ لیا اور بحث ختم ہوئی۔

راستے میں شرما نے باہر دیکھتے ہوئے کہا، ''آپ تو پنڈت جی اصولی آدمی ہیں، پان کے علاوہ کچھ لیتے نہیں ہیں۔''

بھوک چند نے پان کی ڈبیا نکال کر شرما کی طرف بڑھائی اور ڈرائیور سے کہا کہ بازار میں گاڑی روک لینا۔ گاڑی رکنے پر انھوں نے اس کے ہاتھ میں سو سو کے تین نوٹ تھمائے۔ ''وہسکی کی ایک بوتل لے آؤ۔ برانڈ صاحب بتائیں گے۔''

''کوئی سی لے آؤ، سستی شراب تو شراب ہے۔''

ہوٹل میں پہنچتے ہی سب سے پہلا کام شرما نے یہ کیا کہ اپنا کرتا اتار کر فرش پر پھینک دیا، بنیان پیٹ کے اوپر تک اٹھائی اور ایئر کنڈیشنر کے آگے بیٹھ گیا۔

''اب تو بڑے صاحب انھیں بنا چین نہیں پڑے گا۔''

''تو نہا لیجیے۔ تب تک میں کھانے کے لیے منگواتا ہوں۔''

بھوک چند نے اخبار میں لپٹی شراب کی بوتل کا کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا اور بوتل شرما کی آنکھ کے سامنے میز پر رکھ دی۔

اشارہ صاف تھا کہ جا کر نہا لو پھر آ کر دو دو پیگ ہو، پر شرما نے اشارہ سمجھنے سے انکار کر دیا۔ اس نے پیٹ کے اوپر تک اٹھائی بنیان پوری طرح سے اتار کر پھینک دی، دھڑ ننگا ہو گیا۔

ہوک چند کو لگا کہ شرما کی آواز میں کچھ رندھنے لگی ہے۔

''وقت وقت کی بات ہوتی ہے بڑے صاحب۔ آج اس عورت کے یہاں جا کر انتظار کرنا پڑا۔ کل تک یہی منسٹری...''

شرما پوری طرح سے فلسفہ جھاڑنے کے موڈ میں آ گیا تھا اور جیسا کہ ایسی صورت حال میں فطری بات تھی، وہ جذباتی ہو گیا۔

ہوک جانتے تھے کہ جذباتی ہونے پر آدمی دو میں سے ایک کام کرتا ہے۔ یا تو وہ سچ بولنے لگتا ہے اور اپنے اندر پوشیدہ غار میں دبی چھپی تمام باتیں سامنے والے کو بتانے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے یا پھر پوری طرح سے جھوٹ بولنے پر اتارو ہو جاتا ہے اور رونے لگے، بھرائی آواز اور ڈبڈبائی آنکھوں سے ایسی کہانی گڑھ سکتا ہے جسے سننے والا آخر تک انجام کو سچ ماننے لگتا ہے۔ ہوک چند انتظار کرنے لگے کہ شرما کس خانے میں جاتا ہے۔

غنیمت تھا کہ شرما کو فیصلہ لینے کی اس منزل پر پہنچنے میں، جہاں اسے سچ یا جھوٹ میں کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو، ابھی تھوڑی دیر تھی۔ شاید شراب کم پی تھی۔ اس نے تیسری بار وقت کو کوستا ہوا وہ اٹھا اور غسل خانے میں گھس گیا۔

شرما جب غسل خانے سے باہر نکلا تو کسی شاعر کے الفاظ میں اس کی ''چھب برنی نہیں جاتی'' تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ گرمی والے کمرے میں پنکھا چل رہا ہو تو دیر تک دھوتی کے پانی سکھانے کی ضرورت نہیں پڑتی، اس نے سر سے لے کر دھڑ تک کا پانی بس اتنا پونچھا تھا کہ وہ وافر مقدار میں کمرے میں گرتا رہا اور وہ پنکھے کے نیچے کھڑا ہو کر اسے سکھاتا رہا۔ کمرے میں چونکہ اس نے تولیہ لپیٹ رکھی تھی، اس لیے اندر کی صورت حال واضح نہیں تھی مگر پیروں سے جتنا پانی ٹپک کر کمرے میں بچھے قالین پر گر رہا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ جسم پر تولیے کا استعمال بڑی کنجوسی سے کیا گیا تھا۔ اس کا زیادہ بہتر استعمال کمر کے گرد لپیٹنے میں کیا جا سکتا ہے، یہ ثابت کرنے کے لیے شرما اسے لپیٹے پنکھے کے نیچے کھڑا تھا۔

''کوئی بیرا نہیں آیا؟''

جیسے ہی شرما نے کہا، ہوک چند نے لپک کر کال بیل دبا دی۔ اس دہشت سے چھٹکارا پانے

میں انہیں تھوڑا وقت لگا کہ شرما اپنے فولادی جسم کی نمائش کرتے ہوئے کہیں تین ستارہ ہوٹل کے برآمدے میں نہ چلا جائے۔

"بیرا آتا ہی ہوگا۔ آپ نہا رہے تھے، تبھی میں نے آرڈر دے دیا تھا۔"

بھوک چند نے گھبراہٹ میں اتنی دیر تک کال بیل کے بٹن پر ہاتھ رکھا کہ کئی ڈف ایف کے جدید یہ معلوم کرنے کے لیے چلے آئے کہ معاملہ کیا ہے؟ تھوڑی دیر وہ شرما اور گھنٹی پر ہاتھ رکھے رہتے تو ہوٹل کی انتظامیہ فائر بریگیڈ بلا لیتی۔ جو لوگ آئے، ان میں وہ بیرا بھی تھا جو ان کا آرڈر لے کر گیا تھا۔

شرما بیرے کو میز پر کھانے کی چیزیں لگاتے دیکھتا رہا، اور اسی درمیان بھوک چند کی نظر عروج پر پہنچ گئی اور ان کی نگاہیں کپڑے کے اس ٹکڑے پر گڑ گئیں جسے ہوٹل انتظامیہ نے تولیے کے نام سے بدن پونچھنے کے لیے غسل خانے میں رکھا تھا اور شرما نے جسے تولیے کی ذمہ داری سے ہٹا کر ڈھانکنے کے لیے اپنی موٹی کمر کے گرد لپیٹ رکھا تھا، اور صورت یہ تھی کہ بھوک چند کی جاسوسی نظر نے بیرونی روشنی میں یہ پتا لگا لیا تھا کہ کپڑے کا یہ ٹکڑا کس کی کمر پر لگا ہوا ہے۔ شرما نے تھوڑی دیر آنکھیں جھپکائیں، نتھنے پھیلائے اور میز پر لگنے والی چیزوں کا معائنہ کیا۔ "صاحب سب ویجیٹیرین ہیں نا۔"

"جی..." شرما کے جسم کے اوپری حصے اور تولیے سے بغیر نظریں ہٹائے بھوک چند ہنس دیے۔

"تبھی..."

اس "تبھی" کا مطلب ان کی سمجھ میں تب آیا جب شرما نے نان ویجیٹیرین کھانوں کی ایک لمبی فہرست بیرے کو نوٹ کرادی۔

بیرا جب مڑا تو شرما نے اسے روکا۔

"پیچھے صاحب کا ڈرائیور ہوگا، اسے اوپر بھیج دو۔ یہ نمبر ہے گاڑی کا صاحب۔"

"کہیں جائیں گے کیا شرما جی؟"

"ارے نہیں صاحب، جائیں گے کہاں؟ بس تو رات کا ڈرائیور سے بات کرنی ہے... پتا چلا ہو گیا۔ دن بھر چھپے بیٹھے میں گھومے۔ سوچ رہے تھے [illegible] والی [illegible]

ہوں گی۔"

"ڈرائیور کو بھیج دینا۔" بھوک چند نے ڈرائیور کا حلیہ اور گاڑی کا نمبر بیرے کو بتایا۔

جب تک ڈرائیور آیا، تب تک بھوک چند نے زبردستی شرما کو اپنی لنگی پہننے کو دے دی۔ اس نے لنگی پہن لی، تب ان کی جان میں جان آئی، ورنہ وہ ان اندیشوں کے بھنور سے ابھر آئے کہ اگر کہیں شرما کی کمر سے بندھا یہ چھوٹا سا ٹکڑا کبھی بھی زمین پر ٹپک گیا تو انھیں محسوس ہوگا کہ وہ خود برہنگی کے عالم میں ہیں۔ اب انھوں نے سکھ کا سانس لیا۔

شرما نے بغیر کسی تکلف کے گلاس میں شراب انڈیلی، برف ڈالی، پانی سے خالی گلاس بھرا اور غٹاغٹ پی گیا۔ بھوک چند نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ وہ پہلے بھی باقاعدہ پیتے تھے۔ ان کی نعت سے لارج، اسمال یا پٹیالہ پیگ بھی خلط ملط ہو گئے۔

ڈرائیور دروازے پر کھڑا تھا۔ گلاس ختم کر کے شرما نے اس کی طرف دیکھا۔ "ڈرائیور صاحب، ذرا شاپنگ جائیں۔ وہاں چاروں طرف کھادی کے کرتے پاجامے بیچنے والے بیٹھے ہوں گے۔ کسی کے یہاں سے میرے ناپ کا کرتا پاجامہ لے آئیے گا۔"

ڈرائیور نے پلکیں جھپکائیں، پر اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

"ارے سب سے بڑی ناپ کا چاہیے گا... ایکسٹرا لارج..."

ڈرائیور اس پر بھی نہ ہلا۔ شرما نے اپنی لنگی کی تصوراتی جیب کو ٹٹولنا شروع کیا۔ جیب نہیں ملی تو پیٹ پر ایک بار ہاتھ پھیر کر گلاس میں دوسرا پیگ بنانے لگا۔

"یہ لو۔" بھوک چند نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"چھوڑیے، نا جی۔" شرما نے دوسرا پیگ منھ سے لگایا۔

بھوک چند کا ہاتھ جیب میں ٹھٹھک گیا۔ وہ اٹھے اور غسل خانے میں کھسک گئے۔ سامنے گالی دینا ٹھیک نہیں ہے۔ شرما کی کئی پشتوں کو گالی دیتے ہوئے انھوں نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی، اس میں سے چند سو کے نوٹ باہر نکالے اور واپس آ گئے۔ ڈرائیور کے ہاتھ میں نوٹ تھماتے ہوئے ان کے منھ سے ہدایت نکلی: "اچھی کوالٹی کا لانا۔ اپنے شرما جی بڑے لیڈر ہیں، روز چیف منسٹر سے ملتے ہیں، کپڑا بڑھیا ہونا چاہیے۔"

Scanned with CamScanner

شرما نے ڈرائیور کے جاتے ہی ایک دوسرے گلاس میں ایک چھوٹا پیگ بنایا اور بھوک چند کے سامنے رکھ دیا۔

"لیجیے بڑے صاحب۔"

"پر میں تو پیتا نہیں۔"

"میں اکیلے نہیں پیتا۔"

بھوک چند نے "نہیں... نہیں..." کرنا شروع کر دیا۔ ان کی زندگی کا آزمایا ہوا فارمولا تھا کہ جب کچھ نہ کر سکو تو "نہیں... نہیں..." کرو، کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ آج بھی نکل آیا۔

"جیسے آپ نہیں پییں گے تو میں پی لوں گا۔ ایک بار اس گلاس سے، دوسری بار اس گلاس سے۔"

پھر شرما نے اپنے اصول کی بات بتائی۔ اصولاً وہ اکیلے نہیں پیتا۔ جب اکیلا ہوتا ہے تو دو پیگ رکھ لیتا ہے اور باری باری سے دونوں سے پیتا ہے۔ اصولاً اپنے لیے بڑا پیگ بناتا ہے اور سامنے والے کے لیے چھوٹا پیگ۔ کئی بار اسے شک ہے کہ دونوں ایک ہی شراب کیسے پی سکتے ہیں، اس لیے اپنے لیے وہسکی بناتا ہے تو سامنے والے کے لیے رم یا جن۔ اس کاک ٹیل سے کئی مرتبہ گڑبڑ بھی ہو جاتی ہے۔ بھوک چند دلچسپی سے شرما کے گڑبڑ کے بارے میں سنتے رہے۔ آج تو کاک ٹیل نہیں تھی۔ شرما دونوں گلاسوں میں وہسکی ڈال کر پی رہا تھا، پر گڑبڑ شروع ہو چکی تھی۔ دراصل یہ گڑبڑ فلسفے سے جڑی تھی۔

فلسفے اور شراب میں بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ویسے تو اوسطاً ہر ہندوستانی ہمیشہ ہی فلسفی ہو سکتا ہے، پیدائش سے لے کر موت تک کوئی بھی ایک مدعا اسے فلسفی بنا سکتا ہے، پر اگر وہ شراب پیتا ہو اور اس نے شراب پی رکھی ہو تو اسے فلسفی بننے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

شرما بھی دو بڑے پیگ حلق کے اندر اتارتے ہی فلسفی ہو گیا۔ بھوک چند اسے دونوں ہاتھوں سے مرغ اور مچھلی کی پلیٹیں صاف کرتے دیکھتے رہے اور اس حد سے تجاوز کرنے والی اس کی حالت کا تصور کرتے رہے جب شرما یا تو بیچ کو پرت در پرت چھیلتے ہوئے اسے ان کے سامنے بکھیر دے گا یا

Scanned with CamScanner

پھر جھوٹ کو اس طرح دلچسپ بنا کر اور اتنے فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کرے گا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے اسے سچ مان لیں گے،" اور اب وہ نقطۂ عروج آ ہی گیا۔

"سب وقت وقت کی بات ہوتی ہے بڑے صاحب!" شرما نے کہا اور رونے لگا۔

شراب اور فلسفہ دونوں رونے میں مدد کرتی ہیں۔ گڑبڑ یہ ہے کہ روتے روتے اکثر آدمی سچ بولنے لگتا ہے۔ بدحالی میں سچ بولنے والا کم پچھتاتا ہے، اسے سننے والے ضرور پھنس جاتے ہیں۔ بلوک چند نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ "دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں" والے فارمولے کے مطابق انھوں نے کمرے کی دیواروں کا معائنہ کیا۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا تھا، اسے اٹھ کر بند کر دیا۔

"پرش بلی نہیں ہوت ہے، سمے ہوت بلوان۔" (انسان طاقتور نہیں ہوتا بلکہ وقت سب سے طاقتور ہوتا ہے۔)

اگلا شعر شرما بھول گیا تھا اس لیے اب اس نے نثر کی مدد لے کر کہنا شروع کیا، "بڑے صاحب، سب وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ ارجن وہی اس کے تیر کمان، سامنے آئے اور بھیل گوپیوں کو لوٹ کر لے گئے۔ یہی ہوتا ہے بڑے صاحب جب وقت خراب ہوتا ہے۔ یہ... سالی..."

فلسفے کا دورہ پڑنے پر رونے کا دورہ موسم کی طرح ہوتا ہے۔ تھکانے والا دم لینے کے لیے وہیں آ رکی۔ اتنی رونق کے لیے بارہ موسم بھی کم لگتے ہیں۔ شرابی فلسفی ستانے کے لیے موقع ملتا ہے۔ شرما بھی رونے لگا۔

اس مرتبہ ستا کر شرما جب فلسفی ہوا تو دیر تک رونے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس نے بغیر دم لیے اپنی کہانی سنانی شروع کی۔

بلوک چند کے سامنے راحد عالی کا پورا کچا چٹھا اپنی تمام تر بدبو کے ساتھ گندے نالے کی طرح بہہ رہا تھا اور وہ اس میں چھپ چھپ ہاتھ پیر پٹک رہے تھے۔ اس کیچڑ میں چھینٹیں مارنے کا بہانہ بھی مزہ ہوتا ہے اور بلوک چند پوری دلچسپی سے اس میں غوطے لگا رہے تھے۔ بیچ بیچ میں یہ ضرور دیکھ لیتے تھے کہ دیواروں کے کان کھلے تو نہیں ہیں۔ ایک آدھ مرتبہ کوئی دروازہ یا کھڑکی کھلنے کو ہوئی تو انھوں نے کہانی کے بیچ میں اٹھ کر اسے بند کر دیا۔

اوسط ہندوستانی عام حالات میں تفصیل پسند ہوتا ہے۔ اگر شراب پیٹ میں ہو اور فلسفہ سر پر

Scanned with CamScanner

ناتج رہا ہو تو وہ کچھ مزید تفصیل میں چلا جاتا ہے۔ شرما کے ساتھ یہ تینوں صورتیں تھیں، اس لیے اس نے جو کچھ بتایا، پوری تفصیل کے ساتھ بتایا۔ چونکہ رات بیتی تھی اور بھوک چند کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ شرما رات میں یہیں رکے گا، اور صبح ہیڈکوارٹر میں لوٹنے والا تھا، اس لیے بھوک چند نے شرما کو ایک بار بھی روکا ٹوکا نہیں۔ انھوں نے اتنا کیا کہ ڈرائیور اس بیچ جب شرما کے کرتے پاجامے لے کر آیا تو اسے بھی کھانا کھا کر آرام کرنے اور صبح سات بجے گاڑی لگانے کا حکم دیا اور دروازے آخری مرتبہ اچھی طرح بند کر لیے۔ جتنا کچھ شرما نے شراب کے ساتھ کھانے کے لیے منگایا تھا اور دونوں ہاتھوں سے اس میں سے نکال نکال کر کھانے اور تالیاں پیٹنے کے بعد جو کچھ بچا تھا، وہ ان کے لیے کافی تھا۔ شرما کی باتوں میں خلل ڈالے بغیر انھوں نے اپنے کپڑے بدلے اور صوفے سے اٹھ کر بستر پر چلے گئے اور وہ تکیے دیوار سے سہارے لگا کر اس پر پیٹھ ٹکا کر بیٹھ گئے اور دیر رات تک شرما کی جوانی داستان سنتے رہے۔

لوگ سوچتے ہیں کہ ایسے معاملات فلموں میں ہی ہوتے ہیں۔ بھوک چند نے تعیناتی شروع ہوتے ہی سمجھ لیا تھا کہ اصل زندگی میں زیادہ مسالا ہوتا ہے۔ اس تفصیل میں تو مسالا فلموں سے زیادہ بہت کچھ تھا۔ سب کچھ، یعنی سیکس، دھوکہ، آنسو، خوشامد، بزدلی اور مار دھاڑ بازی۔ پڑتے ہی شرما کو کچھ وقت کی دوست زندگی اور اس کی سولی پر لٹکا گئی: ”سب وقت وقت کی بات ہے، بڑے صاحب، نہیں تو اس کلیا کی یہ حیثیت کہ مجھے اس کے گھر کے باہر انتظار کرنا پڑے۔“

جس عورت کو شرما ”کلیا“ جیسے اسم صفت سے نواز رہا تھا اور جسے پورا صوبہ ”منی چیف منسٹر“ کے نام سے جانتا تھا، اس سے شرما کی ملاقات تب ہوئی تھی جب وہ واجد حسانی کی سڑکوں پر سبزی کا خونچہ لگاتا تھا۔ یہ عورت اس سے سبزی خریدتی تھی۔ بہت فلموں کی طرح آنکھیں لڑنے کے لیے آئیڈیل پچویشن تھی۔ لوکی یا ترئی تولتے ہوئے کب انگلیاں چھوئیں اور کب آنکھیں لڑ گئیں، شاید اسی وجہ سے شرما کو یہ یاد کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔ پر جدید ہندی شاعروں کی طرح اس کے ساتھ ابہام کا مسئلہ بھی نہیں رہا۔ شراب سے لڑکھڑاتی زبان اور فلسفے سے رندھے گلے سے اس نے جو سمجھانے کا بیڑا لیتے ہوئے کچھ لسرہ مرچ جیسے الفاظ ایسے جتن سے جو وہ سمجھانا چاہتا تھا، بھوک چند فوراً سمجھ گئے کہ ان دونوں کے بیچ ہندی فلموں کی طرح ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔

Scanned with CamScanner

سے ہی جسمانی تعلق شروع ہو گیا۔

کہانی میں سیکس کے بعد جو صد مندری نام کا جز بھی شامل ہو گیا۔ شرما سبزی ضرور بیچتا تھا، پر رہتا تھا اپنے علاقے کے ایک ایم ایل اے کے بنگلے کے آؤٹ ہاؤس میں۔ سبزی بیچنے کے بعد وہ ایم ایل اے کے، جنہیں پورا علاقہ چیئرمین صاحب کے نام سے جانتا تھا کیونکہ وہ ایک کالج کی انتظامیہ کے چیئرمین تھے، بے تنخواہ دار سیاسی صلاح کار کے طور پر کام کرتا تھا۔ شام ہوتے ہی ان کے علاقے کے وہ سارے لوگ جنھیں چیئرمین صاحب اپنا کارکن کہتے تھے اور جن کے بارے میں ان کے مخالف لوگوں کی رائے تھی کہ وہ اٹھائی گیرے اور شہدے تھے اور جو راجدھانی میں دن بھر کسی نہ کسی کام سے دفتروں کے چکر لگا رہے ہوتے، چیئرمین کی کوٹھی پر اکٹھے ہو جاتے۔ کوٹھی کے باہر ایک چبوترا تھا جس پر سورج ڈوبتے ڈوبتے شرما کی قیادت میں علاقے کے کارکنوں کی ایک فوج پانی چھڑکتی۔ پھر گھر میں موجود ساری ثابت اور ٹوٹی کرسیاں جو بیٹھنے والوں کے ساتھ خود نہ بیٹھ جائیں، چبوترے پر لگا دی جاتیں۔ کوٹھی کے برآمدے میں پڑی چار پانچ چارپائیاں بھی چبوترے پر پہنچ جاتیں۔

ان بیٹھکوں میں چیئرمین صاحب کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان کا علاقہ سیاست کے معاملے میں بہت زرخیز تھا۔ علاقے میں سڑکیں ٹوٹی پھوٹی تھیں، صنعت کس چڑیا کا نام ہے، لوگ نہیں جانتے تھے، باندھ کا صحیح استعمال باڑھ روکنے میں بھی ہو سکتا ہے، اس پر لوگوں کے دلوں میں شکوک تھے۔ ان کی رائے ہمیشہ اس جانب رہتی کہ باندھ مچھلی پالنے کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں۔ تمام فالتو چیزیں تھیں جن پر اکثر بڑے شہروں کے لوگ ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر بحثیں کرتے ہیں اور ترقی نام کی کسی فالتو چیز کے طور پر چیئرمین صاحب کے علاقے پر لادنا چاہتے ہیں۔ علاقے کے لوگ جانتے تھے کہ ان بڑے شہروں کے بابوؤں کی خواہشات صرف بحث مباحثے و سیمینار جیسے اعلام پانے کے لیے ہوتی ہیں، اس لیے وہ ان کی بہت فکر نہیں کرتے اور اپنے کام میں لگ جاتے ہیں جو ان کا سب سے پسندیدہ شغل ہے اور جس کی وجہ سے وہ شام کو چیئرمین صاحب کی کوٹھی کے اس چبوترے پر اکٹھے ہوتے ہیں۔

چیئرمین صاحب کے علاقے کے لوگوں کا سب سے پسندیدہ مشغلہ تھا سیاست یعنی پالیٹکس۔

Scanned with CamScanner

وہ ہر چیز میں سیاست کرتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، فراغت کے لیے لپکتے، پریڈ کرتے، دلت لوگوں کی بستیاں اجاڑتے، انھیں جلاتے، کبھی ان کی بستیوں میں ہینڈ پمپ لگاتے، کورٹ کچہری جاتے، تھانے کی دلالی کرتے، غرض یہ کہ جیتے مرتے، ہر وقت سیاست کرتے رہتے۔ ان کے علاقے میں ہر چوراہے پر کافی ہاؤس کھلے ہوئے تھے۔ لوگ انھیں جانتے بھلے ہی چائے یا پان کی دکان کے روپ میں ہوں مگر علاقے کی دانشورانہ صلاحیتوں کی ترقی میں ان کا کنٹری بیوشن کافی ہاؤسوں سے کم نہیں تھا۔ صبح ہوتے ہی دانشوران علاقہ ان کافی ہاؤسوں میں پہنچ جاتے۔ ان کی بحثوں کا دائرہ اکثر قومی یا بعض موقعوں پر بین الاقوامی موضوعات ہوتے تھے۔ ان کے پاس ملک و قوم کے سارے مسائل کے حل ہوتے تھے۔ قومی کیا، بین الاقوامی مسائل پر بھی ان کی رائے حیرت زدہ کر دینے والی ہوا کرتی۔

سیاست سے انھیں بس اتنا سروکار تھا کہ اگر بغیر گھمائے پھرائے بات کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کی مقامی سیاست کا محور صرف اور صرف تھانہ ہی ہوتا ہے۔ اس سیاسی کھیل کو کھیلنے کے لئے دو کیمپوں میں لوگ بٹے ہوئے ہیں۔ چیئرمین صاحب کا کیمپ اور چیئرمین صاحب کے مخالفین کا کیمپ۔ ایک تھانیدار کا تبادلہ کرا دیتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ چیئرمین کا کارندہ جیب کاٹتے ہوئے پکڑا جائے تو اسے داروغہ جی حوالات میں بند کرا دیں۔ علاقے کا ایجنڈا اور ریکارڈ اتنا خراب ہوا ہے۔ دوسرا کیمپ جا کر ضلعی انتظامیہ کے آفس پر دھرنا دے دیتا ہے کہ ایسا تھانیدار تو آج تک آیا ہی نہیں۔ پورا رام راج ہے۔ علاقے کے چور کا مدعی ٹوپی عوام کے قدموں میں رکھ دیتے ہیں اور بھائی صاحب، ماتاجی یا بہن جی جیسے القاب سے مخاطب کرتے ہوئے ان سے بس ایک ہی التجا کرتے ہیں کہ لوگ ان پر ترس کھائیں اور جیب کی ساری رقم ان کے حوالے کر دیں۔ آخر لٹیرے بھی بغیر پیٹ کے مدد کرنے کو نہیں تیار ہوتا تو وہ ہاتھ جوڑ کر ایک ہی جملہ بار بار دہراتے ہیں کہ جب تک یہ کمبخت داروغہ ان کے علاقے میں ہے تب تک ان کا کٹھن امتحان نہ لیا جائے۔

علاقے میں بجلی کے کھمبے گڑے ہیں۔ دو کھمبوں کے بیچ تار نام کی ایک غیر ضروری چیز بھی باندھی گئی ہے جسے لوگوں نے بیچ میں سے کاٹ کر غائب کر دیا اور گھروں میں کپڑے ٹانگنے یا مویشیوں کو باندھنے جیسا استعمال کیا ہے۔ جہاں کھمبوں کے بیچ تار موجود ہیں، وہاں لوگ سرکار سے امید

کرنے لگتے ہیں کہ ان میں بجلی بھی دوڑے۔ سرکار ویسے ہی بہت مصروف چیز ہوتی ہے اس لیے علاقے کے لوگ یا ان کے لیڈر سرکار کو پریشان کرنا نہیں چاہتے۔ وہ ان سے ایسی فضول باتیں نہیں کرتے کہ کھمبوں نے بیچ تار بھی ہو اور ان میں بجلی بھی دوڑے۔ بجلی سے ان کا مطلب مقامی سب اسٹیشن کے جونیئر انجینئر سے ہوتا ہے۔ اگر اپنا آدمی جے ای ہو تو علاقے میں بجلی کی سپلائی ٹھیک ٹھاک چل رہی ہوتی ہے۔ بغیر تار کے بھی کھمبے بجلی کے لٹو سے جگمگانے لگتے ہیں۔ بغیر بجلی کے تھریشر چلنے لگتے ہیں، ٹیوب ویل پانی پھینکنے لگتے ہیں، ور مخالفین بجلی کی چمک دمک کے حملے سے شکست خوردہ ہوجاتے ہیں۔ جیسے ہی اپنے والے جے ای کا تبادلہ ہوتا ہے، بجلی کا نظام درہم برہم لگنے لگتا ہے۔ علاقے میں طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور عوام کے دکھ سے بے قرار کارکن رجدھانی کا رخ کرتے ہیں اور چیئرمین صاحب کے چبوترے پر ہنگامی صورت حال پر صلاح مشورے ہونے لگتے ہیں۔

ایسے صلاح مشوروں میں شرما ان کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوتا تھا۔ دن بھر سبزی بیچ کر شام ڈھلے وہ لاؤٹ ہاؤس پہنچ جاتا۔ وہاں ٹھیلا کھڑا کرکے دن بھر کا حساب کتاب لگا کر وہ نہاتا اور پھر چکاچک کرتا پاجامہ پہن کر شام کی بیٹھک کا انتظام کرنے پہنچ جاتا۔

چیئرمین صاحب کے یہاں مکمل طور پر جمہوریت تھی۔ وہاں کی میٹنگ میں حصہ لینے کے لیے صرف تین چار شرائط پوری کرنی ضروری تھیں۔ شرط نمبر ایک تھی کہ بیٹھک میں حصہ لینے والا چیئرمین صاحب کے علاقے کا ہو۔ دوسری شرط کے مطابق اس کے پھیپھڑے مضبوط ہوں۔ تیسری شرط لباس سے متعلق تھی۔ وہاں آنے والا اگر کھدر کے کرتے پاجامے میں ہو تو اس کی حیثیت میں مزید اضافہ ہوتا۔

شرما ان تمام شرائط پر پورا اترتا تھا۔ خاص طور سے بیچ والی یعنی دوسری شرط پر۔ اس کے پھیپھڑے اتنے مضبوط تھے کہ وہ کسی بھی بحث میں کبھی بھی گلا پھاڑ کے چلانے لگ سکتا تھا اور پکے راگ کے کسی سدھے گانے والے کی طرح دیر تک راگ ولمبت میں رہ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور خوبی بھی تھی جس کی وجہ سے چیئرمین صاحب کے دربار میں اس کا مقام تھا۔ وہ ہمیشہ چپل پہنتا تھا اور کبھی بھی اسے پیر سے نکال کر ہاتھ میں لے سکتا تھا۔ پھیپھڑے کی طاقت سے بھرپور آواز اور ہاتھ میں چپل یہ ایسا منظر پیش کرتے کہ چیئرمین صاحب اس پر لہلوٹ ہو کر اسے دیکھتے رہتے۔ یہ منظر

Scanned with CamScanner

آخر سیکریٹریٹ میں دکھائی دیتا جب چیئرمین صاحب کسی نادان افسر کو یہ سمجھانے کی کوشش میں لگے ہوتے کہ ترقی وہ نہیں ہے جو دلی میں دیے گئے کمیشن سے جھلک رہا ہے بلکہ وہ ہے جسے وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے سمجھانے میں لگے ہیں۔ بحث کا اختتام عام طور سے شرما کی مداخلت سے ہوتا۔

چیئرمین صاحب دل کے مریض تھے۔ ویسے بھی ان کی سیاسی تربیت گاندھی وادی اقدار کے مطابق ہوئی تھی۔ ان کا اس پر یقین تھا کہ نادانی کرنا تو افسروں کی فطرت ہے، اس لیے ان کی نادانی پر ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ وہ مسکراتے رہتے اور دھیمے لہجے میں رک رک کر باتیں کرتے، پر اس طرح کے کسی رویے کے لیے شرما کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ نہ صرف شرما بلکہ ان کے چیلوں پر بھی اس قسم کے رویے کی کوئی پابندی نہیں تھی، اس لیے وہ مسکراتے رہتے اور ان کے چیلے اپنے پینتروں کا استعمال کر کے سمجھانے کی کوشش کرتے۔ چیئرمین صاحب دھیرے دھیرے رک رک کر بولتے اور شرما اس افسر کا دھیان اس صورت حال کی طرف مبذول کراتا جس میں چپل پاؤں سے نکل کر ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہے۔ شرما کسی بھی افسر کے سامنے ہندوستانی دفتروں میں چپل کے استعمال کے موضوع پر گھنٹوں تقریر کر سکتا تھا۔ زیادہ تر افسروں کی اس تقریر میں دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ کئی بار کچھ نادان افسر اس موضوع پر غیر منطقی دلائل دینا شروع کر دیتے۔ وہ شرما کو بتانے کی کوشش کرتے کہ چپل سے زیادہ مفید جوتا ہوتا ہے اور اپنے زمانہ طالب علمی میں یہ پچھلی صدی تک وہ بھی چپلیں پہنتے تھے، پر اب وہ جوتا پہننے لگے ہیں۔ بحث اس بات پر ٹک جاتی تھی کہ جوتے اور چپل میں کسے پہلے اتارا جا سکتا ہے۔

چیئرمین صاحب مسکراتے رہتے اور اس بحث مباحثے سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔ کئی مرتبہ یہ بھی ہوا کہ یہ بحث جوتے چپل اتارنے کے مقابلے میں تبدیل ہو جاتی۔ تب ان کی مسکراہٹ بڑی کام آتی۔ اگر شرما جیتتا تو وہ افسر کو بتاتے کہ جس فن کی مہارت کے بارے میں شرما بات کر رہا ہے، یعنی پھینک کر ماری گئی چپل، یہ اس کی اس ٹریننگ کا جیتا جاگتا ثبوت ہے جس کے تحت وہ چاہتا ہے کہ ہندوستانی نونہال اس طرح کے کرتبوں میں ماہر ہوں اور اولمپک میں قوم کی خواہشات کو پورا کرتے ہوئے طرح طرح کے میڈل جیتنے کی تیاری میں لگ سکیں۔ اگر شرما ہارتا ہوا دکھائی دیتا تو ان کی مسکراہٹ 'ابھی بچہ ہے' والے تاثرات سے اس کی حفاظت کرنے کے لیے آگے بڑھتی۔

Scanned with CamScanner

چیئرمین کے گھر شام کو اکٹھے ہونے والا "بلند بریگیڈ" صرف سرکاری دفتروں کے بابوؤں کے ساتھ تبادلۂ خیال کے لیے ہی کارآمد نہیں تھا، سیاست میں اس کی افادیت زیادہ تھی۔ چیئرمین صاحب شفقت کے ساتھ بلند بریگیڈ کو "بچے" کہا کرتے تھے۔ ان کے مطابق بچوں کو ان کی افادیت کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ ایک طرف پھیپھڑا والے تھے اور دوسری طرف چپل والے۔ پھیپھڑے والے اپنے پھیپھڑوں میں ہوا بھر کر اسے منہ کے راستے اس طرح نکالتے تھے کہ سامنے والا افسر یا سیاسی مخالف ہکا بکا منہ کھولے تب تک دیکھتا رہ جاتا جب تک اس کے منہ سے رال نہ بہنے لگتی۔ زیادہ تر مسائل تو پھیپھڑا والوں کے سہارے حل ہو جاتے۔ کبھی کبھی ہائی کمانڈ کا کوئی نمائندہ یا کوئی افسر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا کہ اس کے پھیپھڑوں میں بھی تابناک دم ہے، تب پھیپھڑے والے ایک طرف ہٹ جاتے اور چپل والا دستہ فعال ہوتا۔

شرما دونوں دستوں میں تھا اس لیے اس کی افادیت زیادہ تھی۔

شرما کی افادیت کے اور بھی اسباب تھے۔

حالانکہ شراب نے تکلف اور شرم و حیا کی ضرورت ختم کر دی تھی، پھر بھی شرما نے کمرے میں چل رہے پنکھے، کونوں، کھڑکیوں اور دروازوں کے اوپر سے جھانکتے ہوئے جو کچھ کہا، اس سے جوگ چند کی سمجھ میں یہ آیا کہ چیئرمین صاحب لنگوٹ نام کی کسی پوشاک کے بڑے کچے تھے۔ شراب شرما پی رہا تھا، پر سمجھ میں آنے کے بعد جوگ چند نے بھی کھڑکی دروازوں اور پنکھوں کو گھورنا شروع کر دیا۔

راجدھانی میں بہت سے نیتا تھے جو چیئرمین صاحب کی طرح لنگوٹ کے کچے تھے۔

راجدھانی میں ایسی بہت سی عورتیں بھی تھیں جو کسی کی طرح خوبصورت اور حوصلہ مند تھیں۔ ان دونوں طرح کی مخلوق کے ساتھ شرما جیسے سیلف سروس والوں کی ایک بڑی فوج تھی جو خوبصورت اور حوصلہ مند عورتوں کو لنگوٹ کے کچے ان قومی لیڈروں سے ملانے کے لیے سب جتن کیا کرتی تھی۔ اکثر یہ سیلف سروس والے اندھیری راتوں میں اپنی لیڈری یا حوصلہ مند خوبصورت عورت کی حیثیت کے مطابق، چوپہیا، تپہیا یا دوپہیا سواری سے اترتے اور ان کے ساتھ اترتی وہ حوصلہ مند اور خوبصورت عورت جسے نیتا جی سے بہت ضروری سوالوں پر سیاسی صلاح مشورے کرنا ہوتے۔ کئی بار شرما کی گاڑی سے لوگ باہر ہی رک جاتے اور بعض دفعہ یہ اس خوبصورت عورت کو خود ہی ان کی آرام گاہ تک پہنچا

Scanned with CamScanner

آتے۔ یہ بات بھی وقت، موقعے اور آسانی پر منحصر تھی کہ عورت کو لانے والا یا تو اپنی موٹر کی میں انتظار کرے گا یا گھر جا کر صبح ہونے سے پہلے آ کر اسے واپس لے جائے گا۔

شرما نے جب مکھن کو چیئرمین صاحب سے ملنے کی بات کی تب سے امید تھی کہ اس کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھانے والی حسینہ بھڑک جائے گی لیکن بیوقوف عاشق کی طرح اس نے بھی اس خوبصورت جسم کے اندر دھڑکتے ہوئے بلند حوصلوں کی تہہ تک نہیں دیکھی تھی۔ جیسے ہی اس سے یہ تجویز رکھی، ویسے ہی محاورے کی زبان میں مکھن نے اسے چٹ کر لیا۔

وہ چار دن کی شام والی بیٹھک میں شریک ہوئی۔ سیاسی موضوعات پر اس کی عقل اتنی تیز چلتی تھی کہ کئی بار شرما بھی بھونچکا رہ جاتا۔ چیئرمین صاحب اس کی معلومات سے کئی بار دنگ رہ جاتے تھے۔ آخر میں وہ وقت آ ہی گیا جس کا مکھن اور شرما کو انتظار تھا۔ چیئرمین صاحب مکھن سے زیادہ سنجیدہ موضوعات پر اور زیادہ دیر تک تبادلۂ خیال کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اتنے سنجیدہ موضوعات پر شام کے دربار عام میں گفتگو نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے شرما مکھن کو پیچھے رکشے پر یا کار میں بٹھا کر رات کے وقت چیئرمین صاحب کے گھر لانے لگا۔ چیئرمین صاحب اور مکھن بہت ہی سنجیدہ سیاسی صلاح مشورے کرتے اور باہر رکشے پر بیٹھ کر شرما "مچھروں سے بچنے کے طریقے" نام کی کتاب کی ورق گردانی کرتا رہتا۔ تھوڑے عرصے کے بعد کار آ جانے پر اس میں ریڈیو چلا کر سوجاتا۔ مشورے ختم کر کے پو پھٹنے سے پہلے مکھن باہر آتی تو وہ اسے گھر چھوڑ آتا۔

اس طرح کی کہانی میں جیسے موڑ آتے ہیں، ویسے ہی اس کہانی میں بھی آئے۔ ایک خوبصورت اور بلند حوصلہ عورت جس کی سیاسی بصیرت ان لوگوں تک پہنچنا چاہتی ہے جو جیتا ان میں اس کا بہتر استعمال کر سکیں۔ ایک ایم ایل اے اپنے علاقے کی عوام کی خدمت کے لیے منسٹر بننا چاہتا ہے۔ ایک چیف منسٹر جو حکومت سے پیچھے بہتر نئے راستوں پر سیاست کی تکمیل کیے ہوئے بلندی پر پہنچ گیا، وہ دن بھر کی تھکاوٹ، سیاسی اور تھکا دینے والے اعصاب کے بعد اپنے تھکن اور دانشمندی کے مجسم کو آرام دینے کے لیے سیاست میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے بے قرار حسیناؤں سے کچھ صلاح مشورے کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اوپر سے دیکھنے میں تینوں میں کوئی خاص تعلق نہیں دکھائی دیتا مگر تھوڑا غور سے دیکھنے پر ان سب میں ایک جیسی گہری یکسانیت نظر آتی ہے۔

ملے گی جس کے بہاؤ میں تینوں نہانے کے لیے بیتاب ہوں گے اور کہانی کا اختتام فطری طور پر یہی ہو سکتا تھا کہ جلد ہی تینوں کیچڑ میں چھپ چھپ کر نہانے لگتے۔

اس کہانی میں بھی یہی ہوا۔ منتری بننے کے لیے بے قرار چھوٹا موٹا نیتا حسین عورت کو لے کر ڈھلتے گالوں اور تھل تھل کرتے جسم اور پائیوریا سے سڑتے دانتوں والے چیف منسٹر کے دربار میں حاضر ہوا اور ان دونوں کو سنجیدہ صلاح مشورے میں مشغول چھوڑ کر لوٹا اور باہر کار میں رات بتانے لگا۔ منتری بن جانے کے بعد بھی چیئرمین صاحب نے اپنا رول چھوڑا نہیں۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ پہلے اپنی کار خود چلاتے ہوئے جاتے تھے اور ممن کے اندر چلے جانے کے بعد گاڑی کی اگلی سیٹ پر ہی پسر کر سو جاتے تھے؛ اب جھنڈا لہراتی ہوئی گاڑی پر پچھلی سیٹ پر ممن کے ساتھ بیٹھ کر جاتے اور اسے اندر تک پہنچا کر پچھلی سیٹ پر سو جاتے، اگلی سیٹ پر ڈرائیور سوتا۔ اس نے پہلے بھی دوسرے منتریوں کے ساتھ اتنی بار یہ ڈیوٹی انجام دی تھی کہ صلاح مشورہ ختم ہونے کے وقت اس کی نیند خود بخود ٹوٹ جاتی۔ جب ممن تیز قدموں سے گاڑی کی طرف آتی دکھائی دیتی تو وہ ایک ہاتھ سے گاڑی کا دروازہ کھولتا ہوتا اور دوسرے ہاتھ سے منتری ہونے کے باوجود چیئرمین صاحب نام سے پکاری جانے والی مخلوق کو جگاتا ہوا دکھائی دیتا۔

یہ وہ مقام تھا جب شرما کو برے وقت کی اہمیت سمجھ میں آنے لگی۔

"سب وقت وقت کی بات ہوتی ہے بڑے صاحب۔ اس وقت میری مت ماری گئی تھی..."

بٹوک چند کی سمجھ میں آ گیا کہ مت کہاں ماری گئی تھی۔ ان کہانیوں میں ایک غلطی ہمیشہ دہرائی جاتی ہے۔ بلند حوصلہ حسینہ کا عاشق یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اپنے شوہر سے بے وفائی کرنے والی اس کی محبوبہ اس کے تئیں وفا سے لبریز ہے۔ یہیں وہ دھوکا کھاتا ہے اور یہیں اسٹیج پر وقت دندناتا ہوا داخل ہوتا ہے۔

شرما نے دو تین مرتبہ سی ایم ہاؤس میں ممن کو لے جانے کے لیے گاڑی بان کا کردار ادا کرنے کی پیشکش کی پر شروع میں روکھے اور بعد میں سختی سے یہ پیشکش ٹھکرا دی گئی۔ چیئرمین صاحب کے رویے میں بھی کچھ ایسی تبدیلی آ گئی کہ شرما کو شام کی بیٹھکیں کافی بیگانی لگنے لگیں۔ اس کی موجودگی میں

Scanned with CamScanner

چیئرمین صاحب کو ایسے گمبھیر موضوعات یاد آ جاتے کہ وہ ان کے بیان کرنے میں پوری طرح غرق ہو جاتے۔ اگر وہ بحث میں دخل اندازی کرنے کی کوشش کرتا تو چیئرمین صاحب کی سماعت کچھ ایسی ہو جاتی کہ انھیں دوسروں کی باتیں تو سنائی دیتیں لیکن شرما کی آواز ان کے کانوں تک نہ پہنچتی۔ شرما شام کی نشستوں کے لیے کرسی میز ہٹوانے پہنچتا تو اسے نرم انداز میں بتایا جاتا کہ اسے تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس کی دعا سے یہاں یہ سب کام کرنے کے لیے سیف ہاؤس والے موجود ہیں۔

بڑی مشکل سے شرما چیئرمین صاحب کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوا تھا کہ سمن کو سی ایم ہاؤس میں چھوڑ کر آنے کی تجویز کے سلسلے میں اس کی نیت صرف یہ تھی کہ چیئرمین صاحب کو ایسے کسی کام میں ملوث ہونے سے بچایا جائے جو ان کے شایان شان نہیں۔ چیئرمین صاحب منتری ہوتے تھے اور کسی منتری کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ سی ایم ہاؤس میں کسی کو پہنچا کر خود باہر کار میں سوتے ہوئے کسی کا انتظار کرے۔

شرما چیئرمین صاحب کو اتنا یقین تو نہیں دلا پایا کہ اسے سی ایم اور سمن کے بیچ پل بننے کا موقع مل جانے پر اتنا یقین ضرور دلا دے گیا کہ ان کی کوٹھی پر شام کو کرسی اور چارپائی کھینچنے کا اس کا پرانا کام اسے پھر سے مل گیا۔ چیئرمین صاحب بھی زیادہ دنوں تک قاصد بنے نہیں رہ پائے۔ جلد ہی سمن کے شوہر نے بڑی ذمے داری سنبھال لی۔ شوہر نام کا یہ انسان کافی دنوں سے بے روزگار تھا۔ چیف منسٹر نے سمن کے ساتھ پہلی رات کو ہی تنہائی میں سنجیدہ صلاح مشورے کے بعد یہ طے کر دیا تھا کہ وہ شوہر محترم کو او ایس ڈی بنا دیں گے۔

او ایس ڈی یعنی آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی۔ یعنی نوکر شاہی میں اس کا کردار پران میں نارد کی طرح ہوتا ہے۔ یہ موجود ہو سکتا ہے اور کہیں نہیں بھی ہو سکتا ہے۔ او ایس ڈی بنا کر چپراسی سے چیف سیکریٹری کا رول ادا کرنے کو کہا جا سکتا ہے اور بعض اوقات کسی چیف سیکریٹری کو اس کی اوقات بتانے کے لیے او ایس ڈی بنا کر چپراسی کی حیثیت میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

سمن کا شوہر او ایس ڈی بنا، تب تک سمن بھی چیف منسٹر بن چکی تھی۔ اس لیے صوبے کی نوکر شاہی کے لیے اب او ایس ڈی شوہر کی وہی حیثیت بنی جو صوبے کے چیف منسٹر کی بیوی کی تھی۔ چیف منسٹر کے بہت قریبی کچھ افسروں کو چھوڑ کر وہ کسی بھی افسر کو ہٹا سکتا تھا اور کوئی بھی افسر اس سے

Scanned with CamScanner

ماتحت کے کام کو انجام دے کر اور انھیں مطلع کر کے اپنے اوپر فخر محسوس کرتا تھا۔

"بڑے صاحب، ایک وقت آ گیا ہے!" اس مرتبہ وقت کی یاد نے جس پر دانش کے کان میں جو ہل چل مچی، وہ یہ کہ وہ اس کے شوہر کے اس نئے رول کے بارے میں چند شذرے جسے بتانے کے لیے وہ بے تاب تھا۔

"اب آپ نے کبھی سنا ہے بڑے صاحب، اگر کوئی شوہر خود ہی اپنی بیوی کو کسی صاحب کے بیڈروم میں بھیج کر باہر اسٹول پر بیٹھ کر چوکیداری کرے؟"

ہنوک چند نے دیکھا اور سنا دونوں تھا کہ ترقی اور اچھی جگہ تقرری کی چاہ میں کئی ماتحت اپنی بیویوں کا اسی طرح استعمال کرتے تھے، پر ابھی شرما ان سے کسی جواب کی امید نہیں کر رہا تھا اس لیے چپ چاپ سامع بنے رہنے کو وقت کی پکار مان کر انھوں نے سلاد میں سے مولی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اسے ٹونگنے لگے۔

"لوگ سالا کہتا ہے کہ اس کی مہر رو (بیوی) سی ایم اے کے ساتھ پولیٹکل ڈسکشن کر رہی ہے، اور خود گاڑی میں بیٹھ کر مچھر مارتا رہتا ہے... ڈسکشن نہیں، ٹھینگا کرتی ہے... پورا صوبہ جانتا ہے کہ کیا ڈسکشن ہوتا ہے..."

اس کے بعد شرما نے پولیٹکل ڈسکشن کا جو نقشہ کھینچا، اس سے ہنوک چند ہندوستانی روایت کے مطابق اسی طرح سے جم کر لطف اندوز ہوئے جس طرح سامع بنے چہرے اور آنکھوں میں مسلسل ایک ایسا تاثر محسوس کرتا ہے کہ اس کے لیے اس غلیظ موضوع کو سننا کسی جہنم کے نظارے سے کم نہیں ہوتا مگر اس کے کان بکسولی سے سامنے والے کی گفتگو سے چھلکتے رسیلے الفاظ کو خوب ہی خوب اندر اتارتے رہتے ہیں۔ وہ بیچ بیچ میں اپنی لغت سے حاصل دھتکارنے جیسے الفاظ کا جم کر استعمال کرتے رہے، اور جب بھی شراب کے اثر سے شرما کی زبان کچھ لڑکھڑاتی، اسے واپس کتھا کے لذیذ موضوعات کی طرف موڑ کر لاتے۔

اگلے کچھ منٹوں میں شرما نے جو کتھا سنائی، وہ اس پچھڑے ہوئے صوبے میں کئی بار دہرائی جا چکی تھی اور ہنوک چند جیسے لوگوں نے الگ الگ چیف منسٹروں کے دورِ حکومت میں الگ الگ حوالوں سے سن رکھی تھی۔ اس صوبے میں ایک بہترین آدمی چیف منسٹر رہ چکے تھے جن کی بیوی

صدق سے ان کان چلاتے تھے۔ ان کے زمانے میں صوبہ بہومت (اکثریت والے) سے نہیں، بھومت (بھوجی والے) سے چلتا تھا۔ ایک ضلع میں اکثر دو کمشنر چارج لیے بیٹھ جاتے تھے۔ ایک کو سرکار آرڈر دیتی تھی دوسرا بھوجی کے دربار سے جاری آرڈر کی کاپی پکڑ کر آ بیٹھ جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ بھوجی جس پر مہربان ہوں، وہی کمشنر کی کرسی پر براجمان ہو سکتا تھا۔ ایک دوسرے تہائی معزز مانے جانے والے صاحب، جن کی شہرت "چیل کھڑو" چیف منسٹر کی تھی، صوبے کے ہر شہر میں ڈکش کے لیے لٹ اسٹ قسم کے کردار پالنے میں یقین رکھتے تھے۔ اپنی بیوی سے اولاد پیدا کرنے میں ناکام رہے تھے مگر صوبے کے کونے کونے میں ان کی اولاد بکھری دکھائی دیتی۔ شرما جن چیف منسٹر کے بارے میں بتا رہا تھا ان کے ساتھ دقت یہ تھی کہ وہ پچھڑی ذات کے تھے اور دلکش ہمیشہ اگڑی (اونچی) ذات کی خواتین سے کرتے تھے۔ شرما کے دکھ کی ایک یہ بھی وجہ تھی۔

"اب آپ ہی بتایئے بڑے صاحب... سارا وقت اتنا خراب آگیا ہے کہ..." اس کے بعد شرما نے دکھ ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ اس خراب وقت میں فلاں فلاں ذاتوں کی خواتین کو فلاں فلاں ذاتوں کے مردوں سے پولیٹکل ڈکشن جیسا گھناؤنا کام کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کے مطابق "فلاں ذات کے چیف منسٹر تک تو ٹھیک تھا، پر فلاں ذات کے چیف منسٹر کے ساتھ... چھی چھی..."

تھوڑی دیر تک "چھی چھی" ہوتی رہی مگر ظاہر تھا کہ "چھی چھی" سے نہ تو وہ بے چینی ختم ہوتی جو سب کچھ بیان کر دینے کے لیے اندر سے بے قرار کر رہی تھی اور نہ اس اشتیاق کو سرد کر سکتی تھی جو ان رس بھری کہانیوں کا جی بھر کر مزہ لینا چاہتی تھی۔ لہٰذا دیر رات تک شرما وہ ساری تفصیلات بتاتا رہا جنھیں سن کر یوں لگا چند کونگ، ہاتھ کے نخوں سے آج دن بھر جو کچھ بار بار شرما پر خرچ کیا تھا، وہ بیکار نہیں جانے والا تھا۔

شرما کی کہانی کا سب سے یہ تھا کہ پہلے چیئرمین صاحب کی قربت سے اس کی زندگی کے طور طریقے بدلے اور پھر چیف منسٹر سے گہرے تعلقات نے پوری زندگی ہی بدل ڈالی۔ کس طرح چھوٹے بڑے شروع کرکے اس نے لاکھوں اور کبھی کبھی کروڑوں فیس کی شکل میں وصول کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران شرما نے بار بار اپنے خالی گلاس کو بھر کر پیا۔ دکھانے کی بات یہ تھی کہ شروع میں تو کئی سودے اس کے ذریعے ہوتے تھے اور سے بھی اس کا حصہ مل گیا تھا۔ بعد میں اس کے توسط اور

Scanned with CamScanner

دیوروں نے براہ راست سودے کرنا شروع کر دیے۔ شرما کے پاس شکار نہیں آتے تھے اسے خود شکار کی تلاش میں پیکر پیٹ سے لے کر ریلوے اسٹیشن تک خاک چھاننی پڑتی تھی۔

ان تفصیلات کے بعد شرما کچھ ٹھٹکا۔ شراب میں اس کا جسم ضرور دھت تھا، پر دماغ ابھی کام کر رہا تھا۔ اس نے پوری طرح بے سدھ ہو کر لڑھکنے سے پہلے بوس چند کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا، ''پر چنتا مت کرو بڑے صاحب... جتنی بھی بڑی توپ ہوئی ہو سالی، پر اپنے پرانے یار کو کبھی بھی نہیں بھولی جیوں۔ میں کوئی کیس لے کر جاتا ہوں تو انکار نہیں کرتی۔ آپ کا کیس بھی کرے گی... بڑے صاحب... آپ نے دیکھا نہیں، کیسے مجھ سے بات کر رہی تھی...''

شرما تو بستر پر لڑھک گیا، پر اس جملے سے بوس چند کا منھ لٹک گیا۔

انھوں نے ممی کے کمرے میں جو دیکھا تھا، اس کے پیش نظر اس بات سے ان کا منھ زیادہ لٹکنا چاہیے تھا۔ ممی عرف بھابی جی کا ایک ذہنی کارکن جب شرما کو بانہوں میں بھر کر اندر کمرے سے واپس لا رہا تھا اور شرما اس کی طرف اس طرح سے دیکھ کر مسکرا رہا تھا کہ یہ تو اپنا یار ہے اور دوستی میں یہ سب چلتا ہے، انھوں نے اس وقت اسے مان لیا تھا اور خود بھی مسکرائے تھے۔ اب چونکہ انھیں لگنے لگا کہ ذہنی کارکن شرما کو گھر کے اندر بغیر اجازت گھس جانے پر ڈانٹ ڈپٹ کر باہر نکال رہا تھا۔ کسی طرح ممی کی نگاہیں کمرے میں بیٹھے لوگوں کے چہروں پر گھومتی ہوئی شرما کے کندھے پر ٹکی تھیں، اپنائیت سے وہیں تک بڑھ جاتی تھیں۔ تب انھوں نے سوچا تھا کہ شوہر اور کارکنوں کی موجودگی میں پرانے عاشق کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ مگر پھر لگنے لگا تھا کہ شرما کے لیے ممی کی بے اعتنائی والی صورت حال ان کی آنکھوں سے صاف جھلک رہی تھی۔ انھوں نے اپنی یادداشت پر کافی زور ڈالا، پر انھیں ایسا کوئی موقع یاد نہیں آیا جب انھوں نے اپنے شوہر سے چھپ کر شرما سے کبھی بات کی ہو۔ یہ یاد آتے ہی بوس چند کا منھ اور لٹک گیا۔

یہ تو نہیں کہ دن بھر جو کچھ ہوا تھا وہ سب خیال میں چلا گیا؟ اب تو وہ بھی خواب تھے۔ پیٹ تو مدہوش کر دینے والی تیز خوشبو اور چمک دمک والے روپیوں والے اس محفل کی تھی جو اس وقت بے سمت سوچنے سے ہوا اور کراہت آمیز آوازوں سے ماحول کو گندہ بنانے میں مشغول تھا۔ تھک کر بول کے چپ رہے۔ دوسرا اختیار تھوڑا آسان لگ رہا تھا۔ وہ نیند میں غرق ان جسم کو ڈھیلا چھوڑنا سے

دوسری مخلوق کی غراہٹ کی آوازیں نکالنے دیں اور مدن کے نچلے سوراخوں سے بدبودار گیس چھوڑنے کے عمل کو جاری رہنے دیں اور ان سب سے بے خبر ہو کر سونے کی کوشش کریں۔ انھوں نے یہی کیا اور جلدی ہی ان کے جسم نے بھی وہی سب کچھ دہرانے کا عمل جاری کر دیا جسے ان کے کمرے میں موجود پہلے شخص نے شروع کیا تھا۔

دوسرے دن جب بھوک چند کی آنکھ کھلی تو انھوں نے دیکھا کہ شرما نہا دھو کر، رات میں لائے گئے کرتے پاجامے میں سجا سنورا، سنٹرل ٹیبل پر پیر پسارے اخبار پڑھ رہا ہے۔

"بڑے صاحب، جلدی اٹھیے، اب تک تو درخواست گزار بھی کے یہاں اکٹھے ہو گئے ہوں گے۔"

بھوک چند ہڑبڑا کر اٹھے۔ کئی بار کا سیکھا ہوا سبق وہ بھول گئے تھے۔ راجدھانی میں سو، تو بھی، اٹھو منھ اندھیرے، اور منھ دھو کر نکل پڑو منتری کی کوٹھی کی طرف۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے گھر سے نکلے، اسے پکڑ لو۔

جب بھوک چند اور شرما کار سے اترے تو صبح کے ساڑھے سات ہی بجے تھے، لیکن اس قدر گرمی تھی کہ شرما کا دل چاہ رہا تھا کہ دوڑتا ہوا ملاقاتیوں کے کمرے میں گھس جائے اور وہاں سے بہہ رہے پسینے کو پنکھے کی ہوا میں بیٹھ کر سکھائے۔ اس نے بھوک چند کی مہربانی سے حاصل نئے کرتے پاجامے کو پہن رکھا تھا اور گزری ہوئی شام کی اپنی کارگزاری کو یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔ اس کارگزاری نے اس میں ایک خود اعتمادی پیدا کر دی تھی جو اس گھر کی چہار دیواری میں قدم رکھتے ہی اس کی چال سے جھلک رہی تھی۔ گیٹ پر پولیس کا ایک سپاہی بندوق لیے کھڑا تھا۔ شرما نے اس کی سوالیہ نظروں کے سامنے اس خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہ اگر آپ پورے اعتماد کے ساتھ چلتے ہیں اور بنی ٹھنی بالکل سیدھ میں کسی کے محل میں داخل ہوں تو کسی دربان کی کیا مجال کہ آپ کو روک سکے، سیدھا اندر چلا گیا۔

بھوک چند پیچھے تھے ور ان کی چال کو سپاہی کی آنکھوں نے مشکوک مانا۔ انھوں نے سپاہی کی آنکھوں سے اپنی آنکھیں ٹکرانے دیں۔ نتیجے میں وہ ٹھٹھکے اور سپاہی نے انھیں ڈپٹ دیا۔

"کس سے ملنا ہے جی؟ سیدھے سیدھے منھ اٹھائے چلے آ رہے...."

Scanned with CamScanner

"تم ب لڑ بھیر ہو تم.. بڑے صاحب کو نہیں پہچانتے" شرما جو کچھ آگے بڑھ گیا تھا، بھوک چند کی حفاظت کے لیے جھپٹا۔ "لڑ بھیر" اور "بڑے صاحب" دو ایسے لفظ تھے جن سے سپاہی کے چہرے پر پیدا ہوا تناؤ دور ہو گیا۔ وہ مسکرایا۔ ابھی اس کوٹھی کے دربانوں میں وہ نیا نیا آیا تھا، پر تین چار دن میں ہی کچھ باتیں اس کی سمجھ میں آ گئی تھیں۔ لڑ بھیر جیسا سنسکرت کا لفظ بھوک چند جی کے رتبے کا کوئی ہی استعمال کر سکتے تھے۔ اپنے چھوٹے سے قیام کے دوران اس نے تمام بڑے صاحبوں کو تبادلوں اور ترقیوں کے چکر میں بھوک چند جی کی ڈیوڑھی کے چکر لگاتے دیکھا تھا، اس لیے "لڑ بھیر" اور "بڑے صاحب" لفظوں کو سننے کے بعد اس نے احترام کے ساتھ راستہ چھوڑ دیا اور بھوک چند کوٹھی کے اندر داخل ہو گئے۔

اندر کا منظر کسی ایسے میدان جنگ کا نظارہ پیش کر رہا تھا جہاں سے افواج ایک طویل جنگ کے بعد رات میں تھوڑے آرام کے لیے اپنے اپنے خیموں میں واپس چلی گئی ہوں۔ باہر کھلے میدانی حصے میں، جسے اس کے اچھے دنوں میں لان کہا جا سکتا تھا، کٹے پھٹے پولی تھین بیگ، مونگ پھلی کے چھلکے، ادھ کھائے سموسوں کے ٹکڑے، سگریٹ کے ٹکڑے اور چائے کے کاغذی پیالے بکھرے پڑے تھے۔ اگر کسی درمیانہ شاعر کو اس دیپتہ پر خوبصورتی کے بیان کے لیے بلا دیا جاتا تو شاید اسے اس تمام میدان میں الٹی پلٹی کرسیوں کو دیکھ کر شکست خوردہ بادشاہوں کی یاد آ جاتی۔

بھوک چند خوش ہوئے۔ صبح کا سورج چڑھ چکا تھا، پر لان میں ابھی تک کوئی نہیں تھا۔ لوگ دھیرے دھیرے کاہل ہو گئے تھے۔ پچھلے مہینے تک تو ایسا نہیں تھا۔ وہ اپنے محکمے کے منتری کے یہاں منھ اندھیرے پہنچے تھے، تب بھی فریادیوں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ اچھا ہے لوگ دیر تک سونے لگے ہیں۔

ان کی یہ خوشی عارضی تھی۔ جیسے ہی شرما انھیں لان سے تقریباً دھکے دیتا ہوا گزشتہ رات والے کمرے میں لے گیا جو ملاقاتیوں کے لیے تھا، ان کا چہرہ اتر گیا۔ اندر آدھے سے زیادہ کمرہ بھرا ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ لوگ صوفوں پر آرام سے بیٹھے تھے، کل کی طرح دری کی جگہ نیچے نہیں تھے اور بھوک چند کو آسانی سے بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ شرما نے خالی جگہ کی تلاش نہیں کی۔ پہلے وہ کسی کی گود میں بیٹھا، پھر اس نے کسی کا پیر کچلا، آخر میں دو تین لوگوں کے جسم کے مختلف حصوں کو روندتا کچلتا ایک جگہ

پڑھتے رہے۔ اس کے بیٹھنے کے بعد بھوک چند کی سمجھ میں آیا کہ اسے خالی جگہ کی نہیں بلکہ صحیح جگہ کی تلاش تھی۔ وہ جہاں بیٹھا تھا، وہاں سے گھر کے اندر تک دیکھا جا سکتا تھا۔ بیچ میں ایک دروازہ تھا جس پر پڑا پردہ تنی ہوا رکھ سکتا، جو چاک تھا کہ اب اس کی شکل ہونے نہ ہونے کے درمیان کی تھی۔

جیسے ہی بھوک چند نے کمرے میں نگاہیں دوڑائیں، پہلے سے بیٹھے کچھ لوگوں نے پہلو بدلے۔ جاسوسی فلموں جیسا ماحول ہو گیا۔ ایک صاحب نے اخبار اس طرح پڑھنا شروع کیا کہ ان کا چہرہ تو ڈھک گیا مگر ورق الٹے ہوئے تھے۔ ایک کے چہرے پر پسینہ اس قدر کانٹے تھا کہ اس نے رومال جیب کی بجائے چہرے پر ہی رکھ لیا۔ بھوک چند نے بھی بائیں جانب بیٹھے شخص سے بچنے کے لیے دائیں جانب گردن موڑ لی، پر دائیں طرف ایک اس سے بھی زیادہ شناسا چہرہ تھا، اس لیے گھبرا کر وہ سامنے کی طرف دیکھنے لگے۔ جس طرح کمرے میں دوسرے سنجیدہ لوگ تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ انھیں کوئی نہیں دیکھ رہا، اسی طرح وہ بھی سنجیدہ ہو گئے اور ان کے نزدیک کمرے میں سارے اندھے موجود تھے۔

تھوڑی دیر میں ماحول عام حالت پر آ گیا۔ اخبار اور رومال اپنی اپنی جگہ پر پہنچ گئے۔ حمام میں دوسروں کو ننگا دیکھ کر اپنے ننگے ہونے کے احساس شرمندگی کی جگہ ایک تجسس کا جذبہ ابھر رہا تھا۔ اخبار سے چہرہ چھپانے والے شخص نے جیسے ہی اخبار سیدھا کیا، بھوک چند نے اسے سلام کیا۔ "گندھار سنگھ جی۔"

"گندھار سنگھ... کیسے ہو؟"

"جی آپ کا آشیرواد ہے... میرا نام بھوک چند پارکھ ہے۔ آپ سے پچھلے سال ملاقات..."

بھوک چند نے انھیں یاد دلانے کی کوشش کی کہ کس طرح پچھلے سال وہ سکریٹریٹ میں ان سے ملے تھے اور کون اس ملاقات کے پیچھے تھا، پر جنھیں "سر" کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا، انھوں نے کچھ بھی یاد کرنے سے انکار کر دیا۔

بھوک چند کو انھیں یاد دلانے میں کچھ کچھ ایسا لطف آ رہا تھا جیسے پنڈت ماخوذ بیت پرودی کا لطف لیتے ہیں۔ مگر جھوں رہے تھے اور بھوک چند یاد دلا رہے تھے۔ انھیں یاد دلا کر وہ اپنی بے عزتی کا

بھرے رہے تھے۔ جنھیں یاد ہو یا جان ہو، وہ کچھ دن پہلے تک بلوک چند کے محکمے کے سیکریٹری تھے۔ بلوک چند پچھلے سال ایک ایم ایل اے کو پکڑ کر ان کے پاس پیروی کے لیے گئے تھے۔ سیکریٹری صاحب کافی دیر تک انھیں ڈانٹتے رہے۔ انھوں نے ہر حصے میں "ڈیلن" نام کے اس جزو کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو "پولیٹیکل انٹریرنس" نام کے ہر محکمے کے جزے میں بچا کچھا تڑپ رہا تھا اور جسے بچانا ان جیسے نوکرشاہ کا فرض منصبی تھا۔ جس ممبر اسمبلی کے ساتھ بلوک چند گئے تھے، اس نے دہاڑنے سے پہلے ریریانا شروع کر دیا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ جس ممبر اسمبلی کو لے کر وہ سیکریٹری کے کمرے میں گھسے تھے، مسیانا اس کے کردار کا مستقل حصہ تھا۔ نوکرشاہ ایسی ممبر اسمبلی کے ساتھ دب کے پیش آتے ہیں جس کی زبان اور جوتا ایک ساتھ چلتے ہیں۔ غنیمت تھا کہ اندر آنے سے پہلے انھوں نے صرف آدھی فیس ہی دی تھی۔ نکلنے کے بعد انھیں اشاروں سے کئی بار سمجھایا گیا لیکن انھوں نے بقیہ رقم کے بارے میں یاد کرنے سے انکار کر دیا۔

بلوک چند کو معلوم تھا کہ سیکریٹری صاحب کا تبادلہ کسی ایسے محکمے میں ہو گیا ہے جہاں "گزیٹیر" نام کی کسی کتاب کی ترمیم و اضافے کا کام کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی نوکرشاہوں کو غم اسی بات کا تھا۔ انگریز جیسی چالاک صاحب بہادر والی طبیعت کی مالک قوم نے ایسے ایسے محکمے بنا دیے تھے جو نوکرشاہی کے لیے عذاب تھے۔ اگر ان میں کچھ بے سر پھرے موجود تھے جنھیں جنگلوں، چیونٹیوں، چرند پرند اور قبیلوں جیسی فضول چیزوں کے پیچھے مارے مارے پھرنا اچھا لگتا تھا تو انھیں کرنے دیتے یہ سارے کام۔ وہ لکھتے رہتے کتابیں، بناتے رہتے گزیٹیر۔ پر یہاں سے جاتے جاتے انھیں یہ سارے فضول سے محکمے ختم ہی کر دینے چاہیے تھے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ان کے جانے کے بعد بھی ہندوستانی نوکرشاہوں کو یہ جھنجھٹ صاف کرنے پڑ رہے تھے۔

سیکریٹری صاحب کا بھی تبادلہ ایسا ہی دکھ تھا۔ انھیں پی ڈبلیو ڈی کے محکمۂ تعمیرات سے ہٹا کر گزیٹیر ڈپارٹمنٹ میں بھیج دیا گیا تھا۔ پچھلے تین مہینوں سے وہ اسی الجھن میں ڈوبے تھے کہ گزیٹیر نام کی یہ چیز آخر ہے کیا چیز؟ اور اگر انگریزوں نے اسے ڈھونڈ نکالنے کی حماقت کر ہی دی تھی تو اب اسے سکون کے ساتھ اپنے گھونسلے میں بیٹھنے کیوں نہیں دیا جا رہا؟ اس میں نئے رنگ روغن بھرنے کی کوشش کیوں کی جا رہی ہے؟ اس سے پہلے جو صاحب وہاں تعینات تھے، وہ تو کئی سالوں تک اس

Scanned with CamScanner

سوالوں کے جواب میں ڈھونڈ پائے تھے۔ سیکرٹری صاحب تو تین مہینے میں ہی گھبرا کر بھابھی جی کی پناہ میں آ گئے۔

سیکرٹری صاحب کی یادداشت درست کرنے کے ساتھ ساتھ بھوک چند کمرے کی سرگرمیوں پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے، جس کے تحت جیسے کوئی شخص اچانک اٹھتا اور اندر والے دروازے سے ہوتا ہوا غائب ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی اس کمرے میں واپس نہیں آ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اندر بات کرنے کے بعد اسے کسی دوسرے دروازے سے باہر بھیجا جا رہا تھا۔

آخر وہ لمحہ بھی آ ہی گیا جس کا انہیں انتظار تھا۔

ایک زنگی کارکن اندر آیا۔ اندر کیا آیا، دروازے کی دہلیز سے اس نے ایک قدم اندر کی طرف بڑھایا اور باقی حرکت اس کی گردن نے کی۔ سانپ کی طرح لمبی گردن چاروں طرف گھومی اور کمرے میں بیٹھے لوگوں پر گھومتی ہوئی بھوک چند پر ٹھہر گئی۔

"آئیے بڑے صاحب۔"

بھوک چند اٹھے۔ شرما بھی اٹھ گیا۔

"آپ نہیں... بڑے صاحب کو بلایا ہے۔"

بھوک چند نے کہنا چاہا کہ شرما ان کے ساتھ ہے، بلکہ وہی انہیں لائے ہیں، پر انہیں بولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ شرما خود ہی بول اٹھا: "ارے بھائی جی، ہم بھی صاحب کے ساتھ ہیں نا۔"

"صرف بڑے صاحب کو بلایا ہے۔"

آواز کی سختی نے بحث ختم کر دی۔ بھوک چند اندر چلے گئے۔ اندر آنگن تھا، آنگن کے بعد برآمدہ تھا اور برآمدے کی طرف کھلنے والے کئی چھوٹے بڑے کمروں میں سے ایک کمرے میں انہیں لے جایا گیا۔

کمرہ چھوٹا ہی تھا، اتنا کہ بس اس میں صرف ایک صوفہ سیٹ آ جائے اور ایک کونے میں ٹی وی جو کرسی سے اس طرح چلایا جا سکے جس سے بات چیت کرنے والے جب بات چیت سے اکتا جائیں تو ٹی وی دیکھنے لگیں۔

اندر بھابھی جی تھیں، بھائی صاحب تھے، ٹیم سارے خبر رکھے، اور ایک ٹی وی سیٹ تھا

Scanned with CamScanner

اخبار بھائی صاحب اور بھابھی جی کے ہاتھوں میں تھے، ان کے قدموں میں بکھرے ہوئے تھے، صوفوں پر تھے اور فرش پر جہاں کہیں جگہ بچی تھی، وہاں پر بھی پھیلے ہوئے تھے۔ جوگ چند اخباروں سے اوپر چل کر آئے تھے اور جب صوفے پر بیٹھے تو کچھ ان کے جسم کے نچلے حصے تلے بھی دب گئے۔ انھوں نے پہلے تو انھیں نیچے سے نکالنے کی کوشش کی، پھر تھوڑی دیر بعد یہ حرکت چھوڑ کر اس ٹی وی کی طرف دیکھنے لگے جو اس طرح چل رہا تھا کہ اس کی آواز میں بات کی بھی جا سکتی تھی اور نہیں بھی کی جا سکتی تھی، اور جس کی موجودگی سے یہ سمجھنا دشوار تھا۔ میاں بیوی اخبار پڑھ رہے تھے یا اسے دیکھ رہے تھے۔

بھابھی جی نے پوری مسکراہٹ کھول کر چھوڑ دی۔ انھوں نے ڈھیلا ڈھالا گاؤن پہن رکھا تھا۔ رات کا میک اپ بدرنگ دھبوں کی طرح کہیں کہیں چہرے پر چپکا تھا۔ بھائی صاحب پاجامے اور بنیائن میں تھے۔ وہاں بیٹھنے پر جوگ چند کو پتا چلا کہ ان کے جسم کے الگ الگ حصوں میں کھجلی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے یکے بعد دیگرے حصے کو کھجا رہے تھے، ایک ہاتھ سے اخبار پکڑے ہوئے تھے۔ ایک آنکھ سے اخبار پڑھ رہے تھے اور دوسری آنکھ ٹی وی کے سکرین پر جمائے ہوئے تھے۔ ٹی وی کے پردے پر ایک ہیروئن کولہے مٹکاتی ہوئی ہیرو کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ جب ہیرو پردے پر رہ جاتا، بھائی صاحب دوسری آنکھ بھی اخبار پر گڑا دیتے۔ ہیروئن کا اچھلتا کودتا وجود جیسے ہی پردے پر آتا، ان کی دونوں آنکھیں ٹی وی پر ٹک جاتیں اور کھجلی والا ہاتھ ایک ہی حصے پر گھومنے لگتا۔

چائے دوبارہ لائی گئی اور پوری طبیعت سے دی گئی۔ چائے اس طرح سے لی گئی کہ اس کے دو معنی نکلتے تھے۔ ایک تو یہ کہ جوں ہی جیسے دل کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی اور دوسرے یہ کہ آنے والے کو کمرے میں اخبار پڑھنے یا ٹی وی دیکھنے کے لیے نہیں بلایا گیا ہے۔

جوگ چند نے دونوں معنی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ٹی وی پر ہیروئن کے مٹکتے ہوئے سینے پر نظریں گاڑ دیں اور بھائی صاحب کے نقش قدم پر چلنے لگے۔

"جناب بڑے صاحب، کیا حکم ہے؟" بھابھی جی نے پھر چھیڑ دی۔

اس سوال کا بھی جب یہ جواب دیا گیا، اس کا مطلب یہ تھا کہ حکم وہ کیا دیں گے، وہ تو خوش نصیب تھے کہ آپ بھابھی جی کے درشن ہو گئے۔ رات پہلے آنے کی تو اسی کی سزا بھگت رہے

Scanned with CamScanner

تھیں وہ، پہلے گھر سے دربدری۔ وہیں آ گئے ہوتے تو آج یہاں کیوں دیکھنے پڑتے۔

ٹی وی پر کوئی دوسرا پروگرام شروع ہو گیا تھا اور ہیروئن اپنے گداز جسم کے ساتھ غائب ہو گئی تھی۔ اس لیے بھائی صاحب نے گفتگو میں دخل اندازی کی۔

"پھر بتائیے کیا کرتا ہے؟... کیسے کرتا ہے؟"

بھوک چند کا تجربہ بتاتا تھا کہ یہی سوال ایسے موقعوں پر کیا جاتا ہے۔ ان کا تجربہ یہ بھی بتاتا تھا کہ ایسے سوال کا سیدھا اور فوری جواب نہیں دینا چاہیے۔

"میں کیا بتاؤں بھائی صاحب... بتانا تو آپ کو ہی ہے۔" اس کے آگے وہ پھر ایک طویل جملہ بولے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ عمر میں بڑے ضرور ہیں، پر ہیں آپ کے بچوں کی طرح، اس لیے اس مصیبت سے، جسے لوگ تبادلے کے نام سے پکارتے ہیں، نکالنے کے لیے کیا کرنا ہے، کیسے کرنا ہے، یہ تو بھائی صاحب یا بھابھی جی کے مبارک ہونٹوں سے سننا ہی اچھا لگے گا۔

"اس سالے منتری کو کتنا دیا تھا؟" سوال اتنا سیدھا سپاٹ تھا کہ بھوک چند جھینپ گئے۔ یہ سمجھنے میں بھی انھیں تھوڑا وقت لگا کہ جسے "منتری" کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے، وہ ان کے محکمے کے منسٹر تھے۔

اس سوال کا جواب ایک طویل جملے سے نہیں دیا جا سکتا تھا اس لیے انھوں نے اس کا جواب دینے کے لیے ایک بے حد گہرے اثر کا سہارا لیا۔ ان کے پچیس منٹ پر مشتمل تمہید، دلائل، اعداد و شمار اور استعارات کو نکال دیا جائے تو اس میں مندرجہ ذیل معنی کام کے نکلتے تھے

— کہ بھوک چند عام انسان ہیں اور دوسرے عام لوگوں کی طرح ان سے بھی زندگی میں غلطیاں ہوتی ہیں، مگر زندگی کی دو سب سے بڑی غلطیاں ان سے تبادلے کے سلسلے میں ہوئی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ شروع میں ہی بھابھی جی کی پناہ میں نہیں آئے، اور دوسری یہ کہ کچھ خود غرض لوگوں کے مشورے مان کر وہ منتری جی کے پاس چلے گئے۔

— کہ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے، آتا جاتا رہتا ہے۔ ایک بار ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بھوک چند اسے یاد نہیں کرنا چاہتے۔ منتری جی کو کتنا پیسہ دیا تھا، یہ وہ بھول گئے ہیں اور اس بابت کچھ بھی خدمت کرنی ہے اسے یہاں سے نکلتے ہی بھول جائیں گے

— کہ تبادلے تو زندگی میں ہوتے رہتے ہیں اور ان کا اصول یہ ہے کہ سرکار جہاں خدمات

کر دے۔ وہیں وہ نوکری کر سکتے ہیں، وہ بھائی صاحب اور بھابھی جی کے آشیرباد سے جھٹکے کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ تو اس بار معاملہ عزت کا بن گیا ہے۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ کسی دلت کے، ان نے انھیں ہٹا کر اپنا تقرر کرایا ہے۔ اس ذلت کو وہ نہیں سہہ سکتے۔ اس لیے کچھ بھی کرنا پڑے، وہ واپس اسی جگہ جانا چاہتے ہیں۔

اپنے لمبے پیراگراف کا اختتام انھوں نے اس گزارش کے ساتھ کیا جو ایسے موقعوں پر کی جاتی ہے کہ وہ ان سے باہر تھوڑے ہی ہیں، جو حکم ہو، وہ سیوا اس بار کریں گے، اور زندگی بھر سیوا کے موقعے تلاش کرتے رہیں گے۔

طویل پیراگراف کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ بھابھی جی کو یاد آ گیا کہ ابھی انھوں نے کچھ ایسے کام انجام نہیں دیے تھے جنھیں صحت مند رہنے کی خواہش رکھنے والے لوگ صبح صبح ہی نپٹا دیتے ہیں اور ان سے ملنے آنے والے لوگ ہمیشہ اس سلسلے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک لمبی جمائی لی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میرے لیے کیا حکم ہے؟'' ہنوک چند ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

''صاحب بتا دیں گے۔ آپ بات کریے، میں آتی ہوں۔'' بھابھی جی نے بھائی صاحب کی طرف اشارہ کیا۔

''اب یہ غریب برہمن آپ کی پناہ میں ہے۔ آدمی بڑوں ہی کے پاس جاتا ہے۔ اب برہمنوں کے حامی کتنے بچے ہیں؟''

ہنوک چند نے جس طرف اشارہ کیا تھا، اس کی وجہ سے بھابھی جی نے صحت سے متعلق ان ضروری امور کو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کیا اور بیٹھ گئیں۔

انھوں نے بتایا کہ وقت ایسا آ گیا ہے کہ چھوٹی ذات کے لوگ چوری چکاری، بوٹ پالش جیسے آئیڈیل کام چھوڑ کر آئی اے ایس، پی سی ایس بن رہے ہیں، یا منسٹر، چیف منسٹر کی کرسیوں پر بیٹھے نظر آ رہے ہیں۔ اب ایسے میں برہمن بیچارے کہاں جائیں! پر اس میں غلطی ان کی بھی ہے۔ بھابھی جی نے سختی سے بتلایا ہے کہ وہ آپسی جھگڑے چھوڑ کر ایک ہوتے نہیں، اور ایک ہی نہ ہوں ان کی رسوائی میں بھی آ جائیں۔ اس کے بعد بھی اگر وہ ایک نہیں ہوتے، آپس میں لڑتے رہتے ہیں تو

اس میں ان کا کیا قصور؟ پرانی اکڑ میں ڈوبی ہوئی: ہم اپنا فرض بھول جائیں تو بھول جائیں، وہ کیسے بھول سکتی ہیں؟ ان کا دربار ہمیشہ ان لوگوں کے لیے کھلا رہتا ہے۔

اس کے بعد بھابھی جی کے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ تیر گئی۔ انھوں نے بھائی صاحب کی طرف اتھاہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا، ''میں تو سی ایم سے بھی کہتی ہوں کہ آپ لوگ کہاں سے اس کرسی پر بیٹھ گئے... آپ کو تو...''

انھوں نے بہت سارے ایسے دھندوں کا ذکر کیا جنھیں چیف منسٹر کو اس لیے کرنا چاہیے تھا کیونکہ وہی ان کی ذات کے لوگوں کو زیب دیتا ہے۔ وہاں صرف وہی تین لوگ تھے اس لیے وہ تینوں دھندوں کی اس فہرست پر زوردار قہقہے لگانے لگے۔

''ارے بھائی، سی ایم کے مشیر کا رکن لوگ ہیں؟ یہ بھی تو دیکھو۔ ہمارے مشورے پر عمل کریں تو پرمانینٹ سی ایم رہیں گے۔'' بھائی صاحب کی اس رائے پر بھابھی جی اور جھوک چند دونوں نے سر ہلایا۔

بھابھی جی اٹھیں اور اندر چلی گئیں۔

''ہاں تو بتائیے بڑے صاحب... کیا کرنا ہے؟''

''مجھے کیا بتانا ہے؟ میں تو آپ کی پناہ میں آیا ہوں۔ بتانا تو آپ کو ہے۔''

اس کے بعد دونوں طرف سے اس بات پر لمبی بحث ہوئی کہ کسے بتانا ہے۔ اتنا ضرور ہوا کہ بحث کے دوران بھائی صاحب نے جتانے کی کوشش کی کہ کمد کانت کو ہٹا کر کیبیہ میڈ ڈویژن میں بھیجنے کے لیے جھوک چند نے منتری جی کی کتنی خدمت کی تھی۔ جھوک چند نے پھر بتایا کہ وہ پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں اور ایک مرتبہ کسی کی خدمت کرنے کے بعد اس رقم کو یاد کرنے کی خواہش ان کے دل میں کبھی نہیں تھی۔ اس دربار کی خدمت کرنے کے بعد تو ان کی جان بھی لے لی جائے تو وہ کسی کے سامنے منہ نہیں کھولیں گے۔ بھائی صاحب نے اس کے جواب میں جو کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ جھوک چند جی کی جان بہت قیمتی ہے اور ان کے اس جذبے کی وہ قدر کرتے ہیں، کہ ایسے رشتوں میں رازداری بڑی ضروری چیز ہے۔

اس کے بعد جو گفتگو ہوئی، اسے اگر سیاق وسباق سے ناواقف کوئی بھی شخص آڑ میں بیٹھ کر سنتا تو

Scanned with CamScanner

بھی سمجھتا کہ اس کمرے میں ریاضی، الجبرا اور جیومیٹری کے کچھ اہم اور کٹھن مسئلوں پر دو کم ورتی علماء غور و خوض کر رہے ہیں۔

بھائی صاحب نے کمبھ میلے کے بجٹ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اب تو پردھان منتری نے بھی اعلان کر دیا ہے کہ سو روپے آنے میں صرف چار آنے عوام تک پہنچتا ہے، اس لیے اس کمبھ میں تو بڑے صاحب کی چاندی ہے اور ان کی سات پشتوں کو اس کمبھ کے بعد کوئی کام نہیں کرنا پڑے گا۔

شوک چند نے انتہائی انکسار سے گزارش کی کہ حالانکہ بھائی صاحب خود بھی سیاست میں ہیں، مگر وہ برا نہ مانیں تو شوک چند انھیں بتانا چاہیں گے کہ سیاست دانوں کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے۔ وہ لوگ اکثر سنجیدہ چہرہ بنا کر مذاق کرتے ہیں۔ پردھان منتری نے بھی عوام کو ہنسانے کے لیے چٹکلہ چھوڑا تھا، پر ہمارے ملک میں لوگوں کا سنس آف ہیومر اتنا کم ہے کہ لوگوں نے ہنسنے کے بجائے منھ لٹکا کر سنا اور زیادہ سنجیدگی سے اسے لے لیا۔

کچھ دیر تک کمبھ کے بجٹ پر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ دونوں طرف کے اندازوں میں کوئی اتنا زیادہ فرق نہیں تھا کہ اگر اسے کوئی سن رہا ہوتا تو اسے پارلیمنٹ میں بجٹ پر ہو رہی بحث کا مزہ آتا۔ بھائی صاحب ٹریژری بنچ پر بیٹھے ممبر کی طرح بول رہے تھے جس کے مطابق بجٹ میں اتنا پیسہ تھا کہ صرف اس سال کیا، اگلے کئی سالوں میں اس بجٹ کا پیسہ خرچ نہیں کر پائے گا۔ شوک چند کا رول اپوزیشن ممبر کا سا تھا جو یہ ثابت کرنے میں لگا تھا کہ اس بجٹ سے تو بس اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ سرکار پچھلے قرضے چکا سکے اور نئے قرضوں کے لیے پھر کٹورا لے کر نکل پڑے۔ کمبھ کا بجٹ بھی کچھ ایسا ہے کہ بس رام رام کرتے کمبھ نکل جائے گا۔

جیسا کہ اس طرح کی طویل بحثوں میں ہوتا ہے، یہاں بھی ہوا کہ دونوں طرف سے لوگوں کو یاد آنے لگا کہ ان کے پاس سب کچھ ہے، پر ایک سب سے قیمتی چیز جسے وقت کہتے ہیں، اس کی کمی ہے۔ دونوں کی اپنی اپنی مجبوریاں تھیں۔ بھائی صاحب کو ان دکھیاروں کی فکر ستا رہی تھی جو صوبے کے دور دراز علاقوں سے آ کر ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے؛ اور چونکہ راجدھانی میں کوئی کام نہیں کرتا، صرف ان کے دربار میں ان کے دکھ درد سنے جاتے ہیں، اس لیے ان کا یہ فرض ہے کہ وہ ان دکھ کے ماروں کا دکھ درد سنیں اور ان کی مدد کریں۔ یہ مدد تبھی ہو سکتی ہے جب شوک چند اپنا دکھڑا کچھ مختصر

بیان کریں اور جلد ہی اسٹیج سے رخصت کریں۔ خوب چند کو بھی وقت کی فکر نہیں تھی۔ [illegible] ابھی تک [illegible] نہیں۔ [illegible] وقت [illegible] کا ایک ناکارہ شخص صرف سفارش کے بل پر [illegible] گریجویٹ [illegible] بن بیٹھے اور سب کچھ برباد کرنے پر تلے ہوئے۔ [illegible] نقصان [illegible] میں خوب چند کے پیچھے [illegible] بھی کیا کر پائیں گے؟ جو بھی نقصان ہوگا، اس کا [illegible] ہو جاتے تھے۔ اس لیے خوب چند کو آج کی [illegible] جانا چاہیے۔ وقت کی [illegible] کا احساس ہوتے ہی دونوں طرفین میں [illegible] رقم کے بارے میں [illegible] نہیں ہونے لگے جمالی صاحب پارٹی فنڈ میں [illegible] کی بات کر رہے تھے [illegible] تفصیل بتانے سے پہلے وہ وعدہ واضح کر دینا ضروری [illegible] کی بیوی نے [illegible] کے برابر ہے۔ دونوں [illegible] اپنی مدد سے چندہ رقم [illegible] کرنے کا [illegible] اس لیے دولت [illegible] حیثیت کے مطابق چندہ [illegible] پارٹی کا [illegible] بڑی عقیدت کے ساتھ [illegible] واضح کر دیے تھے۔ [illegible] جمالی صاحب [illegible] اب تو [illegible] قسمیں [illegible]

وقت [illegible] رقم پارٹی فنڈ کے لیے [illegible] جیسے [illegible] میں [illegible] کرتا [illegible] تھے مگر [illegible] کی ایک رقم [illegible] بات [illegible] میں [illegible] دونوں [illegible] جانے والے نہیں تھے، [illegible] جمالی صاحب [illegible] کا [illegible] خوب چند کا دل اندر اندر خوشی سے اچھل رہا تھا۔ انہوں نے [illegible] کا [illegible] میں [illegible] تھا۔ اسی طرح [illegible] خوب چند جمالی صاحب [illegible] نہیں [illegible] محسوس ہوتا [illegible] خوش تھے۔ [illegible] وقت [illegible] تھے [illegible] انہوں [illegible] کا [illegible] جاتے [illegible]

Scanned with CamScanner

رقم طے ہو جانے کے بعد اس کی ادائیگی کی مدت اور جگہ پر تھوڑی دیر تک بحث ہوئی۔ ہنوک چند کی رائے تھی کہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی طرح بھائی صاحب اس رقم کی ایک لمبی مدت کے قرضے کی شکل میں ادائیگی کا موقع دیں۔ بھائی صاحب کی رائے تھی کہ اس طرح کے معاملات میں وہ اپنے باپ پر بھی بھروسا نہیں کر سکتے۔ ہنوک چند کے بار بار یہ کہنے پر کہ وہ ان لوگوں سے الگ تھوڑے ہی ہیں اور اب تو وہ ان کے خاندان کے فرد کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، بھائی صاحب نے ہر مرتبہ اثبات میں سر ہلایا، لیکن ہر بار یہ بتانے سے نہیں چوکے کہ ادائیگی میں تاخیر طرح طرح کے وسوسوں کو جنم دیتی ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کے اور ہنوک چند کے درمیان، اب جبکہ وہ ان کے خاندان کے ایک فرد بن چکے ہیں، کوئی بدمزگی پیدا ہو۔ انھوں نے ہنوک چند کو وہ محاورہ سنایا جسے بچپن سے پنساریوں کی دکان پر پڑھتے آئے تھے اور جس کا مطلب تھا کہ ادھار نام کی قینچی محبت نام کی ڈور کو کاٹتی ہے۔ بھائی صاحب نہیں چاہتے تھے کہ یہ قینچی ان کے بیچ چلے۔

اتفاق رائے اس بات پر ہوا کہ طے شدہ رقم کا آدھا ہنوک چند ابھی دے دیں، باقی رقم کا آدھا آرڈر کی کاپی ہاتھ میں آنے کے بعد شام تک پہنچا دیں اور باقی آدھا کمبھ کا پہلا ٹینڈر پاس ہوتے ہی دے دیا جائے۔ اس کے لیے ہنوک چند نے پورا اطمینان دلایا کہ پہلے ٹینڈر کا نوٹس چھپتے ہی وہ خود اس رقم کو لے کر بھائی صاحب کے یہاں حاضر ہو جائیں گے۔

بھائی صاحب نے پیار سے منع کیا اور اس بات پر مصر رہے کہ ہنوک چند بڑے افسر ہیں اور کمبھ کے میلے میں مصروفیت اور بھی بڑھ جائے گی، اس لیے ان کا یہاں آنا سرکاری کام میں رکاوٹ کے مترادف ہوگا، اس لیے وہ خود نہ آئیں، بلکہ اپنے کسی نمائندے کو اس کام کی ذمے داری سونپ دیں۔

ہنوک چند نے اپنے بریف کیس کو کھول کر روپے گننے شروع کر دیے اور وہ تب تک انھیں گنتے رہے جب تک بھابھی جی اندر نہیں آ گئیں۔ روپے بھائی صاحب کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے انھوں نے رقم کو اس طرح دیا کہ بھابھی جی اسے گن لیں۔

"آپ شاد خاطر رہیں۔ شام تک آرڈر مل جائے گا۔"

بھائی صاحب کو اس جملے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہنوک چند کو معلوم تھا کہ بھابھی جی جو [illegible]

Scanned with CamScanner

چاہیے تھی، وہ بھی شام تک ہو جائے گا۔ موجودہ چیف منسٹر جب تک تھے، تب تک اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی، کیوں کہ اپنے اصول کے خلاف آدھی رقم انھوں نے پیشگی میں لے لی تھی۔

"تو مجھے اجازت دیں۔" ٹھاکر چند نے فخر سے ہونٹ آدھا کھینچتے ہوئے میاں بیوی کو باری باری نمستے کیا۔

"ارے کیوں شرمندہ کرتے ہیں بڑے صاحب... آپ تو ہمارے بزرگ ہیں۔"

ٹھاکر چند دروازے کی طرف بڑھے۔

"بڑے صاحب، [illegible] آپ کو پہچان لیا؟"

ٹھاکر چند جاتے ہوئے، انھوں نے پیچھے مڑ کر بھابھی جی کی طرف دیکھا۔

"[illegible]... کل آئی تھی... [illegible]"

ٹھاکر چند ہنستے ہوئے گئے۔

"[illegible]"

"[illegible]... اب آپ [illegible]"

⁂

آج کی کتابیں

کہانیاں

آئینۂ حیرت اور دوسری تحریریں	سید رفیق حسین	Rs. 375
عطرِ کافور	نیر مسعود	Rs. 80
ترید اور دوسری کہانیاں	اسد محمد خان	Rs.180
خطِ مرموز	فہمیدہ ریاض	Rs.100
ایک اور آدمی	حسن منظر	Rs.85
عاقبت کا توشہ	نگہت حسن	Rs.85
دور کی آواز	فیروز مکرجی	Rs.150
صحرا کی شہزادی	سکینہ جعفر	Rs.120

کہانیوں کے ترجمے

ایرانی کہانیاں	(انتخاب اور ترجمہ نیر مسعود)	Rs.90
عربی کہانیاں	ترتیب اجمل کمال	Rs.180
سندھی کہانیاں (جلد 1)	ترتیب اجمل کمال	Rs.180
سندھی کہانیاں (جلد 2)	ترتیب اجمل کمال	Rs.180
[illegible]	(منتخب ترجمے) محمد سلیم الرحمٰن	Rs.80
گم شدہ خطوط	(منتخب ترجمے) محمد عمر میمن	Rs.90
[illegible]	(منتخب ترجمے) [illegible]	Rs.120
گل مجاور کی برقیں	(منتخب ترجمے) [illegible]	Rs.120

انتخاب

منتخب تحریریں	گابریل گارسیا مارکیز	ترتیب اجمل کمال	(زیر طبع)
منتخب تحریریں	نرمل ورما	ترتیب اجمل کمال	Rs.280
منتخب کہانیاں	وائکوم محمد بشیر	ترتیب مسعود الحق	Rs.180
پریم وانی	میرا بائی	ترتیب سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب سردار جعفری	Rs.395

ناول

بیس سو گیارہ	محمد خالد اختر	Rs. 70
گنگا جمنی میدان	اختر حمید خاں	Rs.120
دائرہ	محمد عاصم بٹ	Rs.100
نمبردار کا نیلا	سید محمد اشرف	Rs.60

ناولوں کے ترجمے

تمس	بھیشم ساہنی	ترجمہ شبنم تنویر	Rs. 180
قلب ظلمات	جوزف کونریڈ	ترجمہ محمد سلیم الرحمٰن	Rs 80
بوف کور	صادق ہدایت	ترجمہ اجمل کمال	(زیر طبع)
خیمہ	میرال الطحاوی	ترجمہ اجمل کمال	Rs.75
نوکری کی قمیص	ونود کمار شکل	ترجمہ عامر صدیقی، اجمل کمال	Rs.100
چپلی پوش	خوسے بیاما رتس	ترجمہ اجمل کمال	Rs.95
سرزمین مصر میں جنگ	یوسف القعید	ترجمہ اجمل کمال	Rs.125
درخت نشین	اتالو کالوینو	ترجمہ شہد فتی	Rs.175
شہزادہ احتجاب	ہوشنگ گلشیری	ترجمہ اجمل کمال	Rs.70
آگ کے دیس میں	ولاس سارنگ	ترجمہ شوری پنڈورجن، اجمل کمال	Rs.150
امید اور دوسرے خطرناک مشاغل	لیلیٰ العثمی	ترجمہ محمد حسن	Rs.100

Scanned with CamScanner

شاعری

پریم وانی	میرا بائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کلیاتِ اختر الایمان	اختر الایمان	ترتیب: سلطانہ ایمان، بیدار بخت	Rs.350
مٹی کی کان	افضال احمد سید	(کلیات)	Rs.500
روکوکو اور دوسری دنیائیں	افضال احمد سید		Rs.50
آدمی کی زندگی	فہمیدہ ریاض		Rs.70
ساری نظمیں	ذی شان ساحل	(کلیات)	(زیرِ طبع)
جنگ کے دنوں میں	ذی شان ساحل		Rs.125
ای میل اور دوسری نظمیں	ذی شان ساحل		Rs.150
نیم تاریک محبت	ذی شان ساحل		Rs.100
رات	سعید الدین		Rs.50
سائے چراغ کے	احمد عظیم		Rs.150
مٹی کا مضمون	فرخ یار		Rs.150
سویرے کا سیاہ دودھ	پاؤل سیلان	ترجمہ: آفتاب حسین	Rs.150
بارہ ہندوستانی شاعر	(انتخاب)	ترتیب: اجمل کمال	(زیرِ طبع)
خودکشی کے موسم	زاہد امروز		Rs 120

Scanned with CamScanner

نیر مسعود کی کتابیں

عطر کافور
(افسانے)
قیمت: 80 روپے

ایرانی کہانیاں
(ترجمے)
قیمت: 90 روپے

انیس
(سوانح)
قیمت: 375 روپے

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
قیمت: 150 روپے

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
قیمت: 780 روپے

کافکا کے افسانے
(ترجمے)
قیمت: 70 روپے

معرکۂ انیس و دبیر
(تنقید و تحقیق)
قیمت: 150 روپے

گنجفہ
(افسانے)
قیمت: 200 روپے

Scanned with CamScanner

سٹی پریس کی کتابیں یہاں دستیاب ہیں

ویلکم بک پورٹ
اردو بازار
کراچی
فون: 32633151

فضلی سنز
ٹیمپل روڈ، اردو بازار
کراچی
فون: 32212991

تھامس اینڈ تھامس
نزد صدر جی پی او
کراچی
فون: 35682220

سٹی بک پوائنٹ
نزد مقدس مسجد، اردو بازار
کراچی
فون: 32732912

فرید پبلشرز
نزد مقدس مسجد
اردو بازار
کراچی

کریمی بک کارپوریشن
نزد چاندنی شاپنگ مال
حیدرآباد کینٹ
فون: 780182

خالد بک ڈپو
درانی چوک
خانپور
فون: 5577839

کتاب نگر
حسن آرکیڈ
ملتان کینٹ
فون: 4510444

سانجھ پبلی کیشنز
دوسری منزل، مفتی بلڈنگ
ٹمپل روڈ، لاہور
فون: 042-7355323

کوپرنیکس شاپ
70 شاہراہ قائداعظم
لاہور
فون: 7321161

بک ہوم
بک اسٹریٹ،
46 مزنگ روڈ، لاہور
فون: 7231518

مرزا غالب کتاب مرکز
I-8 دکان نمبر 10
سٹی آرکیڈ پلازہ سیف
اسلام آباد

Scanned with CamScanner

خالد طور

مرچی

(ناول)

Scanned with CamScanner

اگلے صفحات میں خالد طور کا مختصر ناول یا ناولٹ "موچی" پیش کیا جا رہا ہے۔ آج کے شمارہ 63 میں ان کا پہلا ناول "کانی نکاح" شائع کیا گیا تھا جس نے پڑھنے والوں کی توجہ اور تحسین حاصل کی۔ موچی میں بھی اپنے اردگرد کے سماجی اور قدرتی ماحول میں پیوست کرداروں کے گہرے مطالعے کی وہی خصوصیات کارفرما ہیں جو خالد طور کے پہلے ناول میں تھیں۔

ان دونوں تحریروں کی ایک اور اہم مشترک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں عام انسانوں اور ان کے مسائل سے، یہاں تک کہ مادی مسائل اور محرومیوں سے، اور انسانوں کا بنایا ہوا جو نظام ان مسائل اور محرومیوں کا باعث ہے اس سے بھی تخلیقی دلچسپی لینے کے سلسلے میں کسی قسم کی جھجک یا شرمندگی نہیں پائی جاتی۔

آپ کو یاد ہوگا چند دہائیوں پہلے بعض نک چڑھے اور تخلیقی طور پر بنجر نقادوں کے اس فتوے نے کہ سماجی، مفلسی، ناانصافی، جبر، استحصال وغیرہ ادب کا نہیں بلکہ اخبار یا صحافت کے موضوعات ہیں، اور یہ کہ ادیب کا کام تو دراصل تصنیف اور علامت سے کھیلنا مانا جاتا ہے، ہمارے بہت سے ادیبوں کو اس قدر سہما دیا تھا کہ وہ آنکھ کھول کر اپنے گرد و پیش کی زندگی کو دیکھنے اور اسے اپنی تحریروں میں ایمانداری سے برتنے کی صلاحیت، اور شاید خواہش بھی، کھو بیٹھے تھے۔ ہمارے مجموعی ادبی ماحول میں کنفیوژن اور سہما پن کی فضا پیدا کرنے میں ان پیشہ ور نقادوں کی کوششیں بلاشبہ رنگ لائیں۔ جب ان کوششوں کے نتیجے میں ہمارے معاشرے میں موجود انسانی زندگی کے حقیقی مسائل ہمارے ادبی کلچر کی توجہ کا مرکز نہ رہے تو ادب پر جمود طاری ہو جانے، بلکہ ادب کے ختم ہو جانے تک کے حق میں دلائل اور اعلانات کیے جانے لگے۔ اب ان اعلانات کا زور ٹوٹ رہا ہے اور نقادوں کی ہدایت کاری میں احتیاط سے پروان چڑھائے جانے والے مصنوعی ادبی رجحانات کے تجربوں سے گزرنے کے بعد اردو فکشن میں اپنے گرد و پیش کی حقیقت سے آنکھیں ملانے کی ہمت پیدا ہونے لگی ہے۔ موچی اسی رجحان کی نمائندگی کرنے والی تحریر ہے۔

انسانی معاشرے کی بنیاد جس نظام پر ہے، یعنی معاشی حقیقت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی طبقاتی صورت حال، ہمیشہ تخلیقی طور پر زندہ ادیبوں کو اپنی طرف کھینچتی رہی ہے۔ ہمارے معاشرے پر مسلط یہ نظام، ایک ایسے ہی حساس ادیب ابوالفضل صدیقی کے لفظوں میں، ایک زندگی کو فربہ کرنے کے لیے بہت سی زندگیوں کو برباد کرنے کے اصول پر قائم ہے۔ ایک اعتبار سے خالد طور کا ناول موچی اپنے مختلف اور منفرد اسلوب میں اسی نظام کے دوسرے پہلو پر توجہ مرکوز کرتا ہے جس کے ایک پہلو کو گزشتہ شمارے میں چھپی تحریر فسادات میں موضوع بنایا گیا ہے۔ موچی کا مرکزی کردار ایک ٹھیکیدار ہے جو طاقتور ہونے کی وجہ سے استحصالی معاشرے سے بھرپور فائدہ اٹھانے میں کامیاب رہتا ہے۔

Scanned with CamScanner

1

شاید یہ انسان کی فطرت ہوں کہ جب کوئی خیال [illegible] بوڑھے کی طرح پیچھے [illegible]
سے چھٹکارا پا [illegible] ہو جاتا ہے۔ مخالفت عمل سے متعلق کی [illegible] ایک تمثیل مجھے [illegible]
بوڑھے کی طرح ذہن سے یوں محسوس ہوتی ہے:

> [illegible] پتھر [illegible]
> [illegible]
> [illegible]
> پتھر [illegible]
> گرا تھا۔

[illegible] عمل [illegible] تمثیل میں [illegible] شاید بوڑھے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کرنے میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔

میں [illegible] پھر بھی اس تمثیل [illegible]
[illegible] تمثیل [illegible]
[illegible] ایک [illegible] عمل کا [illegible]
[illegible]

کرے گی؟ کیا اس کی شدت کو کم نہیں کرے گی؟ پھر یہ کہ زندگی حادثہ ہے۔ ہر سمت، ہر سمے، وجود اور عدم کی آندھیاں چلتی رہتی ہیں — کسی تالاب کی سطح، تند جھونکوں میں، اپنی سطح کیسے ہموار رکھ سکتی ہے؟

بلونگڑے کے پنجوں کو ذہن سے نکالنے کی یہ کوشش بھی خود بخود اس رد عمل سے ناکام ہو جاتی ہے کہ زندگی کا مدور تالاب ہر عمل کے لیے اپنا الگ وجود رکھتا ہے، اور لمحے قید نہیں کیے جا سکتے۔ ہر انسان کی حادثاتی زندگی اس کے شعور میں، وجود اور نتائج دونوں کے وجود سے پہلے، اپنا ساکن وجود رکھتی ہے۔

مجھے یاد ہے، برسوں پہلے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے نیو کیمپس میں نہر کے کنارے خزاں رسیدہ درخت کے نیچے، کینٹین کی ایک بازو ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا میں نہر میں تیرتے ہوئے ان درختوں کی ٹہنیوں سے سوکھ کر ٹوٹے ہوئے پتوں کو دیکھ رہا تھا جن کے زرد رنگ نمی سے سیاہ ہو چکے تھے۔ ایک دوست مجھے بھائی کا خط دے گیا۔ میرے منجھلے بھائی ان دنوں ضلع اٹک میں پنڈی گھیب کے پاس کھوڑ کی آئل فیلڈ میں فیلڈ انجینئر تھے۔ وہ مجھے باقاعدگی سے خط لکھا کرتے تھے، جن کا میں ہمیشہ بے قاعدگی سے جواب دیا کرتا تھا۔ خط میں سب خیریت کے ساتھ ایک خبر یہ بھی تھی کہ آئل کمپنی کا ٹھیکیدار ضیغم خان جریان خون میں مبتلا ہو کر مر گیا ہے۔ اسے معدے کا السر تھا۔ وہ مرنے سے دو دن پہلے خون کی قے آنے پر کیمپ کے ہسپتال میں داخل کیا گیا، پھر اسے راولپنڈی کے کسی بڑے ہسپتال میں منتقل کیا گیا۔ وہ مسلسل دو دن خون اگلتا رہا اور اس طرح خون کی قے کرتے کرتے مر گیا۔

ضیغم خان کا چہرہ تصور میں ابھرا — چوڑا سرخ و سفید چہرہ، چوڑا دہانہ، بڑے بڑے ہموار دانت جن میں سامنے کے دو دانت تیز تھے۔ چھوٹا قد، موٹا جسم۔ اکثر یوں لگتا تھا جیسے اس کا اوپر والا دھڑ نیچے کے دھڑ سے زیادہ لمبا ہے۔ موٹی ناک، عقابی آنکھیں، گھنی بھنویں۔ ہر سمت بہت تیز نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ اس کے لب نیچے سے گول کٹے ہوئے تھے بالکل ویسے جیسے خشک ڈانس کرنے والوں کے ہوتے ہیں اور جو رقص کے دوران میں ذرا کم بھیگے رہتے ہیں۔ سر پر سفید پٹکا جس میں کبوتر کے پروں جیسا رنگ بھی نمایاں رہتا تھا جنگلی کبوتر کے پروں جیسا۔ کبھی کبھی وہ

Scanned with CamScanner

[illegible] سے شعلوں کی زد میں تھی۔ [illegible] تھا۔ تھوڑا [illegible] کی شلوار قمیض اور صدری اس کا پسندیدہ لباس تھا۔ [illegible] پٹی چپکا [illegible] رنگ تھیں، مہندی رنگی مونچھوں کو [illegible] رہتا تھا۔ ضیغم خان کی اصل پہچان [illegible] سے ہوتی تھی۔ کیمپ کی کالونی کے مغرب میں [illegible] کا ذخیرہ تھا۔ احاطے میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ضیغم خان جب شراب پیتا تھا تو [illegible] کالونی سے [illegible] میں جا پہنچتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اکثر شور مچاتا تھا:

''وصیب (صاحب)... اوہزا'' اچھی خاصی اردو بولنے کے باوجود وہ نشے میں جب بھی ہوتا تھا تو یہی پشتو بولتا تھا۔ ''اوصیب... [illegible]... [illegible]... آؤ ہزا... یک [illegible] وصیب... [illegible] کا [illegible]'' [illegible] کبھی اپنے ساتھیوں کو بھی شراب [illegible] اور کبھی اپنے آپ کو [illegible] کیا کرتا تھا۔ کیمپ کے کلب سے غیر ملکی شراب کی بوتلیں [illegible] تھیں۔ [illegible] میرے دل میں [illegible] تھی [illegible] ایک گھونٹ پی لینے کی شدید خواہش پیدا ہوتی تھی۔ مجھے [illegible] ذائقہ یاد نہیں تھا لیکن [illegible] میں [illegible] میری اس سے [illegible] ہو چکی تھی۔ مجھے [illegible] دیکھ کر ضیغم خان کی آنکھیں چمکا کرتی تھیں۔

''اولک... اوہزا... آپ [illegible]''

مجھے [illegible] خوف [illegible] سے زیادہ تھا۔ [illegible] خوف کا [illegible] کے [illegible] میں تو [illegible] تھا جب [illegible] دینیات کے ماسٹر نے میری اس بات پر شدید [illegible] کی تھی کہ میں نے بھری جماعت میں، سب لڑکوں کے سامنے، [illegible] کرتے ہوئے یہ کہہ دیا تھا کہ:

''میں دوزخ سے نہیں ڈرتا، مجھے جنت کا شوق نہیں ہے، کیونکہ خوف اور [illegible] دونوں [illegible] کی چیزیں ہیں۔''

لیکن اس کا خوف ہمیشہ میرے [illegible] کرتا تھا۔ اس کا چہرہ [illegible] میرے سامنے [illegible] کرتا تھا۔ [illegible] آنکھوں میں مجھے [illegible] شکایت نظر آیا کرتی تھی [illegible] شراب [illegible]

ماں کا چہرہ تصور میں ابھرنے پر ڈر سا جاتا تھا۔ میرے رکتے قدم پھر تیز ہو جاتے تھے۔ ضیغم خان کا کوئی مقامی ساتھی مجھے جاتے دیکھ کر شاید جواب کے مخصوص لہجے میں دیسی لہجے میں طعنے دیا کرتا تھا

"ہا گھیڈو... ہا ڈراکل... ہا بے نصیب..." (ہا بزدل... ہا بزدل ڈرپوک... ہا بے نصیب...)

غصہ تو بہت آتا تھا لیکن ماں کا خوف مجھے شیر، دلیر اور بانصیب ہونے سے روک دیا کرتا تھا۔

ضیغم خان کا میرے بھائی سے گہرا ربط تھا۔ بھائی انجینئر اور وہ ٹھیکے دار۔ کھوڑی آئل فیلڈ سے راولپنڈی میں مورگاہ آئل ریفائنری تک جانے والی پائپ لائن کے ساتھ ساتھ پتھریلی اور کچی سڑک کو قابل استعمال رکھنے کا ٹھیکہ سالہا سال ضیغم خان ہی کو ملتا تھا۔ پائپ لائن کے انچارج میرے بھائی تھے۔ وہ روزانہ پائپ لائن کے معائنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ چھٹیوں میں اکثر میں بھی ان کے ساتھ سیر سپاٹے کے لیے نکل پڑتا تھا۔ خوشحال گڑھ سے احمدال، احمدال سے تھمیال، تھمیال سے ہوتے ہوئے مرے سے گلی جاگیر تک ڈیزل انجن والی جیپ کار کچی سڑک پر اڑتی ہوئی جایا کرتی تھی۔ گلی جاگیر سے چکری روڈ تک سڑک پتھریلی اور کچی تھی۔ اسی سڑک پر تارکول بنا ہوا ہے۔ گلی جاگیر سے تا ... تک سڑک پتھریلی ہے۔ اس سڑک پر آتے ہی جیپ کار ہچکیاں لینا شروع کر دیتی تھی۔ انجن کا شور سا ہو جاتا تھا۔ وہ اکثر غرانے بھی لگا کرتا تھا۔ ان پتھریلی سڑکوں کی طرف جنھیں ضیغم خان ٹھیکے پر مرمت کیا کرتا تھا اور جوان بھر کدالیں، بیلچے اور ہتھوڑے اٹھائے سڑک کی مرمت میں مصروف رہتے تھے۔ مجھے اکثر شک گزرتا تھا کہ ضیغم خان ٹھیکہ دار ہے۔ اسے بھی نہ جانے کیسے میرے اس شک کا پتا چل گیا تھا۔ ایک دن بنا کسی تمہید کے وہ درست ... میں بولا:

"صاحب، میں بے ایمان نہیں ہوں" اس نے سوری دانتوں میں ... ہوئے داڑھی کو پیچھے کھینچتے ہوئے، لگتے ہوئے کہا۔ "ان سب کو باقاعدہ مزدوری دیتا ہوں۔ مزدوری میں پیچھے ان کے ماں باپ کو بھی دیتا ہوں۔ یہاں انھیں روٹی کپڑا دیتا ہوں۔ یہ ادھر سرحد میں مارے پھرتے تھے۔ گوں چوپ بیٹے تھے، وارداتیں کرتے تھے۔ میں نے انھیں کام پر لگایا ہے۔ میں نے!"

اس کا ہاتھ سینے پر جا ٹھہرا۔

شدید گرمی کے دنوں میں سڑک کی مرمت میں مصروف کبھی گدوں پر پتھر اور مٹی ڈھوکر انھیں

[illegible] ہوئے مزدوروں سے رنگ [illegible] چکے تھے۔ ضیغم خان سرحد کے دیہات سے [illegible] ہوئے ان مزدوروں کو روزی فراہم کرنے کو خدمت خلق سمجھتا تھا۔ ان [illegible] میں زیادہ سے زیادہ عمر والا شاید اٹھارہ برس کا ہوگا۔ [illegible] گئے تھے۔ جہاں [illegible] کرتی ہوئی تھی، وہاں ان کا کیمپ بن جاتا تھا [illegible] جاتی تھی۔ شام کے وقت ڈوبتے سورج کی کرنوں میں، ترچھی کرنوں میں، ہر خیمے سے [illegible] دور سے سیاہی مائل [illegible] اور بکھرے نظر آتے تھے۔ ہر خیمے کے [illegible] کلّے (کھونٹے) گڑے ہوئے تھے۔ اور ہر کلّے پر ایک [illegible] نظر آتا تھا [illegible] ہوئے بچے کلّے پر [illegible] کی طرح گھومتا رہتا تھا۔ رسی [illegible] کلّے کی [illegible] محسوس ہوتا تھا [illegible] میں گھومتا [illegible] مسلسل چلتا رہتا تھا [illegible] اور لید [illegible] رہے تھے۔ کیمپ میں ایک مخصوص تعفن پھیلا رہتا تھا۔

"[illegible]" میں نے ایک [illegible] سے [illegible] رہتے ہیں۔ انھیں [illegible] تعفن [illegible] چاہییں۔"

ہمیشہ سنجیدہ رہنے والے پٹھان کی [illegible] بہت خوشگوار [illegible] تھی۔ "تعفن..." انھوں نے ہنستے ہوئے کہا، "ضیغم خان سے بات کرو۔"

میں نے واقعی ضیغم خان سے بات کی۔ [illegible] زوردار قہقہہ لگایا۔ "صاحب... او صاحب... یہ تو ہمارا [illegible] ہیں۔ [illegible] نہیں ہوگا۔" وہ مسلسل ہنستا رہا تھا۔

میری نگاہیں [illegible] پشتو میں [illegible] کی طرف [illegible] بہت [illegible] تصور [illegible] دلدل بن گئی ہو۔

[illegible] ڈی این اے کی طرف۔ ان کا بھی [illegible] ہوگا۔ [illegible]

کالج میں پڑھنے والا ایک—"

اپنے وجود سے کراہت کا یہ تو کھا اور ہیرا رکن احساس مجھے اکثر کیمپ کے قریب محسوس ہوا کرتا تھا۔

2

ان دنوں میں گورنمنٹ کالج ساہیوال میں گریجویشن کر رہا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں میں ہمیشہ کھوڑ میں گزارتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح جب میں کھوڑ گیا تو چچا جی کے منع کرنے کے باوجود شدید دھوپ میں پائپ لائن پر جانا میرے معمول میں شامل تھا۔ ان دنوں خیمہ بستی تارز ڈیم کے پاس آباد تھی۔

نہ جانے مجھے کیا سوجھی، کیوں سوجھی، میں نے ایک بار شام کے وقت تارز ڈیم سے بستی کی کالونی میں واپس جانے سے انکار کر دیا۔ میری ضد تھی کہ میں ایک رات پٹھان لڑکوں کے ساتھ کیمپ میں گزارنا چاہتا ہوں۔ چچا نے مجھے سنجیدگی سے منع کیا۔ ان کا خیال تھا کہ میں اگر ایک رات بھی کیمپ میں رہا تو میرے بیمار ہونے میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہے گی۔ خود صغیر خان نے میرے رونے کی آنکھیں بند کرنا۔ میری ضد قائم تھی۔ چچا نے یہ فیصلہ دیا کہ اگر مجھے رات رہنا ہی ہے تو اس سے بہتر تارز ڈیم کے ریسٹ ہاؤس کا بستر رہے گا، جہاں بستی کے ایک قلی محمد خان نے قریبی پمپ اسٹیشن کی چوکیداری کے لیے خیمہ لگا رکھا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے قریب ہی پکی سڑک پر پائپ لائن کے اوپر پمپ اسٹیشن بنا ہوا ہے — صرف ایک کمرے کا پمپ اسٹیشن، جہاں ڈیزل انجن کی مدد سے خام تیل کو آگے کی سمت پمپ کیا جاتا ہے۔ خام تیل میلوں ڈھلوانوں اور اونچائیوں کو اسی طرح پمپ اسٹیشنوں کی مدد سے مورگاہ ریفائنری تک پہنچایا جاتا ہے۔ پمپ اسٹیشن پر ہمیشہ تالا پڑا رہتا ہے۔ ہفتے میں شاید ایک یا دو بار کروڈ آئل کو پمپ کیا جاتا تھا۔

ریسٹ ہاؤس کا لان بہت خوبصورت تھا۔ جولائی کے شدید تپتے دنوں میں گرمی کے ساتھ ڈیم کی نم خوشبو رچی تھی۔ ہوا میں جنگلی درختوں اور پودوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ جھیل کے خوبصورت پس منظر میں چاندنی رات گزارنے کا تصور مجھے کس قدر دلکش محسوس ہوا کہ میں نے فوراً یہیں کا فیصلہ کر لیا۔ چاند کی شاید چودھویں تھی۔ ہم ریسٹ ہاؤس پہنچے تو شدید گرمی میں دن گزر رہے تھے۔ وہ شام

Scanned with CamScanner

[illegible]

درختوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔

[illegible]

وہاں تک جا پہنچتے تھے۔ ہمیں ان کی سمت جاتا دیکھ کر چپ چاپ ان پر کام کرنے والے ٹیم بھی، ابراہیم، مہدی اور شیخ جان محمد بھی ان میں آ گئے۔ شیخ جان اس قدر پھرتیلا تھا کہ وہ دوڑ کر پہاڑوں پر چڑھ جایا کرتا تھا۔ اسے سب ٹیٹنا (Teetna) کہتے تھے۔ اس لفظ کا کیا مطلب ہے، مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ اسی طرح بھائی جان کے ڈرائیور غلام حسین کو سب کھٹر (Khattar) کہتے تھے۔ یہ لفظ بھی میرے لیے اجنبی تھا۔ محمد خان کو جب پتا چلا کہ میں رات اس کے ساتھ گزاروں گا تو بہت خوش ہوا۔

"چلو بئی رات تیں ای سہی، اک توں دوست ہوسیں۔" (چلو ایک رات ہی سہی، ایک دوست تو ہوں گے۔) وہ خوشی سے بولا۔ "میرا تے بگھیاڑاں ساہ کھچی گدا اے۔" (میرا تو بھیڑیوں نے سانس کھینچ رکھا ہے۔)

تارڈ جھیل اس علاقے میں پانی کا واحد ذخیرہ ہے۔ شام ہوتے ہی کالے چٹے پہاڑ کی ڈھلوانوں پر اگی جھاڑیوں اور کریروں کے نیچے کی غاروں سے یقیناً درندے باہر نکلتے ہوں گے اور وہ سب پانی پینے جھیل ہی پر آتے ہوں گے۔ محکمہ جنگلات نے زیتون کے درخت لگانے کا جو تجربہ اس علاقے میں کیا ہے، بے حد کامیاب رہا ہے۔ نیچری سورت کے پہاڑی سلسلے کالے چٹے پہاڑ کے دامن سے تارڈ جھیل تک ایک گھنا جنگل نمودار ہو گیا ہے۔ زیتون کے درختوں پر میں نے سیاہ زیتون کے پھل دیکھے تھے۔ لیکن یہ زیتون کہاں جاتا ہے، کچھ پتا نہیں چلا۔ نیچری سورت کی ڈھلوانوں سے تارڈ ڈیم تک گھنے جنگل میں جنگلی جانور رات یقیناً چھپن چھپائی کا کھیل کھیلتے ہوں گے اور ان کی آوازیں محمد خان کے خیمے تک صاف پہنچتی ہوں گی... ہولناک آوازیں۔

محمد خان کے خیمے سے باہر نکلتے ہوئے بڑے دانتوں والے لمبے قد کے ابراہیم نے آتے ہی کہا۔

"اج رات تسی ایتھے ای رہسو؟" (آج رات آپ یہیں رہیں گے؟ رات کا کھانا یہیں تیار کر دیں، کیا کرو گے؟)

محمد خان نے ناپسندیدہ آنکھوں سے ابراہیم کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر یہ تاثر تھا، جیسے اسے توقع نہ تھی۔ وہ ... چہرے پر اضطرابی کیفیت نمایاں تھی۔ اس کی پلکیں بار بار اوپر نیچے جھپکنے سے کپکپا رہی تھیں۔

"اے نہ آکھو، مچھی میں ... کر ... ماردوں گا۔) محمد خان نے فیصلہ کن لہجے میں

[illegible] قوت [illegible] رہیں ۔ ([illegible] تو کوشش کروں گا ۔) [illegible]
([illegible]) محمد خان [illegible] اس [illegible] جیسے [illegible] اپنی شدت کا یقین ہو گیا ہو '' [illegible]
[illegible] مجبوری ... '' ([illegible] مجبوری ہے ۔)
محمد خان نے اس [illegible]

3

[illegible]
[illegible] مصروفیت [illegible]
[illegible] مقصد [illegible]
[illegible] محمد خان سے باتیں کر رہا ۔

'' دونوں [illegible] صاحب ، '' محمد خان نے [illegible] حقیقت [illegible] رہا ہوں ۔

[illegible]
[illegible] شاید [illegible] دو سال [illegible]
[illegible] شاید [illegible]

محمد خان شاید جھیل [illegible] جھیل [illegible]
[illegible] باتیں کرتا ہوا [illegible]
[illegible] جھیل [illegible]
[illegible] جھیل [illegible]
[illegible] جھیل [illegible] پانی میں [illegible]
چلے جاتے ہیں ۔

[illegible] شاید [illegible]
[illegible]
[illegible] شاید یہ طاقت [illegible] موجود نہیں ہے ۔

تارہ ڈیم کی جھیل بہت چھوٹی سی ہے۔ گہری بھی نہیں ہے۔ اس جھیل کے جنوب میں بھی ای صورت میں پہاڑی سلسلے سے آنے والے برساتی نالے اس جھیل میں گرتے ہیں۔ شمال کی جانب پتھروں کا مضبوط ڈیم ہے جس کی درزوں سے پانی رستا رہتا ہے۔ شاید یہ ڈیم کو بچانے کی کوئی تکنیک ہوگی۔ ڈیم کے نیچے شمال میں میدانی علاقہ ہے جہاں چھوٹے چھوٹے کھیت ہیں جو پھیلتے ہوئے تحصیل تک چلے جاتے ہیں۔ اس میدان میں بہت چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں اور مقامی لوگوں کی ڈھوکیں بھی نظر آتی ہیں [illegible] بکھری ہوئی دور دور۔ جہاں مرشد مزاروں کا دھواں نیلا ہو کر جاتا ہوا اوپر اٹھتا ہے اور ہوا کے رخ کا اعلان کرتا نظر آتا ہے۔ جھیل کے شمال مشرق میں ایک پہاڑی ہے جس کے دامن سے جھیل کا پانی ٹکراتا رہتا ہے۔ یہ پہاڑی جھیل کے لیے فطری دیوار کا کام کرتی ہے۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر جانے کے لیے پتھروں کی سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔ چوٹی پر ایک کھلا صحن کے جیسا چبوترہ بنایا گیا ہے جس پر کنکریٹ کی گول چھت چار ستونوں پر شامیانہ بناتی ہے۔ اور چاروں ستون چاروں جانب کھلے دروازوں کا منظر بناتے نظر آتے ہیں۔ چبوترے میں پتھروں کو تراش کر ہموار فرش بنایا گیا ہے اور بیٹھنے کے لیے گول ستونوں سے بنچ بنے ہوئے ہیں۔ یہاں سے ڈیم کے چاروں طرف کے مناظر صاف دکھائی دیتے ہیں اور دور تک ہریالی صاف نظر آتی ہے۔

جھیل کے ذرا جنوب مغرب میں دو تین سو گز دور گھنے درختوں کا ایک چھوٹا سا ذخیرہ ہے۔ جہاں [illegible] سے منگوائی بھیڑوں کی افزائش کا تجربہ کرنے کا خیال جانے کس خوش قسمت کے ذہن میں آیا تھا۔ چاروں جانب قدرتی چراگاہیں تو موجود ہیں لیکن یہاں [illegible] آباد میں ساتھ [illegible] اور راولپنڈی میں قربانی کے دنوں میں بکتی رہتی۔ خصوصاً بڑی عید (عید قرباں) پر تو یہ سلسلہ بہت بڑھ گیا۔ محمد خان نے بتایا تھا کہ یہاں بھیڑوں کے پانچ سو جوڑے لائے گئے تھے لیکن اب صرف پچیس جوڑے باقی رہ گئے ہیں۔ فارم کا انچارج ڈاکٹر [illegible] مقامی ہے یہ تو تنخواہ لیتا ہے [illegible] کی تعمیل کرتا ہے اور جب [illegible] سلام [illegible] چلی جاتی ہیں تو گندی گالیاں دے کر رجسٹروں میں اندراج کرتا رہتا ہے کہ [illegible] بیماری سے مر گئیں اور [illegible] کو بھیڑیے کھا گئے [illegible] کبھی اب [illegible] نے مجھے [illegible] پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔

بار میرے احساس کی نوعیت مختلف تھی۔ بھالی گھوڑے چُھپ چکے تھے۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ محمد خان اپنے خیمے میں شاید واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ مغرب افق پر شفق کی لالی مدھم ہو گئی تھی۔ آسمان پر روشنی مکمل طور پر معدوم نہیں ہوئی تھی۔ جھیل کی سطح پر دھیمی دھیمی لہروں کا تموّج نمایاں تھا۔ ہوا کے جھونکے بہت دھیمے سے تھے۔ جھیل کے مشرقی کنارے کے قریب پانی میں سفید بگلوں کے سر کی، اور چونچیں، سرخ چونچیں، سیاہ ہوتی جا رہی تھیں۔

بے اختیار میرا دایاں ہاتھ گردن پر جا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی مچھروں کی بھنبھناہٹ سنائی دی۔ مچھروں کو سیاہ رنگ سے شاید عشق ہے۔ میرے سر کے سیاہ بالوں پر وہ جھنڈ سا بنا کر اڑ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ رقص کر رہے ہوں۔ یہ رقص پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا ہوں، خصوصاً بھینسوں پر مچھروں کے جھنڈ دیکھ کر ان کے کالے رنگ سے عشق سے متعلق کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

"بے چارے محمد خان کو مچھر کا یہ عشق بہت مہنگا پڑتا ہوگا۔" میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ مچھروں کو سیاہ رنگ سے کیوں دلچسپی ہے؟ اس کی توجیہہ تو کوئی ماہر حشرات ہی کر سکتا ہے۔ شاید کالے رنگ کو مچھر جما ہوا خون سمجھتے ہوں گے۔ مجھے تو گردن پر جلن کا احساس جیسے مجبور کر رہا تھا کہ میں ریسٹ ہاؤس لوٹ جاؤں یا محمد خان کے خیمے میں چلا جاؤں۔ "خیمے میں تو بہت گرمی ہوگی،" میں نے فضا میں حبس محسوس کرتے ہوئے سوچا۔ مچھروں کے ساتھ رات گزارنا ایک بڑی دلچسپ بات ہو سکتی تھی۔ میرے تصور میں بہت سے بچپن کے بھیانک تجربات تازہ ہو گئے جب مچھروں کو اپنے خون کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے۔ پھر میرے تصور میں گدھوں نے سر اٹھایا۔

"شاید وہ..." میں نے سوچا، "شاید وہ مچھروں سے بچنے کے لیے انھیں دن رات اپنی دُم میں جھلاتے رہتے ہیں۔" مجھے ہنسی سی آ گئی۔ گدھوں کا خیال آتے ہی مجھے ان کا لات پر مسلسل گھومتے رہنا یاد آ گیا۔ بچپن کی یاد میں چھپے خلش کے وہ لمحے جو مجھے میرے انجینئر بھائی بتانا چاہتے ہیں۔ میرے بڑے بھائی جو وزیری ڈاکٹر ہیں، جن سے کئی ایک ... ایک چھوٹے سے قصبے میں ... بچپن میں مسجد گھوڑوں کے ... میں جانے سے منع کیا تھا۔ انھیں بھی ... مجھے خلش ہے ... وہاں ... جائیں گے۔ مجھے یہ خوف تھا کہ ... میری گردن گینڈے کی طرح اکڑ نہ جائے۔

"یہ پٹھان لڑتے تھے تو کسی سے بھاگتے نہیں تھے..." "میں چپ رہتا تھا۔" راستے میں ان کی بھی کڑ لگتی ہیں۔ ان کو دوسروں سے بچنے کی فکر نہیں ہوتی۔ میرے ساتھی ان کے [illegible] میں ان کے اصل نسلی خاندان کا فرد ہوں۔ یہ پٹھان لڑکے جینے کی اصلی خاندان سے تعلق نہیں رکھتے..."

میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

"خاندان اصلی کیسے ہو جاتے ہیں؟ دولت سے، رشتوں سے، خوبصورت عورتوں سے، اپنے نسلوں والی پگڑیوں سے، [illegible] مردوں سے، اونچے اونچے محلوں سے، بڑی بڑی حویلیوں سے، کی ہوئی پگڑیوں سے، [illegible] پگڑیوں سے، کلف شدہ پگڑیوں سے، حکومت سے، اکڑی ہوئی گردنوں سے۔ جو مجھے میرے بھائی گردن کٹ جانے سے بچا چکے ہیں؟"

4

ابھی تک چل میں سیڑھیوں سے اتر کر گھوڑوں کے قریب [illegible] میرے قدم [illegible] کے کیمپ کی طرف تھے۔ میں ان [illegible] میں جا پہنچا۔

[illegible] رات میں بدل رہی تھی۔ [illegible] رہی تھی۔ [illegible] تھا۔ شاید تو رہا تھا [illegible] روٹیاں لگ رہی [illegible] رکھے ہوئے [illegible] کی ہوئی تھیں۔ میرے کانوں میں [illegible] [illegible] میں کوئی چیز چبھی جا رہی [illegible] گھوڑوں کے [illegible] خاموش کھڑے تھے۔ شاید مسلسل چہرے کھا کر سخت تھک چکے تھے۔ [illegible] تھے۔ وقفے وقفے سے ان کی دمیں دائیں بائیں جھولتی تھیں۔ مجھے [illegible] جو گھاس کے ڈھیروں کے اوپر اترے ہوئے تھے۔ گھوڑے اس قدر [illegible] تھے جیسے [illegible] میں بھی نہ اٹھیں تو وہ پتھر کے تراشے ہوئے مجسمے ہی تھے۔

"یہ [illegible] ہاتھوں سے چھپا کر [illegible] جاتے" میں نے سوچا [illegible] میں پڑھی ہوئی [illegible] "[illegible]" [illegible]

سے بھاگتے نظر آئے۔ ''بندے گدھے ہی ہوتے ہیں...'' میں نے تلخی سے سوچا اور تنور کی سمت چل دیا۔

تنور کے قریب ایک کچی جگہ پر پچاس لڑکے نظر آئے۔ وہ شور مچا رہے تھے۔ کچھ کونڈیوں میں مسلسل کوئی شے گھوٹ رہے تھے۔ قریب ہی چارپائی پر ضیغم خان کا مقامی کارندہ سجاول بیٹھا تھا۔

''صاحب آپ۔'' وہ یوں گھبرا کر چارپائی سے اٹھا جیسے میرا خیموں میں آنا بڑے تعجب کی بات ہو۔ ''آؤ... آؤ صاحب... یہ ہمارا ڈیرہ ہے۔'' وہ دونوں ہاتھ بڑھاتے ہوئے آگے بڑھا، پھر اس نے یوں دائیں بائیں دیکھا جیسے کسمپرسی کا اظہار کر رہا ہو۔ ''ہزار بار کہا ہے خان صاحب سے...'' اس کا اشارہ ضیغم خان کی طرف تھا۔ ''ہزار بار کہا ہے کہ ان میں سے کوئی نہیں بھاگے گا، پھر بھی مجھے چوکیداری پر لگا رکھا ہے۔''

میں چونکا۔ ضیغم خان کی خرکاری سے متعلق میرا شک پوری شدت سے میرے ذہن میں ابھرا لیکن اپنے احساس کو میں نے شعوری طور پر چھپایا۔

''کھانے کا کیا پروگرام ہے؟'' میں نے بات کا رخ بدلا۔

''آپ کا کھانا تو...'' سجاول بولا۔ ''آپ کا کھانا تو خان صاحب گلی جاگیر سے بھیجیں گے۔''

''کیا؟'' مجھے حیرت ہوئی۔ ''کیا پانچ میل دور سے آئے گا میرا کھانا؟''

''پانچ میل...'' سجاول کے لہجے میں فخر سا ابھرا۔ ''او صاحب! ہمارے خان صاحب تو کھوڑ سے کھانا بھیج دیتے۔ بڑا جگرا ہے خان صاحب کا۔''

''آج لڑکوں کو کیا کھلا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا اور سجاول کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ چپ سا ہو گیا۔ اس کی خاموشی کا راز بہت جلد کھل گیا۔ کونڈیوں میں سرخ مرچیں پیسی جا رہی تھیں۔ کچی سرخ مرچوں میں نمک اور تھوڑا سا پانی ڈال کر مزدور لڑکوں کا ڈنر تیار کیا جا رہا تھا، جسے وہ تنور کی روٹیوں کے ساتھ کھا لیں گے۔ اس ڈنر کا نام ''مرچی'' تھا۔

''یہ مزدور یہی کھاتے ہیں؟'' میں نے سجاول کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا سا تھا۔

''نہیں صاحب،'' وہ بولا۔ ''ہفتے میں ایک بار کالے چنے بھی اُبالے جاتے ہیں۔''

''بس، صرف کالے چنے؟'' میرے لہجے میں سوال تھا۔

Scanned with CamScanner

سجاول نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا۔

"صاحب!" وہ ہاتھ کو اوپر کی طرف جھٹکتے ہوئے بولا۔ "تھوڑے گدھے یہ کھاتے ہیں؟"

"کیا یہ تھوڑے گدھے ہیں؟" میں نے پٹھان لڑکوں کی طرف دیکھا۔

"تھوڑے گدھے ہی ہیں صاحب!" سجاول کے لہجے میں بیزاری تھی۔

"یہ مرچیں..." میں نے کہنا شروع کیا تو سجاول نے فوراً جیسے مجھے ٹوکا۔

"بڑی کمال کی چیز ہے یہ مرچی!" اس نے تیزی سے کہا۔ "کھا کر غصہ آتا ہے۔ غصہ آتا ہے تو بدن میں طاقت آ جاتی ہے۔ طاقت آتی ہے تو یہ زور زور سے کسیاں (کدالیں) چلاتے ہیں۔ ٹوکرے بھر بھر کر پتھر اٹھاتے ہیں۔ تین دن کا کام ایک دن میں ہو جاتا ہے۔" سجاول نے کارکردگی بڑھانے کا نسخہ پیش کر دیا۔

"کیا تم بھی یہی کھاتے ہو؟" میں نے سجاول کی طرف دیکھا اور وہ خاموش ہو گیا۔ میں ہنڈیوں کی طرف بڑھا۔ وہاں موجود ضیغم خان کا ایک ورکر [illegible] ایک دیگچی کے پاس کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سیدھا میری طرف آیا۔ سجاول بہت پریشان لگ رہا تھا۔

"آپ نے آنے کی تکلیف کیوں کی صاحب؟" نذیر نے ہاتھوں میں تھامی ہوئی دیگچی دیگچیوں میں رکھ دی۔ "مجھے معلوم ہے، محمد خان کے پاس ایک ہی چارپائی ہے۔ میں یہ چارپائی بھجوانے ہی والا تھا۔ بہتر ہوگا جگہ سے خان صاحب بھیج ہی دیں گے..... کھانے کے ساتھ۔"

اس نے پھر دیگچی کو تھمایا، انگلیوں کو یوں حرکت دی جیسے انگلیوں پر جلن کا احساس ہو رہا ہو۔ دیگچی سے ڈھکن کے کناروں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ وہ سیدھا ایک خیمے کی طرف گیا۔ خالی ہاتھ واپس آیا۔ اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر انھیں انگوٹھے سے مسلا اور چٹکی ماری۔ قریب پڑی ہوئی چارپائی خالی کر کے چارپائی سر پر رکھی اور بستی کی طرف چلا گیا۔

پٹھان سب سے بے خبر پشتو میں اونچا اونچا بول رہے تھے۔ ایک سمت میں چار کم عمر پٹھان لڑکے خاموش اور اداس بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کے چہرے پر وحشت سی تھی۔

"تم ان کے چوکیدار ہو؟" میں نے شور مچاتے پٹھان لڑکوں کی طرف دیکھا۔

"او نہیں صاحب..." سجاول کے لہجے میں بیزاری بڑھ چکی تھی۔ "خان صاحب کا حکم ہے ورنہ ان مادر... نے" اس نے گندی گالی دی۔ "بھاگ کر کہاں جاتا ہے۔ کوئی بھاگ کر جانے کا کہاں؟ رات ہی کو بھاگ سکتا ہے۔ بھاگ کر دکھائے۔ بگھیاڑ[1] اور تیندوا[2] صبح تک قیمہ بنا دیں گے... بڑے بگھیاڑ اور تیندوے ہیں اس جنگل میں... رات کو ٹولیوں[3] میں پھرتے ہیں بگھیاڑ۔"

"کبھی دیکھے ہیں تم نے؟" میں نے پوچھا۔ سجاول کی نگاہیں تاریک جنگل کی سمت تھیں۔

"کئی بار صاحب" سجاول کے لہجے کی بیزاری پل ہی میں مٹ سی گئی۔ تمام رات میں بدل چکی تھی اور پیڑوں کے پیچھے چھپی جھیل کا تصور شاید سجاول کے ذہن میں ابھرا ہوگا۔ "کئی بار صاحب... جھیل پر پانی پینے آتے ہیں۔ کبھی آٹھ... کبھی دس... کبھی اس سے بھی زیادہ۔ ایک بار انھوں نے دھنا کیمپ پر حملہ کیا تھا۔ ایک گدھا مار دیا تھا صاحب" سجاول نے کھلے پر بندھے گدھوں کی طرف دیکھا۔ ایک گدھا خاموشی سے گردن جھکائے اس انداز میں سو رہا تھا جیسے سامنے کی سمت جا گرے گا۔

"محمد خان کا خیمہ تو جھیل کے کنارے پر ہے... وہ..."

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی سجاول نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "صاحب... وہ تو بہت بوڑھا، دس سال سے رہ رہا ہے محمد خان... ایک بار بھی اس پر بھیڑیوں نے حملہ نہیں کیا... کوئی کلام ہے اس کے پاس..."

"کلام؟" میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ محمد خان کا نورانی جیسا چہرہ میرے تصور میں میرے سامنے، مجھے اپنے بہت قریب محسوس ہوا۔

"سب کہتے ہیں، محمد خان کے پاس کوئی کلام ہے جس سے ڈر کر بگھیاڑ اور تیندوا حملہ نہیں کرتے۔" سجاول نے کہا۔ "ورنہ... ورنہ اکیلا بندہ..." سجاول کی آواز میں حیرت اور خوف کے تاثرات ملے تھے۔ "ہم یہاں گرمیوں میں بھی ساری رات جاگتے ہیں، ساری رات جب بھی آتے ہیں۔ آگ روشن رکھتے ہیں سے بگھیاڑ اور تیندوے ڈرتے ہیں... پھر بھی اگر قریب آئیں تو ہم باری باری رات کو جاگتے ہیں صاحب۔ قریب آئیں تو ہوائی فائرنگ کرتے ہیں۔" وہ پل بھر کے لیے رکا۔

---

[1] بھیڑیے۔ [2] تیندوے، چھوٹے قد کے چیتے۔ [3] گروہ۔

[illegible] سب ختم ہو... کیسے بچ سکتا ہے صاحب!"

کھلی جگہ پہ تھوڑی روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہانڈیوں کی مرچوں میں نمک اور پانی ڈال کر مرچ رنگ کا شوربہ بنا لیا گیا۔ روٹیاں ایک چنگیر میں قطار میں پڑی تھیں۔ ہانڈیاں سامنے رکھ دی گئیں۔ پھر جیسے کسی شور سے [illegible] سب کے سب روٹیوں اور ہانڈیوں پر جھپٹ پڑے۔

پتھریلی زمین پر چوکڑیاں مارے، بیٹھے تھوڑی روٹی سے نوالے توڑ کر ہانڈیوں کی مرچ میں ڈبو رہے تھے جیسے وہ دنوں سے بھوکے ہوں۔ میں ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ تجاہل پریشان نظر آ رہا تھا۔ میں نے قریب بیٹھے ہوئے ایک گورے چٹے، قدرے بھوری آنکھوں والے ایک نوجوان لڑکے کی چنگیر میں پڑی روٹی کا نوالہ توڑا۔ اس نے سر گھما کر مجھے حیرت سے دیکھا۔ نوالہ توڑ کر ہانڈی کے اندر مرچوں کے سرخ پانی میں ڈبو کر میں نے ہونٹوں کے آگے [illegible] تھا کہ [illegible] اچھل پڑی۔

"صاحب جی... کیا کرتے ہیں! آپ کا کھانا تو خان صاحب کی جاگیر سے آئے گا۔"

"یہ بھی تو کھانا ہی ہے جی [illegible]" چند چھوٹے لڑکوں نے میری طرف دیکھا۔

[illegible]

[illegible] پیالے میں پانی بھر رکھا تھا۔ ٹھنڈا پانی پیتے ہی [illegible]

[illegible]

4 [illegible]: مٹی کا پیالہ۔

سجاول کے ماتھے پر شکنیں ابھری ہوئی تھیں۔

"جب محمد خان کب سے کیمپ میں آیا ہوا تھا۔ میں نے تو اس نے شکایت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ "واہ صاحب۔" وہ ناراض سا تھا۔ "میرا تو کوئی حق ہی نہیں ہے۔ میں سے جو آنا رہے گا یا سے تب کیا اب جنگلی مرغوں کو کھلاؤں گا؟"

"اے، صاحب کا کھانا۔" سجاول چیخا۔ "صاحب کا کھانا گلگت سے آتا ہے۔" اس کے لہجے میں صداقت تھی۔ "ان بھگوانوں نے مرچی کھالی ہے۔"

جیسے ہنستی آنکھوں، جیسے نعروں اور جیسے سانسوں کے ساتھ، مجھے پٹھان ڈ کے بہت اچھے لگے، اپنے جیسے، جیتی جاگتی اور سلگتی چھاتیوں والے۔ مجھے اپنے گلے اور سینے میں جلن سی درد سا محسوس ہوا۔ میں نے محمد خان کی طرف دیکھا۔

"تمہاری روٹی کی لڑائی ہے محمد خان،" میں نے آہستہ سے کہا۔ "چل، باقی تیرے ساتھ۔"

"پر صاحب جی،" سجاول پھر چیخا۔ "حال صاحب کا کھانا۔"

میں نے اسے فراموش کر دیا۔ مجھے اس محبت میں ضیغم خان سے وفاداری کے ساتھ ساتھ وہ حیا بھی نظر آ رہی تھی جو ضیغم خان کو ہر سال میرے جانی کے دشمنوں سے ملتا ہے۔ مجھے ضیغم خان سے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی ... کڑوی، جلتی ہوئی نفرت۔

5

میں اور محمد خان آہستہ آہستہ چلتے ہوئے، کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے لیکن زیادہ تر خاموشی سے چلتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کے لان میں پہنچے۔

"یہاں پانی۔" میں نے چلتے ہوئے سینے میں سوزش سی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ یہ سوزش اور جلن کا ایک احساس ہے جسے شاید کبھی بھی لفظوں میں بیان نہ کیا جا سکے گا۔ کڑوی، غصہ دلانے والی سوزش۔ "میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔" مجھے ہونٹوں پر بھی جلن کا مسلسل احساس ہو رہا تھا۔

محمد خان نے ریسٹ ہاؤس کے متصل صحن کی طرف اشارہ کیا جس کی دیوار ایک اونچی دیوار، پھیل

[illegible]

[illegible] دیوار سے قریب ہی ہینڈ پمپ نظر آیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ [illegible] آ رہا تھا
[illegible] ہینڈ پمپ کی سمت [illegible] نہیں گیا تھا۔ میں ہینڈ پمپ پر گیا۔ محمد خان میرے پیچھے پیچھے آیا۔

”میں پیاسا ہوں محمد خان صاحب۔“ میں نے ہینڈ پمپ چلانا شروع کر دیا۔ ”آپ سے کسی [illegible]“ محمد خان [illegible] ”تو... ٹھنڈو ہے صاحب ٹھنڈو!“

محمد خان نے پمپ چلانا [illegible] پانی کی گرتی ہوئی دھار ہاتھوں پر بہت ٹھنڈی محسوس ہوئی۔ [illegible] ٹھنڈا پانی بہت اچھا [illegible] پانی کے چند قطرے [illegible] میرے حلق میں جلن [illegible] قطروں کو چوس لیا۔

محمد خان اور میں خیمے کے قریب آ گئے۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ محمد خان خیمے سے [illegible] خیمے کی طناب سے لالٹین لٹکا رہا تھا۔

”محمد خان [illegible]“ [illegible] میں [illegible] ”میں نے [illegible]

محمد خان میرے [illegible] سمجھ [illegible] فوراً سمجھ گیا۔

[illegible]

آپ دن رات سے ڈرتے ہیں اور روشنی (صبح) ان کے آنسوؤں سے طلوع ہوتی ہے — یہی اس کا مقدر ہے۔" المناک لہجے میں مقدر کی حقیقت کا احساس دلاتے ہوئے محمد خان نے مجھے دیکھا۔

"چھوٹے ہیں صاحب — رو نہیں سکتے۔"

میرے ذہن میں بچوں کے دو حصے، مریض کی کراہیں آئے اور جسم میں قوت بڑھ جانے کے متعلق حصے، ناگوں کی طرح ہرانے لگے۔ یوں محسوس ہوا جیسے ہر سو روشنی ختم ہو گئی ہے۔ ہر سمت بھیانک تاریکی چھا گئی ہے اور اس تاریکی میں چھوٹے بچوں کی گھٹی گھٹی چیخیں ہیں، سسکیاں ہیں، آنسو ہیں۔

گلی چوک کی سمت سے آتی ہوئی سڑک پر جیپ کی آواز سنائی دی۔ ناہموار سڑک پر ہیڈ لائٹس اچھل اچھل کر گزر رہی تھیں۔ جیپ ریسٹ ہاؤس کے سامنے رکی۔ سیٹھ خان کا ایک اور مقامی کارندہ، ہاتھ میں ٹفن پکڑے مسکراتا ہوا جیپ سے اترا۔ ڈرائیور نے انجن بند کیا اور جیپ سے اتر کر پچھلی سیٹ سے ستار اٹھایا، کندھے پر رکھا۔ دونوں مسکراتے ہوئے ہمارے قریب آ گئے۔

"واہ صاحب!" کارندہ مقامی لہجے اور انداز سے بولا، "آپ کو بھی عجیب عجیب شوق چڑھتے ہیں۔" وہ ہنسا۔ "گھمر اور تحیازوں کے ساتھ رات گزارنے کا مزہ آئے گا۔"

ڈرائیور بھی اس کے ساتھ ہنسی میں شامل ہو گیا۔ "صاحب ستار..." اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چپ رہو... پہاڑی پر رہو،" محمد خان بولا۔

"بابا..." مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ہنسنے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔ میری ہنسی بہت کھوکھلی ہے، بے جان ہے، زندگی سے عاری ہے۔ "کیا یہ..." میں نے محمد خان کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا یہ تکھرے یا تحیاز؟"

محمد خان نے قہقہہ لگایا، آنے والے کارندے کا قہقہہ تو اتنا بلند تھا کہ شاید دور کیمپ کے پٹھان لڑکوں نے بھی سنا ہو گا۔

"آپ کا کھانا صاحب!" کارندے نے ہنستے ہوئے ٹفن آگے بڑھایا۔

کھانا تو میں کھا چکا، میں نے کہا۔

کارندے کے چہرے پر ناگواری سی آئی۔ وہ محمد خان کی طرف تیزی سے مڑا۔

"محمد خان" اس نے تیز لہجے میں کہا، "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ صاحب یہاں خان صاحب کے مہمان ہیں۔ تو نے کھانا کیوں کھلایا؟"

"میں نے نہیں کھلایا۔" محمد خان اونچی آواز میں تیزی سے بولا۔ "شکنوی[6] دیکھو۔ صاحب نے کیمپ میں لڑکوں کے ساتھ مرچی کھائی ہے۔"

"مرچی کھائی ہے؟" کارندے نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "صاحب" وہ میری طرف مڑا۔ "کیا ہم آپ کو کھانا بھی نہیں کھلا سکتے تھے؟ یہ آپ نے کیا کیا؟ خان صاحب نے تو بانگی ککڑ[7] ذبح کر رکھا ہے۔ یہ آپ نے کیا کیا؟ خان صاحب تو بہت ناراض ہوں گے۔" اس نے تشویش کے انداز میں رک رک کر کہا۔ وہ تیزی سے ایک بار پھر محمد خان کی طرف گھوما۔ "تجھے کیا ضرورت تھی صاحب کو کیمپ میں لے جانے کی؟"

"میں نہیں لے کر گیا" محمد خان چلایا۔

"اب میں مرغے کا کیا کروں؟" کارندہ بولا۔

"تم اور ڈرائیور کھالو" میں نے جواب دیا

"ہم تو خان صاحب کے ڈیرے پر ہی کھا چکے ہیں۔" ڈرائیور نے کہا۔

"تو پھر کھانا یہیں سے جاؤ، وہاں کھا لینا" میں نے کہا۔ "میں تو کھا چکا، یہ یوں ہی ضائع جائے گا۔"

کارندہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر وہ اضطراب بھری نظروں سے دیکھتا رہا، پھر اس پر شکست کی کیفیت طاری ہوئی۔

"کھانا یہیں سے جاؤں؟" وہ حیرت سے بولا۔ "آپ جانتے ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

میں پٹھانوں کی روایات سے بخوبی آگاہ تھا۔ پھر بھی جان بوجھ کر میں یہ صدمہ پہنچا رہا تھا۔ میرے دل میں ان کے لیے نفرت بھری ہوئی تھی۔

---

6 شکنوی: بھٹیاری۔ 7 بانگی ککڑ: اذان دینے والا جوان مرغا۔

"کھانا واپس لے جاؤ اور خان صاحب سے کہنا کہ میں نے ابھی کی مرغی کھا لی ہے۔"

میرے لہجے میں نہ جانے کیا تھا — تلخی، بیزاری، طنز، نفرت — کارندے نے ایک لحظ کے لیے جیپ کی سمت قدم بڑھائے۔ لالٹین کی دھیمی دھیمی روشنی میں جیپ کے قریب جا کر وہ رکا، اس نے مڑ کر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ٹفن کو دیکھا، پھر مجھے دیکھا، محمد خان کو دیکھا اور جیپ میں بیٹھ گیا۔ سٹارٹ کرتے ہوئے ڈرائیور نے جیپ ریورس کی، جیپ نے ایک نیم دائرہ بنایا، چکر کاٹا، مٹی اڑی اور جیپ گلی جاگیر کی سمت چلی گئی۔ میں نے محمد خان کو دیکھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

"محمد خان،" میں نے کہا، "کہاں ہیں آپ اندر سے؟"

محمد خان کے جیسے چہرے پر پل بھر کے لیے گھبراہٹ اور مسکراہٹ کے تاثرات ابھرے، پھر اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ کھنچ کر کانوں کی لوؤں تک جا پہنچے۔

6

رات کا اندھیرا گہرا تھا۔ جنگل میں رات گزارنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ محمد خان کمال کا انسان تھا۔ ہر طرف مشہور تھا کہ وہ بے حد دلیر اور حوصلے والا ہے۔ سب لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے پاس کوئی کلام ہے جس کی وجہ سے جنگلی درندے اس سے ڈرتے ہیں۔ اس کی صداقت کا بھید کچھ دیر بعد خود ہی کھل گیا۔ کھانے کے بعد برتن سمیٹ کر میرے پاس آیا۔

"صاحب جی،" وہ سرگوشی میں بولا۔

"کیا بات ہے محمد خان؟"

مجھے اس کی سرگوشی عجیب سی لگی۔ وہ اس انداز میں بولا تھا جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی اس کی بات سن نہ لے۔ ویسے کیمپ پر گہری خاموشی چھا چکی تھی۔ کیمپ اور درخت بھی تاریک خاموشی میں لپٹا ہوا تھا۔

"صاحب جی،" محمد خان نے جھجکتے ہوئے کہا، "اگر کسی کو نہ بتائیں تو صاحب، یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔ رات کو یہاں سے جنگلی جانور گزرتے ہیں۔ وہ تیندوا تو گھروں کا جوڑ بھی گرا دیتا ہے۔ یہاں سونا بھی موت ہے۔" میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"تو کہاں سوتے ہو؟" میرے جملے پر محمد خان مسکرایا اور اس کی نظریں درختوں کی سمت

اوپر اٹھیں۔

"وہاں چھت پر۔ سیڑھیاں تو اندر صحن میں اترتی ہیں جہاں صحن پر دروازہ [illegible] سے ہو کے لوہے کا دروازہ کھولنا پڑتا ہے جو بند ہے پر [illegible] وہ جو ٹینکی کے پاس ایک مٹی دیوار ہے"

اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "وہاں سے چھت پر چڑھ جاتا ہوں۔ رات بھر گشت کرتا ہوں۔ یہ کروں۔ ڈیوٹی ہے۔ ورنہ [illegible] موت کے منہ میں رہتا ہے۔"

محمد خان کے چہرے پر تمسخر کا تاثر ابھرا۔

"کیا کروں صاحب!" اس کی آواز آہستہ ہو گئی۔ "سب کہتے ہیں میں بہت بہادر ہوں۔ پر یہاں بہادری نہیں چلتی صاحب۔ یہاں صرف عقل کام آتی ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کا لان نہایت غیر محفوظ تھا۔

"میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔" میں نے کہا۔ محمد خان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں چھت پر بستر لگاتا ہوں۔" محمد خان کے پورے بدن میں تیزی سی عود کر آئی۔ وہ کسی تنومند لڑکے کی سی چستی سے بستر اٹھا کر ریسٹ ہاؤس کی سمت بڑھ گیا۔ [illegible] چھت پر پھینکے، پھر بندر کی طرح اچک کر ایک مٹی دیوار پر چڑھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ چھت پر [illegible]۔ بستر بچھا کر وہ پھر نیچے اترا اور خیمے کے قریب آیا۔

"چارپائیاں اوپر لے جاؤں صاحب؟" وہ بولا۔

"نہیں، رہنے دو۔ [illegible]" میں نے کہا۔ میری نگاہیں جنوب کی سمت درختوں سے معمور جنگل کے دہانے پر بنی ہوئی گزرگاہوں کی سمت اٹھیں، جہاں سے درندوں کی آمد متوقع تھی۔ محمد خان نے ریسٹ ہاؤس کی چھت کی طرف دیکھا۔

"بھیڑیے اتنی اونچی چھلانگ نہیں لگا سکتے صاحب، [illegible] ایک مٹی دیوار پر چڑھ سکتے ہیں۔" اس نے ٹینکی کے پاس ایک مٹی دیوار کو دیکھا۔

"چیتے تو چڑھ سکتے ہیں محمد خان۔" میں نے محمد خان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"[illegible] کا کوئی [illegible] ہے میرے پاس۔" محمد خان نے [illegible]۔

مسکراہٹ سے اس کے ہونٹ پھیلتے ہوئے کانوں کی لووں تک جا پہنچے۔ ''کروڈ آئل کا ڈبا، ڈنڈا، ورنہ ڈنڈے کے سرے پر بندھی تھتھویں[8] اور ماچس

''جب ہم پائپ لائن میں پگ (pig) ڈالتے ہیں۔'' محمد خان نے پمپ سٹیشن کی طرف دیکھا۔

''میں کروڈ آئل کا ڈرم بھر لیتا ہوں۔''

''پگ؟'' میں نے پُرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''اسی سے تو پائپ لائن صاف ہوتی ہے صاحب۔'' محمد خان نے کسی ماہر انجینئر کی طرح مجھے سمجھاتے ہوئے بتایا۔ ''پلاسٹک فوم کا ہوتا ہے پگ — بڑا مضبوط۔ لائن میں ڈالتے ہیں۔ آگے سے بند کھول دیتے ہیں، پیچھے سے پریشر بڑھاتے ہیں۔ پگ لائن کی ساری گریس (grease) باہر نکال پھینکتا ہے۔ لائن صاف ہو جاتی ہے۔ میں کروڈ آئل ضائع نہیں ہونے دیتا، ڈرم بھر لیتا ہوں۔'' محمد خان سمجھانے کے انداز میں سر ہلا رہا تھا۔ ''ماچس، کروڈ آئل کا ڈبا، ڈنڈے کے سر پر تھتھویاں سب میرے پاس۔ فکر نہ کریں، آگ لگا کر ان کے منہ میں دے دوں گا۔''

محمد خان نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

''جہاں بہادری کام نہ آئے، عقل کام آتی ہے صاحب۔ آئیں، چھت پر چلیں۔''

''تم چلو، میں آتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

میں راں کو جھیل سے جدا کرتی ہوئی دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچا اور پھر آہستہ آہستہ چڑھنے لگا۔ میرے قدم اوپر بنے جھروکا نما چبوترے کی سمت سیڑھی سیڑھی اٹھ رہے تھے۔ اُفق پر بارھویں کا چاند تاخیر سے جلوہ گر ہو رہا تھا۔ ابھی اسے اپنے عالمِ شباب کا شدید احساس نہیں ہوا تھا۔

میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چبوترے میں پہنچا اور ایک کنکریٹ کے اسٹول پر بیٹھتے ہی میری نگاہیں جھیل کے پانی پر پڑیں۔ جھیل کا پانی شگنوں پر چاندنی کے عکس سے چمک چمک جاتا تھا۔ سرخ نقطوں کی سمت پانی پر چاندنی کا عکس نمایاں تھا۔ مجھے رات کا یہ سناٹا ماورائی سا محسوس ہوا۔ یہ حقیقت اس قدر چونکا دینے والی تھی کہ سب پر کسی خواب کا گمان ہوتا تھا۔ یہ جھیل میں جیسے میں خواب

---

8 تھتھوی: تھگلی، کپڑے کا ٹکڑا۔

سے باہر نکل آیا۔ مجھے جھیل سے اردگرد پھیلے ہوئے جنگل، [illegible] پہاڑوں کی طرف سے وہ [illegible] نہیں جنھیں [illegible] بھر لیا تو سارا [illegible] یادوں کو پناہ [illegible] نہیں رکھتی ہوں گی۔ [illegible] ابھی مجھے [illegible] بھی [illegible] سے قریب [illegible] دونوں [illegible] پاس، مچھروں کی بھنبھناہٹ سے میں بیزار ہو گیا۔ چہرے پر، ہاتھوں پر، گردن پر، بغیر جرابوں کے ٹخنوں والے پیروں پر [illegible] مچھروں نے اپنی یلغار شروع کر دی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے [illegible] بے دردی سے استعمال کرتے ہیں [illegible] ڈنک چبھوتے ہوئے۔ شاید سارے بدن کا لہو نچوڑنا چاہتے ہیں۔

ہمارے جسموں میں کتنا خون ہوگا؟" میں نے سوچا۔ "[illegible] سے؟ یہاں تو [illegible] کی تعداد میں مچھر ہیں۔"

اس علاقے کے مچھر بہت [illegible] ہیں۔ جہاں سے خون چوستے تھے وہاں [illegible] جلن ہوتی [illegible] کی جلن اور [illegible] سوزش [illegible] گلے [illegible] سینے میں اپنی [illegible] سے ساتھ مسلسل مجھے [illegible] احساس دلا رہی تھی۔ [illegible] مینڈکوں کی [illegible] آتے تھے جھیل سے [illegible] سنائی دے رہی تھی۔ [illegible] کے قریب [illegible] تھی۔ [illegible] ورنہ برسات میں تو مینڈک [illegible] وقت کی [illegible] لیے [illegible] ہوتے ہیں۔ [illegible] قریب ہی ایک [illegible] کا درخت، چھوٹا سا درخت [illegible] میں [illegible] ایک [illegible] چھوٹا سا پرندہ [illegible] ننھے ننھے سے [illegible] تیز رفتاری سے حرکت کرتے ہوئے [illegible] ایک [illegible] سے بھی [illegible] اس طرح داخل [illegible] نام [illegible] ہوگا۔[9] [illegible] جھیل کی سمت [illegible] جنگل کی سمت [illegible] جھیل کی سطح [illegible] مغربی [illegible] یادوں کی [illegible]

[9] [illegible] (Hummingbird) کی طرح کا [illegible] ندیوں کے کناروں پر ہوتا ہے۔

پھر بھی فضا میں نظر دور تک جاتی محسوس ہوتی تھی۔ تحصیل کی جنوبی سمت زیتون کے درختوں میں مکمل تاریکی تھی۔ زیتون کے جنگل سے آگے کالے چٹے پہاڑ کی چوٹیاں نمایاں تھیں۔ ان کی ڈھلوانوں پر پھیلی ہوئی ہلکی ہلکی سی روشنی، نیچے کی سمت جاتے ہوئے گہری ہوتی ہوئی، سیاہی مائل ہو رہی تھی۔ پہاڑوں کے نیچے سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔

ہوا میں دھیمی دھیمی سی خنکی تھی اور میرے کان، چبوترے کے آگے پیچھے، دائیں بائیں پھیلی ہوئی جھاڑیوں میں مخصوص سرسراہٹ سننے کے منتظر تھے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ علاقہ خطرناک ترین سانپوں کا علاقہ ہے۔ دھمی[10] سانپوں کا گھر ہے۔ دھمی کا کھیچی رنگا کوبرا، جو بہت لمبا نہیں ہوتا، اس لیے تو دو تین منٹوں میں مضبوط سے مضبوط بدن والا تنومند بیل بھی مر جاتا ہے۔ شور کرتے ہوئے لٹا چھینے والا جلیبی سانپ، حلائی گھڑیال ڈسنے کے بعد پورے بدن کو سوجن میں مبتلا کرنے والی چھوٹی اور بڑی دو مونہی۔ بڑی دو مونہی تقریباً ایک فٹ اور چھوٹی دو مونہی چھ انچ تک بھی ہوتی ہے۔ چھوٹی دو مونہی تقریباً نابینا سانپ ہے۔ چھوٹی دو مونہی کو پہچاننا ہر سپیرے کے بس کی بات نہیں ہے۔ سپیرے اکثر اسے دو مونہی کا بچہ سمجھتے ہیں۔ بے ضرر سمجھ کر بے احتیاطی سے کام لیتے ہوئے سپیرے عموماً دو مونہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بڑی دو مونہی کی طرح چھوٹی دو مونہی کی دم بھی منہ جیسی موٹی ہوتی ہے۔ روشنی میں بھی پتا نہیں چلتا کہ منہ کس طرف ہے۔ پھر اس علاقے میں درختوں پر چڑھ کر کینچلیاں چھوڑنے والے زہریلے ناگ، پھسیر، پرندوں اور چھوٹے جانوروں کو بل دے کر کچلنے والے اژدہے، جلیبی صورت کے پہاڑی سانپ بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ کم زہریلے سانپوں کی بہت بڑی تعداد اس علاقے کی پہاڑیوں اور میدانی علاقے کے کھیتوں میں پائی جاتی ہے۔ یہاں کے دیہاتی رات کے وقت تین چیزیں لے کر گھر سے نکلتے ہیں: لاٹھی، کندھے پر بڑی سوتی چادر اور ہاتھ میں لوہے کی نوکدار کھونڈی، کوبرے اور پھسیر کو مارنے کے لیے۔ وہ پھن کھولے ناگ کے سامنے چادر پھینکتے ہیں۔ ناگ غصے میں چادر کو ڈستا ہے اور اس کے تیز دانت سوت میں پھنس جاتے ہیں۔ چادر اس کے پھن کے ساتھ الجھتی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ سوت سے دانت نکالے دیہاتی اس پر ہاتھ میں لوہے کی نوکدار کھونڈی اس تسلسل اور روانی سے برساتے ہیں کہ اس کا کچومر نکل جاتا ہے۔ ماہر دیہاتی

10 دھمی شمالی پنجاب کے ساتھ بنت میں تحصیل پنڈی گھیب اور تحصیل فتح جنگ کا علاقہ۔

ایک دو رسی میں سانپ کا سر کچل دیتے ہیں۔

''ضیغم خان سے آگے چادر کون پھینکے گا؟'' سانپ سے بڑے دشمنوں کا خیال آتے ہی ضیغم خان کا چوڑا چہرہ مجھے چین کی طرح نظر آیا۔ ''یہ بڑے بڑے پٹھان بڑے ... آخر ان کا قصور کیا ہے؟ یہی کہ انھوں نے امیر خاندانوں میں جنم نہیں لیا''

میری نظر شمال مغرب کی جانب کیمپ کی سمت گئی۔

'خاندان کیسے بن جاتے ہیں؟' میں نے سوچا۔ ''کمزوروں اور زیردستوں سے ان کا حق چھین کر ہی طاقتور بنے ہوتے ہیں، ورنہ معاشرتی ناہمواری کوئی اور توجیہہ نہیں رکھتی۔''

مجھے قدیم زمانے کے وہ لوگ یاد آئے جنھیں میں ساحلی ڈاکو ... (پرانی) کہانیوں میں، پڑھتے وقت تصور میں کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ وہ گروہ بنا کر کبھی سمندروں میں وائی کنگز (Vikings) اور کبھی قزاق اور خشکی پر بربروں کی صورت میں نمودار ہوا کرتے تھے۔ وہ ایک سردار بنا لیتے تھے جو دلیر اور جسمانی طور پر سب سے زیادہ طاقتور ہوتا تھا۔ وہ پہلے خشکی پر چھوٹی چھوٹی بستیوں میں ڈاکے ڈالتے تھے۔ سمندر میں تجارتی بادبانی کشتیاں لوٹتے تھے۔ جوں جوں ان کا گروہ بڑھتا جاتا تھا، گروہ جب بڑے ہو جاتے تو تجارتی جہازوں اور جزیروں پر قبضے کرتے تھے اور خشکی پر ان کا دائرہ ... قلعوں تک بڑھ جاتا تھا۔ سردار اپنی برتری کا تسلسل چاہتا تھا۔ پھر بڑے بڑے ... میں ... کے بعد ... کبھی فرعون، کبھی راجہ، کبھی ظل الٰہی، کبھی مہاراجہ اور کبھی ... بن جاتا تھا۔ اس کا خاندان شاہی خاندان بن جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ڈاکے ڈالنے والے قدیم ساتھی شرفا بن جاتے تھے۔ ... سپہ سالار ... صوبوں کے حاکم بن جاتے تھے اور اس طرح ... سلطنتوں کا آغاز ہو جاتا تھا۔ اب بڑے بڑے محلوں ... ڈاکوں کی منصوبہ بندی، سیاست ... کہا جانے لگی۔ ... فرعون، ... زار، ... خان، ... شہنشاہ، ... مہاراجہ — سب ڈاکو تھے... سب کے سب...

''تاریخ شاہد ہے کہ امیر تیمور اپنے جد ... چنگیز خان کی طرح ... ڈاکے ڈالتا تھا،'' میں نے سوچا۔ ''... تاریخ میں عظیم مغل خاندان کہلاتا ہے۔ آج وہ خاندان ...

نہایت قابلِ احترام ہستی ہے۔ نہ معلوم کتنے شاہی خاندان ڈاکوؤں کے خاندان ہوں گے۔ کیا خبر!"

میرے ذہن میں تلخی سی بھر آئی۔ مجھے گل جاگیر کا مشہور ڈاکو محمد خان[11] یاد آیا جو شیغم خان کا گہرا دوست بھی تھا۔ تلخی بڑھ گئی۔ "اگر محمد خان ڈاکو کو نہ روکا گیا تو وہ ملک کا سربراہ بن کر دوبارہ اعلیٰ صدر بن جائے گا۔" اس خیال سے پیدا ہونے والی کڑواہٹ زہریلی تھی۔ رات کا پرفسوں ماحول زہر آلود ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے دشمن کے موذی کوبرے نے میرے ذہن کو ڈس لیا ہے۔ مرچی سے میرے حلق اور سینے میں سوجن سی نمودار ہو چکی تھی۔ مرچی کی دو موٹی پتنہ زہر میرے گلے اور چھاتی میں انڈیل چکی تھی۔

"مرچی تو انسانوں کی خوراک ہے،" میں نے تلخی سے سوچا۔ "اسے تو انسان کھاتے ہیں۔ شیغم خان کے ڈیرے پر تو مرچی سے متعلق کبھی کسی نے سوچا تک نہ ہوگا۔ وہاں تو ہر روز بکروں کی کھالیں اتاری جاتی ہیں۔ بانگی مرغوں کی گردنوں پر چھریاں پھرتی ہیں۔ اس کے دسترخوان پر بیس سات قریبی ساتھی موجود رہتے ہیں۔ ان میں اس کا جگری یار محمد خان ڈاکو بھی شامل ہوتا ہے۔ شراب پی کر بھنے گوشت کو دانتوں میں چباتے ہوئے انھوں نے کبھی مرچی سے متعلق سوچا بھی نہ ہوگا۔ انھیں تو مرچی کا ذائقہ بھی معلوم نہیں ہوگا۔ مرچی تو انسانوں کی خوراک ہے۔ وہ تو دوسری مخلوق ہیں۔"

میرے ذہن میں ایک مصرع ابھرا۔ ذرا سی کوشش سے شعر ہو گیا:

جسے کھانے پہ ہو جائے محبت نوعِ انسان سے
مجھے مرچی پسند آئی ہے نعمت ہائے الوان سے

شعر کی تخلیق نے زہریلی فضا میں تریاق کا کام کیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں شعر کو گنگنانے ہی لگا تھا کہ جھروکے کے اوپر سے ایک پرندہ اڑا۔ تیر کی طرح سیدھا جھیل کی سمت گیا۔ جھیل کے پانی میں ڈبکی لگا کر پھر اڑا اور زیتون کے جنگل کی سمت چلا گیا۔ وہ شکرے کی طرح کا کوئی پرندہ تھا۔ ایسے پرندے دریائے سوات کے کناروں پر پھیلی ہوئی جھاڑیوں اور کریروں کی شاخوں پر آ

11۔ محمد خان ڈاکو [illegible] میں نامور ڈاکو تھا۔ [illegible] حاصل تھی۔ [illegible] پر محمد خان ڈاکو کی حکومت قائم تھی۔

نظر آتے ہیں۔ ان کا رنگ گہرا بھورا اور نیلا ہوتا ہے۔ اس کی پونچھیں، سرخ اور کی چونچیں، بہت نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔

''فطرت کی شدت اور فطرت کی لطافت کے درمیان کشمکش، جستجو کی جنت ہی سے نمایاں ہوتی ہے۔'' میرے خیال کا ربط ٹوٹا۔ میرے خیالات [illegible] دخل ہوا [illegible] کہ جھاڑ سے کے نیچے جھاڑی میں سرسراہٹ ہوئی۔ میں تیزی سے [illegible] جھاڑیوں پر گیا۔ شاید یہ [illegible] ہو [illegible] سانپ بھی ہو سکتا ہے۔ ان جھاڑیوں میں سے بھی ملتے ہیں۔ جہاں سرسراہٹ ہوئی تھی وہاں غور سے دیکھنے پر چھوٹا سا خارپشت نظر آیا۔ سیاہ خارپشت گوشت کی [illegible] میں الجھا [illegible] جاتے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یہاں تو دور دور تک کوئی سانپ نہیں ہوگا۔'' میں نے سوچا۔ سیاہ خارپشت جس [illegible] سانپ کو مارتا ہے، اتنی اذیت سے شاید ہی کوئی جانور کسی دوسرے جانور کو مارتا ہوگا۔ خارپشت سانپ کو دیکھ کر ایک سمت سمٹ جاتا ہے، پھر پہلو کی سمت سے [illegible] سانپ پر حملہ کرتا ہے۔ [illegible] تیزی سے دو سانپ کی دم کو دانتوں میں دبا کر [illegible] کانٹے اکڑ جاتے ہیں۔ [illegible] دانتوں میں [illegible] چھوڑ دیتا ہے۔ خارپشت مکمل طور پر جکڑے ہوئے سانپ [illegible] طرف سے کھانا شروع کر دیتا ہے۔ سانپ درد کی شدت میں بار بار کوڑے کی طرح خارپشت سے ٹکراتا [illegible] ہے۔ تار تار [illegible] کا بدن چھلنی ہو جاتا ہے۔ اس شدت [illegible] سانپ مر جاتا ہے۔ سانپ کی یہ اذیت کبھی کبھی دو گھنٹے تک جاری رہتی ہے۔

''یا ضیغم خان کے لیے بھی کوئی خارپشت کیوں نہیں بنا؟'' میں نے پھر سوچا اور [illegible] کی شمالی سمت میدان میں چھپے ہوئے کھیتوں سے [illegible] کی آوازیں سنائی دیں۔ گیدڑ کھیتوں میں موجود خرگوشوں پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ [illegible] آوازیں آئیں۔ مجھے بچپن میں سنی ہوئی ایک کہانی یاد آئی جس میں [illegible] سے:

''پدرم سلطان بود!''

Scanned with CamScanner

''تو راجہ ۔ تو رجہ ۔ تو راجہ ''سب گیدڑ چلانے لگتے ہیں کہ باپ سلطان تھا تو مجھے کیا؟ تو کیا ہے؟'' میرا دھیان پھر ضیغم خان کی طرف گیا۔

''ضیغم خان نامی کا شیر ہوگا — اور پھر شیر ہونا کون سی فخر کی بات ہے؟ نہ جانے انسانی تمدن میں ہمیشہ طاقت ہی کو کیوں پوجا گیا ہے، قوت ہی کی کیوں پرستش کی گئی ہے۔۔ شیر جیسے خونخوار اور بے رحم درندے کو شجاعت کی مثال قرار دے کر جنگل کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ عقاب جیسے بدصورت اور خون آشام پرندے کو بہادری کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ غزالوں، فاختاؤں اور کبوتروں جیسے نازک اور خوبصورت پرندوں کو ڈرپوکی کی مثال بنایا جاتا ہے۔ ان کے حسن کا احساس کسی کو نہیں ہوتا۔ نہ جانے اس دنیا میں حسن کو صید اور بدصورت مکروہ ہوس کو صیاد کا درجہ کیوں ملتا ہے۔ شاید انسانی تمدن نے صدیاں گزرنے کے بعد بھی ذوقِ جمال سے فطرت کی لطافت کا ادراک حاصل نہیں کیا۔ شاید جبلی تقاضوں کی تخلیق قوتِ شر کا اپنے لیے حفظ ماتقدم تھا۔ شاید ہوس قوتِ شر کا وہ ازلی ہتھیار تھا جس سے آگے سانپ کی زبان کی طرح دو شاخیں خوف اور اور خود غرضی، قوتِ شر کی سلامتی کی ضمانت بن کر قائم ہو گئی تھیں۔''

سیڑھیاں اترتے ہوئے میرے قدم ایک آواز پر رک گئے۔ دور زیتون کے مصنوعی جنگل میں، بہت دور، کتے کے رونے جیسی دھیمی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ دھیمی سی آواز چند لمحوں میں دہرائی گئی۔ یہ بھیڑیے کی آواز تھی۔ پھر دو تین بار ایسی آوازیں ابھریں۔ ریسٹ ہاؤس کی چھت کی طرف میری نظریں تیزی سے اٹھیں۔ محمد خان گوریلے کی طرح کھڑا میری سمت زور زور سے بازو ہلا رہا تھا۔

''صاحب... صاحب... صاحب جی!'' اس کی دبی دبی سی آواز سیڑھیوں تک پہنچی۔ ''بھیڑ... بھیڑیا!'' وہ چلا رہا تھا۔

میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا لان میں پہنچ کر دوڑا، خیمے کے قریب سے گزرا، ٹنکے کے پاس اچک کر دیوار پہ چڑھا۔ ایک فٹی دیوار پر توازن برقرار رکھنا مشکل تھا۔ محمد خان نے چھت سے بازو نیچے کر کے میرا ہاتھ پکڑا اور میں چھت پر چڑھ گیا۔ دو تین گہرے سانس لے کر میں نے زیتون کے جنگل کی سمت دیکھا۔ محمد خان نے مجھے اس طرح بلایا تھا جیسے اس نے بھیڑیوں کو دیکھا ہے۔ جھیل کے کنارے زیتون کے درختوں میں تاریکی تھی۔ بھیڑیوں کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔

Scanned with CamScanner

"آتے گئے، دور —" محمد خان نے تندی گالی دی۔ وہ سیدھا جھیل کے اس کنارے کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس سے ملا ہوا تھا اور جہاں چوہدری کی خشک گھاس کا قطعہ سا بنا ہوا تھا۔

"آتے گئے، دور... دل ہار رہے ہیں، کئی چھوڑے ہیں جو آ پہنچے پانی پینے... ہر رات آتے ہیں۔"

محمد خان چھت پر بچھے ایک سر پر بیٹھ گیا۔ وہ اس کی سمت اشارہ کرتے ہوئے اس نے مجھے دیکھا۔

"بیٹھ جائیں صاحب جی... بیٹھ جائیں... بیٹھ کے لیٹ جائیں... یہاں سے تو اچھی صاف نظر آتے ہیں۔"

مجھے یکایک شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ بھیڑیے بھی بہت دور تھے لیکن میں یوں سمجھتا تھا جیسے انہوں نے نظر کر دیا ہو۔ میں شرمندہ سا تھا۔

"شاید ہر انسان کے اندر ایک درندہ موجود ہے جو بیری وحشت سمجھتا ہے اور اپنی پہ ندامت محسوس کرتا ہے،" میں نے گہری سے سوچا۔ "مجھے فطرت کی شدت نے چہرہ دکھایا ہے جو پشت کی طرح سیاہ اور سفاک چہرہ، جو اپنی ہی طرح ایک درندگی کی علامت ہو... ذہنی علامت و خطرہ تھا۔ وحشت... کر مٹا دیتا ہے... لطافت، شاید کسی چہرے کے سامنے ہوتیں سائیں، چھوٹے سے پرندے کی طرح مسلسل لرزتی ہوئی، جس کا شکر بہت ہی محدود سا ہے، جو بھیڑیوں کے ڈر سے بکھر جاتا ہے۔"

—

7

بارھویں کے چاند کی روشنی میں جھیل سے... پر ہوا سے دھیمے جھونکے ارتعاش پیدا کر رہے تھے اور لہروں پر روشنی متحرک رہی تھی۔ اس سے آگے پھیلی ہوئی ہر کالی میں جھینگے لگاتے جل مرغوں کی چپاک چھپ... ریسٹ ہاؤس کی چھت پر بھی شام سے... رہی تھی۔ بھیڑیوں کی آوازیں رک رک کر آ رہی تھیں۔ پھر جیسے بھیڑیوں کی آوازوں کے علاوہ سب آوازیں ختم ہو گئیں۔

"محمد خان،" میں نے آہستہ سے کہا، "کیمپ میں تو ہر رات خطرہ رہتا ہوگا؟" شیپ... میں

بھی ''

''ہاں صاحب،'' محمد خان نے جواب دیا۔ ''خطرہ تو رہتا ہی ہے۔ کیمپ میں رات کو آگ جلتی ہے... گرمیوں میں بھی۔ شیپ فارم کی پتھر کی دیواریں اور لوہے کے گیٹ بہت مضبوط ہیں۔ وہاں خطرہ نہیں ہے'' محمد خان نے میری طرف دیکھا۔ ''خطرہ تو مجھے ہے صاحب... مجھے۔''

''اس چھت پر بھی؟'' میں نے کہا۔

''چھت محفوظ ہے،'' محمد خان آہستہ سے بولا ''پر آئی کو کون ٹال سکتا ہے!''

بھیڑیوں کی آوازیں قریب تک ضرور محسوس ہوئیں۔ آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ان میں صاف ہو رہا تھا۔ بھیڑیوں کا غول، زیتون کے درختوں میں بھاگتا، پھیلتا چلا آ رہا تھا۔ محمد خان پیٹ کے بل بستر پر لیٹ گیا۔

''لیٹ جائیں صاحب،'' وہ بولا، ''تکیے پر ٹھوڑی رکھیں، آواز نہ نکالیں''

''کیوں محمد خان؟'' میں نے بستر پر تقریباً لیٹتے ہوئے کہا، ''وہ اوپر تو نہیں چڑھ سکتے''

''تماشا دیکھنا ہے تو چپ رہنا صاحب،'' محمد خان نے دھیما سا قہقہہ لگایا۔ ''ورنہ بھاگ جائیں گے سالے'' محمد خان نے پھر گالی دی ''پہلے غرائیں گے، پھر خود ہی ڈر کر بھاگ جائیں گے۔ انسان کی آواز سے ڈرتے ہیں لیکن اکیلا دیکھ لیں تو پھر'' محمد خان کی آواز قریب آتی ہوئی بھیڑیوں کی آوازیں سن کر آہستہ ہو گئی۔ ''اکیلا اور غیر محفوظ دیکھیں تو بھیڑ بکری نہیں چھوڑتے چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ مجھے کئی بار دیکھ چکے ہیں۔ غراتے ہیں، پھر بھاگ جاتے ہیں۔''

بھیڑیوں کی آوازیں اب اتنی قریب تھیں کہ ان کا آپس میں غراتے ہوئے الجھنا بھی صاف سنائی دے رہا تھا۔ چاندنی میں ہماری نظریں زیتون کے جنگل کی طرف سے آنے والی گزرگاہوں پر جمی ہوئی تھیں۔

''سالے'' محمد خان نے دانت پیس کر کہا۔ ''آپس میں کھیلتے بھی ہیں تو یوں جیسے ایک دوسرے کو مار دیں گے۔''

زیتون کے جنگل سے دو جانور نکلے۔ بہت تیزی سے لان میں دوڑتے، ٹیلے کے قریب چارپائیوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچے اور پتلی سڑک سے ہو کر پمپ سٹیشن کی سمت کھیتوں کی طرف نکل گئے۔

Scanned with CamScanner

سورج بھی [illegible] ''محمد خان مسلسل کا بیان بند رہا تھا۔ میری موجودگی میں اس نے اپنے مخصوص دیہاتی انداز پر جو خود ساختہ پابندی لگائی تھی، جو شائستگی کا جو [illegible] اس نے اپنے ذہن پر خود ہی بنا لیا تھا، کرچی کرچی ہو چکا تھا اور اسے خبر تک نہ تھی۔ وہ اضطراری کیفیت میں تھا۔ اس سے [illegible] کا اجڈ دیہاتی میرے قریب بیٹھا، تیز تیز نگاہوں سے جنگل کی طرف دیکھ رہا تھا — مکمل ترین اجڈ دیہاتی۔

ہرنوں نے درختوں سے پہلے جھانکا، پھر دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں [illegible] میں حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے تصور کے برعکس تھے۔ تصویروں اور دستاویزی فلموں میں دیکھے ہوئے چھوٹی چھوٹی ٹانگوں [illegible] کالے چتکبرے، سفید اور سینگ [illegible] بڑے میرے سامنے مکمل [illegible] کی تھوتھنیوں والے شکاری [illegible] تھے [illegible] ستارے [illegible] بیٹھے ہیں [illegible] پانی کی سمت [illegible] پیاسے ہوں۔ وہ کافی دیر پانی پیتے رہے۔ پانی پیتے ہوئے چپڑ چپڑ کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ [illegible] پانی پیتے [illegible] پانی میں [illegible] پانی میں [illegible] تھے۔ پانی پیتے ہوئے [illegible] پانی [illegible] اس نے ٹانگ اٹھا دی۔

[illegible] محمد خان نے [illegible] چاندنی میں اگرچہ وہ بہت نمایاں نہ تھے [illegible] ان میں بچے نہیں تھے، اگرچہ کچھ [illegible] قدرے چھوٹے تھے اور [illegible] تھے [illegible] بہت [illegible] سے سست نظر آتے تھے [illegible] پانی پینے کے [illegible] انہوں نے [illegible] پانی [illegible] تھے۔ [illegible] محمد خان نے [illegible] تھی [illegible] وہ بھی [illegible] تھے [illegible] میں [illegible]

بھیڑیا اپنے اگلے پنجوں کو دن کی گھاس میں دبا کر، سر کو نیچے پنجوں کے قریب رکھ کر، چھلانگ لگانے کا انداز بناتا اور قریب سے گزرنے والے بھیڑیے پر کود پڑتا۔ ایک بھیڑیے نے اسی طرح چھلانگ لگا کر دوسرے بھیڑیے کو گرا دیا اور غراتے ہوئے اس پر پل پڑا۔

"دھر گندا اس!" (مار گرایا ہے) محمد خان نے مخصوص دیہاتی انداز میں پھر سرگوشی کی۔ کچھ بھیڑیے ان کے ساتھ، جھیل کو ہم سے جدا کرنے والی اینٹوں کی دیوار کے پاس ادھر ادھر گھوم رہے تھے، دو چار مشرقی جانب سرکنڈوں میں چلے گئے۔ چاندنی میں وہ صاف نظر آ رہے تھے۔ ایک نے اچانک اتھلے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ ایک جل مرغا "کیں" کی تیز آواز کے ساتھ اوپر تک پانی میں اچھلا، پھر پھڑپھڑاتا چلا گیا۔ بھیڑیا اگلی ٹانگوں سے پیچھے کے زاویے پر پلٹا۔

"تیری ماں ..." محمد خان کی آواز بلند ہوئی اور ہمارے سامنے ان میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دو چار بھیڑیے رک گئے۔ انھوں نے ہماری سمت دیکھا، غرائے، پیچھے ہٹے۔ ان کی بھی تھوتھنیاں، لمبے جبڑے ہماری سمت اٹھے ہوئے تھے۔ وہ غراتے ہوئے خیمے کی سمت بڑھے۔ کئی دوسرے بھیڑیے بھی اپنی تھوتھنی نما لمبے جبڑوں میں سے دانت دکھاتے ہوئے، آنکھوں کے درمیان شکنیں سی نمایاں کرتے ہوئے غرانے لگے۔ ایک دو بھیڑیے اینٹوں کی دیوار کی طرف آئے، پھر غراتے ہوئے واپس چلے گئے۔ خیمے کی سمت جاتے ہوئے انھوں نے رک کر، سر گھما کر، لمبے جبڑے اٹھا کر ہمیں دیکھا، غرائے اور پھر تمام بھیڑیے اسی طرح کبھی سیدھے، کبھی دائروں میں، غراتے ہوئے چارپائیوں کے قریب پہنچ گئے۔ انھوں نے کتنی ہی بار خیمے اور چارپائیوں کے چکر کاٹے، پھر غراتے، دوڑتے، ایک دوسرے پر اچھلتے، چکر کھاتے وہ اس کچی سڑک پر جا پہنچے جو گلی جاگیر کی سمت جاتی ہے۔

"گلی جاگیر کے کھیتوں میں بہت خرگوش ہیں،" محمد خان نے کہا، "اور چھاڑوں میں ہڑیال[12] بھی ہیں۔ یہ حرامی ایسے ہی موٹے تازے نہیں ہیں۔ کبھی کبھی تو گلی جاگیر اور ساتھ والے گاؤں ڈھوڑی میں بھیڑ بکریوں کے باڑوں پر بھی حملہ کرتے ہیں لیکن نولی کتوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے بھاگ جاتے ہیں۔"

گلی جاگیر کا ذکر چھڑتے ہی پل بھر میں مجھے شمیم جان کا چہرہ تصور میں ابھرتا محسوس ہوا۔

---

[12] ہڑیال: موٹے سینگوں والے ہرن۔

"ادھر میں سمجھ رہا تھا کہ محمد خان..." "ان حرامیوں نے میرا سامان کھینچ رکھا ہے۔" محمد خان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہر رات گزرتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو محمد خان،" میں نے کہا۔ "یہاں بیماری نہیں، قتل عام آتی ہے۔ اگر ہم چارپائیوں پر ہوتے تو اب تک..."

"دو سال سے رہ رہا ہوں اکیلا۔" محمد خان ٹھوکر سے پر بیٹھ گیا۔ "ایک بھیڑیا کبھی حملہ نہیں کرتا صاحب... یہ تو جتھا ہے جتھا..."

محمد خان نے گلی جانے کی سمت جاتی ہوئی سڑک کو دیکھا تو سب خاموش ہو گئی۔ بھیڑیے وہاں سے جا چکے تھے۔

"محمد خان ٹھیک کہہ رہا ہے،" میں نے سوچا۔ "ایک بھیڑیا کبھی حملہ نہیں کرتا۔ بھیڑیے ہمیشہ مل کر حملہ کرتے ہیں۔ انھیں اپنی اجتماعی قوت کا غرور ہے۔"

مجھے فطرت پر غصہ آیا۔ اس نے بھیڑیوں کو یہ اجتماعی شعور، یہ اجتماعی قوت کا احساس غول بندی کے ذریعے دے رکھا ہے جس سے یہ کیمپ کے پٹھان لڑکے محروم ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ضیغم خان سے خوف زدہ ہے۔ وہ سب مل جائیں تو ضیغم خان ان سے ڈر جائے لیکن ان میں اجتماعی شعور ہی نہیں۔

"یہ پٹھان لڑکے،" میں نے تلخی سے سوچا، "یہ پٹھان لڑکے ان سب سے [illegible] کے پر بندھا ہوا گدھا ہے۔"

محمد خان ابھی تک گلی جانے کی سمت جانے والی پتھریلی پگڈنڈی کی سمت دیکھ رہا تھا جس پر بجھے ہوئے سیٹ جیسے پتھر پڑے تھے جو چاندنی میں بہت اداس تھے۔

"محمد خان،" میں نے کہا، "کبھی اپنے ہم نام محمد خان ڈاکو کو بھی دیکھا ہے؟"

"کوئی ماریں جی،" محمد خان نے یوں جھٹکا سا دے کر مجھے دیکھا۔ "بہت دور کی بات ہے صاحب [illegible] کئی مار دیتا ہے [illegible] قتل کر چکا ہے [illegible] تحصیلدار ضیغم خان کا جگری دوست ہے۔ [illegible] محمد خان نے محمد خان [illegible] اس کے ان میں [illegible] چہرے پر نفرت کھل کر سامنے آئی۔ محمد خان [illegible] علاقے کا [illegible]

کے دل میں اس کے لیے شدید نفرت موجود تھی۔ مگر یہ نفرت کبھی اجتماعی نفرت بن کر ظاہر نہ ہو سکی، اس کی نوعیت انفرادی ہی رہی۔

"طاقتور کا کمزور کو مار دینا شدید فطرت کا امین اصول ہے۔" میرے خیالات کا رخ بدلا۔ "کمزوروں کا مل کر طاقتور کو ختم کر دینا بھی اسی شدید فطرت کا ہی مظہر ہو سکتا ہے۔ لطافت نداوں سے تہ ثانی۔ لطافت کسی بھی پہلو پر تخریب کا مظہر نہیں ہو سکتی۔"

جھینگروں کی وہ جھنجھناہٹ جو بھیڑیوں کی آمد کے ساتھ ہی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی واپس آ گئی۔ اچانک میری نظر ان خاردار جھاڑیوں، سوکھی جھاڑیوں پر پڑی جو چھت کے ایک کونے میں پڑی تھیں۔ ان کے قریب ہی دو بھاری پتھر بھی نظر آئے۔

"یہ جھاڑیاں کس لیے ہیں محمد خان؟" میں نے پوچھا اور وہ خاموش سا ہو گیا۔ اس نے جھاڑیوں کو دیکھ کر چھت کے اس کونے کو دیکھا جہاں سے ہم ایک انچی دیوار پھلانگ کر چڑھتے تھے۔

"سب راتیں چاندنی راتیں نہیں ہوتی ہیں صاحب،" محمد خان نے گہرا سانس لے کر آہستہ سے کہا، "تسکران کے جوڑے کو میں تین چار بار دیکھ چکا ہوں۔ اندھیری راتوں میں یہ جھاڑیاں کام آتی ہیں۔ انہیں میں ادھر..." محمد خان نے ایک انچی دیوار والے کونے کی سمت اشارہ کیا۔ "دھر دیتا ہوں، اوپر پتھر رکھ دیتا ہوں۔ بڑی کانٹے دار ہیں۔ بڑے زہریلی کانٹے ہیں۔ تسکران سے گزر کر اوپر نہیں آ سکیں گے۔ آ بھی گئے تو کچھ دیر تو لگے گی صاحب، میں خبردار تو ہو جاؤں گا۔"

مجھے محمد خان بہت ہوشیار اور ذہین انسان محسوس ہوا۔

"سردیوں میں کیا کرتے ہو؟ اور برسات میں؟" میں نے پوچھا۔ محمد خان اس بار خاموش ہو گیا۔ میں نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ چاندنی میں مجھے اس کے چہرے پر اضطرابی کیفیت نمایاں نظر آئی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر پلکیں تھرتھرا رہی تھیں۔

"صاحب،" وہ بمشکل بولا "اگر آپ بڑے صاحب کو نہ بتائیں تو..."

"نہیں بتاؤں گا،" میں نے کہا، اور محمد خان کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

"سردیوں میں اور بارش میں..." محمد خان نے شمال مغرب میں شیپ فارم کی سمت دیکھا۔ "وہاں فارم پر محبوب خان کمپاؤنڈر کے کوارٹر میں سوتا ہوں۔ اکیلا ہے بیچارہ۔ ستک بتا رہا ہے"

محمد خان نے یوں کہا جیسے میرا قدرے پناہ دے کر وہ اس پر احسان کر رہا ہو۔

"کیا کروں صاحب" محمد خان نے بات جاری رکھی۔ "ہم خیمے میں رہوں تو گھر در

مجبور نہیں چھوڑیں گے۔ چھت پر مٹی سے کر جاؤں گا۔ پمپ سٹیشن کی چابی آپ میرے پاس،

لیکن کمرہ چھوٹا ہے اور کیڑے بہت ہیں۔ سردیوں میں درندے بہت خطرناک ہو جاتے ہیں

صاحب۔ سردیوں میں تو بھیڑیے بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں۔" محمد خان نے دانت نکالے۔

مجھے ہنسی آ گئی۔

مچھروں کی بھنبھناہٹ کے ساتھ ساتھ جنگل کی سب آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ ان میں سب سے نمایاں آواز ریچھوں کے درختوں سے آ رہی تھی۔ یہ آواز جھینگروں کی تھی جن کے مسلسل بجتے ہوئے باجوں میں جھیل کے کنارے سے کسی مینڈک کی آواز یوں شامل ہو جاتی تھی جیسے کسی نے سیکسوفون پر زور سے پھونک ماری ہو۔ مجھے آہستہ آہستہ اپنی جسمانی حالت کا احساس ہوا۔ میرے گلے اور چھاتی میں مرچوں کی سوزش رچ بس گئی تھی، جس کا اثر میری آواز پر نمایاں تھا۔ مچھلیوں کی آمد سے لے کر ان کے جانے تک میرے منہ، گردن، ہاتھوں اور پیروں پر کئی سرخ دھبے نمودار ہو چکے تھے۔ مچھروں کے کاٹے ہوئے ان دھبوں میں جلن تھی جو خارش کرنے سے اور بڑھ جاتی تھی۔ میرے ایک پاؤں کا انگوٹھا اور ساتھ والی انگلی ایک دوسرے سے مسلسل رگڑ کھا رہے تھے۔ محمد خان مچھروں کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ اسے احساس تک نہیں تھا۔

"یہاں تو بہت زیادہ مچھر ہیں۔" میں نے کہا۔ محمد خان پھر کھل کر ہنسا۔

"صاحب جی!" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ جنگل ہے۔ یہاں ہر جاندار دوسرے پر حملہ کرتی ہے۔ مچھروں کو ہمارے خون کی بو بے چین کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہوا ٹھنڈی ہو جائے گی تو چادر اوپر لینے سے بچت ہو جائے گی۔"

محمد خان بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے آسمان کی طرف یوں دیکھا جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ میری نگاہیں بھی آسمان کی سمت اٹھیں۔ چمکتے ہوئے ستارے بہت قریب محسوس ہوئے۔ "ابھی تو" محمد خان بولا، "ابھی تو مرغابیاں اور بگلے[13] بھی آئیں گے، وہ بھی مچھلی پکڑتے ہیں صاحب، ایک میں

13. بھاس کی چڑیاں

گدھوں کے کانوں سے چمٹ کر خون چوستی ہیں۔"

میں نے کھیس نما چادر، سوتی دھاگوں کی قدرے موٹی چادر، ٹانگوں پر کھینچ لی۔ ایک نامعلوم سی اداسی نے میرے دل پر جیسے سایہ سا ڈالا۔

"پٹھان لڑکوں کا خون مچھر پیتے ہیں، گدھوں کا خون چمگادڑیں پیتی ہیں۔ سب سے بڑا ویمپائر تو ضیغم خان ہے..."

مجھے خون چوستے مچھر، ہو چوستی چمگادڑیں اور ضیغم خاں ایک ہی نسل کی مخلوق محسوس ہوئے۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک اندیشہ سا ابھرا۔

"محمد خان،" میں نے اندیشے کو چھت پر چڑھتے ہوئے محسوس کیا۔ "چیتوں کا جوڑا اگر چاندنی رات میں بھی چھت پر چڑھ آئے، اور تم سوئے ہو تو؟"

محمد خان نے میری سمت دیکھ کر گہرا سانس لیا۔

"صاحب،" اس نے ایک اینٹی دیوار والے کونے کی سمت دیکھا۔ "اس فکر نے مجھے کئی راتیں سونے نہیں دیا۔ شروع شروع میں میں ساری رات جاگتا رہتا تھا۔ اب عادی ہو چکا ہوں۔ نیند اتنی کچی ہے کہ اگر چوہا بھی چھت پر چڑھنے کی کوشش کرے تو میں اٹھ جاتا ہوں۔" محمد خان نے چھت پر پڑے کروز گل کے ڈبے کی سمت دیکھا۔ سیاہ کنستر میں گھنگھرو بندھا ڈنڈا ڈوبا ہوا تھا۔

"ماچس میرے سرہانے تکیے کے نیچے پڑی رہتی ہے صاحب۔ ابھی تک تو نہیں چڑھے۔ گھر آتے ہیں، پانی پیتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ کبھی اوپر چڑھنے کی کوشش کریں گے تو نہ چھوڑوں گا مادر——ے۔" محمد خان نے پھر گالی دی۔

"چاندنی راتوں میں بھی جھاڑیاں رکھ دیا کرو،" میں نے مشورہ دیا۔

"دستانے نہیں ہیں میرے پاس،" محمد خان نے کہا۔ "بڑے صاحب سے کہوں گا کہ اسٹور سے ایک جوڑ نکلوا دیں۔" اس نے میری سمت دیکھا۔ "پھلاہی کی ٹہنیاں ہیں اور بیری کی جھاڑیاں بھی۔ بڑے کانٹے ہیں، بڑے زہریلے۔ ہاتھوں میں کھب کھب جاتے ہیں اور بہت دیر تک چبھتے رہتے ہیں۔"

میں جانتا تھا کہ محمد خان کبھی کسی بھائی سے دستانے نہیں مانگے گا۔ نہ جانے اس علاقے کے

Scanned with CamScanner

انسانوں کی فطرت میں یہ جھجک کیوں ہے۔ تکلیف سہہ جاتے ہیں، بولتے نہیں۔ مجھے محمد خان ایک عجیب سی شخصیت محسوس ہوا — نہایت عجیب۔

"یہاں،" میں نے کہا، "اس علاقے میں تو بچھو بھی بہت ہیں۔"

"ہاں صاحب!" محمد خان تیزی سے بولا، "سب سٹیشن میں تو بہت ہیں۔ کالے اور[14] [illegible] کریس[15] بھی بہت ہیں۔ لیکن چھت پر نہیں چڑھتے۔ شاید چوکیداروں سے ڈرتے ہیں۔"

محمد خان نے پھر اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔

مجھے وہ بے حد [illegible] انسان محسوس ہوا۔ وہ دو برس سے تنہا اس جنگل میں رہ رہا ہے [illegible] بچوں سے دور، گھر کے سکون سے دور۔ ہر رات اس پر موت کا خوف منڈلاتا ہوگا اور وہ چھت پر لیٹا آسمان کو دیکھتا ہوگا۔ اس کی نظریں مشرقی افق پر پھوٹنے والے اجالے کو تکتی ہوں گی۔ [illegible] وہ نیند سے بار بار چونک اٹھتا ہوگا۔

"انسانی زندگی تاریک شب کی مانند ہے۔" میری نگاہیں آسمان پر دور تک پھیلے ستاروں پر جم گئیں۔ "یہ تو میں بھی اکثر کہا کرتا ہوں کہ زندگی ایک نیند کی مانند ہے جس میں ہم موت کے خواب دیکھتے ہیں۔ اور جب ہم اس نیند سے بیدار ہوں گے تو وہ زندگی کا آخری اور موت کا [illegible] لیکن یہ اس تاریک شب کی سحر زندگی میں کبھی طلوع نہیں ہوگی؟"

محمد خان کے گہرے سانس سنائی دیے۔ وہ سوچ رہا تھا [illegible] الجھن میں تھا۔

"یہ زندگی..." میں نے محمد خان کی طرف دیکھا۔ پھر میری نگاہیں جنگل کی سمت میں پھیلی ہوئی [illegible] درختوں سے اوپر اٹھیں اور ایک بار پھر ستاروں پر جم گئیں۔ "یہ زندگی، جس میں فطرت نے اپنے دونوں جلووں کو نمایاں کر دیا ہے لیکن کسی پہلو پر بھی مداوا کی مہر نہیں لگائی۔ یہ زندگی کیا ہے؟"

یہ سوال جو صدیوں سے انسان کے ذہن میں تاریک شب کی طرح موجود ہے [illegible] تاریک شب کی سحر آج تک طلوع نہیں ہو پائی۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ [illegible] اپنے [illegible] نہیں ہے۔ جہاں تک عقل کی رسائی ہے وہاں تک روشنی ڈال کر [illegible]

---

14 [illegible] 15 [illegible]

سوال کا ہر جواب تاریکی میں روپوش ہو جاتا ہے، اور ہر اندازہ عقیدے کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ غیر فطری قوتوں کا کوئی جبر نہیں ہوتا کیونکہ ان کا اپنا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا، وہ عقائد کی نظر آنے والی صورتیں ہیں جو تاریکی میں بگڑے ہوئے اندازوں سے پیدا ہوتی ہیں۔

"یہ زندگی اور اس میں قائم کیسا توازن ہے،" میں نے سوچا "جو ایک سمت خون آشام اور دوسری جانب بے بسی کا شکار ہے۔ غزال، فاختہ میں، کبوتر اور بے ضرر خوبصورت پرندے خون تو نہیں پیتے۔ میں اس توازن کو کیسے مان لوں؟ پرندے کسی حد تک جزوی گوشت خور (Semi-Carnivorous) ہوں گے۔ میں نے کبھی فاختہ اور کبوتر کو حشرات الارض کھاتے نہیں دیکھا لیکن وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایسا نہیں کرتے۔ لیکن غزال خون تو نہیں پیتے، گوشت تو نہیں کھاتے۔ جنگلی بھینسے، گائیں، بیل، گائیں، ہرن اور گھاس کھانے والے تمام جانور کس اعتبار سے توازن میں ایک پلڑے میں ہو سکتے ہیں؟ شاید کچھ لوگ یہ کہیں کہ وہ گھاس کھاتے ہوئے کئی چند کیڑے بھی کھا جاتے ہوں گے، لیکن حیوانات کا یہ عمل دانستہ کہلائے گا؟ وہ درندوں کی طرح دانستہ خون آشامی تو نہیں کرتے۔ یہ کیسا توازن ہے؟ میں اس توازن کو نہیں مانتا۔ ایک پلڑے پر زندگی ختم ہوتی ہے تو دوسرے پر زندگی کو تقویت ملتی ہے۔ حسن کو دوام ہے اور ہمیشہ رہے گا، ورنہ قرن ہا قرن سے جاری عمل سے حسن مٹ چکا ہوتا۔ حسن کو انجام ہے اور ہمیشہ رہے گا ورنہ اس کرۂ ارض سے خیر کی قوت کب کی جا چکی ہوتی۔ خیر کا وجود ہی ختم ہو چکا ہوتا۔ وہی جمال کو فروغ ہے اور ہوتا رہے گا، جبلی بدنمائی کو معدوم ہونا ہے اور ہو کر رہے گی۔ ایسا ضرور ہوگا، یقیناً ہوگا۔ یہی اس زندگی کا مقصد ہے کہ فطرت کا سفر کثافت سے لطافت کی سمت جاری رہے جو صدیوں سے جاری ہے۔ یہی تو زندگی ہے کہ جس میں ہر شدید جذبہ لطیف جذبے میں تبدیل ہوتا رہے، جو ہزاروں سال سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہ ہر انسان اپنی زندگی میں مشاہدہ کرتا ہی رہتا ہے کہ برائی ہی سے برائی جنم لیتی ہے۔ نیکی کا جذبہ ایک بار فروغ پا جائے تو پھر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ تاریک جستوں کے پیمانہ عمل اسے رد نہیں کر پاتے، جبکہ شدید ارادوں سے قائم شدہ تاریک جذبے نیکی کے جذبے کی روشنی میں خود بخود مٹ جاتے ہیں۔ اس روشن ثبوت کی راہوں میں یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس کرۂ ارض پر آخرش اور ہمیشہ رہنے والی فتح خیر ہی کی ہوگی۔ شدید فطرت کی شدت اور کثافت مٹتے مٹتے مٹ جائے گی۔"

چاند کے پاس سے ایک بڑا سا پرندہ، اپنے پر پھیلائے تیزی سے گزر رہا تھا
چاند کی ہالے کا ایک منظر میرے ذہن میں ان کی طرف چلا۔

در انتظار ہما دام چیدہ ام ہنگر

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

8

صبح جب محمد خان نے مجھے جگایا تو صبح کا تارا بہت قریب محسوس ہوا، بالکل آنکھوں کے سامنے، بہت ہی قریب۔ میں نے دونوں ہاتھ آنکھیں بھینچیں۔ شمالی سمت درختوں کے جنگل میں پرندوں نے شور مچا رکھا تھا۔ تیتر کی آوازیں تھیں جو کہ جنگل کو جگا رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی سی روشنی ہر سمت پھیلی ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں ملتے ہوئے جھیل کو دیکھا۔ جھیل بھی بیدار ہو رہی تھی۔ جل مرغ خاموش سا، شمال مشرقی سمت سرکنڈوں کے سامنے سبز کائی میں تیر رہے تھے۔ میری بائیں سمت کنارے کے قریب چھپے ہوئے پانی کی سطح پر بیٹھے ہوئے گہرے سبز، سرخ اور پیلے رنگ کے پتوں میں رنگ سے بکھر گئے۔ ان کے کنارے بہت سے نظر آئے۔ میری بائیں طرف مجھے کئی سو جیسی تیز والے بہت سے چھوٹے چھوٹے پرندے نظر آئے۔ غور سے دیکھا تو یہ پرندوں کے پروں پر جھینگر کے پروں کا گمان ہوتا ہے۔ یہ بہت ہی چھوٹے چھوٹے سے تھے اور پتوں پر رکھتا تھا۔ خوف کا سا منظر تھا، ہوا میں ٹھہرے ٹھہرے سے۔ درختوں سے دور سے کئی ہرے ہرے، چمکتے ہوئے سیاہ مائل رنگ والے سرخ اور سبز پروں والے ایک قسم کے پرندوں کی قطار میں بہت نظر آتا ہے۔ آسمان پر بھی اڑتے ہوئے کچھ پرندے دکھائی دیے رہے تھے۔ یہ جنگل کشتیوں کا ہونا تیزی سے گزرا۔

میں نے خیمے کی طرف دیکھا۔ محمد خان مجھے جگانے کے بعد خیمے کے قریب چلا گیا تھا۔ وہ خیمے کے اندر جا کر باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں ناشتہ تھا۔ وہ سیدھا میری سمت آیا۔

"آپ صاحب!" اس نے چائے پیش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ چائے پی لیں اور صورت حال کا جائزہ لیں۔ ہم پچھلے پہر تک نہیں پہنچ پائیں گے، پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔"

محمد خان نے سارے جمالیاتی ماحول کو انسانی ضرورت کی بھینٹ چڑھا دیا۔ میں نے بستر تہہ کر کے نیچے پھینکا، جسے محمد خان نے دبوچ لیا اور خیمے کی سمت چل گیا۔ میں چھت سے اترا۔ اترتے ہوئے ایک اینٹ دیوار پر غیر متوازن ہونے پر، میں نے تقریباً چھلانگ لگا دی۔ محمد خان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ میں خیمے کی طرف گیا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ محمد خان نے خیمے میں جاتے ہوئے مجھے مڑ کر دیکھا۔

”چائے پئیں گے صاحب؟“ وہ بولا اور دوسرے ہی لمحے وہ تولیہ اور صابن لیے باہر آیا۔ اس نے تولیہ اور صابن مجھے پکڑاتے ہوئے ہینڈ پمپ کی طرف دیکھا جہاں نلکے کے نیچے لوٹا پڑا تھا۔ پھر خاموشی سے وہ دوبارہ خیمے میں گھس کر پیتل کے اسٹوو میں مٹی کے تیل کی پھوار بنانے کے لیے ہوا بھرنے لگا۔

9

ہینڈ پمپ پر ہاتھ منہ دھو کر، خشک دودھ کے مخصوص ذائقے والی گرم گرم چائے پی کر، میں اٹھا اور جھیل کے مشرقی کنارے کی طرف چل گیا۔ میری نگاہیں کنول کے گلابی پھولوں پر جمی ہوئی تھیں، کہیں کہیں سفید کنول بھی نظر آتے تھے۔ ننھے ننھے پرندے اب وہاں نہیں تھے۔ کثافت اور لطافت کے رشتے کی گہرائی کو میں نے بہت سچائی کے ساتھ محسوس کیا۔ انسانی ضرورتوں کو انسانی احساسات سے مربوط دیکھ کر مجھے گوتم بدھ کا ایک واقعہ یاد آیا۔

ایک شاگرد نے گوتم بدھ سے پوچھا کہ پریم کیا ہے؟ ”پریم کنول کا پھول ہے۔“ گوتم بدھ نے جواب دیا۔ ”پریم کنول کا وہ پھول ہے جو جھیل میں کھلتا ہے، اور جس کی جڑیں جھیل کے اندر کیچڑ میں ہوتی ہیں۔ پر بھنورے جب وہ کھلی بھیگی پتیوں میں جھومتا ہے تو وہی کیچڑ کو بھول جاتا ہے۔“

مجھے لطافت اور کثافت کے رشتے میں لطافت کثافت سے جدا ہوتی محسوس ہوئی۔ گزشتہ شب کے خیالات میرے ذہن میں تھے۔ میری آنکھیں شاید جھپک گئی ہوں گی۔

”سمندر سے بادل اٹھتے ہیں،“ میں نے سوچا، ”ہوا پر تیرتے ہوئے وہ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں سے ملتے ہیں، گھنے ہو کر وادیوں میں برستے ہیں، چٹانوں میں جذب ہو جاتے ہیں،

چشمے بن کر پھوٹتے ہیں، پھر سے بن کر گزرتے ہیں، ندیاں بن کر بڑے بڑے پتھروں سے ٹکراتے ہوئے، جھاگ بناتے ہوئے، پیچ و تاب کھاتے جھیل میں آن گرتے ہیں۔ جھیل سے چند ندیوں کی صورت نکلتے ہیں، ندیاں مل کر دریا بن جاتی ہیں، دریا بہتے بہتے پھر سمندر میں جا گرتے ہیں۔ گردش مکمل ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ شبنم کا قطرہ جو صبح کسی پھول کی پتی پر پڑا ہوتا ہے، سورج کی کرن سے چمکتا ہے اور پھر ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے، وہ گردش کو توڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے بدن کو ضعیف کرتے ہوئے، ثقافت کے دائرے کو توڑ دیتا ہے ... تو مجھے ثقافت کو دوام کیوں نہ ہوتا؟"

میری نگاہوں کے سامنے کنول کے تر و تازہ، چمکتے ہوئے گلابی اور سفید پھول، پانی پر بچھے ہوئے گہرے سبز رنگ کے پتوں کے درمیان، ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں میں جھوم رہے تھے۔ ان کی بھینی بھینی مہک ہر سمت پھیلی ہوئی تھی ... یہی مہک جو جنگل کی دوسری خوشبوؤں کی موجودگی میں اپنا احساس دلایا کرتی ہے۔ ہر اس جنگل میں جہاں جھیل ہو، کنول کے پھولوں کی مہک صبح اور شام کے وقت یقیناً بہت نمایاں ہوتی ہوگی۔

"پھول کی جڑیں کیچڑ میں ہوں یا مٹی میں، وہ بیج سے نکلی ہی ہے ہر رنگ کی تازگی دیتا ہے۔ کچھ تنا بن جاتا ہے، پھر اس کی ہری نازک ٹہنیوں پر پتیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ پھول درخت ہو یا بیل، ان کی ٹہنیوں پر پتوں سے پہلے کلیاں نکل آتی ہیں، کبھی کلیوں سے پہلے پتے۔ نازک ٹہنیوں پر کلیاں چٹکیں یا مضبوط ٹہنیوں پر، ان کے چٹکنے پر پھول اپنے وجود کو عیاں کر دیتے ہیں۔ پتوں سے رنگ دیئے گئے ہیں، ان کے رنگوں کے عکس ہوا کے دامن میں بہتے نظر آتے ہیں ... لیکن وہ مہک، وہ خوشبو جو پھول کے وجود کی پہچان بن جاتی ہے اس کے ساتھ درختوں کے ثمر ہونے سے پہلے گردش توڑ دیتی ہے، وہ درختوں پر پھلوں سے پہلے ہی، اپنے ہی وجود کے عکس کی طرح پھیل جاتی ہے، لیکن پھول کی طرح پھل کے سوکھے اور بیج کے ظاہر ہونے سے پہلے گردش توڑ دیتی ہے ... تو اسے ہو جاتی ہے۔ تو مجھے ثقافت سے ذوق جمال کو فروغ کیوں حاصل نہیں ہوگا؟ پھول اور پھل میں مقید ثقافت خوشبو کی طرح بکھر جاتی ہے تو پھر ثقافت کو زوال کیوں نہ ہوگا؟ اس ثقافت کی خوشبو کی صورت میں قوت تو اس کی پہچان ہے، اسے زوال ہوگا اور یقیناً ہوگا۔"

مجھے یوں لگا جیسے وہ دوبارہ اسی چھوٹے سے پرندے کی طرح محسوس ہوا جو کنول کے پھول

Scanned with CamScanner

پر غوطہ لگانے کے انداز میں ساکن سا ہو جاتا ہے اور جس کے پر جھینگر کی طرح انتہائی تیز رفتاری سے حرکت کرتے رہتے ہیں۔ وہ پھول کی خوشبو کا والی پیامبر بن جاتا ہے۔

10

میں پھر ریسٹ ہاؤس کے لان میں پہنچا۔ سورج ابھی پوری طرح مشرقی افق سے باہر نہیں آیا تھا کہ گلی جاگیر کی طرف سے آنے والی کچی سڑک پر جیپ کی آواز سنائی دی۔ محمد خان سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"خان صاحب نے ناشتہ بھیجا ہوگا۔" اس نے بے دلی سے کہا۔ وہ اپنے اور میرے لیے پراٹھے بنا چکا تھا۔ جیپ قریب آ کر رکی۔ ڈرائیور کی سیٹ پر خود ضیغم خان بیٹھا ہوا تھا۔

وہ اترا۔ اس کے گلے میں چمڑے کی پیٹی سے پستول لٹکا ہوا تھا۔ چہرے پر شکنیں تھیں۔ وہ قریب آیا۔ محمد خان نے سلام کیا۔

"آئیے خان صاحب!" میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ضیغم خان جہاں تھا وہیں رک گیا۔

"اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو تم؟" اس کی آواز میں کرختگی تھی۔ "میں نے مہمان سمجھ کر عزت کی، کھانا بھجوایا اور تم نے نہ مزا! تم ہو کیا؟"

"مجھے بھوک نہیں تھی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "کھانا کھا چکا تھا اور مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ کھانا گلی جاگیر سے بھیجیں گے۔ آپ مجھے بتا کر نہیں گئے تھے۔" میں نے صورت حال کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے تھوڑی سی منافقت کی، ورنہ مجھے مرچی کھانے سے پہلے ہی دل یہ بات بتا چکا تھا کہ میرا کھانا گلی جاگیر سے آئے گا۔ یہ ذرا سی منافقت کارگر ثابت ہوئی۔ ضیغم خان آگے بڑھا اور میرے سامنے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"نہ مزا! کیا میں بیوقوف ہوں؟" وہ بولا۔ "کیا مجھے پتا نہیں تھا کہ صاحب تمھیں میرا مہمان بنا کر گئے ہیں؟ کیا میں نہیں جانتا تھا کہ تم نے کھانا کھانا ہے؟ کیا میں نے تم سے اٹھ پہر کا روزہ رکھوانا تھا؟ کون مہمانوں سے اٹھ پہر کے روزے بھی رکھواتا ہے؟" وہ ایک ہی سانس میں سارے جملے

کہہ گیا۔

"مہمان تو میں محمد خان کا بھی ہوں،" میں نے مسکرا کر کہا اور ضیغم خان کا چہرہ بگڑ گیا۔

"مہمان برابری والوں کے ہوتے ہیں" ضیغم خان نے اپنا پیچ کھول دیا۔

اس کے جملے کا رد و از کر سیدھا محمد خان کے ذہن میں اترا۔ محمد خان نے اوپر کی سمت جھٹکا کھایا۔ جلدی سے مٹی کا مٹکا اٹھا کر وہ ہینڈ پمپ کی طرف چلا گیا۔ ضیغم خان نے بڑی رعونت کے ساتھ ترچھی نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ تمہاری ضد تھی کہ تم یہاں ڈیرے پر رہنا چاہتے ہو" ضیغم خان نے میری طرف دیکھا، "ورنہ گل جاگیر میں میرا بہت آرام دہ ڈیرا ہے۔"

"میں یہاں آرام کرنے کے لیے نہیں ٹھہرا تھا" میں نے کہا۔ "میں تو یہاں کا ماحول دیکھنا چاہتا تھا۔"

"تو پھر دیکھ لیا؟" ضیغم خان کی آواز ابھی تک کرخت تھی۔

"ہاں، مجھے پتا چلا ہے میری آمد میں بھی تنگی ہے،" مرشد جی سب سمجھ رہی تھی۔

میرا طنزیہ جملہ ضیغم خان کے لیے بچھو ثابت ہوا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے تڑپ کر کہا۔ "کیا اب تم سے بھی اجازت لے کر بات کراؤں؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" میری آواز پھر آہستہ ہو گئی۔ "لیکن مرشد جی" میری آنکھیں ضیغم خان کی آنکھوں سے بالکل سامنے تھیں۔ "وہ سب تیار ہو جاتی ہیں۔"

"تیرے چاچے کے بیٹے ہیں یا ماما کے۔" ضیغم خان کا چہرہ غصیلا ہو گیا۔ "کیا لگتے ہیں تیرے؟"

"میرے کچھ نہیں لگتے" میں نے جواب دیا "لیکن انسانیت کے ناتے سے۔"

"ہم" ضیغم خان نے قہقہہ لگایا۔ "تم کالوں سے ... ذات کی بیٹیوں میں بیٹھ کر انسانیت انسانیت کرتے ہو، وہ سب باتیں تھیں جو صرف ... تھیں۔ مدتوں سے ... ان کا تعلق ہے۔" اس کا لہجہ بلند ہو گیا۔

دور ہینڈ پمپ پر نلکے کے نیچے حاجی گھڑا پڑا تھا۔ محمد خان نہ جانے کدھر چلا گیا تھا۔ ضیغم خان نے پہلو بدلا۔

''سن رہے ہو تم؟'' اس نے بلند لہجے میں کہا۔ ''انسانیت صرف کتابی چیز ہے۔''

ضیغم خان کا یہ جملہ سن کر میں نے اس کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

''انسانیت صرف کتابی چیز نہیں ہے خان صاحب! انسانیت کے بغیر زندگی، انسانی زندگی، کوئی شے نہیں ہوتی۔''

''ہوہ۔'' ضیغم خان نے سر کو جھٹکا دیا۔ ''انسانیت! ایک دن کسی کو روٹی کھلانی پڑ جائے تو پتا چل جائے تمہاری انسانیت کا۔'' ضیغم خان نے جملے کو جیسے دانتوں میں پیسا۔

''یہ لڑکے مفت کی روٹی تو نہیں کھاتے۔'' میں براہِ راست حملہ آور ہوا۔

''کیا؟'' ضیغم خان کو میری جانب سے اس حملے کی شاید توقع ہی نہ تھی۔ لمحہ بھر خاموشی رہی، پھر ضیغم خان کی عقابی آنکھیں بھنچ کر لکیر سی ہو گئیں، ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

''اوہو۔'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''تو جرنیل اکبر خان کی پارٹی کا سرخا ورکر تو نہیں ہے؟''

''نہیں، میں کوئی سرخا ورکر نہیں ہوں۔'' میں نے ناگواری سے کہا اور ضیغم خان کی آنکھیں پھر کھل گئیں۔

''تو پھر تجھے کیا تکلیف ہے؟'' اس نے چہرے کو اوپر کی سمت جھٹکا دیا۔

''کیا اپنے جیسے انسانوں سے ہمدردی رکھنا صرف سرخوں کا کام ہے؟'' میں نے تیزی سے کہا۔ ضیغم خان خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے بڑی سنجیدگی سے میری طرف دیکھا۔

''دیکھو۔ میری بات سنو۔'' اس کا لہجہ بہت بہتر ہو گیا۔ ''یہ جو دنیا ہے... یہ تم نے ابھی نہیں دیکھی۔ ناتجربہ کار ہو۔ یہ جو دنیا ہے، اس کا سارا نظام اللہ نے خود بنایا ہے۔ ایک شخص کی صورت دوسرے سے نہیں ملتی، پانچ انگلیاں برابر نہیں ہیں۔ یہ امیری، یہ غریبی، یہ سب اللہ کا نظام ہے۔ یہ فرق خود اللہ نے ڈالا ہے۔ کچھ وہ ہیں جن پر اس کا انعام ہے، کچھ وہ ہیں جن پر اس کا غضب ہے۔ تم اللہ کا شکر کیوں نہیں کرتے کہ اس نے تمہیں ان لوگوں میں شامل کیا ہے جن پر اس کا انعام ہے؟'' ضیغم خان مولوی بن گیا۔

Scanned with CamScanner

"تو کیا ان پٹھان لڑکوں پر" میں نے کیمپ کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا ان پر خدا کا غضب ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔" ضیغم خان نے کہا۔ "ہر کوئی اپنا مقدر لے کر آتا ہے۔"

"دیکھو ضیغم خان" میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "اس دنیا میں جو آتا ہے وہ اپنے حصے کے سکھ اور اپنے حصے کے دکھ لے کر آتا ہے، لیکن کچھ لوگ اپنے حصے کے دکھ دوسروں کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں اور ان سے سکھ چھین لیتے ہیں۔ پھر الزام تو وہ مقدر پر دھر دیا جاتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟" ضیغم خان کی عقل اس کے بدن کی طرح موٹی تھی۔ "کیا کہنا چاہتا ہے تو؟"

"یہ لڑکے جنھیں تم صوبہ سرحد سے لائے ہو، یہ تمھارے اپنے ہیں ضیغم خان" میری آواز پھر آہستہ ہوگئی۔ "یہ سب اس دنیا میں صرف دکھ ہی تو لے کر نہیں آئے ہوں گے۔ ان کے حصے کے کچھ سکھ بھی تو ہوں گے۔ ان کی جھولیاں، ان کے دامن، ان کے ہاتھ خوشیوں سے خالی کیوں ہیں؟"

"کیا میں قصوروار ہوں؟" ضیغم خان نے داڑھی میں خلال کرتے ہوئے کہا۔ "میں ان کو مزدوری دیتا ہوں۔ مزدوری کا اسی فیصد باقاعدگی سے ہر مہینے ان کے ماں باپ کو بھیجتا ہوں۔ سو روپے میں سے اسی گئے، باقی بیس سے ان کی روٹی چلتی ہے۔ کپڑے بھی دیتا ہوں۔ اور کیا اپنی کھال اتار کے دے دوں؟"

آخری جملے پر ضیغم خان کا انداز پھر جارحانہ ہوگیا، لہجہ پھر بلند ہوگیا۔

"یہ جو کچھ کھا رہے ہیں" مجھے اپنا گہرا سانس سینے میں اٹکا محسوس ہوا۔ "یہ جو پتے کھا رہے ہیں، یہ انسانوں کی خوراک تو نہیں ہے۔"

"اوہ!" ضیغم خان کچھ جھلا سا گیا۔ "ان خچروں کو کچھ نہیں ہوگا۔ تم سے اور مجھ سے زیادہ صحت مند رہیں گے۔"

"کیا تم ان کو خچر سمجھتے ہو؟" مجھے اپنی چھاتی میں مرچی کی سوزش محسوس ہوئی جو پانی کی طرح حلق کی سمت آتی محسوس ہوئی۔

"تو اپنے بھائی سے کہہ" ضیغم خان کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ "کہہ اسے۔ جو مہینے تمہیں دے۔"

کی بوریاں، چاول، گھی کے ڈبے، سب کچھ بھجوایا کرے اس کے واسطے۔''

''تمہیں میرے بھائی تو صوبہ سرحد سے نہیں لائے۔'' اب میرے لہجے میں غصہ بھرا۔ ''میں دیا ہوں تو میری ذمہ داری ہے۔'' ضیغم خان کا لہجہ غصیلا بھی بلند ہو گیا۔ ''تو کون ہے مجھ سے جواب طلبی کرنے والا؟ جا، جا کر جسے بتانا ہے بتا دے۔ مجھے کسی کے باپ کی بھی پروا نہیں۔''

''میں نے کسی سے کیا کہنا ہے۔'' میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔ ''کل رات مرچیں کھائی تھیں، ابھی تک میرا گلا اور سینہ جل رہا ہے۔''

میرے اس جملے کے بعد خاموشی سی چھا گئی۔ ضیغم خان نے پلکیں جھپکتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جم گئیں۔

'تیرا بھائی بہت اچھا ہے۔ بہت شریف۔ تیرے بھائی سے میرے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتا ہے، میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ نہ اس نے کبھی مجھے شکایت کا موقع دیا ہے اور نہ میں نے اسے۔'' اب ضیغم خان نے بھی اپنے غصے کو جیسے دبا لیا۔ ''بہت لحاظ ہے مجھے تیرے بھائی کا۔ اگر تیری جگہ کوئی اور ہوتا۔'' وہ جتانے لگا۔ ''شکر کر یہ سرحد نہیں ہے۔ سرحد ہوتی تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی تجھے گولی مار دیتا۔'' وہ یک دم سنجیدہ سا ہو گیا۔ ''اور اگر میں نہ مارتا تو وہاں لوگ مجھے طعنوں کی گولیوں سے مار دیتے۔''

میں ان دنوں ان پختونوں کے معاشرتی رویوں کو، ان کی ثقافتی روایات کو بخوبی جانتا تھا۔ پھر بھی مجھے ضیغم خان کو صدمہ پہنچانے میں بہت لطف آ رہا تھا۔

''یہ تم نے ابھی ابھی کیا کہا تھا کہ؟'' میں نے کہا۔ ''کہ اس دنیا کا سارا نظام اللہ کا بنایا ہوا ہے؟''

''اس میں کیا شک ہے؟'' ضیغم خان بولا۔

''اور تم نے یہ بھی کہا تھا کہ دنیا میں تفریق خود اللہ نے ڈالی ہے؟'' میرا لہجہ سوالیہ تھا۔

ضیغم خان نے غور سے مجھے دیکھا۔

''ہاں کہا تھا، اور درست کہا تھا۔'' ضیغم خان نے کہا۔ ''یہ میرا ایمان ہے۔''

''تو پھر تمہارے ایمان میں یہ بھی ہوگا۔'' میں نے بات جاری رکھی۔ ''کہ اس دنیا میں ہونے

Scanned with CamScanner

ہے، عمل اور محنت پر یہاں تک کہ ہر چیز پر۔ مقدر ہی کا حکم چلتا ہے۔"

میرے مسلسل سوال کرنے پر ضیغم خان حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا کہ میں نے یہ کیا موضوع چھیڑ دیا ہے۔

"بالکل، بالکل!" وہ تیزی سے بولا۔ "مقدر وحدہٗ لاشریک ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔"

"تو پھر تم [illegible] کے یہ بادل اور ہوا اس کا حکم کیوں نہیں مانتے؟"

میرے سوال پر ضیغم خان کے چہرے پر کچھ غصہ سا آ گیا۔

"کیا کہنا چاہتا ہے تو؟" اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

"بادل جب برستے ہیں تو وہ سب دیکھتے ہیں کہ [illegible] میں نے [illegible] ہیں کہ وہ کسی زمیندار کی بہت بڑی اراضی پر برس رہے ہیں یا کسی کسان کی چھوٹی سی کھیتی پر۔ [illegible] تمہارے باغیچوں میں بھی اترتی ہے اور کیمپ کے بچوں [illegible] کسی [illegible] تک کوئی فرق نہیں [illegible] کے کنارے پر کسی غریب نے جو جھونپڑی ڈال رکھی ہے۔ شبنم کے قطرے پھولوں کی پتیوں پر بھی اترتے ہیں اور مٹی میں پڑے ہوئے خشک تنکوں پر بھی۔ [illegible] فرق نہیں ہے ضیغم خان۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا [illegible]"

ضیغم خان کا جملہ اب میں نے کاٹ دیا۔

"دیکھو ضیغم خان... فطرت کی قوت نے اپنے مظاہر سب کے لیے یکساں رکھے ہوئے ہیں۔ بچہ چاہے [illegible] میں پیدا ہو یا [illegible] میں، روتے ہوئے ہی پیدا ہوتا ہے۔ تم نے کسی [illegible] کے خون کی بات کی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان گورا ہو یا کالا، [illegible] کی طرح [illegible] اس کے خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس دنیا کے کسی [illegible] جب بھی کوئی انسان روتا ہے تو آنسو کے قطرے پانی کے قطروں جیسے ہی شفاف ہوتے ہیں۔ [illegible] آنسو صاف پانی کی طرح شفاف ہوتے ہیں۔ [illegible] انسانیت [illegible] کوئی [illegible] نہیں۔ فرق [illegible] نظام آدمیوں کا بنایا ہوا ہے..."

ضیغم خان کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں چمک سی آئی۔

"ادھر جنگل میں" ضیغم خان نے مسکراتے ہوئے کہا، "ادھر جنگل میں" اس نے زیتون کے جنگل کی سمت اشارہ کیا۔ "رات کے وقت چیتے اور بھیڑیے مرغیوں اور خرگوشوں کو چیر پھاڑ دیتے ہیں، مرغیاں اور خرگوش انھیں کیوں نہیں چیر پھاڑ دیتے۔ یہ فرق کس نے ڈالا ہے؟"
ضیغم خان نے پھر ایک بار بہت مضبوط دلیل پیش کی۔

"فطرت کے مظاہر شدید بھی ہیں لطیف بھی۔" میں نے جواب دیا۔ "فطرت کے شدید مظاہر ہی مکمل زندگی نہیں ہیں۔ لطافت کا بھی ایک روشن وجود ہے اور زندگی کا مقصد ہی شدت اور کثافت سے لطافت کی سمت جانا ہے۔ نامکمل قوت کو مکمل کہنا حماقت ہوگی۔ نامکمل تعریف کو سچائی سمجھ لینا کہاں کی عقلمندی ہوگی؟"

"یہ مشکل باتیں میرے پلے نہیں پڑتیں۔" ضیغم خان نے کہا، "اور نہ ہی میں ان چکروں میں پڑنا چاہتا ہوں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اللہ نے دنیا میں کسی کو حاکم بنایا ہے، کسی کو غلام۔ کسی کو عزت دی ہے کسی کو ذلت۔ اور وہ جو ابھی تو نے بادل، ہوا اور پانی کی بات کی تھی"

"آگ کی بات کرنا میں بھول گیا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا، "جلانے پر آتی ہے تو یہ نہیں دیکھتی کہ کسی غریب کا کچا مکان ہے، دیمک زدہ شہتیر ہیں یا کسی بادشاہ کا محل اور صندلی دروازے اور کھڑکیاں ہیں... سب کچھ بھسم کر دیتی ہے۔"

"اس کا بھی جواب ہے میرے پاس۔" ضیغم خان نے جملے پر زور دے کر کہا۔ اس کی آنکھیں ہنستی تھیں۔ "اللہ نے یہاں بھی فرق ڈالا ہے۔ تو نے کہا تھا کہ بادل یہ نہیں دیکھتے کہ وہ بڑے زمیندار کی جاگیر پر برس رہے ہیں کہ غریب کے کھیت پر۔ اس میں بھی فرق ہے۔ تیری عقل وہاں تک نہیں پہنچی۔ سن، اللہ نے زمیندار کو مربعے دیے ہیں، اس کی وسیع اراضی پر بادل زیادہ برستے ہیں، غریب کو چھوٹا سا کھیت دیا ہے، وہاں پانی کم برستا ہے۔ وہ جسے جتنا چاہے دیتا ہے، اس سے جتنا دینا ہوتا ہے اتنا ہی دیتا ہے۔ آئی بات تیری عقل میں؟"

"تو کیا اس زمین پر" میں نے ضیغم خان کی دلیل کو رد دلیل سے کاٹتے ہوئے کہا، "کیا اس زمین پر فرشتوں نے آ کر زمین کی پیمائش کی تھی؟"

Scanned with CamScanner

"میں نہیں جانتا۔" ضیغم خان نے کہا۔ "جس کو طاقت ملی ہے، اس کی رحمت بھی ہے۔"

"تو یہ طاقت اس بے حسی سے ختم کیا جائے۔ دوسروں کا حق چھینا جائے اور پھر اسے اللہ کی مرضی قرار دے دیا جائے؟" میں نے کہا۔

"یہ میں نہیں جانتا۔" ضیغم خان نے تیزی سے کہا۔ "میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میرے اللہ نے مجھے اونچا درجہ دیا ہے۔ میں اس کا شکر گزار ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ پکا مسلمان۔ مجھ پر میرے اللہ کا کرم ہے۔ میں اس کا حکم مانتا ہوں۔ نماز پڑھتا ہوں، روزے رکھتا ہوں، حج کر چکا ہوں۔ زکوٰۃ دیتا ہوں۔ میرے اللہ نے مجھے آقا بنایا ہے اور مزدوروں کو میرا محتاج بنایا ہے۔ میں ان کے لیے روزی کا وسیلہ ہوں اور مجھے وسیلہ میرے اللہ نے بنایا ہے۔ میرے اللہ نے مجھے بہت دولت دی ہے۔ جو میں کھاتا پیتا ہوں وہ مجھے میرے اللہ نے دیا ہے۔ جو یہ لوگ کھا رہے ہیں، اللہ نے ان کے مقدر میں یہی لکھا ہے۔ یہ بات تمہیں بہت بری لگی ہوگی۔" ضیغم خان نے میری آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ "لیکن یہی دنیا کا دستور ہے، نظام ہے، جو اللہ نے بنایا ہے۔ یہی میرا ایمان ہے اور یہی میرا دین بھی ہے کہ جو جیسے اللہ نے قائم کیا ہے، ٹھیک ہے۔ میں اچھا آدمی نہیں ہوں۔" ضیغم خان نے پہلو بدلا۔ "میں شراب پیتا ہوں، اور بھی بہت سی برائیاں ہیں مجھ میں۔ وہ میرا رب ہے، پروردگار ہے، بڑا رحم کرنے والا، بخش دینے والا۔ میں جس نبی کی امت میں ہوں، اس کا وعدہ ہے کہ وہ امت کو بخشوائے گا۔" ضیغم خان نے جیسے فیصلہ سنا دیا۔

"تو کیا..." میرے لہجے میں تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔ "تو کیا یہ غریب لوگ کسی اور نبی کی امت میں ہیں؟" مرید کی جھجک ایک بار پھر مجھے سینے میں محسوس ہوئی۔ "کیا یہ غریب لوگ مسلمان نہیں ہیں؟ کیا یہ اللہ کا حکم نہیں مانتے؟ کیا یہ اس لیے غریب ہیں کہ اللہ نے انہیں غریب بنایا ہے؟ کیا یہ اللہ کا غضب ہے؟ اگر ہے تو کیوں ہے؟ کیا ان پر رحم کرنے والا اور انہیں بخشنے والا کوئی نہیں ہے؟ ضیغم خان صاحب! یہ کیسا ایمان ہے آپ کا؟"

میرے جملے پر ضیغم خان کی آنکھیں سکڑیں، چہرے پر شکنیں پڑ گئیں۔

"ہوں..." اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ "ایک بات تو بتاؤ۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کیا تو مسلمان ہے؟" میں ضیغم خان کی طرف سے اس سوال کا منتظر نہیں تھا۔

"میں صرف ایک انسان ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو یوں کہہ نا" وہ تیزی سے بولا، "تو مسلمان نہیں ہے"

"تو کیا مسلمان انسان نہیں ہوتے؟" میں نے کہا اور ضیغم خان سٹپٹا گیا۔

"یہ میں نہیں جانتا۔" اس کے لہجے میں بہت تیزی سی آ گئی۔ "یا تو... تو مسلمان ہے یا کافر ہے — بس!" ضیغم خان نے اونچی آواز میں غصے سے کہا۔

"دیکھو ضیغم خان،" میں نے آہستہ سے کہا، "میری ایک بات سن لو، پھر میں کچھ نہیں بولوں گا۔"

"کیا؟" ضیغم خان کی آواز میں کپکپاہٹ سی نمودار ہوئی۔ یہی کپکپاہٹ اس کے بدن پر بھی ظاہر ہو رہی تھی۔ شاید اسے غصے کا اثر تھا جسے وہ دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"دیکھو ضیغم خان،" میں نے کہنا شروع کیا، "ہم یہاں دو بیٹھے ہیں۔ ایک تو ایک میں۔ چلو تمہارے مطابق تم ایک سچے مسلمان ہو اور میں کافر ہوں۔"

میرے اس جملے پر ضیغم خان کے ہونٹ کپکپائے، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

"چلو ہم تصور کرتے ہیں،" میں نے کہا، "ہم تصور کرتے ہیں کہ یہاں چارپائیاں بچھی ہوئی ہیں اور ان پر دس لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک عیسائی ہے، ایک بدھ کا ماننے والا، ایک ہندو ہے ایک سکھ ہے ایک یہودی ہے، ایک آتش پرست، ایک قبائلی بت پرست ہے، ایک کمیونسٹ ہے۔ پھر یہاں سائبیریا اور الاسکا کا اسکیمو، افریقی بش مین بھی بیٹھا ہے جسے اپنے مذہب کا بھی علم نہیں ہے۔ یہ سب یہاں بیٹھے ہیں۔ جب تک ان کے ساتھ ان کے عنوانات لگے ہوئے ہیں، جب تک وہ ان ٹائیٹلز کے پیچھے ہیں، وہ الگ الگ ہیں۔ ٹھیک ہے کہ نہیں؟"

"ہیں،" ضیغم خان نے بات سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کی کپکپاہٹ ختم ہو گئی۔

"یہ سب عنوانات، سب ٹائیٹلز ہٹا دو، باقی سب کیا رہ جائیں گے؟"

"کیا رہ جائیں گے؟" ضیغم خان نے میرا سوال دہرایا۔

"صرف انسان،" میں نے کہا۔ "وہ صرف انسان رہ جائیں گے۔ جب تک وہ اپنے اپنے

عنوانات کے ساتھ ہیں۔ تم بھی، میں بھی — جب تک ہمارے ساتھ یہ ٹائٹل لگے ہوئے ہیں، ہم جدا جدا ہیں۔ اور ایک ستم ظریفی یہ ہے کہ ان میں سے ہر کوئی اپنے مذہب کو، اپنے دین ہی کو سچا سمجھتا ہے، اور چاہتا ہے کہ سب اس کا مذہب، اس کا دین قبول کرلیں، کیونکہ وہ خود کو راہ راست پر اور دوسروں کو گمراہ سمجھتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک خود کو حق پر اور دوسروں کو گمراہ سمجھتا ہے۔ ہر ایک کا یہی گمان ہے، یہاں تک کہ جن کو اپنے مذہب کا بھی علم نہیں وہ بھی اپنے آباؤاجداد کے طور طریقوں ہی کو درست مانتے ہیں۔ یہ جو تم سرخوں کی بات کر رہے تھے، یہ کمیونسٹ بھی صرف اور صرف اپنے نظریے ہی کو درست سمجھتے ہیں۔ خود کو آزاد اور باقی تمام دنیا کو غلام سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سب کمیونسٹ ہو جائیں۔ یہ بھی انسانوں کے گروہ سے الگ ہیں۔ اسی طرح طاقتور، کمزور، امیر غریب سب عنوانات ہیں۔ حاکم محکوم، آقا غلام، یہ سب ٹائٹلز ہیں۔ شاید کوئی یہاں یہ دلیل دے کہ صحت مند اور بیمار بھی کیا عنوانات ہیں؟ ہاں ہیں، دکھی بھی اور سکھی بھی، سب عنوان ہیں۔ صحت مند بیمار ہو سکتا ہے، بیمار صحت مند ہو سکتا ہے۔ دو کمزور مل کر ایک طاقتور کو کمزور بنا سکتے ہیں۔ عنوان بدلتا ہی رہے گا کیونکہ یہ دنیا کا نظام آدمیوں کا بنایا ہوا ہے۔ ''میں پل بھر کے لیے رکا۔ ''میں انسان ہوں... صرف انسان...''

اچانک سیٹھ خان پر چھائی ہوئی ناگواری یکسر ختم ہو گئی۔ اس کے چہرے پر سکون سا نمایاں ہوا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آ گئی۔

''اب سمجھا۔ میں سمجھ گیا۔'' وہ تیزی سے بولا۔ ''تو یہ سمجھتا ہے کہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب برابر ہیں؟ مرزا، یہی ہے نا... تو باچا خان کی پارٹی کا بندہ ہے۔ پر وہ تو مذہب دار ہے۔''

''یہ مصیبت ہے۔'' میں چڑ کر چیخا۔ ''میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں کسی باچا خان کی پارٹی کا بندہ نہیں ہوں۔ میری زندگی گزارنے کا اپنا راستہ ہے۔ یہ راستہ میرے ذہن میں بہت روشن ہے اور میں اسی پر چلوں گا۔ میں تو کسی کے بنائے ہوئے رستے پر کسی کے پیچھے نہیں چلتا۔ آج تک اس دنیا میں جتنے راستے بنائے گئے ہیں، میرا راستہ سب سے جدا ہے۔ لیکن اگر سب، اسی روشن خیالی سے کام لیں، تنگ نظری چھوڑ دیں، اپنے انسان ہونے کا شعور حاصل کر لیں تو میرا راستہ خود بخود سب کا راستہ بن جائے گا۔''

میں ضیغم خان سے خاصا چڑ چکا تھا۔ ضیغم خان بھی میری اس کیفیت کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ غصے سے اٹھا۔ دو قدم جیپ کی سمت جا کر رکا، مڑا۔

"دیوانہ" وہ غصے سے بولا۔ "تو تو پاگل ہے... دیوانہ ہے۔ سویرے سویرے میرا مغز بھی خراب کر دیا۔"

وہ غصے سے بولتا ہوا جیپ کے قریب گیا۔

"جا کہیں جا کر دماغ کا علاج کروا!"

وہ بڑبڑاتا ہوا جیپ میں بیٹھا، جیپ اسٹارٹ کی، ریورس کی، جیپ نے تیزی سے نیم دائرہ بنایا اور یوں گلی جاگیر کی طرف دوڑی جیسے جیپ بھی شدید غصے میں ہو۔

"میں دیوانہ ہوں؟" میں نے تلخی سے سوچا۔ "ہاں میں دیوانہ ہوں۔ مجھے بھی یہ دیوانگی بہت اچھی لگتی ہے۔ میں دیوانہ ہوں، باقی سب فرزانے ہیں۔ وہ جو خود کو دوسرے انسانوں سے برتر سمجھتے ہیں۔ وہ جو اپنے حصے کے دکھ دوسروں کی جھولیوں میں ڈال دیتے ہیں اور دوسروں کے سکھ چھین لیتے ہیں۔ وہ جو استحصال کرتے ہیں۔ وہ جو اپنے جیسے انسانوں کو کبھی طاقت سے، کبھی عیاری سے لوٹتے ہیں۔ کبھی مذاہب کے لبادے پہن کر، کبھی نظریاتی مکاری کی نقاب پہن کر، وہ جو دلدل کی جونکوں کی طرح، ہم جنسوں کا خون چوستے ہیں۔ سب فرزانے ہیں، سب فرزانے ہیں۔"

مجھے اپنے قریب کسی کا احساس ہوا۔ محمد خان میرے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پیلو ہی کی مسواک تھی۔

"چلا گیا؟" محمد خان نے کڑواہٹ سے کہا۔ "انگریزوں کے ساتھ رہ رہ کر لاٹ صاحب بن گیا ہے — برابری کا پتر... خوچہ... خر دماغ۔"

محمد خان نے منہ میں بھرا مسواک کا پانی دور ایک سمت تھوکا، پھر مسواک کو بھی گھما کر جھیل کی سمت پھینکا۔ اس کے ذہن میں ضیغم خان کے کہے ہوئے جملے کا زہر خاصا پھیل چکا تھا۔ خیمے کے قریب پڑے پانی کے گھڑے سے، جسے وہ جھیل سے بھر لایا تھا، اس نے پانی مٹی کے پیالے میں انڈیلا اور کئی بار رخسار پھلا پھلا کر کلیاں کیں۔ پھر وہ خیمے کے اندر گیا۔ خیمے کے اندر، اس کی آواز بلند ہوئی: "پراٹھے بھی ٹھنڈے ہو گئے... خوچہ... خر دماغ۔"

Scanned with CamScanner

11

ناشتے کے بعد میں ریسٹ ہاؤس سے اس جھیل سے اٹیچ کرنے والی جگہ کے ساتھ چلتے چلتے درختوں کے مصنوعی جنگل کے سامنے اس کھلی جگہ پر آ گیا جہاں رات کو بیٹھے ہوئے لوگ باتوں میں مگن تھے۔ جنگل کے اندر سے ابھی تک پرندوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"پٹھان لڑکے صرف اسی صورت میں ضیغم خان کے پنجے سے نجات حاصل کر سکتے ہیں اگر میں بھائی کو سب کچھ بتا دوں،" میں نے سوچا۔ "میں بھائی کو بتا دوں گا کہ کیمپ میں لڑکوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔"

میں کھلی جگہ سے ہو کر شمال مشرق میں درختوں کے سامنے، گہرے سبز رنگ کی ڈالی میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں کی سمت چلا گیا۔ میری ذہنی حالت اس وقت اس بچے جیسی ہو چکی تھی جو شکایت کرنے کی تیاری کر رہا ہو۔ کنول کے پھولوں پر اب وہ چھوٹے چھوٹے پرندے بھی نہیں تھے جنہیں دیکھ کر مجھے اپنے وجود کا کوئی احساس ہوا تھا۔ اتنی بڑی کائنات میں اتنا چھوٹا لیکن مکمل وجود — ایسا وجود جو اڑتے ہوئے، ہوا میں تیرتے ہوئے، ہوا ... سے ناآشنا کر دے، اتنا چھوٹا لیکن اتنا مکمل۔ کنول کے پھولوں پر بہت سی تتلیاں اڑ رہی تھیں۔

"درختوں کے جنگل میں بہت سے چیتے ہوں گے،" میں نے تصور میں جنگل سے دور جھانکا۔ اس کے ساتھ ہی مرچی کی کڑواہٹ پوری تلخی کے ساتھ ابھری۔ شکایت لگانے کا جذبہ کہیں چھپ سا گیا۔ میرے ذہن میں تلخی سی آ گئی۔

"خاموش رہنا تو مجرمانہ بزدلی ہو گی،" میں نے سوچا۔ "میں بھائی سے کہوں گا کہ ضیغم خان کو ان کے ظلم سے روکنا ایک انسانی فرض ہے۔ ہمیں یہ فرض ادا کرنا چاہیے۔ میں بھائی سے کہوں گا کہ وہ اگلے برس کا ٹھیکہ ضیغم خان کو نہ دیں۔ وہ ڈسٹرکٹ پر ... کے سربراہ ہیں۔ ان کی رضامندی کے بغیر ضیغم خان ٹھیکہ لے ہی نہیں سکتا۔ وہ لینڈ کمشنر ... ہیں۔ میں ان سے کہوں گا کہ ضیغم خان کی ہمیشہ کے لیے چھٹی کر دیں۔"

میں کنول کے پھولوں کے قریب رک گیا۔

''آخر اور ٹھیکے دار بھی تو ہوں گے۔ اس علاقے کے رہنے والے مقامی ٹھیکے دار بھی تو ہوں گے...''

مجھے فتح جنگ کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا مہتاب دین یاد آیا جس کی ایک آنکھ پھوٹی ہوئی تھی اور جسے سب مذاق میں ''تابوکانا'' کہتے تھے۔ مہتاب میں شاید کسی بات پر برا ماننے کی حس ہی نہیں تھی۔ وہ ہنستا رہتا تھا۔ مہتاب دین کمپنی کے بہت چھوٹے چھوٹے کام ٹھیکے پر لے کر ضیغم خان جیسے گھنے درخت کے نیچے ایک کمزور پودے کی طرح اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔

''میں بھائی سے کہوں گا کہ وہ اگلے سال کا ٹھیکہ مہتاب دین کو دے دیں۔''

جہاں پانی سرکنڈوں میں گم سا ہو جاتا ہے، وہاں ایک بڑا سا بگلا نظر آیا۔ نہ جانے کس چیز پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی لمبی لمبی ٹانگیں پنجوں سے کچھ اوپر تک پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ میری نگاہیں کنول کے پھولوں سے نیچے لمبی ڈنڈیوں کی سمت گئیں جو جھیل کی گہرائی میں چھپی دلدل تک جاتی ہیں، جہاں ان کی جڑوں سے کیچڑ لپٹا ہوتا ہے۔

''ٹھیکہ ملنے پر لڑکے ضیغم خان کے چنگل سے آزاد ہو جائیں گے۔ وہ انھیں آزاد کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ یہاں کوئی ورکنگ بھی نہیں ہے۔ میں مہتاب دین سے کہوں گا کہ ان پٹھان لڑکوں ہی کو کام پر لگائے۔ مجھے یقین ہے کہ اسی فی صد مزدوری ان کے ماں باپ کو بھجوا کر بھی انھیں اچھی خوراک دی جا سکتی ہے۔ مہتاب دین اچھا آدمی ہے۔ وہ میری بات ضرور مانے گا۔''

میں نے جیسے فیصلہ کر لیا کہ ضیغم خان کی چھٹی کرا کر ہی دم لوں گا۔ اس فیصلے نے مجھے ہر شے سے بے نیاز کر دیا۔ میں تیزی سے واپس خیمے کے پاس آیا اور بے چینی سے بھائی کا انتظار کرنے لگا۔

تقریباً ساڑھے نو بجے جب بھائی بکس کار پر کھوڑ سے تنازعہ ڈیم پہنچے تو ان کا موڈ بے حد خراب نظر آیا۔

''یقیناً وہ کلی جاگیر میں ضیغم خان سے مل کر آ رہے ہیں۔ اور ضیغم خان نے میرے خلاف بہت سی باتیں کی ہوں گی۔'' میں نے سوچا۔

ریسٹ ہاؤس کے قریب بکس کار سے اتر کر انھوں نے بکس کار کے پیچھے بیٹھے میل ڈرتے، بیرہ محمد احمدی اور فتح خان جیسے کو کچھ ہدایات دیں۔ ڈرائیور خضر سے کچھ کہا۔ وہ بکس کار کو کیمپ کی

طرف لے گیا۔ بھائی میرے پاس آئے۔

"رات کیسی گزری؟" انھوں نے بہت ملائم لہجے میں کہا۔

"رات میں نے تمہیں بے چین دیکھا" میں بھول گیا کہ میں نے محمد خان کو یقین دہانی کرائی ہے کہ میں اس کے چھت پر سونے کی بات کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ بھائی بہت بیزار سے لگ رہے تھے۔ وہ آہستہ سے چارپائی پر بیٹھے۔

"ضیغم خان سے جھگڑنے کی کیا ضرورت تھی؟" انھوں نے کہا۔

"میں نہیں جھگڑا" میں نے جواب دیا "بات صرف تھی۔"

"معلوم ہے مجھے" بھائی نے کہا۔ "کیا ضرورت تھی پٹھان لڑکوں کے ساتھ مرغی چرانے کی؟"

میں پریشان سا ہو گیا۔ بھائی نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"دیکھو" انھوں نے سمجھانے کے انداز میں کہا "ضیغم خان تیل کمپنی کا سب سے پرانا ٹھیکیدار ہے۔ انگریز افسر اس سے بہت خوش ہیں۔ وہ ہر کام وقت پر کرتا ہے اور اس کا کام اعلیٰ کوالٹی کا ہوتا ہے۔ وہاں" انھوں نے مشرق کی سمت اشارہ کیا "جہاں پتھریلی کچی سڑک پہاڑیوں اور برساتی نالوں سے ہوتی ہوئی جرنیلی روڈ تک چلی جاتی ہے اور پھر وہاں سے راولپنڈی کی طرف دیہاتی موڑ کی طرف چلی جاتی ہے۔" وہاں موڑ کا وہیں کمپنی کے بڑے انگریز افسر ضیغم خان سے بہت خوش ہیں۔ تم میری پوزیشن نہیں سمجھتے۔ مجھے ضیغم خان سے بہت بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔ انگریز افسروں کا حکم ہے کہ ہر سال ٹھیکہ ضیغم خان کو دیا جائے۔ وہ بہت طاقتور آدمی ہے۔"

میرے ذہن میں میرے سارے سوچے ہوئے منصوبوں کو بھائی نے تازہ مایوسی کی دلدل میں ڈبو دیا۔ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ضیغم خان کا چوڑا منہ کسی بھوت کی طرح میرے سامنے کھلا سا تھا۔

"میں ضیغم خان کو دشمن نہیں بنا سکتا" بھائی نے آہستہ سے کہا۔ "تم شاید یہ سمجھ رہے ہوتے ہو، مجھے بھی معلوم نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کیمپ کے مزدوروں سے بہت غیر انسانی سلوک کرتا ہے۔ وہ انھیں کیڑے مکوڑے سمجھتا ہے۔ لیکن مجھے اس سے کیا۔ اس کے عمل اپنے ہیں۔ اس کے ساتھ

Scanned with CamScanner

ہیں۔ مجھے تو صرف کمپنی کا کام دیکھنا ہے۔ جس روز اس کا کام غیر معیاری ہوگا، میں اس کی گردن پکڑوں گا۔ وہ کیا کرتا ہے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ ان مزدور لڑکوں سے متعلق بہت حساس ہے۔ اس معاملے میں وہ ایک جملہ سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ مگر اس نے کچھ غلط کیا ہے تو میری خاطر۔" بھائی نے بہت سنجیدگی سے کہا جس میں رنج نمایاں تھا۔ "وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ غصے میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ جانتے ہو اس نے مجھے کیا کہا ہے؟ اس نے مجھے کہا ہے کہ میں تمہیں کسی ذہنی امراض کے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں یا تمہیں پاگل خانے میں داخل کرا دوں۔"

میں خاموشی سے بھائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ محمد خان قریب کھڑا سب سن رہا تھا۔ وہ مڑ کر دوبارہ ریسٹ ہاؤس کے پیٹرول پمپ کی طرف چلا گیا، بغیر قدم اٹھائے۔ بھائی کے چہرے پر رنج نمایاں تھا۔

"میں نہیں چاہتا کہ تم کسی مسئلے سے الجھو، یا میرے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کرو۔" انھوں نے آہستہ سے کہا۔ "یا میں امید رکھوں کہ آئندہ تم میرے پیمانے سے غرض رکھو گے؟ میں تمہیں کبھی نہیں روکتا، لیکن مجھے امید ہے کہ تم آئندہ ضیغم خان کے معاملات میں دخل نہیں دو گے۔"

بھائی آہستگی سے اٹھے اور پیدل ہی پٹھان لڑکوں کے کیمپ کی طرف چلے گئے۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں جنگل کے ساتھ درختوں کے جنگل میں، بھیڑیوں کے نرغے میں ہوں اور وہ مجھ پر غرا رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ اذیت کے اس احساس سے میں پہلے بھی کئی بار گزر چکا ہوں جو پورے وجود پر بے حسی بن کر اترتا ہے، لیکن اترنے سے پہلے ذہنی کیفیت کو ایسے بے حسی کر دیتا ہے جیسے کوئی دماغ کے تھپیڑے مارے ہوں۔ یہ احساس اس وقت شدید تر ہو کر اترتا ہے جب کسی صداقت کا یقین بھی دل و دماغ میں روشن ہو اور ہر طرف سے مخالف قوتیں جھٹلاتے ہوئے، ذہنی اذیت میں مبتلا کر رہی ہوں۔ یہ احساس اذیت کا یہ دور اور احساس ذہن، دل اور بدن کو جلا دیتا ہے اور سب کچھ ہوا بن کر آتش کے شعلوں میں چھپانا شروع کر دیتی ہے۔ پھر اس کے بعد مجھ پر بے حسی طاری ہو جاتی ہے پتھر کی طرح۔ پتھر کو بھی شاید بے حسی کا احساس کسی مرتعش لمحے میں ہوتا ہوگا... میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

12

وہ چاشت بے حد تاریک تھی۔ مجھے تنہائی کا شدید ترین احساس ہوا۔ براہیم آیا اور محمد خان اس کے ساتھ چلا گیا۔ میں جھیل کے قریب پہاڑی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک چھوٹے سے چبوترے پر جا بیٹھا۔ ہر شے دھندلی دھندلی سی تھی۔ میں جھیل کی سمت یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں ایک مورتی ہوں جسے چبوترے میں نصب کر دیا گیا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ میری چھاتی پر دھرے پتھر میں شگاف نمودار ہوا۔

"کیا ہو گیا [illegible] کیا ہوا [illegible] میرے دل میں اذیت کا احساس شعلوں کی طرح پلٹا اور [illegible] گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ [illegible] والے میرے بھائی کی حالت میں ملازمت کر رہے تھے۔"

بھائی کے ہاتھ سے بے اختیار ہونے کے بعد وہ اس قدر بے اختیار ہونے سے جو ایک تاریک احساس میرے دل پر چھا گیا، اس میں میں نے دیکھا کہ جھیل پر میرے سامنے ایک بہت بڑا بگلا، سفید پر پھیلائے، اپنی گردن کو آگے کی سمت اور جسم کی نازک ٹانگوں کو پیچھے کی سمت اڑائے ہوئے، جیسے سوچ میں غرق ہو۔ دور کسی مورت کا پہاڑی سلسلہ، پہاڑی ڈھلوانیں، ڈھلوانوں پر چھپے ہوئے جھاڑیوں اور کیکروں کے درخت، درختوں اور جھاڑیوں کے نیچے [illegible] میں چھپے ہوئے درندے، سوئے ہوئے چیتے، [illegible] سہمے ہوئے ہرن اور خرگوش، تیتروں کو پکڑتے ہوئے [illegible] سے نیچے [illegible] اڑتے ہوئے [illegible] ہوئے [illegible] اور [illegible] ہوئے [illegible] درختوں پر گھونسلے بناتے پرندے، جھاڑیوں کے نیچے کنڈلی مارے [illegible] ملتی جلتی [illegible] درختوں کی شاخوں پر تتلیاں [illegible] جھیل کے کنارے، درختوں پر مسلسل [illegible] جھیل کے کنارے [illegible] ہرے رنگ کی کائی، پانی پر تیرتے ہوئے بڑے بڑے پتے، کنول کے پھول، [illegible] مرغابیاں، مینڈک، کوے، [illegible] مچھلیاں [illegible] چھوٹے چھوٹے پرندے، [illegible] سب کچھ تصور میں [illegible] تھا [illegible]

میں شکست کے اس احساس سے ناواقف نہیں تھا۔ میں اس احساس سے پہلے بھی دوچار ہو چکا تھا۔ مجھے بلکسر کا سائیں موسم یاد آیا جس نے پیر مدرت شاہ کے بیٹے پیر کوثر شاہ کی دھوپ میں جبر وتشدد اور ذلت بھرے ماحول سے نکلنے کی ہامی بھرنے کے باوجود دھوک کو نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے ماڑی گاؤں کی میاری[16] زینب یاد آئی جس کے ساتھ ملک کے بیٹے نے کھیتوں میں زنا بالجبر کیا اور جس کے ڈیرے پر لگی عدالت میں مجھے زینب کے باپ رمضان میار کا ساتھ دینے پر پیر کے ملنگوں نے اٹھا کر ڈیرے سے باہر پھینک دیا تھا۔ شکست کا یہ احساس، جو پرائمری سکول میں دینیات کے ماسٹر کے ڈنڈے کی شدید مار سے شروع ہوا تھا، بار بار نئی جون اور نیا روپ لے کر آتا ہے۔

میری نگاہیں کیمپ کی سمت گئیں جہاں پٹھان لڑکے جوانی کی اس تپتی چاشت میں تیز دھوپ میں، پتھریلی کچی سڑک پر اوندھے ہو کر کدالیں چلا رہے تھے، بیلچوں پر پتھر اور مٹی اٹھا کر گدھوں پر رکھی کھلی، دونوں جانب سے کھلی، بوریوں میں ڈال رہے تھے۔ گدھوں پر سوٹیاں برسا رہے تھے، گالیاں دے رہے تھے، شور مچا رہے تھے۔ مجھے ایک بار پھر حلق اور سینے میں مرچی کی سوزش کا احساس یوں ہوا جیسے گلے سے سینے تک کوئی خراش پڑ گئی ہو۔

"آخر ہر بار مجھے ہی شکست کیوں ہوتی ہے؟" میں نے کڑواہٹ سے سوچا۔ "ہر بار مجھے ہی کیوں ذلت جھیلنا پڑتی ہے؟ ہر بار مجھے ہی ہزیمت کا سامنا کیوں کرنا پڑتا ہے؟ مجھے اپنی صداقت کا علم یقینی ہے۔ میں ظلم کو ظلم کہتا ہوں، جھوٹ کو جھوٹ کہتا ہوں، باطل کو میں ہمیشہ باطل ہی قرار دیتا ہوں۔ مداہنت نہیں کرتا۔ ظلم اور باطل کو مٹانے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ پھر بھی ہر بار مجھے ہی پسپائی ملتی ہے۔"

میرا ایک بار پھر جی چاہا کہ کوئی میرے سامنے ہو جسے میں دیکھ سکوں۔ میری نگاہیں اوپر پھیلی ہوئی نیلی فضا کی سمت گئیں۔

"اے روحِ فطرت، تجھے اپنی الوہیت کی قسم، ایک بار مجسم ہو کر میرے سامنے آ۔ میں تجھ سے بس اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں ہر بار حسن اور سچائی کو کیوں شکست ہوتی ہے؟ کس لیے؟ آخر کس لیے؟"

---

[16] میار [illegible] میاری [illegible]۔

جھیل کی سطح پر سورج کی کرنیں پوری طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ ہوا کے جھونکوں سے جھیل کے پانی پر ارتعاش نمایاں تھا۔ لہریں بار بار چمک جاتی تھیں۔ ہوا میں تپش بڑھ رہی تھی۔ درختوں کے تنوں اور ٹہنیوں سے چپکے جھینگر، ان کے پروں سے اٹھتی ہوئی ریں ریں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ کچھ دور زیتون کے درختوں پر فاختائیں اڑ اڑ کر بیٹھ رہی تھیں۔ سرکنڈوں کی جانب اوپر فضا میں سفید چیلیں اڑ رہی تھیں۔ مغرب کی سمت میں نے کچی سڑک پر ضیغم خان کی جیپ کو آتے دیکھا۔ میں نے منہ پھیر لیا اور سرکنڈوں کے سامنے گہرے سبز رنگ کی کائی میں کنول کے پھولوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ گلابی پھولوں میں اکا دکا دودھیا سفید کنول بہت چمکتا نظر آ رہا تھا۔ پھولوں پر شہد کی مکھیوں کے ساتھ ساتھ تتلیاں بھی اڑ رہی تھیں۔ پھر میری نظریں کھیری موڑ کے پہاڑی سلسلے کی چوٹیوں کی سمت چلی گئیں۔ دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ فطرت کی شدید قوت ... قوت شر ... مجسم ہو کر میرے سامنے آئے۔ میں اس سے دو دو ہاتھ تو کر لوں۔

"میں جانتا ہوں کہ اس دنیا پر تیری حکومت ہے۔ اس زمین پر قوت خیر کا نہیں، تیرا راج ہے۔ تو قوت شر ہے۔ میں جانتا ہوں تیرے کچھ تقاضے بھی ہیں۔ اس دنیا میں جو کوئی تیرے تقاضوں کو پورا کرتا ہے تو اسے کامیابی دیتی ہے۔ تو اسے عزت، دولت، شہرت اور ہر قسم کا آرام اور آسائش فراہم کر دیتی ہے، جو تیرا باغی ہوتا ہے اور تیرے تقاضے پورے نہیں کرتا، تو اسے بے حد تکلیفیں دیتی ہے۔ اس کے حصے کے سکھ چین چھین کر اپنے ماننے والوں کی مدد کرتی ہے۔ تو تاریک قوت ہے۔ کوئی تجھے ابلیس کہتا ہے، کوئی عزازیل، کوئی شیطان کہتا ہے ... میں تیری اصلیت سے واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تو فطرت کی ... وسعت میں تاریک ... سایہ ہے۔ کائنات میں یہ زمین تیرا مسکن ہے۔ تو ایسا سایہ ہے جو فطرت کی ... روشنی کی راہ ازل سے روک رہا ہے۔ اس لطیف روشنی کی راہ جس سے تو خود خوفزدہ ہے۔ ... یہ خوف تیرے اندر خود تیرا اپنا ہے۔ میں تیرے ہتھیاروں کو بھی جانتا ہوں۔ جبلتیں تیرے ہتھیار ہیں۔ تو ایسی قوت ہے جو ... سے تقاضے پیدا کرتی ہے۔ تو اپنا جال جبلی تقاضوں کے مضبوط تاروں سے بنتی ہے اور اس دنیا میں رہنے والوں کو حشرات ... کی طرح پھانس لیتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ خوف اور خود غرضی تیرے قصر تاریک کے دو مضبوط ستون ہیں۔ یہ ہٹ جائیں تو تیرے تکبر کی عمارت ... سے نیچے آ

Scanned with CamScanner

کرے گی۔ تونے ازل ہی سے انسانی ذہن کو خوف اور خود غرضی کا اسیر بنا رکھا ہے۔ تو ایک تاریک قوت ہے۔ جھوٹ ہے، باطل ہے۔ اسی لیے تو اپنے آپ کو منوانے کے لیے جبر و تشدد کا سہارا لیتی ہے۔ تو باطل قوت ہے۔ سچائی کو اپنے آپ کو منوانے کے لیے جبر و تشدد کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ سچائی اپنے آپ کو کسی جبر کے بغیر منوا لیتی ہے۔ لاکھ انکار کرنے کے باوجود بھی منکر کے دل میں صداقت کا احساس موجود رہتا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو فطرت کی لاانتہا اور لافانی روشنی کی راہ روکنے کی کوشش تو کرتی ہے، روک نہیں پاتی۔ تو فطرت لطیف کی کرنوں کو ختم نہیں کر سکتی۔ تو اس دنیا میں رہنے والے انسانوں کے دلوں کو محدود کرتے ہوئے تاریک تو بنا دیتی ہے، سنگین تو کر دیتی ہے، لیکن ان میں لطافت کی روشنی ایک کرن کی طرح جگمگاتی رہتی ہے۔ تو اسے تاریکی کے دبیز پردوں میں ملفوف تو کر دیتی ہے، تو اسے سیاہ سنگین دیواروں میں قید تو کر دیتی ہے، لیکن اس کا وجود ختم نہیں کر سکتی۔ اور جب بھی انسانی زندگی اس شعاعِ زندگی کو شعور کی مدد سے حاصل کر لیتی ہے، دبیز پردے ہٹ جاتے ہیں، پتھروں میں شگاف نمایاں ہو جاتے ہیں اور ضمیر کی یہ شعاع راہ پاتے ہی پشیمان دلوں کو منور کر دیتی ہے۔ جب تو دیکھتی ہے کہ کوئی انسان ضمیر کی روشنی پا کر تیرے جال سے نکلنا چاہتا ہے، تو فوراً اسے سزا دیتی ہے۔ اسی عمل کے ساتھ جسے اس نے تیری رضا جوئی کے لیے کیا تھا، تاکہ دنیا پر تیری دھاک قائم رہے اور تیرا پُرفریب نظام قائم رہے۔ تو انتہائی مکاری کے ساتھ مکافاتِ عمل سے بیگانہ ہو جاتی ہے کیونکہ یہ تو بھی جانتی ہے کہ ہر عمل کا ردِ عمل ضمیر کل ہی سے ممکن ہو کرتا ہے — اسی روشنی سے جس سے تو ازل سے گریزپا ہے۔ یہ ہوتا رہا ہے، ہو رہا ہے — ایسا ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے، یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے۔ لیکن تو صدیوں کی اس کشمکش کے بعد بھی، قرنوں کی اس طویل ترین جنگ کے بعد بھی، اندیشے سے دوچار ہے۔ تیرا قصرِ تاریک اس وقت لرزنے لگتا ہے جب تو خود اپنے خوف سے خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ تو اچھی طرح جانتی ہے کہ تجھ سے بغاوت کرنے والوں، تیرے تقاضے پورے نہ کرنے والوں کے اچھے اعمال کا بھی ردِ عمل ہوتا رہا ہے، ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا اور تو اسے روک نہ سکے گی۔ ضمیر کے اس ردِ عمل کو تو روک نہیں سکتی اور یہی بالآخر تیری حتمی شکست کا باعث ہوگا۔

Scanned with CamScanner

13

محمد خان نے مجھے اشارے سے بلایا۔ میں سیڑھیاں اتر کر نیچے اس کے قریب گیا۔ دوپہر ہونے والی تھی۔ جولائی کی جھلستی دوپہر میں سیڑھیاں اترتے اترتے میں پسینے سے بھیگ گیا۔ گلے اور حلق سے کچھ نیچے مرچی کی سوزش پھر محسوس ہوئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے بنگال کی آگ سی ہو اور سینے میں آگ لگی ہو۔ محمد خان نے بتایا کہ بھائی کا ارادہ جلدی واپس جانے کا ہے۔ انھوں نے کھوڑ پہنچ کر سہ پہر کے وقت میاں آگل فیلڈ میں بھی جانا ہے۔ محمد خان نے الوداعی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''بڑے صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔'' محمد خان نے کہا۔ ''وہ خوچہ ... فراد ... جرات سے چھیڑ ... گئے تو ... ڈر ہے گا۔'' محمد خان کو ضیغم خان سے شاید اتنی ہی نفرت تھی جتنی میں محسوس کر رہا تھا۔ ''یہاں ... میں سونا ہو ... تو ہوگی صاحب، لیکن اصل میں بیوقوفی ہوگی۔ جہاں بہادری کام نہ آئے، وہاں عقل کام آتی ہے۔ بس چھت پر چڑھ جاؤ اور تماشا دیکھو۔'' محمد خان نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو شاید وہ صبح سے سوچ رہا تھا۔

کھوڑ واپس جاتے ہوئے بھائی خود بکس کار چلا رہے تھے۔ میں ساتھ بیٹھا تھا۔ ... میں ... مہدی اور فتح خان بیٹے کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔ بھائی کا موڈ بہتر تھا۔

''کیا یہ ممکن نہیں۔'' میں نے کہا، ''کیا یہ ممکن نہیں کہ کمپنی ضیغم خان سے مزدور لڑکوں کی فہرست اور کوائف طلب کرے؟''

''تم ابھی تک اسی سوچ میں ہو۔'' بھائی نے اسٹیئرنگ کو دائیں ہاتھ سے پکڑ کر، بایاں ہاتھ نیچے لے جاتے ہوئے، گھوم کر مجھے دیکھا۔ ''کمپنی کو کیا پڑی ہے۔ کمپنی کو اس سے کیا غرض کہ وہ مزدور کہاں سے آتا ہے؟ وہ بہتر ین کام کرتا ہے اور وقت پر کرتا ہے۔ ان چٹانوں میں سڑک بنانا ناممکن نظر آتا تھا، ضیغم خان نے یہاں بھی راستہ بنا دیا۔''

جس کار کو سڑک پر ابھرے ہوئے سلیٹ جیسے پتھروں پر چڑھانے کے لیے مزدور لڑکوں نے پتھروں کو تراش کر ڈھلوانیں سی بنا دی تھیں۔

''تم ارم ...'' میں نے پھر کہا، ''کوئی فوٹو سٹیٹر ہی ہو جو مزدور لڑکوں کے حالات ...

کرے۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" بھائی نے پھر سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ "وہ معائنہ کرنے آئے گا۔ ضیغم خان اسے گل جاگیر میں اپنے ڈیرے پر لے جا کر روسٹ مرغے کھلائے گا۔ ہزار دو ہزار اس کی جیب میں ڈالے گا اور وہ بہترین رپورٹ پیش کر دے گا۔"

"کیا کچھ نہیں ہو سکتا؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔" بھائی نے میری مایوسی پر بے بسی کی مہر لگا دی۔

14

اس واقعے کو بیس دن گزر گئے۔ اسی دوران میں مجھ پر ملیریا کا حملہ ہوا۔ ملیریا ہر بار بدن کو یوں توڑ جاتا ہے کہ مدافعتی قوت کو دوبارہ حاصل کرنے میں کتنے ہی دن لگ جاتے ہیں۔ ایک دن صبح صبح ہی بھائی ٹیکسی کار میں تمازعدیم سے اس پٹھان لڑکے کو لایا گیا جس کے ساتھ بیٹھ کر میں نے مرچی کھائی تھی، جو میرا بہتا ہوا پسینہ دیکھ کر بہت ہنسا تھا۔ اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ سانپ زہریلا تھا۔ کھوڑ کے ہسپتال میں اینٹی وینم (anti-venom) انجکشن موجود تھے اور ڈاکٹر شیر ولی جیسے شفیق ڈاکٹر بھی، جو سہ پہر تک لڑکے کے ساتھ رہے۔ لڑکا بچ گیا۔

شام کے وقت میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہسپتال پہنچا۔ پٹھان لڑکے نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ اس کا چہرہ جو جوانی کی تپتی دوپہروں نے جھلسا دیا تھا۔ اس کے رخسار پچکے ہوئے تھے اور چہرے کے جھلسے ہوئے رنگ میں خشک نیلا پن تھا۔ اس کے بالوں میں، خشک بالوں میں، گرد و غبار نے بالوں کو رنگ بھورا سا کر دیا تھا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا، خزاں کے جھڑے ہوئے خشک پتے جیسا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" میں نے پوچھا۔

"گل خان۔" اس نے یوں جواب دیا جیسے کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہو۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟" میں نے پھر پوچھا۔

"ہم چھچھ کے پاس ایک گاؤں کا ہوں" اس نے جواب دیا۔ اس کی بے نور آنکھوں میں ہل

Scanned with CamScanner

بھر کے لیے چمک سی آئی، جیسے تصور میں اس نے اپنے گاؤں کو دیکھا ہو۔

"آپ کب سے ضیغم خان کے ساتھ ہو؟" میرے اس سوال پر وہ خاموش ہو گیا۔ دو تین بار پوچھنے پر بھی وہ خاموش رہا۔ اس کی آنکھیں بجھتی گئیں۔ مایوس ہو کر میں جانے ہی والا تھا کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"پچھلے سال..." اس نے سرگوشی میں کہا۔ "ریوڑ چراتے ہوئے بکری گم ہو گئی تھی۔ بابا نے لاٹھی سے مارا تھا۔ میں گھر سے بھاگ آیا۔ پشاور اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر مجھے دو آدمیوں نے نوکری کا جھانسہ دیا اور ایبٹ آباد میں ضیغم خان کے حوالے کر دیا... تب سے یہیں ہوں۔"

اس نے ایک بار اپنے سوجے ہوئے پاؤں کی سمت دیکھا، پھر میری سمت۔ اس کی آنکھوں میں غم، مایوسی اور بے بسی کا ایسا تاثر تھا جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی نگاہیں پھر سوجے ہوئے پاؤں کی سمت اٹھیں۔

"سانپ..." اس کی آواز گویا کسی گہری کھائی سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "سانپ نے مجھے نہیں کاٹا... میں نے خود اپنا پاؤں..."

اس کا لہجہ جیسے کسی گہری جان کنی کی کھائی کے مدھم سے بہت نیچے کی آواز سنائی دی اور جیسے سماعتوں پر بہت سے بھاری پتھر لڑھک گئے ہوں، جن کے نیچے وہ زندہ دفن ہو گیا ہو۔

مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔

15

رات کو جب میری بھتیجیاں سو گئیں تو میں نے بھائی اور بھابھی کو سب کچھ بتا دیا۔ بھائی کے چہرے پر پریشانی سی ابھری۔

"دیکھو، میں تم سے کہتا ہوں، ضیغم خان کے معاملات میں دخل مت دو،" بھائی نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے، ضیغم خان کیا چیز ہے۔"

"پھر بھی آپ خاموش ہیں..." میں نے کہا۔

بھائی نے میری سوئی ہوئی بھتیجیوں کی طرف دیکھا۔

"وہ بہت طاقتور آدمی ہے" بھائی کی آواز میں مجبوری کا احساس نمایاں تھا۔ "بہت طاقتور۔ پولیس بھی اس پر ہاتھ نہیں ڈالے گی۔ اور یہ بات بھی سچ ہے کہ اس کے کیمپ میں زیادہ تر وہی لڑکے ہیں جنھیں وہ صوبہ سرحد سے ان کے ماں باپ کی رضامندی سے لایا ہے۔ اس کے پاس رسید بک بھی ہے جسے ہر ماہ اس کا کارندہ صوبہ سرحد لے کر جاتا ہے اور ہر مہینے ان لڑکوں کے ماں باپ کے انگوٹھے لگ جاتے ہیں۔ اغوا شدہ لڑکوں کو وہ کہیں چھپا دے گا۔ اور پھر ہوگا کیا؟" بھائی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر انھوں نے تھکی تھکی نظروں سے مجھے دیکھا۔ "تم نہیں جانتے" انھوں نے میری سمت گہری نظروں سے دیکھا۔ "تم نہیں جانتے، ضیغم خان کے رشتے دار سمگلر ہیں۔ پشاور میں ان کے ڈیرے ہیں۔ ضیغم خان کمپنی کے بڑے افسروں کی بیویوں کو لنڈی کوتل کے بازار میں لے جا کر، کم قیمت پر بیش قیمت سامان خرید واتا ہے۔ انگریز افسروں کی بیویاں اس سے بہت خوش ہیں۔ وہ آدھی قیمت دے کر آتی ہیں، باقی قیمت بعد میں ضیغم خان خود اپنے رشتے داروں کو ادا کرتا ہے۔ انگریز افسر اس سے بہت خوش رہتے ہیں۔ اور تم یہ بھی نہیں جانتے کہ کمپنی کے جو بڑے افسر ہیں، انگریز افسر، ان کے صدر ایوب خان، اس کی کابینہ کے اراکین، سیاست دانوں، فوجی افسروں، جرنیلوں اور بیوروکریٹس سے بہت گہرے تعلقات ہیں۔ پٹرولیم کی وزارت ان کے دوستوں سے بھری پڑی ہے...

"میں اگر ضیغم خان کے خلاف بات کروں گا تو وہ موقع پا کر انگریز افسروں کے سامنے گڑگڑائے گا کہ میں زیادتی کر رہا ہوں۔ وہ مجھ پر الزام دھرے گا کہ میں نے کسی اور ٹھیکیدار سے رشوت لی ہے اور اگلے سال کا ٹھیکہ اسے دینے کے لیے راہ ہموار کر رہا ہوں۔ نتیجہ کیا ہوگا؟ ممکن ہے کہ میری ہی چھٹی کر دی جائے۔ یا پھر اگر میری گزشتہ خدمات کا خیال کرتے ہوئے مجھے کمپنی سے نکالا نہ گیا تو بھی کم سے کم سزا یہ تو ہوگی کہ مجھے میانوالی، ڈھلیاں یا بلکسر کی آئل فیلڈز میں ٹرانسفر کر دیا جائے، جہاں تمھاری بھتیجیوں کے لیے پرائمری سکول بھی نہیں ہے۔ رہا ضیغم خان، تو وہ یہیں رہے گا، اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔" بھائی نے پھر میری سوئی ہوئی بھتیجیوں کی سمت دیکھا۔ "مجھے امید ہے کہ تم میری، اپنی بھابھی اور بھتیجیوں کی خاطر خاموش رہو گے۔" بھائی کی آواز میں رنجیدگی کی

Scanned with CamScanner

تھی۔ میں ''تمھیں نے تشکیل دیا۔ مجھے ضیغم خان سے تمھی بہت مشکل پڑے گی۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مرچی کی تیز دھسک میرے حلق سے ہوتی ہوئی، میری چھاتی سے گزرتی ہوئی، میرے دل کے گرد کچھ دیر اڑتی ہوئی، پورے بدن میں پھیل گئی ہے۔ مجھے گل خان کا چہرہ دکھائی دیا۔ جھلسا ہوا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ اس کے پچکے ہوئے رخسار اور چپٹے ہوئے، اس کی آنکھیں حلقوں میں۔ وہ خزاں کے کسی خشک جھڑے ہوئے پتے کی طرح تھا جس پر کسی کا پاؤں رکھ دیا گیا ہو۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مرچی کی دھونی، چھوٹی دھونی، پورے بدن و ... میں مبتلا کرنے والے زہر کے ساتھ میرے حلق میں پھنس گئی ہے۔

16

بھائی کے خط میں ضیغم خان کی موت کی خبر پڑھ کر مجھے گل خان کا خیال آیا۔ یونیورسٹی کیمپس کی کینٹین والے نے میرے سامنے چائے کی پیالی رکھ دی۔ چائے پیتے پیتے تمام واقعات میری نظروں سے گزر گئے۔ پھر نہ جانے کیوں، مجھے یوں لگا جیسے ایک بار پھر میرے حلق میں کچھ پھنس گیا ہو، حلق سے پھنسی ہوئی چھوٹی دھونی تھی کے ساتھ باہر آ گئی ہو ... مرچی کی دھونی۔

پھر میرے سامنے دھند سی چھا گئی۔ دھند میں گل خان کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ وہ بے حد زرد تھا، رخسار پچکے ہوئے تھے، آنکھیں رطوبت سے عاری تھیں۔

''تمھارے پاس معذرت نہیں ہے، وہ خوف و دہشت میں ... بے گناہوں سے ... ہوئی ہے، اور تمھارے پاس معذرت نہیں ہے۔ تمھارے راستے پر کوئی نہیں ... ہیں۔''

''ہاں ... میں نے ... میں ضیغم خان سے ... ایک ... لیکن ... تو ... کے ... ''

17

چھتیس برس گزر چکے ہیں۔ مجھے یہ واقعہ کبھی یاد بھی نہ آتا۔۔ پڑا ہوا ایک پرانی نوٹ بک کا جس میں مجھے اپنا تحریر کردہ یہ شعر اداس کر گیا:

دنیا میں مکافاتِ عمل سے نہ بچو گے
بخشش کو کبھی اپنا سہارا نہ سمجھنا

زندگی کے مدوّر تالاب میں بھنور سا پڑتا نظر آیا۔ اٹھی ہوئی لہر دائرہ بناتی ہوئی تالاب کے کونے کناروں تک گئی ٹکرائی، پلٹی۔ وہیں مرکز کی سمت آئی اور پھر مانکے پر مجھے ضیغم خان نظر آیا، چکر کھاتا ہوا ضیغم خان نظر آیا۔ چکر کھاتا ہوا ضیغم خان۔ اس کے منہ سے خون کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ مجھے ضیغم خان کے گرد بہت سے چھوٹے چھوٹے پٹھان لڑکے بھی گھومتے نظر آئے۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ضیغم خان کو دیکھ رہے تھے۔ ضیغم خان کے منہ سے اڑتے ہوئے خون کے چھینٹوں سے ان کے چہرے لال ہو رہے تھے۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ذہن میں پیوست، میرے دماغ میں گڑے ہوئے بلونگڑے کے چھوٹے چھوٹے پنجے ڈھیلے پڑ گئے ہیں، وہ ناخن نکال کر، اپنی نرم فر سے میرے چہرے کو مس کرتا ہوا نازک سی میاؤں کے ساتھ، میری جھولی میں آ گرا ہے۔

شمس الحق عثمانی

ابوالفضل صدیقی کی کہانیاں : فہم و نظر کا اسمبلاژ

Scanned with CamScanner

موجودہ شمارے کی تیسری تحریر ایک منفرد اور غیر معمولی تنقیدی تجربہ ہے۔ غیر معمولی اس اعتبار سے کہ یہ اردو کی معمول کی تنقیدی سرگرمی سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ ہمارے یہاں کی ادبی تنقید کا خطاب عام طور پر پڑھنے والوں سے نہیں بلکہ لکھنے والوں سے رہتا ہے۔ اس کا مقصد تخلیقی ادیبوں کی کاوشوں پر نخوت سے نگاہ ڈالتے ہوئے، اپنے قائم کیے ہوئے مفروضہ تنقیدی معیاروں کی روشنی میں انھیں مختلف درجوں پر فائز کرتے اور انھیں ہدایت جاری کرتے رہنا ہے تاکہ وہ اپنے درجات میں ترقی کی کوشش کر سکیں، اور یہ بات وہ آسانی سے بھول جاتے ہیں کہ آج تک کسی قابلِ ذکر تخلیقی ادیب نے نقاد کے ہدایت ناموں سے روشنی حاصل کر کے اپنے ہنر میں کامیابی حاصل نہیں کی اور نہ تحقیق کے معروضہ طریقِ عمل پر بے جان تحریروں میں جان ڈالی جا سکی ہے۔ ایک دوسری شے جو ہمارے پیشہ ور نقادوں کی توجہ سے اوجھل ہے، یہ سادہ اور بنیادی حقیقت ہے کہ تنقیدی تحریروں کا واحد معقول جواز یہ ہے کہ وہ کسی تخلیقی تحریر یا تحریروں کے مجموعے کو توجہ اور احترام سے پڑھنے کے عمل میں عام پڑھنے والوں کو شریک کر سکے۔ اس صورت میں اسے زیرِ نظر ادیب کی تخلیقی دنیا تک رسائی حاصل کر کے اس کے اسلوب اور لسانی صنعت سے پیدا ہونے والی تخلیقی ہیئت کی معنویت دریافت کرنی ہوگی اور اپنا خطاب کا رخ متوقع ترین پڑھنے والوں کی سمت رکھنا ہوگا جو اس ادیب کی دنیا کو دریافت کرنے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

آئندہ صفحات میں شمس الحق عثمانی نے اردو کے ایک جدید اور اہم صاحبِ اسلوب فکشن نگار ابوالفضل صدیقی کی چند تحریروں کے ایک نکتہ رس اور کارآمد ڈھنگ سے کیے گئے تفصیلی مطالعے میں پڑھنے والوں کو شریک کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی اس منفرد کاوش میں جس کی ہیئت کو انھوں نے 'اسمبلاژ' (assemblage) کا عنوان دیا ہے، وہ ابوالفضل صدیقی کی چند کہانیوں سے پچاس سے زائد اقتباسات منتخب کر کے ان کی مدد سے ان کے اسلوب، کرداروں، موضوعات اور معانی تانے بانے کی پرتیں کھولتے ہیں، اور اس کے مطالعے کے بعد پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے ایک اہم ادیب کی دنیا سے، اور اس کے توسط سے خود اپنے اردگرد کی دنیا سے زیادہ بہتر طور پر واقف ہو گیا ہے۔ شمس الحق عثمانی کی تنقیدی کاوش اسی بنیاد پر کامیاب ہے۔

1

"ارے ستارہ سیوتی ... ارے ابھی یہاں آگئے تو ... کدھر کا سامان سفر؟" وہ بڑے ادب [illegible]
سلام کرنا بھی بھول گیا، جواب بھی نہ دے سکا اور وہ [illegible] چلا گیا۔ اب اس نے پانچ روپے کا نوٹ [illegible]
میں پکڑے، بکنگ آفس کی کھڑکی کے اندر ہاتھ بڑھایا اور بکنگ کلرک نے پہچان کر [illegible]
منتظر رہے [illegible] میں [illegible] کے ساتھ اندر سے [illegible] نکالی: "اوہو [illegible]
[illegible] سیوتی [illegible] کہاں؟ کدھر [illegible] چل پڑے [illegible] آفس کی کھڑکی سے [illegible]
اندر ہاتھ بڑھا [illegible] مسافر [illegible] جیسے [illegible] گیا۔ جہاں [illegible] مسافر [illegible] پوری اسٹیشن [illegible]
[illegible] میں [illegible] دیکھ [illegible] تاریکی میں مشورہ کر رہا ہے [illegible]
[illegible]؟" [illegible] سوال بھی بڑے [illegible] سوال کی طرف سے [illegible]
"کہاں؟" کا سوال اس کے شعور میں [illegible] اندر [illegible] وقت [illegible]
ہاتھ [illegible] کا [illegible] سے جواب دیتا: "[illegible]
[illegible] کلب [illegible] گلاب [illegible] اور [illegible]
[illegible] گلاب سے پھولوں کی [illegible]
[illegible] خود سیوتی [illegible]
[illegible] معلوم [illegible]
[illegible] قطب [illegible]
[illegible] کر دیا [illegible]

Scanned with CamScanner

بجاروں کی اداسی کے اندھیرے میں گم تھا۔

سیوتی دال بے چارہ وہاں کا ٹکٹ لیتی اور وہ غریب کون سے اسٹیشن کا ٹکٹ کاٹتا۔

※

یہ سطور ابوالفضل صدیقی (1910 تا 1987) کی کتاب بیبہ (مطبوعہ 1986، ناشر مکتبہ اسلوب، کراچی) کی تمہید میں سے ایک کہانی "گل زمین کی تلاش میں" (صفحہ 111 تا 231) کے اختتامی اجزا ہیں۔

ابوالفضل کی کہانیوں میں متعدد سیوتی دال ہیں، ان کی گلا جیسی متعدد طوائفیں عورتیں ہیں۔ متعدد زمیندار ہیں اور زمینداروں کی چشم و ابروئے گردش رہی داری جیسے کئی لوگ ہیں۔ مصنف نے ان لوگوں کے باہمی عمل اور ردعمل کے جو ہمہ جہت زاویے نقش کیے ہیں، وہ ہر جہت سے سرسری گزرنے والی نظروں کو تو شاید بہانی سے وہ سے محدود متاثی تجربے اور شخصی مشاہدے کا نتیجہ قصہ کہانی دیں، مگر وہ نظریں جو رک رک کر دیکھنا سیکھ چکی ہوں، غیر مشروط تامل و تحمل ہوں، بظاہر سیدھے سادے (یا بے رنگ) ان پیچیدگی و وحدت کے پار اترنے کی ہوں اور دیکھے پڑتے ایک گزشتہ و موجود کے دوسرے، تیسرے، پانچویں، ساتویں میں آمیز کر کے آئندہ کے گزرنے میں جھانکنے کی اہلیت پا چکی ہوں، تو انھیں صاف دکھائی دے گا کہ ابوالفضل صدیقی کی کہانیوں میں عمل و ردعمل کے دائرے اور افراد کے تعین نقش حالانکہ مصنف کے ماضی قریب اور حال سے منسوب ہیں، مگر انھیں (بصورت دیگر) جو معرکہ خیر و شر درپیش ہے ان کی اساسی وجود بھی وہی ہیں جو گزشتگان کے لیے تھیں، اور آئندگان کو بھی جو معرکہ خیر و شر بصورت دیگر یقیناً پیش آئے گا اس کی اساسی وجوہ بھی کم و بیش یہی ہوں گی۔

ابوالفضل صدیقی کی بیشتر کہانیاں اوائل بیسویں صدی کے اس ہندوستانی معاشرے کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں جس پر چھوٹے بڑے زمیندار اور ان کے طور طریقے حاوی تھے۔ ان کہانیوں میں وہ سب مصنف کی توجہ کا خاص مرکز ہیں جو کسی طور پر زمینداروں کے زیر نگیں تھے، اور وہ انھیں تا دیر غلط بنا (مجبوریت کی حد تک) تابع بنائے رکھنے کے لیے تمام آزمودہ در نت نئے حربے استعمال کرتے تھے۔ ابوالفضل صدیقی نے زمینداروں کے طرز فکر و عمل سے ان کہانیوں کے

[illegible] وجود [illegible] [illegible]

جن کے تخیل میں [illegible] اپنے وجود سے معنی [illegible] محسوس کرنے لگے تھے۔ اس

احساس کی بالواسطہ یا بلاواسطہ تشکیل دینے والے صاحبانِ اقتدار [illegible] تھے کہ ان کے ہاتھوں سے

اقتدار کی رسّی [illegible] دوسرے کے دوسرے سرے پر صدیوں

سے بندھے [illegible] برشتگی اور دلوں میں اپنے وجود

کے معنی [illegible] اقتدار [illegible] میں مزید [illegible]

پیدا ہوتی تھی [illegible] برشتگی اور آرزو [illegible] عود کر آئی تھی۔

[illegible] کہ مذکورہ حالات و کیفیات سے دوچار [illegible] سے

مفصل [illegible] (قدرے محدود پیمانے پر) [illegible]

ترتیب دینے والے [illegible]

گئے ہیں؟ [illegible] مختلف [illegible]

[illegible] واقعات [illegible]

معنویت اور [illegible] کی باطنی کیفیات [illegible]

تاثیر تھی [illegible] مصنف [illegible]

وغیرہ۔

ان سب [illegible] ابوالفضل صدیقی کی [illegible]

میں [illegible] زندگی اور [illegible]

اسلوب کی [illegible] محسوس ہوتی ہیں [illegible]

خاص خاص [illegible] شامل ہوتے ہیں [illegible]

مخصوص رنگ قاری کے [illegible] مزید مستحکم کرتے ہیں۔

ابوالفضل صدیقی کی کہانیاں اردو کے [illegible] افسانوں کے مقابلے میں [illegible]

[illegible] محسوس ہوتی ہیں [illegible] مصنف [illegible]

[illegible] کہانیوں میں [illegible]

موجود ہیں کہ مصنف نے زندگی یا تمام متعلق محسوس ہونے والے واقعات و اجزا کو کسی نہ کسی طور کہانی کے مرکزی خیال سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کوششوں سے محسوس ہوتا ہے کہ ابوالفضل صدیقی نے کہانی کے مرکزی خیال کو نمایاں سے نمایاں تر اور بیان کو طویل سے طویل تر بنانے کا عمل، شعوری طور پر، تقریباً اسی طرح اپنے ہنر میں شامل رکھا ہے جس طرح کوئی مصور اپنی پینٹنگ کے اساسی نقوش کو نمایاں سے نمایاں تر کرنے کے لیے، یا یوں کہا جائے کہ دیکھنے والی نظر کو بہر طور اساسی نقوش پر مرکوز کرنے کے لیے، ان کے قریب و دور کو ایسے رنگوں اور خطوط سے بھر دیتا ہے جو بہ یک نگاہ تو زائد اور بے معنی محسوس ہوتے ہیں، مگر جب دیکھنے والی نظر اساسی نقوش پر مرکوز ہو کر ان کی تاثیر و معنویت تک پہنچ جاتی ہے تو اول الذکر رنگ اس لحاظ سے معنی خیز و ناگزیر قرار پاتے ہیں کہ ناظر نے انھی کے وسیلے سے مصور کے مقصود اساسی نقوش کو گرفت میں لیا ہے۔

یہ اصلاحات ابوالفضل صدیقی کی تمام کہانیوں پر محیط نہیں، کیونکہ ان کی کتابیں برصغیر کے جزو اعظم میں تقریباً نایاب ہیں۔ مرتب اصلاحات کو صرف تین کتابیں دستیاب ہیں: آئینہ، انصاف اور حوالامکھ۔ یہ پہلی بار 1986 میں کراچی سے طبع ہوئی تھیں۔ ان میں چودہ طویل و قدرے مختصر کہانیاں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں کراچی اور لاہور کے کچھ رسائل میں مطبوعہ چند کہانیاں اور ایک ناول کی آخری قسط بھی مرتب کے مطالعے میں شامل رہی ہے، لیکن اصلاحات کا مجموعی مزاج صرف وہ کہانیاں قبول کر پایا جو مذکورہ بالا مجموعوں میں شامل ہیں۔ غالباً اس باعث کہ ابوالفضل صدیقی کی فکر اور فنی ہمدردی کا تمام سفید و سیاہ اور تمام پیچ و خم ان کہانیوں کے دامن میں سمٹ آیا ہے اور یہ مجموعے ابوالفضل صدیقی نے خود ترتیب دیے تھے زندگی کے اختتامی برسوں میں۔

کہانی پڑھتے ہوئے ادب پارے کے آداب مطالعہ برتنے والے کے لیے سمجھنا مشکل نہیں کہ اس کتاب کی ہیئت میں درج کہانی "گل زمین کی تلاش میں" کی اختتامی سطور کسی ایسے حسن و قوت کا منبع اور پھر ان میں خیر کی موجودگی و عدم موجودگی کے بارے میں سوال قائم کرتے ہیں جو راست و صداقت سے ساتھ اس طور پیش آ چکے ہیں کہ وہ سلامت ادب بھی جھول گیا ہے۔ اس وقت وہ میں نظر و سمت اپنی جستجو کی رستی سے اس نکتے پر ہے جو معلوم و انا کی ہے۔ بڑے

Scanned with CamScanner

[illegible] حیرت میں [illegible] سیوتی [illegible] پہلے کبھی اس طرف یہاں نہ آیا تھا۔ [illegible] "[illegible] تم تو [illegible]" اور "ادھر چل پڑے بھئی" [illegible] سیوتی [illegible] قسمت [illegible] جانتے ہیں اور اسے اس خطّے کا اٹوٹ انگ تصور کرتے ہیں۔ اگر سیوتی اس زمین سے [illegible] ہے، تبھی تو [illegible] میں ہاتھ ڈالے [illegible] زمین کا قصہ ہے [illegible] پھل پھول سکیں۔ لیکن کوئی نہیں [illegible] سیوتی اور [illegible] سب۔ [illegible] سب [illegible] اداؤں کے ذریعے [illegible] گئے۔

[illegible] سیوتی [illegible] ابوالفضل صدیقی کی متعدد کہانیوں کے [illegible] ہے کہ بیشتر کہانیوں میں [illegible] بیان کرتے ہیں [illegible] ابوالفضل صدیقی [illegible] ماحول کے ذریعے [illegible] سیوتی [illegible] ہی سے کرتے ہیں۔

2

اور جب قصبوں میں [illegible] دیہات کا ماحول [illegible] تو سیوتی [illegible] پرانے باغوں میں بن جیسے رقبوں کے اندر [illegible]

چلو کر دریافت کر کے پسند کرتا تو وہیں کہیں آس پاس کی جھاڑیوں کی گھاس میں سے کوئی ابھرتا ہوا بچپنے سے اس کا پتہ لگانے کے لیے تلاش کر کے لے آتا اور قدیم دور۔ تاریخی درخت کی کوئی ہونہار موقعے کی شاخ کے ساتھ قلم بندی کر کے آگے بڑھ جاتا۔ ورنہ ذہن اس کی آبائی 'تورسی' تیسری پشت سے چلی رہی تھی! اور آن تو اس کی جوانی کی شام تھی، اس کے باپ دادا، سب نے جوانیاں اسی شاداب صحرا نوردی میں گزاری تھیں ورنہ ان کے دریافت کر کر کے لائے ہوئے اور قلم باندھ باندھ کر ترقی دیے، بنائے سنوارے، پروان چڑھائے آموں کی تعداد بھی کسی کو معلوم نہ تھی۔ اور وہ ان سے آقا زمین سے ان مالکوں کے نام سے موسوم ہو کر، جن کے نام سرکاری کاغذات میں اندراج چلے آتے تھے، اس کے حرف غلط کی طرح گمنام معدوم ہو گئے تھے، اور تیسری پشت میں ان کی میراث ایک گاؤں ہم یا کسی بیٹی تھی اور ایک سرحد آم کا درخت۔ ... اللہ کر گنیا ذات، پر یاد حسن تھا اور آخر مدکر کی ملکیت کا وہ قانونی مقدور رکھتا تھا۔ دونوں ہی دوسروں کا مال تھے، اور ان کو اس کا احساس اور قانون نے دونوں صورتوں اور پہلوؤں سے، جیسی طرح اندازہ بھی تھا اور وہ اس پر صابر بھی چلا آتا تھا، اور دوسرے پہلوؤں سے دل کو سمجھائے ہوئے بھی تھا۔ (ص 175 تا 176)

اور جب صوفی بابا نے پیار بھری پکارنے والی مخصوص آواز بلند کی۔ ”گل بو! گل بو! کدھر ہے؟ ذرا سرکار کو تو اپنا سرخہ پیش کر۔“

اور کہیں گلاب کی جھاڑیوں میں سے گل بو نمودار ہوئی تو فاروقی صاحب چکا چوند ہو گئے۔ حسب صورتی، فطری ... اور خلقی تندرستی کا مجسمہ، اور ستم یہ کہ اپنے آپ سے بے خبر۔ حویلی والے بیگماتی مخصوص انداز میں سلام کیا اور چھپر کے اوپر رکھے ہوئے رات کے بے آم نکالے، جن پر اوس نے تمام رات خنکی اور تری برسائی تھی، اور کاٹ کر ایک قاش بڑے سلیقے کے ساتھ پیش کی۔ فاروقی صاحب پھڑک اٹھے۔ ایسی مرحلہ میں پہلی مرتبہ زبان ذائقہ سے گزری تھی۔ ستم یہ کہ خوشبو بالکل ہی انوکھی تھی، یعنی مایوں سے تو عرق گلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور اس خوشبو والے سرخے کو کھا کر فاروقی صاحب سوچ میں گم ہو گئے اور پروان چڑھا کر اور کاٹ کر کھلانے والی کی شخصیت میں تو پہلی نگاہ میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اور گل بو صوفی بابا کی بیٹی تھی، نسل اور اولاد شور ... جس سے بابا آدم کے اس باغ ... جیسے کلچر میں ... کو ... بہا ... کر کے اور اگر ... کے اس شعبے کو ... کی روشنی سے۔

ہوتا ہوں مذہب سے [illegible] رحم سے پیدا ہوتا تھا۔ (ص 179)

فاروقی صاحب [illegible] آدمی تھے [illegible] کی سوچ اور عمل میں سب سے [illegible] میں سب سے [illegible] دونوں حقوق میں [illegible] رکھنے والے۔ [illegible] یہ سمجھ کیا [illegible] دل ہی دل میں اپنے [illegible] ہم نفسوں کے درمیان [illegible] شعور کی [illegible] کا فیصلہ کر لیا (ص 180)

❁

ابوالفضل صدیقی نے [illegible] فاروقی صاحب کا تعارف کہانی کے پانچ صفحات (149 تا 153) میں پیش کیا ہے، جس کا اختصار یہ ہے کہ فاروقی صاحب [illegible] میں ایک چھوٹے سے [illegible] معمولی حیثیت والے [illegible] زمیندار [illegible] ہندوستان [illegible] یونیورسٹی [illegible] تعلیم حاصل کی ہے [illegible] کاشت [illegible] کے [illegible] پیچھے ہیں اور اپنی [illegible] قلموں کی [illegible] زمینداروں میں شمار ہونے لگے ہیں۔ [illegible] میں برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔

[illegible] 1926 [illegible] ایک [illegible] کے درمیان [illegible] منعقد ہونے [illegible] آموں کے مقابلے کا اعلان [illegible] قبل [illegible] صاحب [illegible] آم [illegible] صاحب [illegible] قلمی [illegible] ختم [illegible] ہو گئی۔

کہانی کے نقل شدہ اقتباس 2 کی آخری سطر میں "[illegible]" سے [illegible] کہ فاروقی نے [illegible] آموں کے مقابلے میں شامل [illegible] کا فیصلہ کر لیا جس میں [illegible] صاحب [illegible] اور [illegible] اور ان کے قلمی پودے پیش کرنے والے تھے۔

فاروقی کے اس فیصلے کا [illegible] مکمل بیان [illegible] مقابلے کی [illegible]

دراصل یہ گفتگو خلق کی ہے جو مکالمہ نگاری پر مصنف کی غیر معمولی قدرت کی مظہر ہے۔ اس گفتگو میں طبقاتی طرزِ فکر کے وہ تقریباً تمام پہلو جھلک رہے ہیں جو جاگیردارانہ معاشرے کی پہچان تھے۔ [illegible] فاروقی کے طرزِ عمل سے مصنف اپنے قاری کو ایک ایسے [illegible] رویے کی آہٹ محسوس [illegible] معاشرے کے تعلیم یافتہ افراد میں بیسویں صدی کے نصف دوم سے پنپنا شروع ہو گیا تھا۔ فاروقی کے پیکر میں مصنف کا یہ احساس بھی نقش ہوا ہے کہ طبقاتی طرزِ فکر کا انہدام [illegible] کی روشنی سے ممکن ہے۔ اس مکالمے کے دوران، فاروقی کی زبان مصنف نے اپنے قاری کو عدل و مساوات کا وہ شعور یاد دلانے کی کوشش کی ہے جس سے پہلو تہی نے افراد اور معاشرے کے عمل کا رخ [illegible] جانب موڑ دیا:

> تب ہمارے ابا نے کہا: میاں فاروقی صاحب ہم [illegible]
> روایت کا پاس [illegible]
>
> فاروقی صاحب نے بات کاٹ دی [illegible]
> [illegible]
> [illegible]
> [illegible]
> [illegible] (ص [illegible])

یہ [illegible] آئندہ واقعات میں بھی [illegible] یہ [illegible] ابوالفضل صدیقی معاشرے کی طبقاتی تقسیم [illegible] ہے تو ان کے ذہن و دل کے کسی نہ کسی گوشے سے یہ آرزو جھانکتی ہے [illegible] اپنے ساقط اقدار [illegible] کی بحالی [illegible] عدل و مساوات [illegible] اور [illegible] کی حقیقی روح کو [illegible] بنائے۔

ایک [illegible] ابوالفضل صدیقی کی [illegible] قرار دینے کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے [illegible] جو [illegible] کہانی میں پیش کیے ہیں ان میں یہ بات بھی شامل ہے:

> فاروقی [illegible] احساس [illegible] ایک [illegible] بھی [illegible] کا ادراک بھی تھا [illegible]
> [illegible] تمام ہندوستان کے زمیندار اور زرعی [illegible]
> [illegible] (ص 49)

Scanned with CamScanner

ابوالفضل صدیقی کی کہانیوں کے ان تینوں مجموعوں: آئینہ، [illegible] اور [illegible] کے [illegible] مصنف کے تعارفی کلمات میں بتایا گیا ہے۔ "[illegible] کتاب [illegible] عباسی کے نام سے 1950 میں چھپی تھی۔ "[illegible] کہانی میں صرف اپنی کتاب کو فاروقی صاحب سے منسوب کر کے [illegible] ان کی عدالت (ص 173 تا 190) کے موقعے پر اور کہانی کے دیگر حصوں میں بھی [illegible] داشت [illegible] کی تمام [illegible] سے واقفیت اور [illegible] سے وابستہ روایت [illegible] کے بارے میں [illegible] معلومات [illegible] کی غمازی کرتے ہیں کہ فاروقی کے کردار میں ابوالفضل صدیقی نے اپنی شخصیت کے کئی رنگ شامل کیے ہیں۔

3

[illegible] متعلق معلومات [illegible] مقابلے میں آنے سے [illegible] مگر فاروقی صاحب نے اس کا کیس [illegible]

[illegible]

[illegible]

ایسی دوبارہ یافت صرف اسی طبقے کی اجارہ داری تو نہیں ہے، اور وہ تو چھوٹوں بڑوں سب کے مفاد میں ہے۔ یہ ذرا دیکھیے کہ ان نے دی ہے بلکہ [یہ دیکھیے کہ] کس بات نے چیر دی ہے۔"

مگر بارے یہ چیز بحث زیادہ چلی نہیں۔ میٹنگ کا ٹیمپو تفرقے اتنی زیادہ تھی کہ گم ہو کر رہ گئی۔ تاہم پہلے اندر پینک (panic) پھیلی۔ مجلس عاملہ کے صدر کچھ زیادہ ہی جز بز تھے۔

"دیکھیے مسٹر فاروقی، آپ ہمیں میں سے ایک ہیں اور آپ اپنی روایات کو جانتے ہیں۔ کسی ادنیٰ طبقے کے فرد کو آج کو مقدمے میں شریک نہیں کیا جاتا رہا ہے آج تک۔ لیکن روہیلکھنڈیوں کے متعلق انکشاف ہو چکا ہے کہ پچھلے مقدموں میں اب کاشتکاروں کے آگے رکھ دیے تھے لاکر۔"

"جناب، یہ دوں کی بات تو نہیں، قبلہ۔ روہیلوں سے تو اپنے سربراہ بھی چھوٹے طبقے میں سے عظیم آدمی تلاش کر کر کے بناتے ہیں،" فاروقی صاحب نے نہایت پیر و مرشدانہ انداز میں کہا۔

"لیکن آپ تو بڑے پکے آدمی ہیں، میرے خوردوں میں ہیں۔ کیا عرض کروں آپ ایک ادنیٰ خدمت گوات بڑے بڑوں کے سامنے ہار بیٹھ گئے ہیں، سوچ تو ہے۔"

ایک روہیلکھنڈی چوہان ٹھاکر صاحب نے جواب دیا، "خان بہادر صاحب، پھر کیا کیا جائے! روہیلکھنڈیوں کی طاقت یہی ہتھیار چھوڑے، کسان لوٹے، دھنتے، جب بے، موالی دے مجبور تھے۔ روہیلکھنڈی ٹھاکر راجپوت اور روہیلے پٹھان تو انہی کی فوج بنا کر ادھر پنجاب تک سکھ سرداروں کو، ادھر دکن میں بنگش پٹھانوں کو، اور بیچ میں دلی کے تخت سے ٹھیکیدار مرہٹوں کو اور آپ کی جناب سے اودھ، وائسرائے بہادر کو للکارا کرتے تھے۔"

"یہ چھوڑو، بھی میسوپوٹامیا (گاؤں) ہوں۔ خود بخود کا مینڈھا ہاتھی سے ٹکر لے کر۔ اور آپ جناب جو نے سے ان کے مقابلے پر تو لے آئے۔" ایک اودھ کے راجہ صاحب نے کہا اور کرسی پر ترچھے ہو گئے۔

فاروقی صاحب کے منھ سے بے ساختہ نکلا، "لاحول ولا قوۃ! یہ ادنیٰ و اعلیٰ چھوٹے بڑے، ٹھاکر، برہمن، سید، مغل، پٹھان یا غریب امیر کا مقابلہ نہیں ہے۔ میرے محترم، یہ اچھے سے اچھے آدمی کی دریافت کا مسئلہ ہے۔ اور یہ ٹھیک طے بھی ہو سکتا ہے کہ ہر ایک آدمی نے چیلنج کو برداشت کیا جائے اور جانچ تحقیق سے اسے میدان میں لایا جائے۔"

Scanned with CamScanner

اس پر ممبر صاحب نے بات کاٹ دی 'ہاں بھئی ٹھیک ہے شفیق! اب للو پنجو شرفا کے ساتھ آ بیٹھتے ہیں۔ ہمارا مقدر ہماری ہاں، ہمارا الملا ہمارے مقابلے پر! آپ تو رئیس زادے ہیں، شیخ، فاروقی، خاص عرب سے۔"

خان بہادر صاحب نے کہا: "میاں فاروقی صاحب بہادر، آپ شریف زادے ہیں، بزرگوں کی روایات کا پاس کرو۔ ہماری نہیں تو اپنی عزت کا خیال کرو—"

فاروقی صاحب نے بات کاٹ دی، 'میرے بزرگوں نے تو یہاں غلاموں کو سپہ سالاری دی اور فتح کے بعد سرداری عطا کی اور بہادر غلاموں کے سر پر ہندوستان کا تاج پہنایا اور سلطان بعد کل غلاموں سے شہنشاہی کرائی۔ قبلہ میری بات سمجھیے، اگر آپ رول شودر کو بھی میرے مقابلے پر ڈال دیں گے تو میں اس کا چیلنج بڑی خوشی کے ساتھ قبول کروں گا جیسے کسی اچھوت نے شرسید سے ملنا ہو۔'

خان صاحب نے تلخ ہو کر نظریں چرا کر صاحب کی جانب روئے سخن کرتے ہوئے کہا
'لاحول ولا قوۃ! چھوڑو جی بلبیر سنگھ۔ ہاں جناب، ذرا ان سے پوچھو، ان مسٹر فاروقی صاحب کا سیکریٹری شپ کے مقابلے پر کس کا نام منظور ہے — سیوتی لال ہی نا؟"

"جی نہیں قبلہ، گلابو دختر سیوتی لال مالی۔"

ہوں، یہ بھی خوب رہی، کلمنڈی رانی جی ہوں گی؟ یہ گلابو، کوئی راج کنواری — ہیں نا؟"

'عورت نہیں مرد کے مقابلے پر، ارے بات نہیں جچتی — مقدر اپنا! آپ سیکریٹری جو ہیں۔"
مجمع میں سے پیچھے سے کوئی بڑبڑایا۔ فاروقی صاحب نے چونک کر دیکھا۔

'جی ہاں جی ہاں سیوتی لال مالی!' مسٹر فاروقی نے کہا۔

خان صاحب نام سنتے ہوئے بڑبڑائے: "ارے رو کلمنڈی کی چھ بات! تعجب ہے" اور یہ کہتے ہوئے اپنے ساتھی رائے بلبیر سنگھ کی جانب مخصوص دوری طلب نگاہوں سے دیکھا اور بڑی بڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بلبیر سنگھ بڑبڑائے:

'ہاتھی سے مینڈھا لڑے گا، ہنسے گا۔" (گاؤں)

بات حافظ رحمت خان روہیلہ اور شجاع الدولہ سے ہوتی ہوئی جنگ نکل کر لی قطب الدین خان، اور اب تک دور میں جا پہنچی تھی، اور پرتھوی راج سے چند اور محمد غوری و قطب الدین ایبک نے دو

چھیڑ رکھا رہی تھی۔ وہ تو خیریت گزری کہ راجہ مہیر سنگھ کے سر پر سے نکل گئی ورنہ خان صاحب نے نزاکت کا اندازہ کر کے آلی گئی کر دی۔ دوسرے ہی دن مقابلے کا وقت آ رہے آ رہے ہو گئی کہ رئیسوں کے مقابلے پر ایک ادنیٰ مل نے سیکرٹری صاحب لے کر آئے ہیں۔ پٹھان، بختاور، چھپات سے مقابلے پر ایک شور اور اس شہرت کے ساتھ ہی مسٹر فاروقی کی پوزیشن کو اس چھوٹے بڑوں سے مقام گئے میں حیرت، تعجب، غم و غصہ، قوت و سنگ کے انداز میں ہر شریک نشین نے اپنی اپنی فکر و استعداد کے مطابق محسوس کیا کہ سیوتی ... ماں تو سامنے پڑنے کی ہمت نہ کر سکا، تاہم ماں کی معصوم نوخیز لڑکی کا ہو، جو بیگمات، رانیوں اور رنگواریوں میں سے تاثی کشی بھوں جھندی سے بجا یا گئی تھی اور جو ٹیوں میں جس کی کھونے کی حسرت پیدا ہو گئی تھی، اس طرح کا ایک کھیل و مشغلہ تجویز ہو گئی۔

غلیستان مسٹر فاروقی نے سیکرٹری کی حیثیت سے مقابلے کا انعقاد کیا اور بجوں کے سامنے ادھر ادھر ہم پیش ہو رہے تھے وہ ... "جیتے معادی نہیں" سب جیتے جیتے سبھی اور ایک ہی بات تھی۔ "یہ انتہے انگریز منش سکتر صاحب بہادر لا کر مسلط کر دیے اور مقابلے پر کیسن کھڑا کر دیا۔ کون ماں، جدید بولی شرافت ہوں۔"

"یہ کون سی حماقت ہے۔ ویسے تو یہ بھی خاندانی شیخ ہیں، اور شیخ ہو کر یہ سید زادہ لٹھل ... حیرت ہے۔"

"انگریزی پڑھے ... والی وصف ... کی کیا جی نہیں بچا ... اور پھر شیخ تو شیخ ہی ہوتے ہیں۔ اپنے آپ ... اور بیٹھے بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ اگر زنج پتاوٹی مقابلے میں ہوتا تو یہ ماں ... مقابلے میں پاس بھی نہ ہوتا۔ برا زمانہ آ گیا۔ چودھویں صدی ہے چودھویں۔ قرب قیامت اور بادشاہیوں، امیروں اور رئیسوں کے منہ آ رہے ہیں، دیکھو نا۔"

"سب آبرو سے شیوہ ... نظر کی ... ماں، آ گیا سارے اودھ، ... لکھنؤ، مرشد آباد، دربھنگہ، ... پورے ہندوستان کے سامنے مقابلہ کرے۔ اللہ خیر کرے، وزن دینا دکھائے۔"

"تعجب ہے ... رام نہیں چڑھتا ... راجہ رام چندر جی پر؟ کیا نتیجہ ہو؟ ... (نکال) ... (نکاں)۔ یہ کی کڑکی ہندوستان بھر میں حشت ... چھڑ رہی ہے۔ بجلی سے ... کی بھی وجہ ہوں سے تو بنا کر چلتے ہی نہیں، ہمیشہ چوہانوں تو مردوں راٹھوروں، بھٹیوں

نے جیسی میں چماروں، کسانوں کی فوج لے کر دھاوے پر چڑھے، اور خود مست گئے، وراثت کو بھی میٹ دیا۔"

"یارب عزت! تو ہی نگہبان ہے شریفوں کی عزت کا سچ۔"

"اجی خان صاحب، عزت تو کل کی گھڑی جب ایک ادنیٰ شودر نے آپ کے مقابلے پر کھڑا کر دیا اس روپیے نے یقین شیخ نے، ہم سب شریفوں کے سامنے۔"

"جی صاحب، سب ملے ہوئے ہیں یہاں سے وہاں تک! ان روپیوں نے تو اپنے تخت پر ادنیٰ جات بٹھائے ہیں۔ تاریخ کھول کر دیکھ لیجیے۔ ان کے یہاں شرافت، نجابت، وراثت کب تھی؟ بس جو دولت چلا، سردار چمک جائے، وہی تخت پر بیٹھ کر تھے تھے روپیے جن کی بدولت راس کے سامنے جھکا کرتے تھے۔ یہ کیا جانیں شرافت، نجابت، وراثت کیا چیز ہوتی ہے۔"

اور ایک رؤسائے قصبہ شیخ نے جواب دیا جو یہ تمام چہ میگوئیاں سن رہے تھے "لیکن انگریز مشن سرکار نے مسند روتی کے ہاتھ میں اتنی مہلت دی تو دولت کو ہی نے دی۔"

"ہاں کسی دن، دولت ہی دلوں نے دیا، پھر دولت ہی وہ سے خلقت بھی رکھتے ہیں۔" ایک اور کے ٹھاکر صاحب بولے۔

"کیوں؟ میاں رؤسائے قصبہ اور یہ غریب مرشد آبادی اور سب رئیسوں کے مارے جنوبی مشرقی اس تو ہین میں کیسے شریک ہیں؟" شیخ بولے۔

"ہاں میاں، چودھری جوتا، داہی ہمارے پورے علاقے نے تو قائدے ایک ادنیٰ شودر کی ٹھوکر کراہی نا فطرتی رؤسائے قصبہ شیخ نے۔ ذرا سی صدی کا تماشا ہے یہ ظالم نے۔ یہ تو اس شیخ کے ہاتھ تھے، دیا تھا خاندان کی روپیہ بٹھا دیا سادات، مرد، سادات بڑے کی شریف نجیب، طفیل عزت کی دے دیتے۔ مگر ادھر کم اس کو شریفوں کی عزت کا پاس تو ہوتا۔ یہ شیخ تو ذرا ظرف کا صاحب سب کے سر پر جوتا کھلوا دیا۔ مفت میں غضب رے غضب!" (ص 194 تا 200)

*

اس مجلس عاملہ میں ابوالفضل صدیقی سے ہر دو مذہب سے تعلق کے اہم رؤسا کی متعدد ذات برادریوں و مراتب گفتگو دکھائے تاکہ زبان کے پیچ پیچ میں ہے لوگ اپنے بول چال سے تاثر کی

پر منکشف ہوں اور سمجھ لیا جائے کہ ان کرداروں کے نزدیک اعلیٰ روایات، شرافت، عزت، وراثت، ٹھیک، شیخ، سید، مغل، پٹھان، راجپوت، برہمن اور رام چندر جی کے معانی کیا ہیں، اور یہ لوگ معانی کے من چاہوں کو کس کس طرح اپنی ذات، طبقے کی اغراض کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

تین طویل کہانیوں کے مجموعے نصاف کی اوس کہانی "وحدہ" (صفحات 5 تا 98) میں بھی ابوالفضل نے ایک گفتگو خلق کی ہے۔ اس میں شریک افراد بھی سماج کے اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس سے مجولہ بالا مجلس عاملہ کے ارکان۔ یہ لوگ راجا نور ایشر سنگھ عرف چنٹو بابو کی دعوت پر ان کی آبائی جاگیر میں سیر و شکار کے لیے آئے ہیں۔ درج ذیل گفتگو کی ابتدا تو سیوتی نامی لڑکی کے حسن و جمال کے ذکر سے ہوئی ہے لیکن آگے بڑھتے بڑھتے ان رویوں اور افکار کا بھی پورا اظہار ہو گئی ہے جو گفتگو والوں کے ذہنوں اور ذہنوں میں عورت ذات کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔ اس گفتگو میں بھی ابوالفضل صدیقی نے ہر شخص کی بول چال کے مخصوص ڈھنگ، ان کے طبقے اور علاقے کی بولی ٹھولی، ان کے تاریخی پس منظر اور طرز فکر کو اتنی عمدگی سے منعکس کیا ہے کہ قاری کو مکالمے پڑھ کر ان کی علاقائیت کی داد دیے ہی بنتی ہے۔ اس گفتگو کے بین السطور سے بار بار ایک درندہ صفت حیوان کی جھلک ابھرتی ہے۔ حتیٰ کہ گفتگو پر ابوالفضل صدیقی نے مست اشتراک جیسے فقرے سے اس حیوان کی صورت و طینت کے سارے زاویے قاری کی روح پر کھول دیے ہیں۔ "اور تو گردوں کی آمد پر سب چہرے یکدم ہموار ہو گئے۔"

4

ادھر جب اس بار وہ دو روز سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا، بڑی محفل جمی ہوئی تھی۔ راجپوتی تو ضع و مہمان نوازی کو چنٹو بابو بڑے جوش کے ساتھ معرض مظاہرہ کر رہے تھے۔ رسم و رواج پورے زوروں پر تھی۔ شکار اور شراب، ضیافتیں، رقص کے لطف، ہوتی دوڑ دھوپ جشن جمشیدی کا سماں تھا۔ روایت تھی جب چنٹو بابو بستر سے اٹھ گئے۔ پتہ تھا کہ چودھری نے انہیں جھنجھوڑ دیا۔ ان کے اوپر سے لحاف اور فرغل کی تہیں کھسکنی شروع کیں۔ "یہ وحشت تیری ہی آسرا ہے اٹھیے اب صبح کی

Scanned with CamScanner

تی۔" شکی بابو چودھری کا انداز [illegible] تھیں [illegible] ہوئے مسکرائے اور چودھری کے سامنے کھڑا کھٹکھٹا رہا تھا۔

"[illegible] کام [illegible] سویرے ہی سویرے تو [illegible] کیوں [illegible] رہتا ہے؟" چودھری نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

[illegible] نے تسلی سے [illegible] پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا کر کہا "[illegible] میں [illegible] سیوتی [illegible] ہے [illegible] سے [illegible] ہاں، وہ سویرے ہی آ جاؤ [illegible] کام پہ گوبر کوڑا صفائی کرنے [illegible]"

"[illegible] سیوتی؟ وہ سیوتی [illegible] سیوتی ہی ہے۔" چودھری نے کہا۔

[illegible] نے ایک قہقہہ [illegible] کرتے ہوئے کہا "ہاں وہ سب چودھری جی [illegible]"

[illegible] حق [illegible] ہیں، [illegible] آپ [illegible] ہیں۔ [illegible] سب چودھری جی [illegible] اب تم زندہ [illegible] میں فرما رہے ہیں [illegible] جیسے [illegible] ہیں۔ الحمد اللہ تمام خدائی کا..."

شکی بابو نے چودھری کی بات کو [illegible] طرح جس طرح وہ ہمیشہ سے ان کی [illegible] باتیں [illegible] کیا کرتے تھے، ہنستے ہوئے کہا "کیسی ہنسی ہے؟"

اور پھر اس طرح جیسے کسی بچے کی شرارت پر مسکراتے ہیں، ان کی جانب دیکھ کر مسکراتا ہوا اور چودھری نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا "ہنسی کی ہے؟ ہوں، [illegible] مجھ سے پوچھو بات! [illegible] بڑے مسخرے [illegible] معلوم ہوتے ہو [illegible] ہو۔ بس دیکھ لی تمھاری ظرافت!"

"وہ تو بڑی ہنسی ہے؟ سچی بتاؤ، تمھیں پسند آئی ہماری [illegible]؟" چودھری [illegible] ایک سانس میں [illegible] پڑے چلی ہے۔ اب تو ہم بھی معلوم نہیں کہ..."

Scanned with CamScanner

"ارے یار، وہ تو جوہر ہے!" چودھری نے کہا اور مخصوص انداز میں سنجیدگی کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے سنگھ بابو نے اس کے منھ سے بات ... "ارے بھئی" اور ایک چرپائی کیا ایک جانب سے یہاں تو جو چیز نظر پڑے گی ویسی ہی نظر پڑے گی۔ وہ اور آپ نے وہاں اُدھر کی اصطبل میں میری جیسی گھوڑی نہیں دیکھی، کیسی پری پیکر ہے؟ اور پھر جس وقت دوڑے گا، قدم چلتی ہے تو پیٹھ پر بھرا کٹورا رکھ دو، کیا مجال جو بوند چھلک جائے۔ اور وہاں تمھیں میری موری بھینس اور گوری گائے نظر نہیں پڑی؟ ایک ایک دو دو تیس تیس دھڑی دوہتی ہیں۔ ایک بکری بھی ہے، یار، ان کے یہاں ... دیکھو گے تو ایک دیکھو گے! اور تم نے وہاں باڑے میں میری ... نہیں دیکھی؟ ... جاتی ہے، ایسی بے پھرتی ہے۔ اور تانگے میں جوت دو، دوست، جیپ ... رہ جاتا ہے۔ کہاں تک دیکھو گے یار، اور ہاں میرے کتے دو، منھ چھوڑ تمھارے، دودھ تک دکھا دو، ... پر تمھارے پر بچے نہ دیں، ... کرش دیں ... وہ۔"

اور چودھری نے بات کاٹتے ہوئے کہا، "ارے چپ بھی رہ یار! تمام خدائی کا ... گئے باتیں ہی کرنا آتی ہیں، اور کچھ نہیں۔ ہوں، ویسے تو بڑے بنتے ہو، تمھیں تو لوگ دکھائی پڑ جاتے ہیں، ایک ایک ... میں تو تو چھوڑتے ہو، اور گھر میں ... موندی ہیں کہ پاؤں تلے کی دکھائی نہیں پڑتی۔"

"نہیں دکھائی نہیں پڑتی؟" سنگھ نے اپنے ہی انداز میں کہا۔

"نہیں تو اور؟ ... وہ جو ہیں تمھاری ... ٹھکرائن رانی، جنھیں تمھارے ... سرمندہ گئے ہیں اور جن کے ... کی تم اور تمھاری ... دونوں دو برس سے ... رہے ہو، سو دوست ... کی چوکھٹ کتنی ہی اونچی ہو، ناک کیسی ہی ہو، مگر جوان ... کے پاؤں کی ایڑی کے برابر بھی نہیں۔"

اور سنگھ بابو نے قہقہہ لگایا اور ٹھنڈے ... میں کہا، "تو پھر میں کیا کروں؟"

"... کرتا یار، خود نہیں تو میرے بتانے ... جاتا۔ ... میں تو یہ کرتا کہ ٹھکرائن کو ... اس ... پر ... تا، اور ... کو رانی بنا کر حویلی میں ... " چودھری نے تمسخر ... تھکا ... انداز بنا کر کہا اور سنگھ ... نے قہقہہ لگایا۔ ساتھ ہی ... میں ادھر ادھر سے دوست ہنس پڑے اور چودھری

اپنی مدد سے کہتا رہا، "اماں بیٹھے ہو؟ رونے کا مقام ہے۔ واللہ اس نے تو کم بخت رنجیتوں کی ناک کٹا دی۔ اپنی جیسی عورتوں کو مات کر دیا۔ کیسے فخر کرتے تھے کہ میں پیدا ہوتے اور جب پیار اپنی نامردی چھپاتے ہوئے رہے تھی، یہ نہیں جانتا کہ عورت مرد کی غذا ہے۔ پھر تھوڑے کسی کی یاری کس نے فرمائی؟ اور دونوں طرف یہ دیوانی جوانی اتو بہ توبہ! اجی مہاراج صاحب، ذرا نظر کر دیکھو تو، یہیں اس کی جڑ کی ہوئی ہے، اور اس نامرد سے پر کچھ نہیں۔"

اور منگھو بابو نے ذرا جھینپ کر ہنستے ہوئے کہا، "ار چودھری یہ بتاؤ ہماری جبریا بھابی چودھرائن کے مقابلے پر کیسی ہے؟"

"یہ کیا پوچھتے ہیں، اور ہم تو آپ کے بڑے قدر دان ہیں۔ دیکھیے کل تمھیں جب تیرے بوڑھے کی صفائی پر، یک مجبوڑ سر چودھرائن۔ کچھ ہم تیری طرف کوئی ... مدتے دستے تو کیسی کہ ہم سے عزت میں فرق نہ کریں۔" چودھری نے تمسخرانہ سنجیدگی سے کہا۔

اور منگھو بابو نے گردن جھکا کر اس کا چہرہ غور سے دیکھا، گویا کسی نے خنجر پیٹ میں لگا دیا ہو؟ اور پھر ذرا سنجیدگی سے ختم کرتی ہوئی سی بات کہی: "چھوڑ یار چودھری، ... ہمارے یہاں رعایا تو نہیں سمجھتے چلے آئے ہیں۔"

"ارے، ہم راجہ نہیں تو پھر اور کیا ہیں! ابھی ہاتھ جوڑے تو دیکھو رب اتنی منہ سے سبحان اللہ نکلا ہی ہمارے — آں اور پھر تیرے اوپر لعنت اللہ۔"

اور منگھو بابو نے پھر بات کا رخ بدلنا چاہا اور زیادہ سنجیدگی سے کہا، "سنو بھیا چودھری، ہمارے بزرگوں سے گاؤں کی بہو بیٹی ماں بہن برابر رہی ہے۔" اور پھر اپنی حمایت میں ماسٹر برکت علی کی جانب دیکھ کر چاہی جو اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور ایک سگریٹ سلگانے میں لگے۔ مسکرا مسکرا کر ان دونوں کی نوک جھونک دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے کہا:

"دیکھیے منگھو بابو، ہم اور آپ اس وقت مادیت اور ... کے دور میں ہیں۔ خدا کے فضل سے اس وقت ہم میں یہاں کوئی بھی ایسا شخص جو تعلیم یافتہ ہو ... کہ بہن ... ہو سکتی ہے اور نہ بیٹی ہی۔ ... کوئی چیز یاد ہو ... کنارہ، ہر حضرات ... کی ... بہن بیٹی نہیں ہو سکتی۔ اور کسی آج کل تو ہر چیز کا ... اور حقیقت تجربہ ہو چکا۔ ... ماں بہن بیٹی ...

رشتوں میں اختلاط، بیالوجیکل ریسرچ کے مطابق نسلِ انسانی کے لیے مضر اور قاطع ہے، ورنہ آپ کی ن خلاقی قدروں پر بھی کسی کی ضرب پڑ نہیں ہوتی اور آج آپ تعلیم یافتہ ہو کر ایک چماری کو بہن بنا رہے ہیں۔"

اور ان کے منہ سے بات سے کر چودھری پھر بول پڑا، "جی ہاں ٹھاکر صاحب، بارہ برس رتی مٹی سے، پھر جنگل کا پانچ برس کا پور اور پھر پانچ برس میکینکل فارمنگ کے بعد بھلا نوک زباں تک رہے وہ اخلاقی قدریں 'دنیا بھر کی ہر عورت ماں بہن نانی نواسی وغیرہ۔ اور گاؤں کی چماری' اب کیا کہوں، اور پھر اسی کا فرآ آپ کی شاید ہمشیر دعزیزہ' تو پھر جورو بھی کوئی غریب بنے گی؟ ایں؟ اور پھر بابا، اللہ نے آنکھیں دی ہیں۔ ذرا انھوں کر یہ دیکھو کہ چماری کے روپ میں ترکی کی زگنن۔ اور یہ ماں بہن بنانے کے رتی ہے یہ جورو؟ اور ماں بہن بنانے کو پورا گاؤں پڑا ہے۔ سیکڑوں کالی کھری بڑھی بڑھی موجود ہیں۔ چاہے ماں بناؤ چاہے نانی کہو۔ مگر بعدِ وحدہٗ اس کا فرادا عورت کو ایسا دمی کو تو بھی کہہ کر اپنی بدذوقی اور مجبوری کا ثبوت مت دو۔"

"نہیں بھئی یار چودھری یہ آج تک ہمارے یہاں ہوا اور ہوں... اس لیے وہ بات ہے ہو نہیں سکتی۔"

"جی ہاں آپ نے یہ بات کیسے نہیں ہو سکتی؟ کیا مطلب، تمھارے یہاں جو آج یہ سب کچھ ہو رہا ہے وہی سب ہوتا چلا آ رہا ہے؟ یہ نعمتے کا جنگل اور فیکٹری کی اسکیم، میکینیکل فارمنگ اور کیا کیا اور یہ تو تمھاری Un-natural approch ہے۔" اور انھوں نے مسٹر پربت سنگھ کی جانب دیکھا اور مسٹر پربت سنگھ نے کہا:

"...شاعر کہتا ہے: But who can view the ripen rose nor seek to "wear

"جی خیر، وہ تو شاعر تھا، ہمارا مذہب ہوتے ہوئے بھی کیسا رنگ تھا ایسی ہی کوئی کھلی سیوتی دیکھ کر کھل اٹھا:

چو یاد بوئے گل خواہد کہ چیند
چو بیند روئے گل خواہد کہ چیند

لیجیے، اب تو کچھ گنجائش ہی نہ رہی۔"

"لو، دادی سے بھی تائید ہو گئی!" پربت سنگھ نے نیم مزاحیہ انداز میں کہا اور پھر ذرا سنجیدہ ہو کر سائنٹیفک انداز میں بولے، "بھلا آپ کے یہاں یہ روایتی رشتے داریاں نبھائی جاتی ہیں، دفتروں اور فیکٹریوں میں کیا ہوتا ہے؟ ہر نوجوان مزدورن لڑکیوں پر رکھی جاتی ہے۔ اور خیر یہ آپ کی چماری جیسی ہو، اور یہ آپ کسی ونڈیا یہ کہیں جا پھنسے تو خیر قیامت ہی آ جاتی۔ اور منیجر، جنرل منیجر چھوڑ، ڈائریکٹر اور چیئرمین تک گھڑدوڑ مچ جاتی۔ ویسے مسلم امرے مل فیکٹری میں ہر جوان عورت کو خواہ کیسی ہی کالی بھدی کیوں نہ ہو، اس عورت ہو — اوس آپ، وہ تو کسی نہ کسی چھوٹے بڑے اسٹاف ممبر کے مرہون ہونا ہی پڑتا ہے ورنہ، میں آپ سے پوچھتا ہوں، کل کو جو یہ کھاد فیکٹری سے جنگل کی سکیم اور مال کی سپلائی کے سلسلے میں یہیں کام پر جانے کی تو بھی معاف کرنا سکھ، پوچھو، مسٹر ایسٹ، پوسٹ وغیرہ جو آج دن یہاں اور سے بھی بچے رہیں گے، آپ کی طرح حلالی اندھے تو نہ ہوں گے وہ تو بھی، جیسا کہ انگریزی فارسی میں بھی کہہ چکے ہیں، دیکھیں گے پھر تو جب جانے کی مزے کی دور کیوں جاؤ، ہمارے پہاڑی میں، کچھ دن پہلی زبردستی چلی آتی ہے۔ ہر نام ہی لونڈیا جیسے فارغ ہوتے ہی زمیندار پٹیل نمبردار کے گھر پہنچ جاتی ہے اور جب تک وہ رکھے اس کے ساتھ رہتی ہے اور پھر جب کچھ کھیا پٹواری وغیرہ سے گزرتی گزرتی چار چھ مہینے میں کہیں جا کر بیاہی جاتی ہے تو دھوم سے ڈولے، نہ زمیندار کو چڑھ جاتا ہے، کیسے۔"

"ارے صاحب! دنیا جہاں کا سو رشتہ ہے۔ کسی کا بابا آدم نرالا ہے۔" چودھری نے پربت سنگھ کی سیدھی بات سے کترا کر جھٹکے سے کہا اور ادھر ادھر بستروں پر بیٹھے ہوئے زنانے کی جانب نظر گھما کر کہا، "یہ باپ، بیٹی، بہن، بھائی، نانی نواسی کی باتیں ان میں ہی سنیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان رشتوں کے ناموں کی آڑ میں بڑی چھپاتے ہیں۔" اور وہ سیلسمینڈ کی رئیس زادے بے کھو بیٹھے ہے، مگر چودھری پوری لسانی سے مسٹر پربت سنگھ کو مخاطب بنائے سب کو سناتا رہا۔

"اور پربت سنگھ، دوں آں، اور ہمارے یہاں تو آپ سے بھی پہلے بھی اختیار نہیں کرتے پہلے ہی پکڑ و لیتے ہیں۔ جہاں کوئی لونڈیا ذرا کاٹ چھانٹ سے درست ہوئی

بھرتی نظر آتی۔ ہاں، اور آپ کے وہاں تو خیر آدمی پر بھی قیمت چڑھنے میں آتی ہے، ورنہ ہمارے یہاں اگر بکتی ہے تو سب کی سب رقم بقایا نکال کے سو میں سوا پیسہ ہو جاتی ہے۔ اور بھائی صاحب، یہ روایتیں اب تک انھیں روہیلکھنڈیوں نامردوں میں ملیں گی۔" چودھری نے پھر ایک بڑی سی چٹکی لی۔

اور جیسے روہیلکھنڈ کے ساتوں ضلعوں میں کھلبلی سی مچ گئی اور چودھری کی چوٹ پر اور سب کے سب روہیلکھنڈی رئیس زادے اپنے اپنے بستروں میں اچھل پڑے اور کرنل ناہر سنگھ راٹھور اور کنور روپ سنگھ تو مع ایک منہ بول پڑے۔

"ارے چودھری صاحب! بھلا ہم سب روہیلکھنڈیوں کو کیوں بدنام کرتے ہیں آپ! یہاں جو ہاں نامردوں کی کچھ پرانی آن چلی آئی ہے آج تک۔ بدنام کنندہ نکو نامے چند۔ ٹھیک کہتے ہیں آپ، نہ معلوم نامردے ہیں کہ کون، جو کچھ بھی آپ کہیں حق بجانب۔ مگر اس میں شک نہیں کہ پہلے بھی بہت سے خاندانوں میں کچھ یہی بات۔ مگر پھر بھی، جیسا کہ آپ نے بھی فرمایا، ہماری طرف یہ قومیں صورت شکل سے بہت گری ہوئی ہوتی ہیں، تو پھر یہی روایت ٹھیک تھی۔ چلو، وہ پہلے بھی گھر میں کوئی رنگیلی سرچ جاتی، جیسے کہ ابھی آپ نے فرمایا کہ ہم آج کل سب وہی کر رہے ہیں جو ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے، اور پہلے تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ یہی غلطی نہیں کرتے تھے کہ ایسی مد کو جیسی آج شیخ بابو کے سامنے ہے، اپنے اوپر حرام کر کے نہ چکھیں۔ وہاں بہشتی بٹی بنانے کے لیے ہزاروں نان بہشتی والی کھتری پڑی ہیں۔"

اور ان کے منہ سے صاحبزادہ معشوق زماں خاں نے بات لے کر کہا: "اور حضور سمجھے، ان کی کیا تھی یہ صاحب! ہمارے جد امجد کی، جن کا اسم حضور نے نام لیا۔ ہے ہے، خیر سے ایک ایک کے ہزار ہزار رنڈی بندھی رہتی تھیں۔ آپ ہاتھیوں چڑھتے چڑھتے پھرتے تھے، پیچھے پیچھے بیگماتیں، ونڈیوں، باندیوں کی ہزار پا سال ہو داروں چلی آتی تھیں۔ حکیم کمر بند میں بندھے بندھے پھرتے تھے، سیکڑوں کشتے طلائیں، معجونیں لیے۔"

اور مسٹر پربھات سنگھ اور چودھری دونوں صاحب معشوق زماں سے اس دوران میں متعارف ہو چکے تھے، اور ان کے کلاسیکل ڈانس اور گون لگانے والی، دونوں خدمات جو عوام سے وراثت در روایت میں پائے تھے، چند روز کے قیام ہی میں بچشم خود دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ ان کی

جناب مسکرا کر رہ گئے اور مسٹر پربت سنگھ نے کہا:

"ٹھیک فرماتے ہیں آپ مشفق میاں۔ لیکن پول کھلتا ہے کہ راجہ مان سنگھ کے ہمدرد سو حرم تھیں۔"

اور چودھری نے ان کے کلام کو بڑھایا: "اور ہمارے پیا جان عالم کی تو معلوم تھی ان دونوں روٹھنے پر یک ہیں۔ اور بغیر ان کے پورا پورا انتقام ناممکن تھا صاحب! بالکل صحیح، ورنہ ہمارے اب بھی دو چار بڑے بڑے شخصوں دیکھے نکل آئیں گے۔"

اور سب روہیلکھنڈی شہزادوں نے اپنے اٹھارویں صدی کے سردار "قار" اور مردان علی خاں صاحب بہادر بیبلہ کی جانب دیکھا جن کے جد امجد نے روہیلکھنڈ کے ساتھ اصولوں نے ایک چھوٹے سے یونٹ کو ورن ہیسٹنگز اور شجاع الدولہ جیسی طاقتوں سے ٹکراؤ کا اعلیٰ شعور دیا تھا، اور بات چودھری سے ہو رہی تھی، جو ایک اودھ کا شہزادہ تھا جن کے تمدن کی اعلیٰ اقدار کو دہلی نے تمدن کے ساتھ مل کر ایک انفرادی روہیلکھنڈی کلچر نے جنم دیا تھا اور نواب زادہ مردان علی خاں نے تاجدار جد مجید حافظ رحمت خاں کی مورتی کی ہر سال دسہرے پر آج تک سب روہیلکھنڈی راجپوت پوجا کرتے ہیں۔ بہرحال اس مرتبہ خاص طور پر نواب زادہ مردان علی خاں اپنی تاریخی سیادت کو چودھری کی ادا سے بھی اس مخصوص پارٹی میں محسوس کر رہے تھے اور بت بنے ہوئے تھے اور اپنی خاندانی سیادت کا ان سب کے درمیان اظہار کیے بیٹھے تھے۔ ان کے متوجہ ہونے پر انھوں نے اپنے حلق سے ہونٹوں تک بھرے تہہ بہ تہہ دریب سے آزاد کر کے بولنے کے لیے منہ خالی کرنے کو ادھر ادھر دیکھا اور جب کوئی خدمتگار نظر نہ آیا تو راجپوت کر برابر کے اسٹول سے اگالدان اٹھایا اور نہایت نفاست کے ساتھ خوشبودار پیک تھوکی اور پھر فشانی کے لیے تیار ہوئے۔ اور پھر "ہوں" نکال کر دو ایک منٹ چپ رہے، جیسے قطعی آخری ٹوک کے لیے درست ہو کر سامعین کو متوجہ کیا اور بہ محققانہ انداز میں فرمایا:

"ارے صاحب، کہاں پہنچے آپ حضرات بھی واجد علی شاہی اور اکبری ادوار میں آئے، دیکھیے نا، زندہ مثال سامنے ہے ہمارے ہز ہائی نس شیوکرن بہادر سنگھ آف کے تمس ہوتے ہوئے یہاں موجود ہیں۔ اور یہ تو رہا آپ کے پنجاب کا، اور ہمارے روہیلکھنڈ میں چھوٹے بڑے دیہاتی روسا کی بھی صورت ہے جو نور دیہاں سنگھ نے بیان کی۔ اور پیسے تو ہمارے دیہات میں چھوٹی قومیں رکھتی ہیں۔

درحال حال کبھی کوئی۔۔ اوں، ہں، اگر کوئی کہیں قبول صورت دیہاتن دکھائی دیتی ہے تو یہ لوگ بلا تکلف پکڑ بلاتے ہیں اور رہا ہم، آں ان لوگوں کا رجحان صنف نازک کی جانب ہوں ... آپ ذرا کم ہی ہے۔ اور چودھری صاحب وہ، اوں، آپ کی اس غذا کی غذائیت زیادہ رہتی نہیں انھیں۔۔ اوں!" اور انھوں نے صاحبزادہ معشوق زماں خاں کی جانب تصدیق طلب نظروں سے دیکھا۔

اور صاحبزادہ صاحب نے نگاہیں اٹھائیں، پھر بدستور جھکا کر مخصوص انداز میں ہاتھ چلاتے ہوئے، گویا نس نس سے پھڑک کر، اپنی ناک میں سے لمحہ چھوڑتی آواز میں بول پڑے، "اور دور کیوں جاؤ، اے حضت، یوں تو ہمارے سرکار خلد آشیانی ہز ہائی نیس مرحوم و مغفور کے خود خیر سے آن سوا سو سے زیادہ بیگمات اللہ رکھے بخشی ہیں، چوڑیاں پھوڑے، اللہ کی بندیاں۔ حالانکہ اللہ بخشے، حضت مرحوم کا ذوق بالکل ایرانی تھا مگر پھر بھی ... وزیر زادہ صاحب، آپ نے پنجاب کی تتاری ورنہ بتائی تو یہ اپنے دکن کی! یہ ہمارے وزیر دکن مہاراج، آپ دیکھا آؤ جاتے نا، پنجابی کے معصوم تختی سیدہ ورنہ تنگ اجاڑے۔"

اور اتنے میں چائے آگئی اور بات کٹ گئی اور نوکروں کی آمد پر سب چہرے یک دم ہموار ہو گئے اور صاحبزادہ، لال، وزیرزادہ، رن تور، سب اپنے اپنے سلی روپ نے یا رہے چڑھا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور چائے کی میز کی جانب متوجہ ہو گئے، جس پر بجھ ان کی اپنی اپنی مخصوص غذاؤں سے ورسب غذائیں سجی رہی تھیں۔ (ص 24 تا 36)

❁

اسی کہانی میں دھورا اور چترسنگھ (عرف چتریا) نامی کرداروں کا ایک مختصر مکالمہ (اقتباس 5) قلم بند کرتے ہوئے ابوالفضل صدیقی نے روہیلکھنڈ کی دیہی بولی اور چتریا کی باتوں میں وہاں کا نسوانی محاورہ خاص طور سے استعمال کیا ہے۔ علاوہ ازیں مجموعے حوالامکھ کی کہانی "نکر" (صفحہ 71 تا 94) میں ایک خانہ بدوش مستی کی ترارہ اور نامبر سنگھ نامی ٹھاکر کی گفتگو (اقتباس 6) ان کے علاقائی لب و لہجے کی مثال پیش کرتی ہے۔ اقتباس 4، 5 اور 6 سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابوالفضل صدیقی نے عمداً یا شعوری طور پر مختلف علاقوں کی زبان کے رنگ اور افراد کے طرز گفتار اپنی کہانیوں میں محفوظ کیے ہیں۔

5

اور چتریا نے اپنی آنکھوں کے مخصوص قسم کے زاویے ترچھے انداز سے نفرت کے ساتھ فاتحانہ تیوروں سے دھارا کی جانب دیکھا کولھے مٹکا کر وہ ہاتھ نچا کر کہا: "ہیں رے رنڈی، تو کون موکی، سے چولھے میں جھونک تو" اور پھر مٹک کر رہ گئی اور دھارا کے مستفسر اشارے پر کہا: "داتا بابو کی آنکھ چڑھ گئی وہ تیری سیوتی، دیکھو" اور بھنویں مٹکا کر اور گردن تھرکا کر: "اب لے بیٹھی ٹھکی، کلموے واری جا..."

اور دھارا اس کی اس بالکل نئی بات پر کچھ چونک سی پڑی اور وہ ٹھاکر بابو کو جس پہلو سے اور سب پہلوؤں سے بھی طرح پہچانتا تھا، اس نے انکشاف پر سے یقین نہ آیا۔ اس نے کہا: "ارے چتریا، ٹھاکر بابو کو کا ہے کے بے سنت بیت ہے۔ ہم تو ہم بھی پہچانت ہیں ٹھاکر بابو کا معلوم ہے تو را جانی کا رہے، ہم تم سمجھیں گے۔"

"ارے ہاں رے، اب تو ہم تیرے سامنے سے ہٹ گئے اب تو ہے اور ٹھاکر بابو — ہاتھی سے گنا لینو ہے، سنبھل جا رے کلموے۔"

"ارے چتری سنی، ہمیں تو تیری خطرات [illegible] (تھی) [illegible] وہ ہم [illegible] میں دھان [illegible] کے یہاں سے کچھ بھی (ہوئی) ہے، [illegible] بھی ہے۔"

"ارے گنگا ماتے (گنگا مانتا ہوں) تو قل سکا رے (سویرے سے) [illegible] جتنی دیر سیوتی اور دوا تو ہے بار کرت ہے، ٹھاکر بابو پیچھے پیچھے پھرت ہیں، اور [illegible] سے [illegible] میں گئے دھرم چنچل کا سا۔ ہماری سونے گل [illegible] دیکھیے۔"

'بس چتری کی تھاری [illegible] (یہ) مکاریوں ہم بہت دیکھت رہت ساری عمر۔ ٹھاکر بابا بچوں سے کوکا ہے کے لیس بیچ میں لائے بات کرت ہے۔"

'دھارا کیسی بات کرت ہو، چھوٹی گنگا کو ہماری بیچھے ہے اور بڑی اور (طرف) [illegible] ٹھاکر بابو تو آج کل میں پکڑ لیں گے۔"

"رے چپ رہو، کیوں بکت (بکتے) ہو، پکارتی [illegible] (ماتا) [illegible] ..."

''سنگی بابو، سنگی، سنگھ بابو اور بھیا ہمارا، ہم تو ہٹ گئے چھوڑ میداں۔ دیکھیں اب تم کیسے بیر بکرماجیت ہو۔ ہتھی بیڑھا کی ٹھرے، تیری سنگھ، بوکی چھوٹ ہے۔''

اور دھارے جیسے ایک کبڑیلی جھٹکے سے دراز ھیلا سا ہوا اور پھر تن گیا۔ ''ارے سنگھ، بوکی تو ہماری پانچ برس کی چھوٹ ہے۔ اب تے ٹھا کو جنگل نکالیں تو دیکھی جائے گی — ہم تو بیٹھنے کے لیے آپ جیسیں ہیں، کل نہیں آج سہی!''

''بس دیکھ لی تمھاری ساتھی دھاران اپنے نہ مچھیا (بغیر مونچھوں والے) لونڈوں کے سامنے باتیں ہاروکرو، چتری کے سامنے بے باتیں مت ہارو کرو۔'' اور پھر طنزیہ انداز کو اور تیز کر کے سلسلۂ کلام جاری رکھا، ''بھاریہ پر تم نے دو تمھارے ان بگلا بھگت گوروجی نے بہت اپاڑی۔ باپ دادا کی چار بیگھے پکڑیا کا ٹھوسے دے کے چھپے۔ وہ گتھا کو جنگل تو اچھے دور ہے اساڑھ میں دیکھو تو پہلے آج اس جیپٹ کو تو روٹ لے مٹی میں دکھائی دے گو (دکھائی دے گا)، اور کانپورسے پرلی اور چڑھے لیے جیسے مڑھا (گھر)، جہاں تیرا نال گڑھا ہے۔'' چتریا نے کہا اور دھرا پلی کر چلا گیا۔

(ص64تا66)

6

خانہ بدوش کو راشور گڑھ کے قریب ٹھہرے ہوئے دوسرا روز تھا کہ شام کے وقت ٹاہر سنگھ نے اُسے بلوالیا اور کہا:

''کیوں رے مداری، اپنا مینڈھا بیچت ہے؟''

''ہے ٹھاکر جی! یہ ہمرے کھانے کمانے کا ٹھکرا ہے، بیچ کیسے دیں؟''

''پچاس روپیے لے اور چھوڑ مینڈھا۔''

''ناہیں سرکار راجہ جی بیچت ناہیں۔''

''چھپا پچیتہ لیو اور چھوڑ، دے رتی ہمارے ہاتھ مینڈھا کی'' ٹھاکر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ناہیں! یہ تو ہمارے پیٹ کا دھندا اور پریم سوک (شوق) کا سہارا ہے۔'' ٹھاکر کے اندر کا ٹھیک مقابلہ سا کرتے ہوئے کہا۔

Scanned with CamScanner

"اچھا چل، چار سے مندار سو روپیا تو رے ہاتھ دھرے، دو مینڈھا ہمیں پکڑ دے۔"
یہ کر کے اپنی پندار میں آسمان کی بلندیوں سے بولتے ہوئے کہا۔

"نا رجا جی، تیری گڈی ہی رہے! سو روپیا کے ان بیٹھے کے کھاٹے کو صدری؟ ویسے مینڈھا تیرو ہے، میرے مہاراج! ایسے تو آج مار دیوں تجھے میں — سو اور پچاس روپیا کی بابت "

اور فی الفور میں جیسے یک دم مخصوص کھلاڑی والا احساس بیدار ہو گیا — جیسے ایک رنگ سا آیا۔ وہ پھر سنبھلا اور تیوروں میں خود بخود مساوات کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اب تک وہ بیچ اس اقتصادی شکست کا دوسرے پیشے سے مقابلہ کرنا چاہتا۔ بالکل اسی لہجے اور تیور سے جیسے دوستی برابر والے مد مقابل دوست سے معاملے والی بات کر رہا ہے۔

"اچھا تو پھر سنا گسائیں جی، ایک ایک ٹکر دیکھیں گے۔ دیکھیں تو جرا کیسی بنیا ہے تمھاری! سیر بھر پکی چاندی پہ تو لات مار دی۔"

"ہے سرکار! تیری میری کہا لڑائی۔ ہاتھی کی ٹکر ہاتھی روکت ہے۔ راجہ ہاتھی صندری مینڈھا۔"

"نا گسائیں جی، میں کہا بات۔ مینڈھا صورت کی سے ہیں، ور یا پٹھی ڈال کو جات ہیں" (اس میں کیا بات ہے۔ مینڈھے لڑتے ہی ہیں لڑنے ہی کو پالے جاتے ہیں۔)

"اے راجہ! تو رہے، ہم پرجا۔ راجہ پرجا کی کہا لڑائی؟"

"نا گسائیں جی، ہم تو لڑائیں کل سویرا کو ضرور بدے کے۔"

"پھر سوچ لے ٹھاکر! ٹھاکر باپ اور مندار ی بیٹا — باپ بیٹا کی کیا بات؟"

"اوں ہوں! ہم تو دیکھیں گے، ٹکریں۔ دیکھیں تو کیسی ہے تمھاری بنیا کس بل کی۔"

"میرے مالک! مداری تیرو واڑ بنیا تیری ابو (وہ بھی) مینڈھا تیرا خسیو (یہ بھی) مینڈھا تیرا — پھر ٹکر کران کی کہا ماری جات ہے؟"

"نا رے! ہم کل سکارے (سویرے) کو ٹکر دیکھیں۔"

"اچھا تو پھر، رجا جی کی جے ہن ہے، تو کر دیں تیار مینڈھا کو" (ص 77 تا 79)

❀

یہ بتانے کے لیے کہ نوکِ زبان سے خود کو اعلیٰ روایت اور شرافت و عزت کے وارث قرار دینے والے، شیخ، مغل، سید، پٹھان، راجپوت، برہمن، ۔۔ باطن کس درجے پر فائز ہیں، ابوالفضل صدیقی نے گلابو کو پوبیس کی سیڑھیاں چڑھتے دکھا کر (اقتباس 7) اپنے قاری کی بصارت و سماعت پر ان خواص کے چہروں مہروں اور آوازوں سے ادھڑتی اصلیت کا رنگ ہی بولتا ہوا محسوس دیا ہے جیسا کہانی ''دھارا'' (اقتباس 4) میں دکھایا تھا۔

7

مقدمے سے آم پہلے بارہ دری کے ایک کمرے میں جمع کیے گئے۔ خوبصورت، سرخ سبز نیلے پیلے کاغذ اور رنگین ڈھکنوں سے ڈھکی ہوئی ٹوکریاں، اندر آموں پر چاندی کے ورق لگے ہوئے۔ باہر سے جو آم مدعوئین پارسل آئے تھے ان کا کوئی نمائندہ اگر ساتھ نہیں آیا تھا تو سیکرٹری کو خود اپنے ہاتھ سے پیش کرنا تھے۔ کسی منچلے شاعر مزاج شوقین نے برف کی سل میں آم جما کر اور سل توڑ کر پیش کیے، کوئی رو پہلی سنہری کٹوروں میں لگا کر لایا اور کوئی شیشے کے جھاڑی مرتبانوں کے اندر! کوئی پتوں میں سجا کر اور کوئی نفاست کے ساتھ صندل، آبنوس، ہاتھی دانت کی پٹاریوں میں لگا کر۔ ور نمائش شروع ہونے سے ذرا قبل گلابو سر پر اپنے آموں کی ڈلیا لے کر پہنچی، دونوں ہاتھوں سے اگڑی کی صورت سر پر سنبھالے! ویسے ہی جیسے بچپن سے دیوان خانے کے آنگن سے گزرتی پھولمنڈی کی ڈیوڑھی زنانہ خانے کی ڈیوڑھی میں جایا کرتی تھی۔ ۔ ماحول سے بے خبر، بھولے پن کے ساتھ گزرتی چلی جاتی، در حویلی میں بیگموں، بہوؤں اور رات کنواریوں، صاحبزادیوں میں اس طرح گھل مل جاتی جیسے یہ انھیں میں سے ایک ہے۔ مگر اس وقت پوبیس کی پہلی سیڑھی سے ساتویں سیڑھی تک چڑھتے چڑھتے چودہ سے چودہ، یک مشت ہو گئے۔ نوجوان زمینداروں میں بزرگوں کی موجودگی کے سبب صرف تالیاں بجیں اور ٹھنڈی سانسیں بھری گئیں۔ منچلے جوان سال لوٹ پوٹ ہو کر آپس میں دو ایک آسنوں تک رہ گئے۔ گدگدی کو دبانے کے لیے غیر شعوری طور پر آہستہ آہستہ ہاتھ چھاتی تک پہنچ گئے دو ایک خشک رہ گئے، کسی نے ہلکا سا آوازہ کسا! اور تو اور، چیف منشی بوڑھوں تک کے چہرے تمتما گئے اور جیسے اپنا زمانہ یاد آ کر جیسے مسلط ہو گیا۔

"آمن انگوری ہے — امی..."

"جی — مس فرخی" "ہوں ہوں، آمس حسن آرا۔" "بھئی یہ تو آمن عروس ہے" "... یہ بجتے ہو یار، برانڈ آف رشیا!" "ارے ارے گالا ہے، وہ سیوتی لال کی ہنڈیا۔" "وہ ہو، کیسے رنگین پر پرزے نکالے ہیں خانم نے! اچیت کی تتلی ہو رہی ہے، بچی تتلی!" "بھادوں کی دھنک کہو..." "اجی یہ بند آم نمائش میں سے کر آئی ہے یہ خود؟" "جی تو دریافت بے ملتے ہیں روہیلکھنڈی انگریز منش سیکرٹری صاحب بہادر کی" "بچئے میرے مالک" "کون جیت پائے گا اس سے! کیا روہیلکھنڈ سے ساتھ لائے ہیں صاحب بہادر؟" "نہیں جی، وہ سیوتی لال استاد مالی کی بیٹی ہے۔"

دراں حالیکہ ان دیدہ ور لوگوں کے درمیان معصومہ چال چلتی، معززین سے دلوں کو پامال کرتی، مسز فاروقی کی رہنمائی میں ججوں کے بورڈ کے سامنے جا پہنچی۔ اور یہ آخری آزمائش تھی جس سے پیشتر خوب تھوڑی بہت بحث تمحیص، مقابلے میں آنے والے ہر آم کا نام، موجد کا نام اور حسب نسب لکھے رہے تھے اور پلکیں چکو کر میر دیتے رہے تھے، اور سب سے آخر میں گاؤں والی آئی۔ کیٹے نے بیتاں سے مٹھی پوری ٹوکری یوں ہی اٹھا کر سامنے والی میز پر رکھ دی۔ ججوں نے دریافت کرنے والے نام پوچھا تو بولی: "لکھو مالن۔" مزید حریف پوچھتی تو وجہ بولنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن مسز فاروقی نے لقمہ دیا:

"دختر سیوتی لال مالی۔"

مقدمہ کا نام پوچھا تو لڑکی کچھ دیکھنے لگی۔ فاروقی صاحب نے عجیب بات بتائی:

"وہ روہیلکھنڈ۔"

جج کچھ دیر تک شش و پنج میں پڑے مگر یہ ان کے جیوری کی بات نہ تھی، انہیں تو آم کا درجہ طے کرنا تھا؛ یہ عمل ما بعد تھا جوں نے ججوں کا ٹون نوٹ کریں۔ آم کا نام پوچھا تو لڑکی تو بے جواب رہی، یہ چیز مسز فاروقی صاحب بھی ججوں کے تھے ڈر گئے، کچھ توقف سے کہہ رہے ہوئے، گلاب خاص، گلاب خاص، گلاب خاص نہ تا؟ یہ کیا ہو؟ اور کا بڑے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تاشیں ججوں کو چیت میں بیٹھ کر بیٹھ گئیں۔ کچھ کر تھوڑی تو تھے۔ اور کا ہوئے

ڈبیا کے اوپر سے کیلے کا پتا ہٹایا، جیسے دیسی گلاب کے پھولوں سے بھری ٹوکری اسا تھ ہی آم کی مخصوص خوشبو کے ساتھ ملی ہلکی گلاب کی خوشبو بالکل ناک میں پہنچی تو چونکے۔ ادھر قاش منہ کے اندر پہنچتے ہی یہ گلاب کی خوشبو بالکل نمایاں ہوئی۔ بے اختیار منہ سے سبحان اللہ نکلا اور گلابو جلدی جلدی قاشیں کاٹ کاٹ کر پلیٹوں میں رکھنے لگی۔ حسب نسب اور اصلی تخمی درخت کی جائے وقوع پوچھی تو کوے کی کھا کر پھینکی گٹھلی سے آگے پتا نہ تھا، مگر وہ تخمی پودھا ابھی تک موجود تھا جس کی یہ قلمیں لی تھیں۔ قلمی درخت اسی پودھے سے قلم لے کر تیار کیے گئے تھے اور یہ اسی کے قلمی آم تھے۔

"مگر اصل درخت کا پتا کیوں نہیں چلا؟" ایک جج نے پوچھا۔

"سرکار، یہاں سے وہاں تک کئی ملک پڑے ہیں۔ ان میں پچھلے دو سال سے کھٹے درخت کاٹنے کی جو مہم چلی ہے، اسی میں کہیں غلطی سے کٹ گیا۔ یا پھر بہت سے درخت ہر سال سوکھ جاتے ہیں، کئی برس تلاش کیا مگر پتا نہ چلا۔ اتنے بڑے جنگل جیسے باغوں میں کوئی نام و نشان نہیں، کیا ہوا۔"

ایک جج نے تخمی پودے کی جائے وقوع پوچھی تو گلابو نے بتائی کہ اس کے باپ کی گلاب باڑی ہے۔

جج نے مسکرا کر کہا، "یہ گلاب خاص کی وجہ تسمیہ ہے۔"

مسٹر فاروقی نے برجستہ کہا، "جناب والا، اس کی خوشبو پر آپ نے غور نہیں فرمایا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ گلاب کی خوشبو آم میں آج تک نہیں پائی گئی، باوجود کوشش کے نہ دی جا سکی۔"

ایک جج نے اظہار خیال کیا، "آم میں فرنگن کا روپ، آم میں دسہری کا قدوقامت، ثمر بہشت چونسے کی صاف شیرینی اور خاص الخاص شاہ آباد کا کیف و لطافت اور آم میں عروس کی خوبصورت سڈول شکل و شباہت آم ہے کہ ہمہ صفت موصوف۔ اللہ اللہ پھر آم، آم میں نبیل 'اور خوشبو' خوشبو' جیسا آپ نے فرمایا، یہ تو اپنی جگہ پر صرف اسی ثمرے میں پائی گئی ہے۔ جیسے گلاب خاص تو خارجی و داخلی ہر اعتبار سے خاص گلاب ہی گلاب ہے۔"

گلابو نے نہایت آزادی کے ساتھ کہا، "جی، دو سرکار پال میں یہ خوشبو اور نکھر جاتی ہے۔" ٹوکری میں سے چند دانے پال کے برآمد کیے اور قاشیں پیش کیں۔

"واہ واہ! پھلتا کیسا ہے؟ کتنا اونچا ہے؟ ڈھل کا کیسا ہے؟" ججوں نے سوال کیے۔

Scanned with CamScanner

گلابو بولی: ''سرکار، درخت سفید پیچ آدمی کے برابر اونچا ہوتا ہے۔ مدتا اتنا ہے کہ پہلی نگاہ میں دیسی گلاب کے پھولوں کی بہار میں بہت بڑی سی ہری بھری جھاڑی معلوم پڑتا ہے۔''

ایک جج نے ٹوپی دیکھ کر کہا: ''ڈنٹھل کا بھی مضبوط ہے چونے کی طرح۔ کچھ بچا درخت ہے، ہوا دھوپ زیادہ نہیں ستا پاتی ہوگی۔''

''سرکار، جتنے آم چھٹ کر گرتے ہیں تقریباً سب کے سب لگے رہتے ہیں۔ اور ہاں سرکار، پیڑ میں لگا کر بھول جائے تو سڑتا نہیں۔ پکنے کے بعد سوکھتا ہے اور سوکھ کر ہی رہ جاتا ہے۔ اور ہاں سرکار، اس کی پتی بھری پال اٹھ جاتی ہے۔ پھر ایسے پال میں کیف کم ہوتا ہے اور ہاں، تیزی بھی کم نہیں ہوتی۔ جی بھری کے پال میں تناتیہ سرخ تک بھی نہیں آپاتا۔''

اور بالاتفاق رائے سب ججوں نے اس پیش سال کا بہترین آم گلاب خاص کو قرار دے کر پانچ سال کے لیے اس کو آموں کا بادشاہ قرار دیا اور کپ، تمغہ گلابو مالن پر سجا دیا۔ جب تک بہر مسابقت گیا۔ گلابو سفید ساڑی پر سنہرا تمغہ سجائے، چاندی کا کپ ہاتھ میں لیے نکلی۔ مقابلے کے پنڈال تو مراتی کی پڑ گئی۔ بعض کو غش سا آگیا (ص 201 تا 205)

❋

گلاب خاص کا پانچ سال کے لیے آموں کا بادشاہ بن جانا درحقیقت علم اساس صاحب کی روشن طبعی (ص 206) کا نتیجہ ہے، جو سنہری تمغے اور چاندی کے کپ کی صورت گلابو کی ساڑی اور ہاتھ میں دمک اٹھا ہے۔ لیکن اصل تنازع میں سے نابلد ہوکر، برہمن، سید، مغل، پٹھان سے شودر گلابو کی کامیابی اور پچی اہانت تصور کر رہے ہیں۔ ابوالفضل صدیقی نے اس تصور کا بیان روشن جس ذائقے سے ملحوظ کیا ہے، وہ ان کی قوت بیان میں اقدار سماں فکر و نظر کی حلاوت کے بغیر قطعی ممکن نہیں تھا:

8

گلابو سفید ساڑی پر سنہرا تمغہ سجائے، چاندی کا کپ ہاتھ میں لیے نکلی۔ مقابلے کے پنڈال پر تو مراتی کی پڑ گئی۔ بعض کو غش سا آگیا۔ جب ذرا آگے بڑھی تو دیہاتیوں کسانوں کے گھٹے میں سے اندر مہاراج کی بیاہ وشنو جی کی جے کا سٹیٹار گونجا۔ زمینداروں کے طاؤسوں، حویلی والوں،

مقدموں نے ڈپٹا مگر جب تک اس مجمعے کے درمیان سے گزرتی رہی، بے کارے پر بے کار، اگوہتا ہی رہا۔ میلوں مربع آراضی پر ایستادہ باغوں کا درخت درخت جیسے الٹا ہو گیا۔ پھنگیاں تحت الثریٰ میں گھس گئیں، جڑیں اور سلاجڑ سے فضائے بسیط میں پھیل گئیں۔ بیچ در بیچ اجاں در جال، جیسے ہر پرانے باغ کے درخت درخت کا حسب بدل گیا۔ جن کے اندر سے زمینداروں کے حالی موالی، ان پرانے درخت دریافت کر کر کے نئی قلمیں باندھتے اور مالکوں کے نام سے موسوم کرتے چلے آئے تھے اور ہر مقابلے میں پیش کر کے گمنام سپاہی کی قبر پر اپنے آقا کے نام کا کتبہ نصب کرتے چلے آئے تھے، اور آج کسانوں کے تیوروں میں سے ہزارہا سال بعد آقاؤں، زمینداروں سے دوں کے مدر جھپکے تھے، اور اس رنگ، رس، خوشبو کے اجتماع میں اذن جنگی کی ریں بلند ہو گئیں (ص 205)

❁

مصنف نے ان چند سطروں میں ''آقاؤں'' کے ہزارہا سالہ پندار کی شکست کا جو ظاہری اور تحلیلی منظر خلق کیا ہے، وہ گویا اس کے تخیل خواہی کی ایک پینٹنگ ہے جس میں قیامت بردوش آندھی دھرتی کو تحت الثریٰ تک ہلا دینے والے زلزلے کے لرزہ خیز تھپیڑے سیاہ اسٹروک شامل ہیں۔ ''آقاؤں'' نے یہ دہشت پہ مستزاد دہشت دو ٹوک دیکھیں ان کی تمنائیں جیسے ہزاروں برس بعد جد جہدی کا حظ میسر آیا ہے۔ اسی باعث ''آقاؤں'' پہ ہراں کی پڑ گئی، بعض کو غش آ گیا۔

صدیوں سے قائم و مستحکم کو متزلزل دیکھ کر ''آقاؤں'' کا ردعمل ابوالفضل صدیقی نے ان پاروں میں بیان کیا ہے:

9

گلاب خاص کی سرخی، ملاحت، شیرینی، حلاوت، سب کچھ فاروقی صاحب کی روشنی طبع میں سمو کر گلاب خاص ولی غریب پر بلا بن کے سوار ہو گئی۔ یوں بھی اس جیت کا پبلک ریلیشنگ خاص ہی ہوتا تھا پھر مقابلے میں آنے والی کے کامیاب مقابلے سے زیادہ گلاب گوں رخساروں کی تمتماہٹ، بلکہ جزوی لب گلاب کی سی ہے۔ ''اس کے لب کی تازگی، نرگسی آنکھوں کے گلابی ڈورے۔ گلاب خاص آم کی تعمیر میں خالق وشنو نے جیسے اسی کا ہو کی بچی ہوئی تھوڑی سی کی سے

ڈھل گیا تھا۔ مگر گلاب خاص کا سارا کیف، شیرینی، رنگینی، خیزش اور تمتماہٹ — جیسے تاریکیاں مد پڑ گئیں۔ گلاب جیسی سندر اور تازہ ہستی کمھلا کر رہ گئی، بھسم ہو گئی۔ لوگ جن سے تمہارے تخمین اوٹ کر جا دیتے اور ان کی چاندی کو سونا بنا دینے کے لیے جھپٹ پڑے۔ ویسے خاں صاحب اور آغا صاحب دونوں ہی اپنے طبقے کے محترم بڑے بوڑھے تھے، بزرگ، سنجیدہ، جوان جوان پوتوں، نواسوں اور نواسیوں کے دادا نانا۔ جھک سفید دودھ برف میں دھلی ہوئی مقطع داڑھیاں، ایک عرصے سے حج بیت اللہ کے سفر کی نیت کیے ہوئے، بقیہ عمر یاد الٰہی میں بسر کرنے کا تہیہ کیے ہوئے بیٹھے تھے، بس عالم کشش کے منتظر تھے۔ دونوں اول راتیں جیت پار چکی تھیں، ادھر سے اللہ میاں بلا رہے تھے۔ خاں صاحب نے تو مدتیں ہوئیں عمر بھر کی چڑھی داڑھی اتاری تھی، یک دم بیٹھے بٹھائے [illegible] اور ان نے سنجال کر پھر چڑھا دی، مگر اب کل بے جوڑ ہو گئی۔ سفید داڑھی لگی [illegible] معلوم ہوتی ہے، اور دوسرے ہی روز حجام نے خضاب، جواب ستارۂ صبح، کا حصول کر دیا [illegible] چڑھائی تو چہرے کی جھریاں بھی ساتھ میں غائب ہو گئیں اور [illegible] خاں صاحب [illegible] جوان ہو گئے۔ اور پرانے بزرگوں سے سنتے چپ رہتے تھے کہ اگلے وقت میں تو [illegible] عمر سے پوجا پاٹ شروع کرتے تھے [illegible] کی عمر میں [illegible] میں تھے، دونوں جوان بھی نہیں نوخیز تھے۔ آغا صاحب اپنی [illegible] بیٹے میں۔ کچھڑی بال تھے اور چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح دمکتا تھا۔ ورنہ جھریاں ضرور ہی نظر آتیں جیسے بڑھیا چرخہ کات رہی ہے۔ دونوں کو [illegible] سے نکلے ہوئے مستانے اور [illegible] سے تجدید [illegible] پڑے۔ وہ دونوں ہی قبض کا شکار تھے، اور قبض کشا نسخہ آفتابی دونوں ہی کے حصے میں [illegible] تو دونوں نے [illegible] گلاب باڑی [illegible] سیوتی لال [illegible] کے [illegible] سے نکل جانے کو سوچ رہے تھے [illegible] تو سب یاد تھے [illegible] اور [illegible] کا قصہ ٹوٹا ہوا [illegible] میں تھے زمین پر سرزمین گلاب باڑی کی چھاتی پر جریب کھنچنے لگی۔ اور [illegible] جب جریب کھنچتی ہے تو زمین [illegible] کا ناپ کرا کے [illegible] ہوتی ہے، اور جریب کی زنجیری کڑیوں کے ساتھ کبھی قطب شمالی اور کبھی قطب جنوبی کی سمت جھک جھک جاتی ہے۔

... سیوتی لال کی پھلواری کی بیلی پر بندوبست اراضی کے سرکاری پختہ مقام [illegible]

Scanned with CamScanner

جریب گھٹنوں کی زد میں آ گئی۔ یہاں اس وقت چار زندہ بیٹھے تھے: ٹھاکر جسبیر سنگھ چوہان، آغا صاحب، خان بہادر صاحب، اور چوتھا جس کا نام ابھی ہوا میں درج تھا، بے نیت کا حوالدار، ان سب پر اکیلا بھاری، خان بہادر صاحب کا نوخیز بھتیجا اور آغا صاحب کا ہونے والا داماد، چھدن میاں، جس کا ابھی تیرہویں سال مونچھوں کا کونڈا ہوا تھا۔ (ص 206 تا 208)

❁

یہاں خان صاحب اور آغا صاحب کے حیلوں اور رویوں کے بیان میں جو طنزیہ لب و لہجہ در پردہ بروئے کار آیا ہے اس کی شدید سفاکی کا سبب ڈاکٹر ابوالفضل صدیقی کا یہ احساس بھی ہے کہ دونوں بوڑھے بظاہر تو "مدتوں سے اللہ اللہ کر رہے تھے،" مگر حقیقتاً اس الوہی منبع لطیف کی روح سے ہنوز محروم ہیں جو تاریک اور بے اساس باطن کو تابندہ و مدید اور خارج و باطن میں بیہودوں کی ادا سے دفاع کا عمل ہوتا مہیا کرتا ہے۔

خان اور آغا کے بعد ٹھاکر چوہان کا طرز فکر و عمل بیان کرتے ہوئے ابوالفضل صدیقی نے ایک ایسے آدمی کو ہدف بنایا ہے جو بہ وجوہ ان کا اہم ترین ہدف رہا ہے، کیونکہ نہ صرف اس کہانی میں مذکور عہد، یعنی بیسویں صدی کا تیسرا عشرہ، بلکہ آج اکیسویں صدی میں بھی اس آدمی کی شقیں، نت نئے الفاظ و اسباب میں مٹھی بھر آدم زادوں کو بربریت کے ایسے پنجہ پڑھا رہی ہیں جو بنی نوع انسان کی کثیر تعداد کو خط آدمیت سے بہت، بہت نیچے، بس سانس لینے کی اجازت دیتی ہیں، مشروط اجازت۔

10

ایک اور شریک کار اور گلاب بازی کے ترتیب گھٹنے کی الٹ پلٹ میں بیچ جا بیٹھا ٹھاکر جسبیر سنگھ چوہان تھے۔ انھوں نے شروع میں اگر مگر کی۔ بات منوجی تک جا پہنچی۔ ٹھاکر جی نے جب ردن سے سر میں پہنچی تھی تو اس کے ساتھ تمام حشرات الارض بھی تو ہاتھ آئے تھے، جو ریچھوں کے لیے جنس حل پیدا کرنے میں کیچوے گبریلے والا کردار ادا کیا کرتے تھے: جنھیں رہیں کھا، جوت کر اور کھاد کی گولیاں بنا بنا کر ادھر ادھر پھیلانے کی خدمت انجام دینے کے بعد، خود صرف مٹی چاٹ کر جیتے

کا جوڑ پیدا ہوتا تھا، اور یہی صورت سیوتی رانی اور گلاب مالن کی تھی۔ ایک گلاب کا پیڑ تھا تو دوسری گلاب خاص سے پوری تھی۔ دونوں ہی [illegible] کے شانہ [illegible] کے راستے روح و فرحت اور جسم کو توانائی بخشنے کے [illegible]۔ گلاب خاص ہو یا گلاب، دونوں ہی دوسرے روز صبح کے سونگھنے نوچے کے بعد کوڑے کے ڈھیر پر نظر آتے ہیں۔ اور ٹھاکر جسبیر سنگھ کی نگاہ میں جیسے ہاتھ میں [illegible] اور سیوتی رانی کا مقدر چلا آ رہا تھا۔ ویسے ان کیڑے مکوڑوں سے ہزاروں کی دنیا میں [illegible] چل رہا تھا جب کہ ٹھاکر جی کی دس ہزار سال پرانی [illegible] تھی، جس کی [illegible] تحریر سب [illegible] تھی مگر پھر بھی [illegible] رہی تھی، اور آغا صاحب، خان صاحب کی طرح بھی، اور ملکہ وکٹوریہ کا [illegible] وہ بھی۔ جب ٹھاکر جی نے راون کا گھر لوٹ کر انھیں منوجی کے قلم سے شودر قرار دیا تھا، مگر سیوتی [illegible] آئین خان صاحب اور آغا صاحب نے بھی برقرار رکھا تھا۔ حتیٰ کہ سات سمندر پار [illegible] کی رانی بھی ٹھاکر، آغا صاحب، خان صاحب، سب کے گھر لوٹ کر سیوتی کے اوپر چلی [illegible] رہتے ہو، [illegible] ہر [illegible] پر یکساں حق رکھتا تھا: ٹھاکر جسبیر سنگھ، خان بہادر صاحب، آغا صاحب، سب کے سب اور [illegible] کی رانی ملکہ وکٹوریہ [illegible] مسعود [illegible] تک چھدن میاں بھی۔ [illegible] سیوتی رانی [illegible] خان [illegible] عدالت [illegible] کا [illegible] زمیندار [illegible] کی جانب سے موصول ہو [illegible] کہ تم نے [illegible] کاشت [illegible] اراضی پر [illegible] درخت [illegible] ہیں لہٰذا [illegible] کرو کہ تم کو حقوق کاشت سے محروم کیوں نہ [illegible] کاشت سے بے دخل کیا جائے۔ [illegible] درخت [illegible] اور اراضی تمھاری ملکیت نہیں ہیں [illegible] بے دخلی کے [illegible] سے بچنے کے لیے [illegible] کو چھپانے کی غرض سے تم درخت [illegible] وہ [illegible] بے دخلی کے [illegible] مداخلت اور نقصان رسانی کے جرم کے مرتکب ہوئے۔ ٹھاکر جی نے تو عدالت مال جا کر یہ نوٹس جاری [illegible] اور چونکہ وہ کاشت [illegible] زمینداروں کے [illegible] پر پڑتی تھی [illegible] کے علاوہ [illegible] جاری ہوتے [illegible] اور [illegible] بڑے [illegible] کی تاریخ میں [illegible] چیز تھی، ورنہ عدالت مال سے رجوع کرنے کے بجائے قصبے [illegible] خود [illegible] کرتے اور [illegible] حکم [illegible] کے ذریعے [illegible] جنس کے طور [illegible] کرا لیتے۔ اور [illegible] یہ کہ وہ [illegible] عدالت کے فیصلے سے [illegible] کم [illegible] خلاف نہ ہوا کرتا۔ اور سیوتی رانی [illegible] اور مال کے جملہ قوانین سے مستثنیٰ تھا [illegible]

Scanned with CamScanner

فوجداری کے جرم کا ارتکاب اس کی ذات سے ممکن ہی نہ تھا (ص 210 تا 211)

❀

عدالت کا نوٹس سیوتی لال اور گلابو کی طرف بڑھتی بھادوں کی راتوں کا پہلا قدم ہے، جو ان ساعتوں میں وجود پا چکا تھا جب گلابو کا گلاب خاص آموں کا بادشاہ بنا تھا اور "کسانوں کے تیوروں میں بڑھ رہا سال بعد آقاؤں، زمینداروں سے دوری کے انداز جھلکنے لگے تھے" اور ابوالفضل صدیقی کو محسوس ہوتی کہ "گلاب خاص کا سارا کیف، شیرینی، رنگینی، خیرگی اور تمتماہٹ جیسے تاریکیاں بن کر اُمڈ پڑیں۔"

بھادوں کی راتوں کے اس ابتدائی غبار سے اس تصادم کے، صبح منظر کا بھی آغاز ہوتا ہے جو کہانی میں ابوالفضل نقش کرنا چاہتے ہیں۔ نام نہاد چھوٹے بڑے طبقے کے اس تصادم کا بیج تو اُسی وقت پڑ گیا تھا جب گلابو کا گلاب خاص مقابلے میں شریک ہوا تھا۔ اب اُس بیج سے اکھوا پھوٹنا ہے اور وہ تصادم منظر عام پہ آ گیا ہے جو اب تک مصلحتوں کے پردے میں تیور دکھا رہا تھا۔

11

اس تصادم کا ایک فریق، سیوتی لال اپنے آقاؤں کی نفسیات خوب ہی سمجھتا تھا ور پھر تمبو، دیوان خانوں میں اس کے جاسوس آقاؤں کے دائیں بائیں لگے ہوئے تھے۔ وہ نوٹس پا کر بھی کسی کے پاس عذر داری، معافی خواہی کے لیے نہ گیا اور بھادوں کی رات میں اس کو ٹھاکروں کی سرزدگی میں چھاپہ پڑنے کی یقینی اور حتمی خبر ملی۔ اس کو معلوم تھا کہ چاہے کہیں سے، یہ تو چھتریوں کا آسمانی مقدر اور زمینی حق ہے۔ ور آج اسی زمینی حق کے سبب اس نواح کے تمام چھتری دیوانے تھے۔ اور یہ آگ تو رہا ہے پاک مقدس دھاگے کے نیچے ہی چھاتی کی انگیٹھی میں دہک سکتی ہے، چھتریوں کا یقین ایسا ہی تھا، جس کے سبب اس نوعیت کی بیگاری کسی شودر کے تحفظ کے لیے بھی اک ذرا سے ذرا جھجکتی ہے تو مستقیں نے کوئی کتاب پوں تب بندگی ہو جایا کرتی ہے، ورنہ گنگا جمنی الٹی بہہ کر سنکوتری جسوتری پر لرزتی ہوئی ترچھی بناتی ہیں۔

"میں اپنے باپ دادا کی مونچھوں کو نہ مرنے دوں گا خواہ تم پھر پالی ہو یا میں ہر قانون سے

گریز کرے گا خود منو سر تیوں کا آکاش سے مارا' میں یوں نہ ہو، جس نے قانون قبضہ راضی بنایا ہے، وہ ان بڑہا چیتوں کے ہاتھ اپنی غیرت حمیت نہ بیچ دے گا۔ وہ بھی گلہ بوٹی کو سداری رکھے گا۔ گلاب جامن کی طرح سے داش، امرت بھری بنا رہا جن رس سے جوں کی توں ہے۔

(ص 211-212)

آئندہ اقتباس میں ابوالفضل نے سیوتی لال کے خلاف متحدہ محاذ کے تشکیل کا جو احوال بیان کیا ہے، وہ صرف ایک چھدن، ایک آغا، یعقوب خان یا ایسا خاکسار کا کیل جلد یہ سب اپنے اپنے حصے کا حوالہ دار شارب ہیں۔ دین دھرم کے لحاظ سے الگ الگ نظر آنے والے یہ طبقے اپنے اپنے مفادات کے لیے ایک ہیں، اور مل جل کر اس معاشرے کی سطوت منکشف کر رہے ہیں جو شان و شوکت اور بادقار رتبے کے پردوں میں ہوا و ہوس کا پاسدار ہے۔

محاذ کے شرکا میں اپنے مجوزہ شب خون کی کامیابی کے یقین اور اس سے حاصل ہونے والی غنیمت کی بٹوارہ تقسیم کے تعین سے ابوالفضل اپنے قاری پر یہ منکشف کرتے ہیں کہ یہ طبقے پنچ کامیابی کو یک لخت روایت تصور کرتے تھے۔

بھادوں کی ماں جیسے تاریک منصوبوں پر عمل درآمد کرنے والوں کے مقابلے سیوتی لال کو ابوالفضل نے ایسا کردار بنایا ہے جس میں ہر اہل سماج کے اذیت برداشت کرنے والے انسانوں کے تیور مجسم ہو گئے ہیں، اور اب وہ خارجی اسباب سے بے نیاز اپنی عفت و حرمت کی حفاظت کے لیے اپنے بادوں کی مجیبوں کو منہ دینے کا عہد کر رہا ہے۔

12

ادھر چھدن میاں کی جوتی دیوان تھی، خسر، تایا، نانا، سب کے سب بڑے بڑے مجاہدوں کے مقابلے پر خم ٹھونک کر آ گیا۔ ورنہ درش حکم بیچاں منصوب سے جو کچھ یاد تھا کہ سیوتی لال کے جانے کے پاس دان میں بکھر بکھر رہتے پڑھا کر اس کا اٹھانے ایک تیشی ورث اور پیدمش کورٹ۔ جتنے مزدور دو کار ہوں، بیگار میں پکڑے۔ کاب ماڈی سے دیں مانے کے

شاکر دپیشے میں منتقل ہو جائے، تمن کو خیریان دبئی رہائش کے لیے پسند کرے۔ اور یہ سب کچھ عیوب بزرگوں کے آداب عشق میں خلل و منافی تھا۔ چنانچہ آغا صاحب نے تو بیٹی کے تنسیخ نکاح کا دعویٰ دائر کرنے کے لیے اپنے دیوانی و سے وکیل کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ بوڑھے خان بہادر نے بے غیرت کے حوالہ بھتیجے کی بغاوت سے شکایت کی اور اپنے بڑھاپے کے عشق میں دراندازی و رقابت سے باز رہنے کی استدعا بھی کر لی۔ جبکہ شاکر صاحب کے نذر بیچاری نوے فیصد چوہان پر قنوجی راج کے ساتھ اب ہزار سال بعد دس پندرہ فیصد ہیمو بقال بھی شامل ہو گئے تھے۔ انھوں نے سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے سنجوگتا کو دن دہاڑے اٹھا کر لے آنے کے بجائے تھوڑا اندھیری رات کے پردے کا سہارا بھی بیامناسب خیال کیا۔ تینوں بزرگ نہایت ہی وسیع القلب اور ایک دوسرے کے حق میں نہایت متواضع واقع ہوئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ سمجھتے تھے کہ اگر چہ یہ نوجوان آتش جوانی میں جا پھنسی تو بھی ان تینوں میں سے ہر ایک کی مٹھی سے باہر ہو گی۔ سر جوڑ کر مشورہ کیا، جس میں صاحبزادے بھی زیر بحث آئے۔ شاکر جی نے آغا صاحب کو دوستانہ ڈانٹ پلائی بھلا اس خارجی عشق کے چکر میں پردہ نشین بیٹی بہو کو کیوں درمیان میں لایا جائے؟ حویلی ہے، دیوان خانہ دیوان خانہ نوکری پردہ نشین بیٹی کیوں مطلقہ بنائی جائے؟ رئیسوں کے بچوں کی بچکم رانی تو معمولی ہے، اور نہ معلوم نخی اور کیا کیا دلوں ہوا کرتی ہیں۔ نکاح ہوتے ہی، میرے پوتے بچھ سے پار ڈالا جائے گا، جارو ٹکے کا ہو نکلے گا اور خود ہی بھادوں کی اماوس کی رات کو فتح کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ورا س وسیع القلبی کے ساتھ کہ بزرگی عمر اور سیادت نسل کے تقاضے کے تحت پہلے ایک شمشیر رہے آغا صاحب قبلہ کی تحویل خلوت میں۔ بے کی دو سے افشار سے آغا صاحب تمام ساعت ان کو خان صاحب بہادر کی تحویل میں دے دیں گے، اور خان صاحب بہادر دو شمشیر ر سے اپنی خلوت مرتی رسید، منشی کے دستور کے مطابق اس شوور کو شاکر جی کے حوالے عمر بھر کے لیے کر دیں گے۔ ویسے تو بالا کا چلن اس طبقے میں اسی روایت چلا آتا تھا۔ سواری کی گھوڑیاں، گھوڑے، شکاری کتیاں، کتے، لڑنے والی بٹیریں، مرغے وغیرہ سے ادھر، ادھر سے ادھر ہوتے رہنے کا رواج تھا ہی۔ اسی طرح ملازموں، خدمتگاروں، حجاموں، ماماؤں کے پارسل ہوتے رہتے تھے۔ ورگیہ تو اپنی حصہ میں سے تو ایک تھی۔ اور ایسی تحفے تحائف کی ساری دو

سال پیچھے رو سامنے کرم میں تکرار ہوتی رہتی تھی۔ ضیافت میں صاحبزادے صاحب نے ان چیونٹیوں بھرے کباب میں ہاتھ ڈالا اور بزرگوں کے اکل و شرب میں چونچ ڈبوئی۔ یہ بیچارے تو مع چیونٹیوں کے کباب ست سے نگل جایا کرتے، اور اس معاملے میں سب کے سب بزرگ یورپ کے جنگِ عظیم کے اتحادیوں سے زیادہ پُرخلوص واقع ہوئے تھے۔ صاحبزادے بھی تینوں بزرگوں کو خوب پہچانتے تھے، لیکن بیچارے خام کار تھے، یہ نہ سمجھتے تھے کہ یہ تپے پہنچے ہوئے بزرگ سمجھیں گے کہ یہ بار محسوس کر جائیں گے، وہ اس جہلِ مرکب میں گرفتار ہو گئے کہ میرے سامنے پڑنے کی ان کی سفید ریش کی ہمت نہ کرے گی۔ (ص 212 تا 214)

❁

متحدہ محاذ میں شامل افراد کے طرزِ فکر کے تخلیقی تعارف کے بعد ابوالفضل نے سیوتی لال کا تعارف بھی اسی ہنرمندی سے رقم کیا ہے کہ فردِ واحد کے وسیلے سے اس کے پورے طبقے کا احوال قاری کے ذہن و دل پہ نقش ہو جاتا ہے:

13

سیوتی لال، ایک رنگ دار اور قدیمی شعورِ حیات، سائنس دانوں میں اہم ترین شخص، علم دوست، ورثہ میں بہت نفیس و عمدہ پھلوں کے قدیم ترین باغات، تاریخی بیج خزانے، دفینوں کا محقق، موجد بے قرار سوشی۔ بزرگوں کی پیدا کردہ ارضی تمدن کی یہ گونا گوں فصلوں کی دولت برابر [illegible] پیدا کر کے عام کرے۔ دادا سیوا اس تمدن کا وہ پیادہ ہیرو تھا جس نے خود رو بیلوں کی حد تک پہنچے ہوئے قدیم تخمی باغوں کے اندر سے، اپنی حد تک تلاش و تحقیق کر کے سیکڑوں نادر اور بیش صفات موصوف اقسام کے آم پیدا کیے اور قلمیں باندھ، خود کر ان کی اصل حقیقت نکالی تھی اور درخت پروان چڑھا کر مشرقی معاشرے پر تخلیقی قلم کاریاں اور خطا کاریاں کی تھیں۔ نوشتوں اور اقتباسوں میں [illegible] چھپا کر اپنے آقا کے نام کا [illegible] آدم کے [illegible] اور اصلی تجربہ بیسویں صدی کی [illegible] دولت کے روشن [illegible] کیا۔ آم کی نوعیت کی صرف ایک [illegible] میں [illegible] سب تھا اور سیوا اس کی کلاس [illegible] کی تحقیق تھی جو روشنی طبع [illegible] پر [illegible] نے [illegible]

ہوئی تھی۔ اس بیچارے طریقۂ نزول سے وہ اپنے اوپر گلاب خاص کو وشنو جی کی دیا تصور کرنے کے جہلِ مرکب میں گرفتار ہو گیا تھا، اور یہی سوچ شوشنکر کا عتاب بن گئی تھی۔ اور وہ تو اپنی ماتا بدن کلا ہو گئی ہی ہو، بیچے وشنو مہاراج کی دیا تصور کیا کرتا تھا، اور گلاب خاص تو اسی کنیا کے ہاتھ کا کرشمہ اور وشنو جی کی کرامت تھا۔ مگر وہ یہ بھول گیا کہ اس کا مقدر ازل سے آج تک نصیبِ غم رہا ہے اور اس کا حصہ منو جی کے سہرے قلم سے چپکے بیٹے ہوئے زنار پوشوں کے دھاگے میں بندھا لکھا ہوا ہے۔ اور ہر دور کلام و تحریر ان کی ہوا کرتی رہی ہے اور سیوان لال کا نام تو ہمیشہ موسوم و شمساں ہی ہوتا چلا آیا ہے، اور اس کی تاعیش مضمون امیدواری ہیں اور تصانیف پر بھی قلمِ غیر مصنفین کا نام ٹھپ ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ عمر بھر لاعدہ، تحقیق اور ریاضتیں دوسروں کی جھولی میں پڑی رہنے کے بعد حادثاتی طور پر اپنی صرف ایک بیجا وشنو جی کے پرشاد کے طور پر دھوکے سے اپنے پلے بندھی رہ جانے کی پاداش میں آج وہ اس حد تک اور تیر کی زد پر ہے کہ وہ زمین کا ذرا سا ٹکڑا، جس پر وشنو جی کا امرت بھرا یہ عطیہ اس نے امانت رکھا تھا، اس سے بھی اس نصب کرنے کے قصور میں محروم ہو رہا ہے۔ اور اس ادھیشی نے اس قصور میں خود ہی اس کو اور اس کی بیٹی کو اور اس کے گلاب خاص سب کو اکھیڑ دیا ہے۔ منو جی کے مرتبہ قانون تحفظ اراضی کے مطابق صرف زمین کے مالک ہی کو آم کا درخت نصب کرنے کا حق ہے، اور زمین کا مالک آم ہی کیا، ہر درخت کا جو اراضی پر بیٹھا دیا جائے یا خود رو اگ آئے، مالک تصور ہوتا ہے۔ اور سیوتی لال پہ حق میں زیادہ سے زیادہ گلاب کی فصل کاٹنے کا مجاز تھا، گلاب خاص کا اگانا اس کو اس کے اس حق کاشت سے بھی محروم کرتا تھا۔ اور گلاب خاص کا درخت تو زمیندار کا حق قانونی ہے اور ملکیت توریثی ہے۔ وہ شودر تھا اور اسی ذات کے لیے ارذل جنس پیدا کرنے کا حق لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس کا مقدر بھی گھٹی خوشبو والے خوش رنگ پھول آقا کے لیے اگانا تھا اور چنتے وقت سے لے کر گجرے گوندھتے وقت ناک پر کپڑا لپیٹ لینے کا حکم تھا، ورنہ پھول جوٹھن ہو جاتے۔ وہ پھولوں اور پھلوں کے پودوں کی جڑوں میں کھوے گبریلے کی خدمت انجام دے کر صرف روئیدگی بالیدگی کا ضامن تھا؛ آم کی تاس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے کسی پھل میں کیڑے پڑ جاتے ہیں اور آقا کے حق پر خیانت دست درازی تھی۔ (ص 215 تا 217)

اس کے گوندھے ہوئے تو۔ ب سے دوسروں ہی کے سر سجاتے اور گھر بساتے رہتے تھے

اور اس کا ازلی مقدر رہنے سہنے کی بے گھری تھا۔ وہ شودر تھا، برہما کی پیٹھ سے میل پسینے کی گندگی پیدا ہوا اور خالق کے جذبۂ نفرت و حقارت کی تخلیق ارذل، ارذل مخلوق، دھرتی پر بوجھ۔ چودھری جی کی نظر کرم نے اس کی خدمت دوسری نوعیت کے خانے میں بٹھایا تھا، اور اس کی خدمت اپنے اصلی تابع، داڑھی مونچھوں والے کودک، حاکم کار آقاؤں کا کھلونا بنا کر رکھی تھی۔ پھول اُگا کر سنگھانا اور میٹھے میٹھے پھل پیدا کر کے کھلانا، زرنار پوشوں کے بدن اور روح کے لیے تغذیہ فراہم کرنا اس کا فرض تھا، اور اس خدمت کے سبب یہ دوسرے شودروں کی بہ نسبت ان زرنار پوش آقاؤں کے ساتھ زیادہ مختلف اور قریب فاصلہ رکھتا تھا۔ اور سیوتی لال اسی قربت کے طفیل ان آقاؤں کی نیت کا نخچیر تھا اور ان سے جسم پتر والے برہمنوں، نجومیوں اور نام دھرے والے باپوں سے بھی زیادہ ان سے واقف تھا، حال، مستقبل کو پہچانتا تھا، اور اس وقت تو بات اتنی چھپی نہ تھی۔ سیوتی لال تو سیوتی لال، اس کی بچی ناسمجھ بیٹی بھی سمجھ رہی تھی کہ یہ ٹکتک کی وحشیل کی سزا ہے، نہ گلاب باڑی کاشت کرنے کی قانون سے ناکافی اور نہ گلاب خاص آم کا درخت نصب کر لینے کی خلاف ورزی کی پاداش ہے۔ یہ ٹکتک کے تقاضے میں شودر کی کوکھ سے گلابی رنگ کی گدرائی بیٹی جنے کی پاداش ہے کہ وہ آج اس جرم میں دھر لیا گیا رو رہا ہے اور اس کی بیٹی کی عصمت سر بازار اور اس کی نامرادی ہے۔ (ص 219 تا 220)

❁

کہانی کے آخری سانحے بارہ صفحات میں ہے اوّلین سانحے تمثیلی سیوتی لال نے اس تمہید کا باب ہیں جس سے وہ اپنی دلاری بیٹی کی عصمت کی حفاظت کے لیے گزر رہا ہے۔ اس باب میں ابوالفضل نے اپنی روایت۔ اس طرح کے ذریعے سیوتی لال، گلابو، زمین، آسمان اور موسموں کے جملہ مظاہر کو زندہ و فعال کر دیا ہے۔ خالق کائنات کی ایک اشرف ترین تخلیق اپنے پسینے سے جنے پیڑ پودوں، پیڑوں کو گویا کسی طور کھاد سے کی زد پر لے رہا ہے جس طور خالق کائنات کی راندہ پودوں کی اماں نے ماحول سے چپے چپے، جان، دانا اور تھک کر کے ریشے ریشے کو نہ صیری میں تجھیز رکھا ہے۔ سیوتی کا تعلق دار، چمپئی پان گلاب باڑی کے ٹوٹے کونے کے بے دیا جس دقائم ہیں یہ بہ جیسے خون، آنسو اور تھوک، گلابو اور سیوتی کے بیج ہیں۔ عصمت واں کے تحفظ میں سیوتی لال کے ہاتھوں گلاب باڑی میں ہر پاسِ ستر "پاروں کی مچھلیوں و نہ مرت" ڈیے کی قسم کا پاس بھی ہے اور اس

قسم کو تشدد دینے والی، بارہ ہزار سال سے جاری، دہشت خیزی کا جواب تھی؛ سنگین، وسعت اور خاموشیوں کے پر درد وحشتناک عمل کا پر شور رد عمل — جو بہر حال پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ جوابی عمل کی زد پہ وہ سب کچھ ہے جو سیوتی لال کی آنکھوں اور ہاتھ کی حدود میں ہے۔

سب کچھ زندہ ہے: گلاب باڑی پیڑ پودوں سے؛ پیڑ پودے پھول، پتوں اور پھلوں سے؛ پھول خوشبو سے؛ پھل ذائقوں بھرے رس سے۔ زمین زندہ ہے بنی کوکھ سے نکلے اگو میں جکڑے، چھوٹے بڑوں درختوں سے اپنے حشرات سے؛ آسمان زندہ ہے پرندوں، شور شرابہ، روشنی سے، اکثر ترنم سے مہکتے ہے..

مگر آج زندہ زمین کی زندہ گلاب باڑی، سیوتی لال کے ہاتھ کے گھڑنے کی زد پہ اور زندہ آسمان بھادوں کی ماوس کی لپیٹ میں محصور ہے۔

14

آج بھادوں کی ماوس تھی، سال کی تاریک ترین اور ہر رات سے بھیانک رات، جو جھل، کالی، سیاہ بھری بھانت بھانت کے حشرات اور جن جسم کے آر پار کی طرح پروں چڑھ چکے تھے، اور مجرموں اور دوروں روشنی کی طرح موت دے رہی تھی اور سادھوؤں کا خوف اور کی طرح پناہ۔ اور سیوتی لال کے مخالف ہم عصر دوست مہینوں شروع ہی سے پیوستہ کند صورت حال سے آگاہ ہوتے رہے تھے، اور آج رات کا آخری حصہ اس پر تیجا پڑنے اور بیٹی کو اغوا کر لے جانے کے لیے سازش کا میدان کل تھا۔ ویسے کئی روز سے سازش کا کام اور تفصیل باپ اور بیٹی دونوں ہی کے کانوں میں اُن کی مستعد ذرائع سے پہنچ رہی تھیں مگر دونوں میں یہ موضوع زیر بحث آنا تو درکنار، اشارتاً کنایتاً بھی تبادلہ خیال میں نہ آیا تھا۔ اور سیوتی لال بھی اس سال کی تاریک ترین رات کا اطمینان کے ساتھ منتظر بیٹھا تھا۔ اور ہر سب کا رب باپ اور ذہین بیٹی دونوں ہی دل ہی دل کے اندر طے کیے بیٹھے تھے کہ "یہ کرنا ہے" اور "وہ نہیں ہونے دینا" ہے۔ اور ایسے مقامات پر تو وہ جو ہوتا تیسرا مدد دار راستہ بتا دیتا ہے۔ اور اگر اُمید ہو تو حقیقی ہی سمجھا دیا کرتی ہے کہ "یوں کرو، یوں نہ کرو۔" اماوس کی سیاہ پوش، جرم پناہ رات کا آخری نصف حصہ تیجا پے اور اغوا کے لیے متعین تھا تو اس کے دل شروع ہوتے کو رفاع کے لیے

Scanned with CamScanner

منتخب کیا۔ اور سیوتی لال کو بھی فرار کا صحیح موقع کسی ساون کی اندھیری کالی چادر کی آڑ میں ہو سکتا تھا۔ آج شیام میں چونکہ گرم نہ ہوا تھا۔ وہ پہر بھر رات گئے تیمودے کی طرح اٹھا اور شیوالے کے اندر سے بارود مزار ساں پرانا مقدس آدمی سادھو نشٹ ہو گیا، اور راجپوت کو ورغلا دینے کے لیے، جب ناموس بچ نکلے تو سیوتی لال راجپوتی طور سے ٹھٹھکا کھڑا ہوا وہ ساں باغبان، جس کے حیات آفریں اور خوشبو و رنگ اور رنگ پیدا کرنے والے روحانی ہاتھ کا ہمیشہ سے پوجا ہی مقدر تھا اور نمو پر ان مقدس پیشہ تھا، آج اس کے ہاتھ میں کلہاڑی نظر آیا — جگوال شیو شنکر مہاراج والا تھیوراٹ اس نے پنڈا رلی مقدر، وشنو جی کا عطا کیا ہو فردوسیں اور اربیلیں، جس کے پھل دیتے سے اس نے زمین پر جنت کی پینگ عمل کی تھیں، گرد رش کی فضا میں رنگ و بو کے غبار سے اڑانے سے، بوڑھ و شبنم کی موجیں بہائی تھیں اور امرت کی پھواریں برسا بار گلی گلی شہر شہر عام کی تھیں، ... کہاں پھینک دیا، اور اس جہاں بیزو بہار آفریں کو ... ہاتھ میں کلہاڑا دیکھ کر شاید وشنو جی کی بھی آنکھیں حیرت اور افسوس سے پھٹی رہ گئی ہوں۔ یہ واقعہ چھپ گئی ہوں گی۔ اور ... کے ہاتھ سے، اس کی ازلی ورثہ ابدی تاریخ ... مقدر میں پہلی مرتبہ کلہاڑی، موت کی بیب ضرب گونجی، دھپ، دھم، دھم، دھم، چھپاٹ پھاٹ، چھپاٹ پھاٹ ... ایک دو تین چار پانچ چھ سات ... ضرب پر ضرب ... دیکھتے دیکھتے ... کا نسل بڑا ... درخت، جس کے متعلق اب عام عقیدہ یہ ہو گیا تھا کہ وشنو جی خود ... (جنت) کا پھل ... ہو گئے ہیں، ... آنے والی تھی ... کلہاڑی کی مانند کا ... ہوا ... پروردار ہو گیا! جس کے پھل نے راجپوتوں کو شکست دینے کا تصور دیا تھا ... راجپوتی سنسار میں اسی طرح ... کردار ... جیسے ... ساتھ ہو ... اپنے ہاتھ سے ... پاؤں میں شیو ... کے سیپے پر سونے کا ... اور چاندی کا ... کی پاداش میں کلہاڑی ماری اور اصل ... کا فتنہ ختم کر کے سیوتی ... وصیت و نابود کرنے کے لیے بڑھا، اور چاروں قسمی درخت بے چارے ... ایک ہی ... میں ... کو چیلنج کرنے کے تصور میں ... ہو گئے ... وہاں تک ... کی ... میں ... کا ... سے ... کو ... ہو ... ہو تا چلا گیا تھا۔ اور اب ... کا ساتھ ... چند ... لیے ...

کی قطار پر نگاہ جا پڑی جن میں گلاب خاص کی یک سالہ، دو سالہ قلمیں نصب تھیں، ہونہار، شگفتہ ہوئی، اپنی پروان چڑھنے والی گلابو کی طرح سانچی، گلبدن سی۔ نرم نرم نیلوفر کے سے سبز ڈنٹھل، گلابی ریشمی کونپلیں، سرسبز شاداب مخملی پتیاں گلاب خاص کی تمام تر رنگینیاں، شیریں چتیاں، ننھے منے وجود کے اندر پاسیدگی اور تاریخ ساری کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ جڑ سے ڈیڑھ دو فٹ اونچی پھنگیوں تک سب کچھ یا جیسے کوئی نوخیز بچی ہنسی گڑیوں کے لیے رنگ برنگے ریشمی کپڑوں کے ننھے ننھے جوڑے تیار کرتی ہے اور قلمیں تیار کرتے ہوئے گلابو کے گڈے گڑیاں کھیلنے والی لڑکی کے سے ہی تو جذبات متحرک ہوتے تھے۔ شاداب، مضبوط، جڑ پکڑتی ہوئی ہونہار گلاب خاص کی قلمیں، جڑ، تنا اور شاخ جس کے ننھے منے وجود کے اندر کرۂ ارض کی اولین متمدن مخلوق آدم و حوا کے جوڑے کا زمردیں شاداب بیوں والا اشتقاق قوس قزح اور قوس کلچر چھلکتا تھا حیات کی ضامن حرارت غریزی اور توانائی کی تو سید کاشت میں تھا، اور سے رشتہ استوار ہوتے ہوئے جد تک اگلی پچھلی تمام نادر قدیم اور ادوار، انگڑائیاں لیے کر اپنے مضبوط کندھوں پر سنبھالے ہوئے تھا اور یہاں سے وہاں تک، وہاں سے یہاں تک، کرۂ ارض تا باغ فردوس، زندگی کی لہر بنا رہی، ساری تھی۔ رنگ، رس، خوشبو کا یہ قافلہ زندگی کا دھارا لاتے ہوئے رواں دواں تھا، گملوں کی قطار۔

اور اب سیوتی لال، متوالی، شرمیلیاں، ہونہار چکنی چکنی پات بروالی گملوں میں کھڑی قطار پہ آ ٹوٹنا۔ اور آپ ہی آپ والے قرونِ اولیٰ کے رجھانوں کی طرح جیسے بیٹیوں کا گلا گھونٹنے لگا۔ بے دردی کے ساتھ اوپر چوٹی والا نرم نرم ریشمی پتیوں والا حصہ مٹھی میں دباتا، اکھیڑتا جاتا اور دور پھینکتا جاتا۔ اب اکھیڑتا اکھیڑتا دو سالہ قلموں سے یک سالہ قلموں تک اس سرے سے اس سرے تک پہنچا اور وحشیوں نے اتارے ہوئے اس امرت پھل کے دھرتی سے نیست و نابود ہونے کا آخری وقت آ لگا اور یک سالہ کی صرف بچی کچی بے دھڑی نازک نوخیز، ہونہار صرف دو ماں قلمیں باقی رہ گئیں، جو بچاریاں بے برابر والی ساتھنوں کے انجام کو پہنچنے کے لیے سرِ تسلیم خم کیے سہمی سہمی کھڑی تھیں، اور سیوتی ماں پر شان پر جو شیدہ بیٹے کے لیے اس طرح جھپٹا جیسے شکرا گوریا پر ٹوٹتا ہے (ص 220 تا 223)

*

قہر کے بر خلاف کی طرح یہ قہر بھرا منظر بھی ختم ہو جاتا ہے۔

ابوالفضل صدیقی نے اس گلاب خاں کی حماقت و غیظ و غضب کی خام بنایا ہے جو مقابلے میں ان آکر پورے خاندان کا سبب ہوا اور اب مشہور وقف آشنا رہیں یوں ہے۔

مگر گلاب تو جبلی ہے — ماں دھرتی جو اپنی کوکھ سے نکلے نیک و شر کے باعث بندھ میں جاتی ہے کسی پر خیر کی توقع میں فعال رہتی ہے: ماں دھرتی۔

15

اس سمن کی، صرف ابھی کی بندھی، نازک، نوخیز، سو بہار، صرف دو پتی قلمیں باقی رہ گئیں۔ سیوتی لال پرشاد ان پر دبوچ بیٹھے کے لیے اس طرح جھپٹے جیسے شیر گوریا پر جھپٹتا ہے، تو مدھیہ میں زبان خلق کے بجائے پیٹ کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی ایک غوں غراہٹ کی سنائی دی اور گلاب اپنے دونوں ہاتھ بچے پودوں اور سیوتی لال کے درمیان آ گئی جیسے ماں کا قطب مینار حائل ہو گیا، بیٹوں کو بچانے کے لیے ماں کی دیوار چین آ کھڑی ہوئی۔ غیں غیں غوں غوں اور ممتا کی شدت کے آثار سے سیوتی لال کی راجپوتی نوعیت کی حدت کے ذرے ذرے اڑ گئے اور دوسرے ہی لمحے جیسے وہ بے دست و پا ہو گیا۔ اپنی فطرت و جبلت پر چوٹ پڑا شاید اور و خجل، اور اس کا ہاتھ تو خلاف جبلت و منافی فطرت عمل پر دنیا میں پہلی مرتبہ حرکت میں آیا تھا۔ اس نے تو چمن بندیوں، باغبانیوں فطرت میں ودیعت پائی تھیں، اور تربیت بھی ماحول میں یہی کشتی میں بھی پڑا تھا۔ وہ فطرت جبلت اور تربیت کا متناسب امتزاج تھا۔ شیر فی کھال نہیں کھایا کرتی، نہ کانٹے چیر پھاڑ کرے گوشت، اور نہ تو چند ایسا ہی ارتکاب ہوا تھا۔ رنگا رنگ خوشبودار شہد بھرے پھول کھلنے والا، میٹھے مسرت میں بھرے پھل پروان چڑھانے والے یکلخت ورجنت کی تربیت کا حامل سیوتی لال متقی، خلاف جبلت اقدام پر منفعل ہو کر رہ گیا — نادم و خجل — اور اس کے مضبوط ہاتھ جو ازل سے آج تک پہلی مرتبہ اس کج پر حرکت میں آئے تھے۔ اور اس نے شکست کی کھا کر ہتھیار ڈال دیے، ٹھاٹھ اور چھینک دیا۔ وہ فطری عمل کی اس کارفرمائی سے ناآشنا، ناتجربہ کار شیر زادی کی چھاتی چھاتیوں کے بجائے پیالوں کے اندر داخل ہونے لگی۔ اس نے دورانیہ و جڑواں بیٹوں کی ماں کی طرح لپک کر دونوں پودوں کے گملے اٹھا کر دائیں، بائیں دونوں جانب گودوں میں دبائے اور اس عمل سے

ردعمل میں بھولی بسری ناواقف دوشیزہ کے دونوں آنچلوں میں میٹھی میٹھی گھر گھر ہونے لگی، جیسے پہلوٹھی کی پیدائش کے ساتھ نوجوان ماں کی چھاتیوں میں دودھ کی گردش بڑھتی ہے۔ اس نے ماں والے پیار کے ساتھ ہی دونوں پودوں کو دونوں گودوں میں بھینچ لیا، اور اس بھینچنے کے ساتھ دونوں چھاتیوں کے اندر گلاب خاص کا رس گدگدانے لگا۔ کچی چاندی اور کچی چھینک کے اتصال سے جلترنگ سی بج اٹھی، اور گلاب خاص کے دونوں نوبندش قلمی پودے نوزائیدہ جڑواں بیٹوں کی طرح دائیں بائیں گلابو کی دونوں گودوں میں تھے، اور گلاب خاص کا مرت رس، اس کی چھاتیوں کے تھنوں دودھ کی دھاروں کی پھواروں کا فوارہ گلاب خاص کے اندر رواں دواں تھا۔ من دیگرم تو دیگری کے پردے درمیان سے معدوم تھے۔ مشتعل عثمان مالی غلہ تو پھینک ہی چکا تھا، اس منظر سے متاثر ہو کر جلدی سے پھر بیلچہ اٹھالیا اور سیوتی لال گلابو کی گنگا جمنی مثبت لہریں پھر یک سمت سیدھی ہو گئیں اور گلاب خاص کے گملوں کے حلقوں میں پراگ کا سماں بندھ گیا۔ دونوں بھائی چپ چپ دودھ پینے لگے اور تخلیق کے جنون اور دھارا نظر آنے لگی۔ آدمی نے پودے کو پہچانا اور پودے نے انسان کو۔ اور جب دونوں گودوں میں اب دونوں گلاب خاص کے پودوں کی رمز، ریشمی، مخصوص خوشبو والی کونپلیں پتیاں گلابو کے رخساروں سے چھوئیں تو اس پر ہلکا ہلکا محسوس ہوا، ایک کیف سا طاری ہو گیا، ایسی ماں کے سرور کی طرح جو اپنے بچے کو گود میں اٹھاتی ہے تو اس کے ریشمی بال رخساروں پر چھو کر پیدا کرتے ہیں۔ تخلیق کے عظیم فطری تعلق، عمل اور منشائے خالق، ہبوطِ آدم کی سب سے بڑی غایت کی مظہر، محبت، پیار اور یگانگت کی کارفرمائی۔ گلاب خاص کے دونوں ننھے پودوں سے گلابو کے گلابی مرمریں نوخیز مدھر سے بدن تک، باہر اندر باہر، مسام جڑنے، ریشے ریشے پتی پتی کونپل کونپل سے رگ رگ بال بال تک، پسینہ خون ہو کر ایک رو گدگدا کر زندگی کو بیدار کرنے لگا اور روئے زمین پر حیات کی ایک نادر ترکیب وجود میں آئی۔ ناکتخدا نوخیز دوشیزہ اور نوزائیدہ خوبندش پودے دونوں ہی پر شدید چھننے اور جنے جانے والی میٹھی میٹھی بات بن گئی...

ناسمجھ، ملال، ندامت اور محرومی مختلف النوع حسیت کا عجیب سا مغلوبہ بنا سیوتی لال، مالی بامعنی بغل میں بیٹھے دانے چل پڑا، اور بچی جیسے اپنے دونوں جڑواں بچے بانہے بھینچے بیٹھی ہولی۔ ہولی دیوالی کے تہواروں پر دیہات میں لڑکیاں باپ بھائی، ماموں، چچا کے ساتھ پیچھے پیچھے ادھر

Scanned with CamScanner

سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر سمیٹے جاتی نظر آیا کرتی ہیں۔ گلاب باڑی پیچھے چھوڑی، پشتوں کی جنم بھوم پیچھے چھوڑی، گلاب جامن کی سوکھی لکڑی اور کچے آم بکھرے پڑے چھوڑے گیا پیچھے چھوڑی اور نہ جانے کسی کونے میں سونے کا ٹھیکرا اور چاندی کا آپ دندھا پڑا چھوڑا، اور آن وجواہت بغیر قصور خورد و ب گندم صرف ایک پودا اگانے کے جرم میں جنت چھوٹی (ص 224 تا 226)

❁

ترکِ بہشت کی ان ساعتوں کو ابوالفضل صدیقی نے تقریباً چار صفحات کے ایسے واحد پیراگراف میں منتقل کیا ہے جو ایک فلم میوزل کے مربوط شاٹس اجزا پر مشتمل ہے۔ پیراگراف میں آنے والے واقعات کو تمیز کرنے کے لیے سکتہ (،) لگایا ہے، رواں تبصرے اور کیفیات حروفِ ربط کے ذریعے منسلک ہیں اور ایک کے بعد دوسری کیفیت ختمے (۔) کے بعد شروع ہوئی ہے۔

اس متحرک نقش میں پچھلی جنت سے ہجرت کرتے ہوئے باپ بیٹی نے رشتہ موجود کے تمام رنگ بھرے ہوئے ہیں۔ رنگوں کے خفی وجلی اسٹروکس ان کیفیات کی نوعیت واضح کر رہے ہیں جو گلاب اور سیوتی اس پر حال میں طاری ہیں اور یہ اشارے بھی دے رہے ہیں کہ ان کیفیات اور نیّات کی وجہوں کے اسباب وعلل کیا تھے کون تھے۔ تاحد نگاہ منظر پہ چھایا ہے تب آسمان گویا ان تمام تدبیروں کی چپیٹ میں آ گیا ہے جو اہلِ زمین کے سیدھے سب تجھ سے اٹھتے ہیں۔ سیوتی اور گلاب دونوں زد میں ہیں لیکن گلاب سے پُرمحبت وشفیق بازو، تدبیر کی چھاتی میں چھکڑ رنج ہیں، اور آسمان اور پُرمحبت وشفیق بازوؤں کا مدمقابل ہے، اور دونوں اپنی اپنی استطاعت بھر تدبیر کی چھاتی چیرنا چاہتے ہیں۔ آسمانی کوندے کی چمک بھری ہر قسمت میں آسمان والے کا امر رہتی، اور باطن میں بھری روشنی کا مظاہرہ سب منظر آسمان زمین پیڑ پودے، طیور، حیوان، رنگ، خوشبو، روشنی تاریکی میں ابھرتے ڈوبتے باہم گڈمڈ ہیں، گویا عناصر کو ایک بار پھر توڑا جا رہا ہے۔

16

اور انھوں نے تاسار کا رہ حول کو خوب ٹھونک بجا کر منتخب کیا تھا اور پرکھوں کی جنم بھومی سے مضبوطی سے ساتھ لات مار کر پیچھے پھیری تھی، ہر راستہ مسدود اور ہر گلی بند پا کر یہ بے تکلف سفر

راہ سے منزل اختیار کی تھی، مگر پھلواری کے دروازے پر پہنچ کر سرحد سے باہر قدم اٹھاتے ہی جیسے خودکار دروازے میں ان کی ترنمیں آپ سے آپ مڑ گئیں اور سب کچھ تو پھولوں کی مالائیں ٹنگے ہوئے تھی، آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے، شش جہات میں تو اندھیریاں ہی اندھیریاں پڑی ہوئی تھیں، جیسے سارے جہان میں اندھیر بپا تھا، کوئی کسی کا نہ تھا، حتیٰ کہ ایک ہاتھ کو دوسرا ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا: مگر انھوں نے تو اندھیریاں چیر کر، اندھیرے ہی میں سب کچھ دیکھ لیا تھا — اپنا مقدر بھی، گلاب خاص کی جیت میں ہار کی وقتی شکست بھی، اور اپنے آقاؤں کا مقدور بھی۔ البتہ گلا ہوئے مرمریں، نزدو اور صندلیں پیچے گلاب خاص کے دونوں گملوں کو آغوش میں دبائے روشن بادات گرفت کی طرح اندھیرے میں چمک رہے تھے، اور جیسے انھی کی رہنمائی میں وہ پھولوں کی اوس چیرتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ کالے کالے بحر ظلمات جیسے تھپیڑوں کو چیرتا، بڑا ہوا کا بوجھل جھونکا سامنے سے بڑھ کر ٹکرایا، اور پیچھے سے بجلی کا کوندا لپکا۔ عام طور پر وہ گئی اور ساتھ ہی کڑ ڑاڑ، ڑاڑ، دھم دیا دل تھی۔

سیوتی لال کے منھ سے بے اختیار نکلا: ''اوم برہم! ہے اندر مہاراج، تمھاری لیلا!'' پی آں پی آں اپنی اپنی سمت درختوں میں ڈھکے ہوئے موروں نے چیخوں کا دور تک پھیلا ہوا کا سلسلہ لا دیا، اور قریب ہی کہیں ایک کیل کیدڑ ہوکا۔ اور یہ شور و منظر تو ان کے کانوں کے لیے نیا ہی مگر آج یہ برسا تو ایسا لگا جو آج تک معمول رہا تھا۔

سیوتی لال کی نگاہ کچھ دور آگے ذرا تا حد نظر اپنے نصب کیے ہوئے باغوں کی قطاروں میں دوڑتی چلی گئی۔ درخت نصب کرنے کے ناپ کی یکسانیت، موزونیت کے سیدھے قاعدے کے مطابق اصطلاح میں 'درم تیور' کہلانے والے طریقے میں لگائی ہوئی قطاروں کے باغ، ہر قطار ہر سمت اور ہر جگہ سے ایک ہی زاویے اور راست خط میں نظر آنے والی، یکساں و یک سمت جاتی ہوئی، جیسے شطرنج کے مہرے قطار میں ایستادہ، درم سیوک مالی سیوتی لال کے سیدھے ہاتھ کی نصب کی ہوئی، کسی خوش فکر سلجھے ہوئے مصنف کی تصنیف کی سطریں لفظ لفظ کھلی ہوئی، عقل و منطق کے رنگ و روپ سے بھری ہوئیں، منطقی تحقیق نادر رسم سے پر درسب کی سب اس کی اپنی جانب رخ کیے، اس کی تحقیق کی شاہد، جیسے دور سے اس کو پہلی حالت کھینچی بڑھتی دکھائی پڑیں، اور انھیں دور سے دیکھ کر خاص طور پر اس موسم میں اس کو اکثر محسوس کرکے اس پر بڑی فخر کرتی، جیسے یہ اس کے اپنے فرزند و خویش سماں

Scanned with CamScanner

بیٹیاں ہی کی تو قطاریں ہیں۔ اس نے ان بیٹیوں کے باپ کے کچھی احساس کو سہارا دے رکھا تھا اور اور دو ذکور کی محرومی کا شاخسانہ بھی اس کے شعور کے اندر کبھی نہ ابھرنے دیا تھا۔ اور اس کے یہ بہت سے بیٹے تو نیر جاری تھے، رس، رنگ اور خوشبوئیں، زندگی کی نعمتیں تمام شیریں نعمتیں عام کرتے بکھیرنے والے، انسان، حیوان اور طیور پر یکساں مہربان، اور انھیں کے قیام سے تو اس کی بھی بیٹے والی زندگی عبارت تھی۔ وہ اس کی گود بھری تو بیٹا تھی اور انھی قطار اندر قطار رنگوں نے بیٹی کے اس باپ کو فرحت و شیرینیوں اور رنگ و بو پاشیاں کر کے اس دو ذکور کی محرومی کا احساس مندمل ہونے دیا تھا۔

گلاب خاں کے متعلق کبھی کبھی تیج ترنگ اس کے شعور میں نیم خواب نیم بیداری کی کیفیت میں یہ آرزو ابھرتی جیسے یہ کوئی خوبصورت سرخ سرخ، دہکتا ہوا لڑکا ہے، بڑا ہی شیریں اور بڑی خوشبودار، اور جیسے وہ اس گلاب کو دولہا بنا کر اس کا بیاہ اس کے ساتھ [illegible] دے گا۔ وہ آج ایک بیٹی اور ایک آدمی اس کے تبادلۂ [illegible] تھے اور دوسرے تھک کے ساتھ ایک تڑپ اور کوندے کی چمک میں یہ قطاریں کی قطاریں اور بھی زیادہ واضح اور متحرک سی ہو گئیں سمت [illegible] کی جانب چلتے ہوئے نظر آئے۔ یہ شاید خود ہی اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ [illegible] میں اس سے دور ہو رہا تھا۔ یہ تو سب اس نے بیٹا دینے کے تصور نے [illegible] تھے، ورنہ اس کا ہم قریب وجود تھی۔ اس نے پال پوس کے تو ان کی پرورش کیا تھا اور تیری میری تمنائیں مرتب زمین پر بنیاد رکھی تھی۔ اور اس کے یہ جواں سال بیٹے کچھ جھکے ہوئے رہ گئے تھے اور دوسروں کی ولدیت میں بھر گئے تھے، اور وہ بیٹا خاندان کے تین بیچوں بیچ سے گزر رہا تھا۔ اور اب کی مرتبہ بڑے زور کا دھماکا اور کڑک ہوئی۔ اس نے آنکھیں دیکھیں۔ یہ درخت سب بے ترتیب جھرمٹ سے کیے نظر آئے۔ قطاروں کا تسلسل، یکسانیت آخری قربت میں گم ہو گیا اور [illegible] دل کو [illegible] میں [illegible] تیشۂ فرہاد سا محسوس ہوا۔ کہ جو اس جھرمٹ میں ایک وحشت کا خوف [illegible] سے دونوں جانب دونوں [illegible] درختوں کے بیچ میں، جڑ [illegible] بچوں [illegible] خاندان کی طرح مضبوط تھی لیے، [illegible] کہیں یہ بیرے جا رہے تھے [illegible] کھڑے ہوں [illegible] پکارنے [illegible] دونوں سے [illegible] جیسے جھرمٹ میں تیز تیز قدم بڑھتے رہے [illegible] جھونکے [illegible] ہر شاخ شاخ [illegible] پتے پتے [illegible] موتی جیسے [illegible]

Scanned with CamScanner

کے نام کی طرح ان کے دستخط ثبت تھے، اور اس وقت یہ انھیں بھوتوں کے غول بیابانی کی طرح ڈراونی مخلوق نظر آ رہے تھے۔ اس ماحول میں اور اس مجمعے کے بیچوں بیچ جہاں اس نے خود کو آدمی کے بجائے چھتنار، شاداب آم کا درخت محسوس کیا تھا، اور انھی میں سے کوئی ایک خود اور اس کی بیٹی گلابو، شاید خود کو زمین سے زیادہ گلاب خاص محسوس نہ کرے، جو زمین، ہوا اور پانی میں بسی ہی رنگینیوں شیرینیوں، خوشبوؤں کے ساتھ پروان چڑھتی رہی تھی جیسا کہ اس کا گلاب خاص تھا۔ انھوں نے آم کے چھتنار درختوں کے ساتھ بچپن کی چیت سے بھادوں، کنوار تک لُوؤں، دھوپوں، آندھیوں کا جم کر اور جھوم جھوم کر آنکھ سے آنکھ ملا کر ہر آفت ارضی سماوی کا مقابلہ کیا تھا اور انھی کے ذریعے اپنے اندر "امرت" کی تخلیق کی تھی۔ اور آج باپ اپنا بچہ بغل میں دبائے اور بیٹی اپنا گلاب خاص جڑواں بیٹوں کی طرح دائیں بائیں دونوں گودوں میں بھرے، عزت بچانے فرار ہو رہے تھے، اور بھادوں کی کالی چادر کی آڑ لیے جا رہے تھے جو پشتوں سے ان کا مرغوب رہی تھی۔ ان باغوں کے سلسلے کو پار کر کے آخری حصے پر پہنچ گئے جنھیں اس نے اپنی بے پناہ قوت بازو کی گرمی، پسینے کی کھاد اور اپنے جذبے کی دھار کے زور سے برآمد کر کے ایستادہ کیا تھا اور ان کے کٹنے نے کلچر کو پروان چڑھایا تھا۔ سامنے ریل کی پٹری نظر آئی اور اس جانب ریلوے اسٹیشن کی غمگین عمارت اور یہ کنبہ سے چلنے کے بعد اس کی وہی منزل تھی، بے سمت منزل، بے نام نشان آخری منزل پر پہنچنے کے لیے۔ پلیٹ فارم تک ہونے والے پودوں اور آموں کے پارسلوں سے پٹا پڑا تھا اور اندھیرے میں ان آم کے پارسلوں اور پودوں کی ٹوکریوں سے ٹھوکر کھانے سے بچتے ہوئے اُدھر پہنچے تو ایک مرتبہ پھر گردن آپوں آپ مڑی۔ مگر پیچھے کا جائزہ نہ لے سکے اور اب اتفاقیہ کوندے کی چمک بھی نہ تھی جو سہارا دیتی اور رہنمائی کا ذریعہ بنتی۔ گھنے باغوں کا سلسلہ، اس کے دست و بازو کے سلیقے کی ترتیب، بھادوں کی اماوس میں سب چھپ گئے تھے، اور وہ بھی گم ہی ہو کر رہ گئے۔ سامنے، اسٹیشن کی مٹی کے تیل کی درمیانی [illegible] والی مخصوص بتی ٹمٹما رہی تھی اور اندھیرے کا پردہ چاک کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ گاڑی پاس کرانے کے لیے اسٹیشن ماسٹر اپنے کوارٹر سے پلٹتا ہوا آ رہا تھا اور سامنے سے آتے ہوئے بڑے بابو نے اس کو پہچان لیا۔ اس کی زندگی کا یہ پہلا سفر تھا۔ وہ اسٹیشن تک بھی سال میں ایک آدھ مرتبہ شاذ و نادر ہی آیا کرتا تھا، مگر اس نواح کا جانا پہچانا اور اپنی نوعیت و سطح کا خاص آدمی تھا۔ ایسے بے

Scanned with CamScanner

وقت اسٹیشن ماسٹر دور ہی سے دیکھ کر بولے:

"ارے استاد سیوتی لال، ارے بھئی کہاں؟ آج تم کہاں؟ خیر تو ہے، کدھر کا سفر ہے؟"

وہ بڑے بابو کو سلام کرنا بھی بھول گیا۔ جواب بھی نہ دے سکا اور بوکھلا گیا۔ اب اس نے پانچ روپے کا نوٹ چٹکی میں پکڑے، بکنگ آفس کی کھڑکی کے اندر ہاتھ بڑھایا اور بکنگ کلرک نے پہچان کر خاص لہجے کے استفسار سے گھریلو انداز میں بے تکلفی کے ساتھ اندر سے ہانک لگائی: "کہو بیر، آج استاد سیوتی لال! کہاں کدھر آج چل پڑے بھئی، ایں؟" تو بکنگ آفس کی کھڑکی کے سامنے اندر ہاتھ بڑھائے، مسافر جیسے جھجک گیا۔ جیسے ہر مسافر گھر سے پوری اسکیم بنا کر پہنچا کرتا ہے، اس نے بار بار ادھر ادھر دیکھا، جیسے آس پاس کی تاریکی میں مشورہ کر رہا ہے۔ "کہاں جاؤں؟" اور چھوٹے بابو کا ہم سوال بھی بڑے بابو کے چپکتے ہوئے سوال کی طرح بے جواب رہا، اور "کہاں؟" کا سوال اس کے شعور میں جھنجھلا کر اندر ہی اندر کھو گیا۔ وہ ٹکٹ خریدنے والی کھڑکی پر اندر ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا اور اس کا سوال سن کر اس نے اندر سے جواب دیا: "وہاں جہاں کی سرزمین کی مٹی اپنی چھاتی پر گلاب خاص کو کھڑا کر کے پروان چڑھاتی ہے اور جس وقت سے ہم پودے پال پروان چڑھا کر چمن اور درخت بنا سکے اور گلاب خاص اور گلاب کے پھولوں کی جھاڑی کی طرح مہک سکے۔" وہ سرزمین کہاں اور کس رخ کے کون سے اسٹیشن پر ہے؟ نہ تو بابو جانتا تھا نہ خود سیوتی لال مگر اس کی کھوج بھی کسی کو نہ معلوم تھی، نہ جریب کھینچنے اور گز ناپنے والے پٹواری کو، نہ تحصیل کے نقشے اور شجرے میں جس زمین کا حدود اربعہ پایا تھا اور نہ اس کا جغرافیہ قطب شمالی سے قطب جنوبی تک تلاش مجبیل "مالک" کہلانے والے زمینداروں نے ہی آج تک دریافت کر پایا تھا۔ سب کچھ جہالت کی ادوں کے اندھیرے میں گم تھا۔ سیوتی لال بے چارہ کہاں کا ٹکٹ مانگتا اور بابو کس اسٹیشن کا ٹکٹ کاٹتا۔ (ص 226 تا 230)

❋

آسمان و زمین پر مظاہر حادثہ ظہور کے اس مرحلے پر جب ابوالفضل صدیقی لکھ رہے تھے، قدیم کی قلعوں کو آغوش کی پناہ دینے والے کا محافظ ہاتھ، جس کے بازوؤں کی مچھلیاں اینٹھ رہی تھیں، اس سوال سے مظلوم چھپا بیٹھا ہے کہ کہاں جاؤں؟ تو غالب تو رہے تھے کہ یہ تحریک وقت کی

سے زر، زن، زمین کے بہانے خیر و حسن پر شر کی یلغار اور اس کے درمیان بچائے عصمت و نا کے لیے ہجر کا قصہ ہے جو یہاں "شرفائے یک دنیٔ شودر کی نگر" (ص 200) کی بنا پر پیش آیا ہے۔ اس قصے سے شودر کرداروں کے لیے کوئی گل زمین ایسے ہی نشان زدنہ ہو، مگر ان کا وجود، بنی کچھ قوتوں کی رتق پا گیا ہے۔ یہ قوتیں اپنے دیگر تمام ثمرات فنا کے گھاٹ اتار کر متروکہ حست کی دو گلاب گوں قلمیں فضائے شر سے نکال لائی ہیں۔ آگے اندھیرے پار "مالک" نہ ہوں گے، سیوک ہوں گے، فضا سازگار ہوگی؛ یہ قوتیں ان قلموں کو چھتنار درخت بنائیں گی جن پر ماضی، حال، مستقبل کی صعوبتوں، محنتوں کے پروردہ گلاب حاصل اپنے سیوک کے لیے حصول لیں گے، کہ زمین ذات نہیں دیکھتی، شودر کو بھی اس کی محبتوں کا صدقہ دیتی ہے وہ حد زوال تک مہربان ماں ہے۔

مجمل توے گزشتہ صفحات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ابوالفضل صدیقی نے ایسے ماحول اور معاشرت کی مفصل کہانیاں لکھی ہیں جن کے متعدد پہلو ان کی نظر اور فہم کا نشانہ تھے۔ نظر نے دیکھا کہ اس معاشرت میں زر، زن، زمین کے حصول کے لیے افراد کا عمل کیا ہے، حاصل شدہ زر، زن اور زمین پر اختیار باقی رکھنے کے لیے افراد کے طور طریقے کیا ہیں؛ اور فہم نے پایا کہ حصول و اختیار کے اعمال و اطوار کیسے کیسے شر و قوت پذیر ہو کر حسن، خیر اور صداقت سے متصادم ہوتے ہیں۔

اپنے جانے پہچانے ماحول میں، خیر و شر کے (ازلی) تصادم کی کہانیاں خلق کرتے ہوئے ابوالفضل نے فہم و نظر کی بیشتر قوت ان افراد کو دیکھنے اور سمجھنے پر صرف کی جو اس ماحول و معاشرت کے زائیدہ ہیں، اسے زندگی دے رہے ہیں، بلند و پست سے دوچار کر رہے ہیں اور اس میں (شعوری یا غیر شعوری طور پر) کسی پر خیر تبدیلی کے خواہش مند ہیں۔ افراد کے ایسے اقدامات، اور خواہشوں کو کہانی کا جزو بنانے کے دوران ابوالفضل نے ان کی عام نفسیات اور جبلت کو بھی معقول توجہ سے دیکھا اور سمجھا ہے۔

ماحول و معاشرت اور افراد کے باہمی تفاعل سے وجود پذیر کہانیوں کو قاری کے ذہن میں پیوست کرنے کا موثر ترین وسیلہ ابوالفضل صدیقی کی زبان اور طرز بیان ہے۔ زبان ان کے ہاتھ میں نرم اور لوچ دار مٹی، موڈلنگ کلے (modelling clay) ہے، جس سے وہ نت نئے مناظر، مواقع اور نوع بہ نوع افراد کے ظاہر و باطن متشکل کرتے ہیں۔ فقروں کی متنوع نشست اور جملوں کی

نئی ساخت کے علاوہ شہروں، قصبوں اور دیہات کے محدود و نامحدود افراد کی لسانی و علاقائی زبانوں کے الفاظ، محاوروں، کہاوتوں، اصطلاحوں اور ضرب الامثال کا ایک ذخیرہ ہے (جسے کوئی چاہے تو "فرہنگ ابوالفضل صدیقی" کے نام سے ترتیب دے سکتا ہے) جو ان کی بے تکان مشق میں خاصی ہنرمندی سے استعمال ہوئے اور یہ سب ... کہانی کا قوام ہے۔

ابوالفضل صدیقی کی زیادہ تر کہانیاں اس باعث طویل ہیں کہ وہ مرکزی خیال یا احساس کی صرف بنیادی وجہ بندی نہ کر کے (بظاہر) ضمنی اسباب و علل بھی پورے پس منظر کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ نتیجتاً جس میں سے خیال اور جس میں سے احساس پیدا ہوتے ہوئے کہانی ایک طویل زنجیر بن جاتی ہے جس کا ہر چھوٹا بڑا حلقہ اپنے آپ میں بھی بامعنی ہوتا ہے اور (بالعموم) اپنے سے پہلے اور بعد کے حلقوں سے مل کر خود اپنے، اپنے سے پہلے اور اپنے بعد آنے والے حلقوں کے انفرادی و اجتماعی مفاہیم واضح کرتا ہے۔ اور چونکہ ابوالفضل صدیقی کی بنیادی دلچسپی انسانوں سے ہے، اس باعث ان کی کہانیوں کے واقعات اور قصے ہر کہانی کا مرکزی نقطہ کوئی فرد واحد، افراد کا کوئی طبقہ، سماجی احساسات و نفسیات کی کوئی جہت یا افراد کے طرز فکر و عمل کی کوئی نوعیت ہوتی ہے۔

گزشتہ صفحات میں پیش نظر بھی عرض کیا جا سکتا ہے کہ ابوالفضل صدیقی کس طور کہانی کے مرکزی و ضمنی کرداروں کی تشکیل اور تزئین کرتے ہوئے ان سے اختتام تک جا پہنچتے ہیں، لیکن اس پہلو کی وضاحت اور ابوالفضل کے حسن و فن کی مزید تفہیم کے لیے زیادہ مناسب محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ایک اور کہانی "بھیر" بھی مطالعہ میں شامل کر لی جائے تاکہ تجزیہ کے بجائے دو پہلوؤں پر آگے بڑھ سکے۔

کہانی "بھیر" (شمولہ آئینہ۔ صفحات: 324 تا 332) چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ "گل رعنا کی تلاش میں" کی طرح یہ بھی ایک ... کا قصہ بیان کرتی ہے جس کا ... زر و زمین ... رہے تھے۔ اس کہانی میں ابوالفضل کی فہم و نظر ان افراد کے ان اقدامات پر خاص توجہ دیتی ہے جو حاصل شدہ زمین پر گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لیے اور زمین سے حاصل شدہ املاک کو پھر جبر و وسائل سے اپنی املاک بنانے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں مصنف نے کہانی کے چند کرداروں کے اطوار و ... کے کسی پس منظر

اس طرح بیان کیے ہیں کہ تصادم کی جہات کے ساتھ ہی ساتھ معاشرے کی طبقاتی تقسیم کے بارے میں اس کے افکار بھی (جو سابقہ کہانی میں کچھ جھلکیاں دکھا چکے ہیں) قاری پر واضح ہوتے ہیں۔ اس عمل میں ابوالفضل صدیقی کا گہرا طنزیہ اسلوب و لہجہ آدمی سے آدمی کے عجیب ہمہ جہت تصادم، ایک دوسرے کے لیے ان کے رویے اور تقدیر کے مقابلے ان کی بے بسی پر عجیب و غریب زہرخند کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔

کہانی کے پہلے حصے میں مصنف نے بندہ علی نامی کردار کا تعارف، حسب عادت بہ ہیئت مفصل پس منظر کے ساتھ، بیان کیا ہے جس کا ایک منشا یہ ہے کہ قاری پر بندہ علی کے اس رویے کی جہتیں کھل جائیں جو وہ اپنی ددھیال اور ننھیال والوں کے ساتھ اختیار کرنا چاہتا ہے۔

17

خورد سال مولا علی اپنے پچپن سالہ باپ کی آٹھویں کنواری بیوی کا بیٹا تھا۔ خالص سادات النسل مگر نہایت غریب گھر کی دوشیزہ خوبصورت لڑکی، جس کو پیر فانی بڑے میر صاحب سید سردار علی شاہ نے سنتے ہیں کہ شادی سے تین چار سال قبل نظر پڑتے ہی اس کے باپ کے فاقوں کو معاف کرتے ہوئے، بچپن ہی میں تاک لیا تھا اور تین چار سال سے منتظر بیٹھے تھے، اور بیٹی میں شباب کی پہلی سرخی نمودار ہوتے ہی اس کے باپ سید ولایت علی عرف لٹن سے روبرو بیٹی فرزندی میں لینے کی درخواست پیش کر دی۔ ظاہر بات ہے کہ کم و بیش پچیس سال عمر میں بڑے داماد کو مفلس سید ولایت علی نے کم سنی معاف کرتے ہوئے ان کے بجائے ان کے املاک و دولت کو فرزندی میں لیا۔ (ص 232)

نوخیز بیوی نے سال اندر چاند سا بیٹا جنا، اور اس غریب سید کی بیٹی نے میر صاحب کی وہ بگڑی بنا دی جو اس سے پہلے سات اور سیدانیاں، رئیس زادیاں نہ بنا سکی تھیں۔ مگر اگلے سال بے چاری خود دق میں مبتلا ہو کر مر گئی گویا مرتے مرتے میر صاحب کا دامن امید بیٹے کی نعمت سے بھر گئی۔ میر صاحب اسی کی لپیٹ میں تھے۔ برسوں سے تن ماب کو بند کر چکے تھے۔ اب شوق کے ساتھ پھر گود کھولی۔ اپنے گرانے والوں اور حالی موالیوں کا خوب ادارہ تھا وراثت کے دھارے

کی رقم رکھا ہے۔ تکالیں بھی خوب نگاہ میں تھا۔ یعنی تمام آبائی املاک نومولود مہابلی کے نام نہایت مضبوط قانونی ذرائع سے حقیقی زندگی منتقل کر دی اور خود اپنی حیثیت نومولود کی بلوغت تک صرف ولی و سرپرست جیسی رکھی۔ لیکن ابھی مہابلی پورے چار سال کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بڑے میر صاحب خود بھی چل بسے۔ اور خوردسال بھائی کا قانونی اور قدرتی ولی و سرپرست بڑا بھائی بندہ علی ہوا، جس کو خاندان اور طبقے کی پنچایت اور ساتھ ہی ان کے متعلقہ سرکاری اداروں نے بھی تسلیم کر کے قانونی شکل دے دی۔ اور اب چودہ سال سے یہ، جب تک نابالغ سن بلوغت کو پہنچے، بندہ علی اس کا قدرتی مختار کل بن گیا اس شرط کے ساتھ کہ کل آمدنی کا صحیح خرچ سول جج کے روبرو ششماہی پیش کرتا رہے اور بچت نابالغ کے نام بینک میں جمع کرتا رہے۔ بندہ علی اپنے باپ، انھیں بڑے میر صاحب سردار علی شاہ کی ہی مشہور شکاری، تندخو، اعصاب وغیرہ و لالچ ان جبلت کا نتیجہ اور ہٹا کٹا تندرست جوان تھا، جس کی رگوں میں تیتر، بٹیر، مرغ بازی کے ساتھ ساتھ گل تیال، مندولیں، گھوڑے، کتے اور چہیتیں بھی آلی ہیں۔ بندہ علی کی نانی کے ساتھ ان کی ماں رمکلیا جو بڑی بچپن سے حویلی میں جھاڑو بہارو کا کام کرتی تھی۔ حویلی کی جو حسن چٹ پٹ کر دے معلوم سب ان سے قائل ہو گئی، کسی وجہ بھی سے چلا۔ ایک روز جیسا کہ ٹھیک دوپہری میں ہوتی [بندہ علی کی] ماں جھاڑو بہارو کرتے کرتے تھک گئی اور خاص بڑے میر صاحب کی دوپہر کی خوابگاہ کی صفائی کا کام بیٹی کے سپرد کر کے چلی گئی۔ رمکلیا نے بڑے میر صاحب کی خوابگاہ کا دروازہ کھول کر اور پردہ ہٹا کر جھانکا تو تاریک، نم ٹھنڈی خوابگاہ میں اسے تو کچھ نہ دکھائی دیا، لیکن میر صاحب نے، جو ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر دوپہر کی دوسری نیند کے لیے بستر پر بیٹھے ہی تھے، جیسے سب کچھ بھانپ لیا۔ کواڑ کے کھلنے اور پردے کی سرسراہٹ پر بڑے میر صاحب تو باوضو ہو گئے اور شیطان حاضر پڑا اور میر صاحب کے بستر میں سے نکل کر رمکلیا کے پیٹ میں گھس پڑا۔ بدنشان تھا، جیسے کہتے ہیں 'اچھوت کا موت' ملک گیا۔ اور برسات کے سچے قطرے جو کنگھی کے مقررہ دنوں سے باہر ہیں، کان سے ٹپک ٹپک کر مٹی میں ضائع ہو جاتے ہیں: جس بچی کے پیٹ کی آب میسر ہوتی ہے وہ گوہر بنتا ہے، اور اگر کوئی سیپی ہی ٹیڑھی ہو جس میں ... گوہر اتنا بڑا ... کا قطرہ موتی کیسے بن سکتا ہے۔ اور بندہ علی کا وجود سب سیپی کے پیٹ میں پرورش پاتا تھا، ابد کنکری ہی بن کر رہا، اور بڑے میر صاحب نے اس

سرٹیفکیٹ کے طور پر اسم بامسمیٰ بندہ علی نام تجویز کیا تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے اور آئندہ نسلوں کی منڈی میں بیچا جا سکے۔ ویسے بڑے میر صاحب نے اپنے طبقے کی جنت کے مطابق نجیب ہونے کے لیے کیا کیا جتن نہ کیے۔ پیر فقیر مجذوب اور مٹی کے پوجے، قبروں پر مزار، ماہر حکیم نوکر رکھے۔ ساری جوانی اسی میں بتا دی اور گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا تو بلا شادی تھیں، جب لب گور آ گئے۔ بہرحال وہ قبر میں اطمینان کے ساتھ گئے کہ توریث سادات کے رستے سے نہیں نکلی۔ لیکن آج گور میں پھر بے کل ہو گئے ہوں گے۔ سنتے ہیں کہ جب ایسے حادثے اتفاق پذیر ہوا کرتے ہیں تو بزرگوں کی ہزار ہا سالہ قبریں پھٹتی دیکھی گئی ہیں۔ سماجی تمدن کا اژدہا جو ابھر رہا سالہ قدیم رواج، شرعی قانون وراثت کے ریلے میں بہہ گیا تھا۔ (ص 233 تا 235)

⊛

اس جز سے کوئی ساڑھے آٹھ صفحے آگے، کہانی کا باب دوم شروع کرتے ہوئے ابوالفضل صدیقی نے بندو علی کی وجہ پیدائش کا ماجرا یوں بیان کیا ہے:

18

یہی راتیں تھیں کہ میر صاحب جیٹھ بیساکھ کی جلتی ہوئی دوپہری میں پنڈی سے لوٹ کر خوشیاں لیے اندر کو پہنچے۔ میر اور امیر صاحبان کا بچہ پیدا ہونے کی آپ بیتی واردات ہوا کرتی ہیں ورنوں دہانے سے ہوتی آئی ہیں، لیکن کبھی کبھی درمیان میں دست قدرت داخل ہو کر چلتے چلتے شوشہ بھی دکھا جاتا ہے۔ رمطیا شوہر کی لونڈیا تھی، جس کو خالق بحر و بر نے ہی محرومیاں عطا کر کے دنیا میں بھیجا ہے۔ رنگ روپ، چال ڈھال، کچھ بھی تو نہ تھا۔ حتیٰ کہ ابھی ڈھنگ کے ساتھ پوری طرح جوانی بھی نہ چڑھ پائی تھی اور بچی والی کے بیچ میں ہی تھی، البتہ اٹھان بتا رہا تھا کہ عورت کی ڈھکی قسم میں سر جائے گی۔ بڑے میر صاحب تو رہے میر صاحب، کوئی چمار کا لڑکا بھی رنج کے ساتھ مشکل ہی سے اپنی چماری بنانے پر تیار ہوتا۔ مذمت کا سوال ہی نہیں، البتہ چھ سات ماہ بعد ایک مرتبہ تو میر صاحب سوچ میں پڑ گئے جب منتر میں خاص کی رہائی چماروں کی چوپٹ کا علم ہوا اور یہ کہ رمطیا نے بڑے میر صاحب کا نام لیا ہے۔ بہرحال ایک منڈی، پستی کے اتصال کی ہندوستانی بھی اپنی برادری میں کوئی نئی چیز نہ تھیں،

Scanned with CamScanner

ہے یہ سید اور شودر کے تصادم میں چنگاری سی بن جاتی تھی۔ حمل کے نمایاں ہوتے ہی اٹھارہ بیس گاؤں کے چماروں کا اکٹھ ہوا لیکن پنچ بڑے میر صاحب کا نام نامی سنتے ہی دم بخود رہ گئے اور یہ آخر فیصلہ رام کلیا کے باپ ہی کے سر رہا۔ چمار نے ہمت کر کے وراثت کا فیصلہ اپنی حیثیت سے زیادہ غور کر کر باقاعدہ عرضی دی۔ اگر چاہتے تو ڈانٹ پھٹکار کر بھگا بھی سکتے تھے مگر میر صاحب جہاں دیدہ زیرک تھے اور سید و تناسل کے دور رس اثرات اور قانون وراثت کی پیچیدگی کے بڑے اچھے محرم تھے۔ سمجھ سکتے تھے کہ اگر چماری چمار کے گھر میں سید بچہ جنے گی تو آئندہ نسلاً بعد نسل کیا کیا اندیشے اور مسائل ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ خاموشی کے ساتھ چمار کو رقم دے کر راضی کیا اور رام کلیا کو خوش خرید لونڈی بنا کر حرم سرائے میں داخل کر کے ضابطے کی پابندی کر لی اور اس طرح شادی بھی پہلے نہ سہی بعد [illegible] اور حویلی کے ایک دیرینہ دوران وہ خوش [illegible] ایک شب [illegible] جشن پیدائش کی خوشی منائی گئی اور خانہ زاد کا نام سرکار نے خود ہی بندہ علی تجویز فرمایا [illegible] رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ اور بندہ علی اسی حویلی میں پل کر جوان ہوئے تب اپنی خصوصی [illegible] [illegible] [illegible] اصطبل میں گھوڑوں کے کھریرے سے پیدا ہو کر [illegible] کے بعد میر صاحب نے پھر کبھی رام کلیا کے قریب جانا [illegible] [illegible] کی کے ساتھ وہ بھی ضابطے کے مطابق سرکار کے خانے [illegible] رنڈ سالہ پہنانے کے لیے ضرور لائی گئی۔

کہتے ہیں کہ [illegible] بعد خود سے کے بھی بھاگ جاتے ہیں۔ شودر [illegible] کی کتاب میں کوئے کرکٹ سے بھی ارذل لکھا ہوا ہے لہٰذا اس کا مقدر بھی [illegible] جب سال خوردہ بڑے سرکار اور ان کے بعد خورد سال سید [illegible] دونوں [illegible] رئیساں کا اتفاق بحر میں [illegible] قطرہ بندہ علی [illegible] کے ساتھ [illegible] صورت [illegible] آیا اور پورے تیس سال بعد اس پر جوانی چڑھی۔ (ص 255 تا 257)

❋

بندہ علی کا تعارف اور رام کلیا کا احوال بیان پڑھنے والے پر [illegible] کی [illegible]

تخیلی پس منظر کیا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ اشارے بھی دے رہا ہے کہ سردار علی شاہ کے طور کیسے تھے۔ جس طرح جیسا کہ جیٹھ کی ایک دوپہر، ٹھنڈی خوابگاہ میں جاگنے والا شیطان، اور اپنی عمر سے پچیس برس چھوٹے ولایت علی کی بیٹی کو اس کے بچپن ہی میں تاک لینے والا شیطان، زمانی فصل کے باوجود، ایک ہی ہے، بالکل اسی طرح وہ ڈھائی تین سو نفوس بھی نسباً بندہ علی جیسے ہیں جو ماضی گزشتہ میں سردار علی شاہ جیسے اطوار والوں کے باعث "سعادت اور دوسرے خونوں کے آمیزے سے" پیدا ہوئے تھے۔

گور میں جاتے جاتے سردار علی شاہ کو حاصل شدہ اطمینان کا ذکر کرنے کے بعد مصنف کا فقرہ:

"لیکن آج گور میں پھر بے کل ہو گئے ہوں گے" کہانی پڑھنے والے میں تجسس پیدا کرتا ہے کہ "آج" وہ کون سا حادثہ پیش آنے والا ہے جس کی نوعیت کے سبب" بزرگوں کی ہزار سالہ قبریں چٹختی دیکھی گئی ہیں۔ سماجی تمدن کا ڈھایا ہوا ہزار ہا سالہ قدیم روڑا شرعی قانونِ وراثت کے ریلے میں بہہ گیا تھا۔" (ص 235)

قبر میں اطمینان کے ساتھ جانے والے کو "آج"، "بے کل" تصور کرنے کی جانب خفیف اشارے کے بعد، یعنی تفصیلی بیان سے پہلے ہی، مصنف نے "شرعی قانونِ وراثت کے ریلے" کا ذکر اس بلاغت سے کیا ہے کہ اس نے کہانی کا عنوان "بھنور" رکھا ہے۔ اقتباس 17 کے تمام اختتامی جملے، یعنی "ایسے بڑے میر صاحب" سے "بہہ گیا تھا" تک، اشارہ دے رہے ہیں کہ اس کہانی کا محوری نقطہ وراثت میں پیدا ہونے والے وہ بھنور ہیں جو کبھی افراد کی آزادی اور کبھی بے ارادہ و حادثاتی اقدامات و اطوار کے باعث پیدا ہوتے ہیں، مگر ان کے ایک بار پیدا ہو جانے کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ وہ ویسے ہی اطمینان بخش انداز پر ہمیشہ برقرار بھی رہیں گے۔ ان میں نہ جانے کب کوئی اور بھنور پڑ جائے کیونکہ یہاں سب کچھ ہمارے ہاتھ میں تو نہیں ہے۔ ایک بالاترین ہاتھ بھی تو ہے جو اپنے ہونے کا ثبوت ہمارے عزائم کو فسخ کر کے (بھی) دیتا رہتا ہے۔

بڑے میر صاحب جس "اطمینان" کے ساتھ قبر میں گئے اس میں اولاً سوا سال کے بچے "بے کلی" یوں پیدا ہوئی کہ "خورد سال بھائی (مولا علی) کا قانونی اور قدرتی ولی و سرپرست "بڑا بھائی" بندہ علی ہوا۔

Scanned with CamScanner

کہانی بتاتی ہے کہ یہ "بے کلی" فوت یافتہ سردار علی شاہ کی قبر تک محدود نہ رہی بلکہ اس کا اثر ان جیتے جاگتوں تک پھیل گیا جو سردار علی شاہ جیسے سابقین کے طور کا نتیجہ تھے۔

19

اس قصبے کے طول و عرض کے موضع میں جہاں سکونت تھی، اسی وجاہت کی شاخ کے، جیسا بندہ علی تھا، ڈھائی تین سو نفوس پر مشتمل پندرہ بیس گھر آباد تھے جو پچھلے سادات اور دوسرے خونوں سے آمیزے تھے۔ سب کے سب کاشتکار لیکن ان ذرا قدیم مراعات کے حامل۔ ان کی کاشتہ اراضیاں بہت ہی کم اور ناقابل اضافہ شرح لگان پر موروثی حقوق کے ساتھ اور ناقابل بے دخلی شرائط پر ان کے قبضے میں چلی آ رہی تھیں۔ یہ مراعات سید بزرگوں نے اپنی حرکتوں کی پاداش میں اپنی خاص نسل کے تھوڑے سے حقوق کاٹ کاٹ کر تفویض کی تھیں۔ بقیہ ان میں اور عام نسلوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ معاشی اور معاشرتی رہن سہن سماجی سطح کے اعتبار سے یہ ادنیٰ کسانوں سے مماثل تھے۔ حتیٰ کہ اسلامی ناموں کے ساتھ سید، شاہ اور میر بھی نہ لگا سکتے تھے۔ البتہ کاغذاتِ سرکاری میں قومیت "مولازادہ" بھری جاتی تھی۔۔۔

بڑے میر صاحب کے مرتے ہی تمام مولازادوں کی نظریں شیر خوار مولا علی پر لگی تھیں اور مونچھوں کے کونڈے کی گھڑیوں کا حساب انگلیوں پر لگایا کرتے تھے، کہ کب لونڈی بچے کا ان کی غلامی سے گلوخلاصی ہو۔ خاص طور پر یہ احساس ان مذکورہ مولازادہ گھرانوں میں شدت کی طرح متحرک تھا۔ جو بندہ علی ہی جیسے تھے اور عام کاشتکاروں اور دوسری قوموں کے بڑے حلقے سے بھی بہت کچھ انھی گھرانوں سے اکتساب حسن کیا تھا۔ غرض پورا علاقہ اس احساس کا شکار تھا۔
(ص 236 تا 237)

❁

مولازادوں کی یہ خلش اور بے کلی واضح کرتے ہوئے ابوالفضل نے بندہ علی کے ایک خاص رویے کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اس اشارے پر مشتمل سطور مندرجہ بالا اقتباس کے وسط میں درج تھیں لیکن وہ سطور آئندہ اقتباس کے آغاز میں پڑھنے سے واضح ہوگا کہ ابوالفضل نے علم نفسیات

Scanned with CamScanner

کی واضح اصطلاحات میں) مولازادوں کی نفسیات کے مقابلے بندہ علی کے طرزِ فکر کی ایک جہت بالخصوص نمایاں کی ہے۔ بہ لحاظِ نسب مولازادوں کے مماثل ہونے کے باوجود، بندہ علی مزاجاً ان جیسا نہیں ہے۔ یعنی ابوالفضل صدیقی کا طرزِ بیان بتا رہا ہے کہ کسی فردِ واحد کی افتادِ طبع سے اجتماعی روش یا طرزِ فکر کے برخلاف عمل کی جانب بھی لے جا سکتی ہے — انحراف بھی تو انسانی فطرت کا ایک تقاضا ہے۔

20

"بندہ علی بھی چماری کا بیٹا تو ضرور تھا، مگر پرورش چمار کسان کے جھونپڑے میں نہ ہوئی تھی بلکہ حویلی اور دیوان خانے کے اندر رئیس سید باپ کی دوسرے تیسرے درجے کی اولاد کے ضمن میں جوان ہوا تھا، اور ایسوں کی بھی ایک مخصوص سطح ہوا کرتی ہے اور جس میں ایاز قدرِ خود بشناس کے حدود نہایت واضح رہتے ہیں۔" (ص 236)

تاریخ آفاق بدلے، دولت، حکومت ہاتھ میں لے کر یہی عمل نسل سے نسل کر رہا تھا۔ قدم قدم پھونک پھونک کر دھر رہا تھا، مبادا، کہیں لونڈی بچہ چماری زادہ کا معاوضہ اچھل نہ جائے۔ اور آس پاس کے سارے گھرانے سید پٹھان رسیداروں سے زیادہ نجیب اشرف سید بنا ہوا تھا۔ اس نے ریاست کا انتظام ہاتھ میں لیتے ہی عام کاشتکاروں میں معمولی مراعات رائج کیں اور ان مخصوص ممتاز دورِ بیت گھرانوں پر تو کرم کی بارشیں کر دیں۔ کیونکہ اسی چوہان خاندان کے ایک جدی نیک نام تھے۔ پہلے تو بندہ علی دراز اختیار ایک کارکن تھا، تنخواہ دار ملازم سے کچھ ہی بہتر اور ایک ذرہ بھی مخلص جیسی پرورش کا آدمی پیدائشی رئیس ذاتی۔ ان مولازادوں کو خاص طور پر مراعات دیتے دیکھ کر نظر لحاظ سے بے سبب کیا، تاہم کمیں اس نے مطمئن کر دیا کہ یہ لوگ اس کے اہل اور حقدار ہیں۔ یہ ٹھیک کا منطقی ثمرہ تو تھا، لیکن غریب ان مستفیض ہونے والوں کو مطمئن نہ کر سکا۔ ان کا منہ جتنا بھرا اتنا ہی زیادہ کھلتا اور پتا نہیں کہ یہ تحت الشعور میں ہی تھا کہ شعور میں بھی کہ یہ لوگ اپنے ہی رئیس زادے کے ہاتھوں یہ مراعات پا کر ذہنی ناآسودگی کا شکار ہو جاتے تھے جس کے رد عمل میں مطالبات فزوں تر اور مجبور ہونے پر ناآسودگی بھی فزوں تر ہو جاتی تھی اور احسان کا میدان میزان

محسوس ہوتا تھا۔ کتے کی فطرت کے خلاف یہ بندو بلی کا ہر بار چھینا ہوا لقمہ غپ سے منھ میں سے گرا لیتے دیکھتے رہتے۔ انھیں یہ مراعات بڑے میر صاحب مرحوم کے روایتی دور ہی کی بخشی [illegible] نئے تعصبوں سے زیادہ قیمتی تھیں۔ اور اس ٹھنڈی جنگ کے درمیان یہ عجیب حادثہ پیش آیا جس کا دور دور گمان نہ تھا۔ کبھی تو ریشمی سی ہی زندگی کے دھارے کے موڑ پر آ کھڑے ہوئے لیکن جیسے ان مولا دادوں کے محسوسات کے بیچوں بیچ ٹیل آپڑے۔ یوں تو تو دوسرے مسائل کا غم سبھی نے منایا، مگر اس پہلو سے کہ یہ موت مستقل طور پر ان کی گردن اُنھیں جیسے ایک اردلی برادر کے ہاتھ میں پکڑا گئی، مولا دادوں کے گھر گھر اکلوتے بیٹے جیسا قلبی ماتم ہوا۔ (ص 237تا238)

⁂

موت [illegible] کی ذہنی کیفیت پر مشتمل یہ پوری عبارت اور بالخصوص یہ فقرے کہ "مولا دادوں کے محسوسات کے بیچوں بیچ ٹیل آپڑا" "[illegible] کی گردن انھیں جیسے [illegible] کے ہاتھ میں پکڑا گئی" اور "گھر گھر اکلوتے بیٹے جیسا قلبی ماتم ہوا" ابوالفضل صدیقی نے [illegible] کے لیے تحریر کیے ہیں کہ معاشرے میں صدیوں سے رائج تصورات اور رویوں کے نتیجے میں خود [illegible] اپنے آپ کو [illegible] تصور کرنے لگے ہیں۔ [illegible] فریب صدیوں جاری رہے تو فریب دینے والے اور فریب کھانے والے دونوں ہی اس فریب کو حقیقت تصور کرنے لگتے ہیں۔ اس باعث بھی [illegible] توقیر [illegible] ضروری ہے، کیونکہ اگر وہ [illegible] جاری رہ جائے تو [illegible] ذہنی [illegible] کرتے [illegible] سوچتے ہوئے ابوالفضل صدیقی نے [illegible] تصورات کی وجہ [illegible] کے بارے میں اپنے [illegible] راست بیان کرنے بھی ضروری سمجھے ہیں۔

21

اور تاریخ شاہد ہے [illegible] روایت میں [illegible] کے لیے [illegible] آئی ہے، [illegible] سے [illegible] دیکھا جاتا ہے [illegible] اور [illegible] رہی ہیں۔ [illegible] مقابلے پر فاسق و فاجر مجبور [illegible] کا حق [illegible]

Scanned with CamScanner

کا اپنی نوعیت کا المیہ وراثت مساواتی تمدن کا کچھ حصہ تھی۔ یوں تو اقتصادی طور پر کوئی بھی فرد متاثر ہونے کی شکایت نہ کر سکتا تھا کیونکہ دور دور بجز بندہ علی کے کوئی دعوے دار تو تھا ہی نہیں، مگر شرفا نجیب الطرفین کے کلیجے دہل کر رہ گئے۔ زرعی اراضی کی ملکیت کی توریث، جو سلطنت برطانیہ کا ایک جزو تھی، مالک تخت برطانیہ کا ایک پایہ نجابت کے راستوں سے بھٹکی تھی، اور یہ طبقہ سارا روایت وہ تھی جس کے تحفظ میں پارسی روایت پناہ اور خواب خوش پرور نے اٹھارویں صدی سے اینگلو محمڈن لا اور ضابطۂ دیوانی کے مضبوط قلعوں تک کو منہدم کے ایجاد کیے ہوئے ہتھکنڈوں سے زمیں بوس کر رکھا تھا، اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ترجیحی اصول پر مفید مطلب مذہبیت کا ملمع بھی چڑھا رکھا تھا۔ اور لونڈی بچے، انجب، رب زادہ تو کس شمار و قطار میں، حسب نسب والی خاندانی ماں کی جھولی میں سے خاص خون والی نجیب الطرفین منتخب بیٹیاں بھی زرعی اراضی کی توریث کے سلسلے میں عدم وجود برابر رہتیں۔ اور پھر یہاں تک کے بڑھ چکے تھے کہ محمدی قانون وراثت کی تقسیم کو بالکل ختم کرنے کے لیے صرف فرزند اکبر ہی سب کچھ ہوا کرتا تھا، اور اس طرح معمولی سے زرعی اراضی کے رقبے کا مالک ایلم ور دکتور سے بھی بڑھ کر اپنا روایتی رشتہ قیصر و کسریٰ سے ملایا کرتا۔ چونکہ اردل تولید، جسے ٹھیک سے لونڈی بچہ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس ترکیب کے ساتھ بھی وراثت ہی کی روایت اور ضابطے کا تصور ہوتا ہے، ویسے معاشرے کے کسی شعبے میں کوئی مقام نہیں ہوا کرتا۔ حظ نفس کی خاطر کم و بیش پولی گیمس پرندوں کی طرح طرفین نہیں بلکہ اکثر یک طرفہ مرضی کے تحت، کسی ایسی دکھی کو تھپیا یا جس کو ہم وارے میں "رستہ چلتی" بھی کہتے ہیں۔ بسا اوقات اتفاقیہ، اور گاہ گاہے کبھی کبھی حادثاتی طور پر ہی، دو جسم جمع ہو جاتے ہیں۔ نجیبی، نجیب الطرفین، بیٹوں کی ہاتھ تھمائی، قاضی کی کندھوں دھری بیگم سے ہیں، پیار و رجعیت کے ساتھ، وقت کے وقت من تو شدم تو من شدی کے انداز میں حلول ہو کر پسند نہ رہتے، لیکن اس سے عطا کردہ پھل سے حنظل کی طرح منہ بگاڑتے۔ یہ میوۂ شیریں فرزند تو فرد ہے، سوری کی گھوڑی کی طرح کے ڈلے ہوئے بچھڑے کی تعریف میں بھی نہ آتا، اور بسا اوقات باپ کو بیٹا بیٹے کا اذیت محسوس ہوتا، اور مجسم افسوس۔ تاہم یہ اذیت و افسوس اپنے وجود کے تو حامل ہوتے، ورنہ بندہ علی تو ان سے بھی اردل سطح کی مخلوق تھا۔ سچ پوچھیے تو نہ ماں کا نہ بیٹا، نہ باپ ہی کا پوت۔ (ص 339 تا 240)

Scanned with CamScanner

❁

یہ وہی افکار ہیں جو ابوالفضل صدیقی "طرزِ دیگر" گل رعنا کی تلاش میں (اقتباس: 3) میں ظاہر کر چکے ہیں مگر یہ تمام کہانیاں الگ الگ ہیں اور صورتِ حال بھی مختلف۔ لہٰذا قاری کے وجود کو ایک بار پھر زحمت دلانے سے باز کیوں رہا جائے، کہ شاید یہ طرزِ بیان اس کے جسم و جاں میں خفتہ صداؤں کو ماحول کی دولت بیدار بنا دے۔

کہانی کے تیرہ یا چودہ صفحات میں بیان شدہ یہ افکار، بالواسطہ طور پر ان واقعات کی راہ بھی ہموار کر رہے ہیں جو مولانا اور ان جیسے دیگر افراد کی ذہنی بے اطمینانی کے نتیجے میں پیش آنے والے ہیں اور کہانی میں ایک پُرتجسس موڑ بھی پیدا کرنے والے ہیں۔

22

باہر ماتم علی اصفہان حویلی سے مولا علی کی موت کا جلوس جاری ہو کر رات گئے تک چھایا رہا سویرے، آدھی رات ایک تے ہوئی، صبح ہوتے ہوتے چھٹ چھٹ گئے، اور بستی میں تمام دن ذہنیت، رنج اور صدمہ، غیبت کا دور دورہ رہا، سہ پہر تک رونا دھونا، غم و فکر سب یکجا ہو گیا اور تقویٰ رشتے کے ساتھ شفاف و تسبیح سے لگے ہوئے دھارے نے نیچے سے راستہ بنا کر گندے پانی کی نالی کی جانب رخ کر دیا۔ اور ہم چشم برادری کے تعزیت کنندگان کو، جو بستی اور دور و قریب سے تجہیز و تکفین میں شرکت کے لیے جمع ہوئے تھے، وہ دھارا جو ایک شفاف جھیل کی تہ سے بہہ کر نالے میں جا تا ہے، اس دھارے کا راستہ فوراً ہی نظر آ گیا، یعنی تپِ دروں، عداوت، روش بھی اس سے اور کوئی منظر بھی نہ تھا کہ پسماندگان میں صرف بندہ علی ہی کو تعزیت کریں۔ اور یہی ترتیب بستی میں تو آئی تھیں لیکن تعزیت میں اس انداز سے قیامت کے بعد یہ پہلی تھی، اور مجھ کی تقویٰ و دانت کا مداق روایت کو زبردست چیلنج اور بے نیاز عبادت وار تھا۔

تمام شرعی کا ہنر سے ہو گئے۔ کلو رکے اور سے پہلے کی جولی روایت اور حقیقت ایک ذرا دیر میں ہاتھ کا کھیل جیسی معمولی کی حرکت کے سبب گڑھے میں گر رہی تھی۔ پچھلی صدی ہوتی تو ہر بندی اور فوج کشی ہو جاتی، اور بزرگوں کی قبریں پھٹنے اور ماتمی کتنے سے بچائی جاتیں اور گریہ و زاری

دور کا بڑا ہو، وہ مرحوم مولا علی تو طبقے کی ناک ہی جیسے جد امجد کا بیٹا تھا جن کی تاریخی روایت کے تحت دوست دشمن سب دل و جان زبان سے سیادت تسلیم کرتے چلے آئے تھے اور اس طرح اس مقتدر خاندان کی وراثت یوں یکایک غیر کفو، بلکہ ارذل، ہاتھوں میں پہنچ جانے پر تمام طبقے میں ایک نوعیت کی ذہنی بے چینی تھی۔۔۔ (ص 241 تا 242)

٭

ہر طبقے کے ذہن میں پیدا شدہ بے چینی سے ایک سازش وجود میں آئی تو اسے مزید واضح کرنے اور سازش کے نتائج ارادی انداز میں منکشف کرنے کے لیے ابوالفضل صدیقی نے مولا علی کے سوئم کا منظر خلق کیا:

23

دراصل مولا علی کا سوئم تھا۔ بستی میں میلہ لگا ہوا تھا۔ شہر، قصبات اور دیہات کے کئی چھوٹے بڑے رئیس تھے۔ چوبیس گھنٹے پہلے تمام متعلقہ کاشتکاروں میں موت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے، جس میں اتنے بڑے رئیس کو ایک ڈاکٹر بھی نصیب نہ ہو سکا تھا، خواہ مخواہ اپنے کو گنہگار سا محسوس کر رہا تھا۔ سب سے بڑا کانٹا متعلقہ کاشتکاروں کے خاص طور پر بندہ علی کے ددھیالی قرابت دار سوار اور ننھیالی چماروں کے دل میں کھٹک رہا تھا کہ یہ انہیں جیسا اب تک تو خیر جو کم ہی تھا اب کمبخت مالک بھی ہو گیا، اور دوسرا چور تو خیر سایہ تھا اور اب پرچھائیں میں یہ غدر پناہ ڈھونڈ رہا تھا کہ "چماری بچے نے یہ مرتبہ سیدانی رالاے کو زہر دے کر حاصل کیا ہے۔" اور اسی سائے میں بندہ علی کے برابر والے رئیس بھی پناہ لیے ہوئے تھے، ویسے منہ سے اس حادثے کو ہر پہلو سے قضا و قدر سے منسوب رہے تھے، اور دل بھی یہی گواہی دیتا تھا کہ ایسا ہی ہے گی، اور زبان بھی یہی بولتی تھی۔ حالانکہ اس میں کسی وقت ذرا معقولیت کی جھلک پیدا ہو جاتی، کیونکہ دماغ کا یہی چاہتا تھا کہ بات زہر دے کر قتل کر دینے والی رہے تا کہ ہماری نسلوں کو اس حرامی چماری بچے کے سامنے کسی پہلو سے تو برتری رہے۔ لیکن قاضی کا وقار کندھوں پر، تلخ گھونٹ تار اتار کر تعزیت، فاتحہ اور تعین وراثت کے تمام روایتی معمولات برت رہے تھے۔ زبان تک تو آنے کا سوال ہی نہ تھا، دماغ کی بات لکھ یہ چہرے کی ہلکی

کی حرکت تک بھی نہ آسکتی تھی، تاہم ہر کھوپڑی کے اندر کھچڑی سی پک رہی تھی۔

سوئم کی فاتحہ خوانی ہوئی۔ جگہ جگہ کارندوں نے اپنے متعلقہ کاشتکاروں سے روپیہ روپیہ دو دو روپے والی روایتی نذر وصول کرنے کے لیے بستر اور بوریے بچھائے۔ ایک بوڑھا حاجی ایک طشت لیے ڈیوڑھی کی جانب سے مجمعے کی جانب بڑھتا نظر آیا۔ یہ حویلی میں سے بندہ علی کی چماری بیگم بوڑھی بیوہ ماں نے سجا کر بھیجا تھا، اوپر زرکار مخملی جزدان میں لپٹا ہوا قرآن پاک، اس کے نیچے غلاف کعبہ کے ٹکڑے میں بنی ہوئی چادر، اور روایتی نوعیت کی دستار، جو پشتوں اور وارثوں کے سروں سے سروں کے سلسلے سے یہاں تک آتی چلی آ رہی تھی۔ حلقہ کیے ہوئے ہم چشموں کے درمیان جو ضلع کے سب سے اونچی حیثیت کے زمیندار کے سامنے طشت پیش کیا جنھیں نجیب الطرفین سادات کے علاوہ سات مرتبہ حج بیت اللہ اور انچاس دفعہ سنگ اسود چومنے کی سعادت بھی حاصل تھی اور تمام برادری میں ''حاجی میاں'' کے لقب سے پکارے جاتے تھے اور سب رئیسوں میں مقتدر تسلیم کیے جاتے تھے۔ روایتی انداز میں انھوں نے پہلے کلام پاک کو بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا، پھر کچھ دعائیں زیر لب پڑھ کر بندہ علی پر دم کیں اور پیشانی پر تین مرتبہ انگلیاں پھیریں۔ قرآن پاک سر سے اونچا رکھوا دیا۔ گویا بندہ علی کا داغ دھو کر حرف غلط کی طرح مٹا دیا، اور پھر بسم اللہ کر کے نہایت عربی طرز سے دستار باندھی۔ بندہ علی نے کھڑے ہو کر کمر جھکا کے پہلے حاجی میاں کو، پھر تمام مجمعے کو عاجزی کے ساتھ سلام کیا۔ عام مجمعے میں لڈو اور چنے بٹنا شروع ہوئے۔ پٹواری، گرداور قانون گو رات ہی سے آئے ہوئے تھے، وراثت کی بنا پر اندراج نام اور داخل خارج کے لیے رپورٹوں کے فارم بھر کر تیار کر چکے تھے۔ سلام کر کے بیٹھتے ہی بندہ علی کے سامنے دستخطوں اور ان پر بڑے بڑے چودھریوں کی گواہیوں اور تصدیقوں کے لیے بڑھائے ہی گئے تھے کہ سب بھونچکا رہ گئے۔ تھانے کا انچارج پولیس افسر معقول تعداد سپاہیوں کے ساتھ، جیسے کہیں بیچ سے آس پاس کی زمین سے نکل آیا۔ حلقہ بھر کے سبھی بادل گرج رہے تھے اور ان کے بیچوں بیچ بندہ علی دولہا کی پگڑی سجائے سر بلند بیٹھا تھا۔ لیکن تھانے دار کے قدم سے جھینپ اور ڈر خود بخود سب سے غلام کے مجمعے میں تاؤ ... حرکت تھی جو اس طرح داخل ہوا جیسے بھیڑوں کے گلے میں تیندوا آ پڑے، اور پیشتر اس کے کہ کوئی بزرگ مداخلت کرتے، تھانے دار سے پوچھ استفسار کرے، اس نے بندہ علی کے ہاتھ میں وارنٹ

گرفتاری تھماتے ہوئے ضابطے کے چند مخصوص قانونی الفاظ ادا کیے: ''آپ کو مولا علی کے زہر خورانی وقتل کے شبے میں گرفتار کیا جاتا ہے۔' اور جب تک ان ماؤں گروں میں سے کوئی اس قانون اور ضابطے کے روبوٹ سے یک ''وار نکال کر مخالف ہو ہو، اس نے مشینی انداز میں کھٹ کھٹ سے ہتھکڑیاں چڑھا دیں... (ص 243 تا 246)

⊛

بندہ علی کے ددھیالی ننھیالی قرابت داروں کے ذکر سے بھی کے مزید بیان اور سازش کے انکشاف کے علاوہ اس منظر سے ابوالفضل صدیقی نے ایک کام اور بھی لیا ہے، یعنی انھوں نے بچے قاری کو ''حاجی میاں کے لقب سے پکارے'' جانے والے شخص کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ اس شخص کو ابوالفضل کہانی کے حصہ دوم (صفحات: 255 تا 272) کے مزید بارہ صفحات (260 تا 272) پر ایسا کردار بنانے والے ہیں جو ''پیر فانی بڑے میر صاحب سید سردار علی شاہ'' کا زندہ روپ محسوس ہوگا۔ کہانی کی ابتدا ہی سے سردار علی شاہ کو فوت شدہ دکھانا ابوالفضل کی فنی مجبوری تھی۔ وہ ایسا نہ کرتے تو کہانی کا مرکزی خیال ''وراثت میں پیدا ہونے والا پھیر'' پوری طرح واضح کرنے میں کئی دقتیں پیش آ سکتی تھیں اور کہانی موجودہ پرکشش ابتدا سے محروم ہو سکتی تھی۔ یہ مجبوری نہ ہوتی تو عین ممکن تھا کہ مصنف سردار علی شاہ کے اطوار بھی ویسی ہی تفصیل سے بیان کرتا جیسے بعد وفات بعد'' حاجی میاں'' کے اطوار بیان کرنے والا ہے۔

راقم الحروف کے اس خیال کی وجہ، کہانی میں سردار علی شاہ کی زندگی کے، حسب ضرورت مختصر بیان کیے گئے واقعات ہیں۔ پہلا ''جیٹھ بیساکھ کی دوپہری میں''، ''ام ٹھنڈی خوانگاہ میں'' ان کا عمل۔ دوسرا لیکن کہانی کے آغاز میں ہی بیان شدہ، ایک غریب گھر کی نوخیز خوبصورت لڑکی کو ''بچپن میں تاک'' کر اسّی سال کی عمر میں اپنی ''آٹھویں نکاحی'' بیوی بنانا۔ یعنی اگر کہانی کے فنی در و بست اجازت دیتے تو ابوالفضل ''حاجی میاں'' سے منسوب اطوار کو سردار علی شاہ سے بھی تفصیل وابستہ کر سکتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا، تا کہ کہانی کا آغاز پرکشش بن سکے۔ یہ کشش قاری کو جلد از جلد مرکزی خیال تک لے جا سکے اور کہانی میں ایک ایسا مکمل کردار شامل کیا جا سکے جو ''سات مرتبہ حج بیت اللہ اور اُنچاس دفعہ سنگ اسود چومنے کی سعادت'' (ص 245) حاصل کر

چکا ہو، جو "حرام کو حلال کرنے کی شرعی ترکیبوں" (ص 260) سے واقف ہو اور جسے "منو سمرتیوں کا اخراج کیا ہوا" (ص 254) سبق بھی یاد ہو۔

بندو علی کی گرفتاری کا واقعہ جتنے ڈرامائی انداز میں پیش آیا، اتنی ہی ابوالفضل نے ڈرامائی انداز میں رقم کیا۔ اتنی ہی جلدی اختتام پذیر بھی ہو گیا، یعنی ایک تفصیل نگار نے اختصار برتنا چاہا تو پورا واقعہ بمشکل پونے چار صفحات میں آغاز سے انجام تک رقم کر دیا۔

یہ واقعہ ایک مختصر پل جیسا ہے جو کہانی کو ایک سے دوسری نوعیت میں لے جا رہا ہے۔ بندو علی کردار کو ایک سے دوسرے روپ میں پہنچا رہا ہے، اور دوسرے مستقبل کے حوالے سے کلی اختتام کے بعد بندو علی کو ایک ایسے کردار "حاجی میاں" سے ہم رشتہ کر رہا ہے جو اسے ایک نئے روپ کی راہ پر قدم جمانے کے لیے قوت عطا کرے گا، تربیت دے گا، اور ایک "آپ کی کمک" بھی مہیا کرے گا۔ حاجی میاں کے یہ اقدام کہانی کے آئندہ اجزا میں بیان ہوں گے۔ درج ذیل اقتباس میں ابوالفضل نے اس کا اشارہ دیا ہے کہ بندو علی نے اپنے اوپر آیا الزام ہٹانے کے لیے جو اقدامات کیے، وہ حاجی میاں کی رہنمائی میں۔"

24

بندو علی کو اس (مولازادوں کی لڑائی ہوئی) فواد کی جیہ ندو سوئم سے ایک روز قبل یا اس سے دوسرے ہی روز گرفتاری پڑ گئی تھی اور وہ سوئم کا مرحلہ طے ہو جانے کے بعد سدباب اور ازالے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا، لیکن یہ اُدھر پولیس کے کان تک بھی پہنچ گئی۔ جیل کی حوالات میں اس کے پیروکار اور وکیل اس سے اطمینان کے ساتھ باضابطہ اور حسب ضرورت ملتے رہے تو جیل کے ہنکاروں نے زر خرید تعاون کے ذریعے بے ضابطہ طور پر بھی رابطہ قائم کیے رکھے۔ بندو علی وکیل کے ذریعے حالات کا علم ہوتا رہا اور جیل کے اندر سے وہ ہدایتیں اور رہنمائی کرتا رہا۔ اور اس کو بڑی حیرت اس بات پر ہوئی کہ اس کے خیالی قرابت دار چمار اس کیس کے سب سے اہم گواہ بنے ہوئے ہیں اور پولیس انہی کے ذریعے روز بروز فراہم ہونے کا ثبوت تراش رہی ہے جس سے مولا علی کا قتل ہو، ورنہ کوئی ثبوت منحد سے کی سب سے زیادہ اہم اور مضبوط شق تھی بقیہ موت زادے، دوھیالی کی تمام تر یاد سے زیادہ قیاس ...

ہو سکتے تھے۔ اب پولیس، بندہ علی اور اس کے پیروکاروں وکیل وغیرہ سب کی نگاہیں کیمیکل اگزامنر کی رپورٹ کی بے چینی سے منتظر تھیں جس پر بہت کچھ دارومدار تھا۔ اس نوعیت کے کیس دھوں کے پھندے ہوتے ہیں اور یہ وہ فلوک جو پولیس لگاتی ہے، وہ خود شبے میں گرفتار ہوتی ہے۔ قانون اس سے زیادہ کر بھی نہ سکتا تھا کہ سر گشتل بندہ علی کو ہتھکڑی چڑھا کر پولیس لے گئی اور حوالات میں بند کر دیا، اور دوسرا اقدام بندہ علی کی بڑی لاش اکھڑوا دینا تھا۔ مگر شروع سے آخر تک، پانچ ہفتے کی مدت میں، سب کچھ مفت کی چہ اندر و سرا اند ثابت ہوا۔ پہلے تو سبب موت زہر خورانی ثابت کرنا تھا، پھر قوی کی شہادت کی چوہیں مہیّا کر عدالت میں اس کا مرتکب بندہ علی کو ثابت کرنا تھا۔

حاجی میاں کی رہنمائی میں بندہ علی کے قانونی مشیروں اور نجی پیروکاروں نے پولیس کے فلوک کے جواب میں فلوک لگایا اور کیمیکل اگزامنر کی رپورٹ پر کیس کا انحصار کر دیا، اور یہ فلوک تیر بہدف پڑا۔ کیمیکل اگزامنر نے سبب موت زہر قرار دیا جس کے جراثیم متوفی کے پیٹ کے مواد میں پائے گئے، اور ایک مہینے سوا مہینے کے اندر ہی اندر بندہ علی یہاں سے لے کر وہاں تک تھانہ عدالت العالیہ ور تمام خسروانہ کی تمام منازل یک جست میں طے کر کے مونچھیں اینٹھتا، بے داغ اور بے داغ چھوٹ کر گھر آ گیا۔ (ص248تا249)

⊛

بندہ علی نے مرحوم چھوٹے بھائی کی فاتحہ بڑی دھوم دھام سے کی کیونکہ اس کے بیٹے تو یہ "دو چند سہ چند تقریب تھی۔" (صفحہ 250) یعنی خاندانی روایت پر عمل، ایک بڑی غنیمت کی توریث اور قتل کے مقدمے سے برأت —— یعنی وراثت کے دریا میں پڑنے والے حادثاتی بھیر کا مکمل اندمال۔

25

خوشی کا موقع تھا۔ چھوٹے بھائی کا ماتم بڑھانے میں بڑے بھائی نے بہت ہی جھوم جھوم کر اقدام کیا۔ ایک خیر تھی، ایسی ہوتیں مختلف نوعیت کے مہمانوں اور دوستوں کے میلے —— سو ناچ گانے اور شہنائی سے، وہ بڑی سے بڑی تقریب میں جو کچھ ہوا کرتا ہے وہ سب ہوا، اور ان کی جگہ بھی

Scanned with CamScanner

بڑی بڑی خوش الحان قرأتیں گونجی ہیں۔ معمولی حیثیت کے گھروں میں بھی چہلم کی دھوم میں دور دور تک جاتے ہیں، اور بندہ علی نے تو پورے دس روز منایا۔ اور مولوی کی موت سے ٹھیک چالیسویں دن وہی گڑی بندش والی اپنے بزرگوں کی پگڑی سجا کر وردی عبا چوغہ پہن کر تخت میں بیٹھا جو سوئم کے روز حاجی میاں پہنائے گئے تھے۔ (ص 250 تا 251)

❁

یعنی — پگڑی، عبا اور چغے کو لگے حاجی میاں کے ہاتھوں کا مس اس نئے بندہ علی کو سر سے پاؤں تک چھو رہا ہے۔ ان دنوں کے بعد بندہ علی کے ذہن پر حاجی میاں کے اثرات اور ان کی روحانی بندہ علی کو ملنے والے ابتدائی، بنیادی اسباق وغیرہ کا بیان ابوالفضل نے اس طرح شروع کیا ہے:

26

حاجی میاں، جو علاقے کے ان درمیانی حیثیت کے سید زمینداروں میں، زمینداروں سے زیادہ اپنے زہد و اتقا کی وجہ سے سب میں ممتاز تھے اور چھوٹے بڑے سادات کے سب بتجھے ان کا لحاظ ادب کیا کرتے تھے اور یہ جان کر کہ آپ رسول اور نسل فاطمہ ہونے کے گہرے احساس عقیدت سے زیر تربیت کی جستجو کرتے آتے تھے اور غلامی پر فخر محسوس کرتے تھے؛ بیچ ہونے پر بہت سے برادر سادات میں کہ حاجی میاں ٹھکتے تھے، ان کی خود داری اور عقل و دانش کی۔ تمام طبقے کے پرخلوص مشیر میاں کیے جاتے تھے اور بندہ علی اس کا بڑا کرم جتن کر رہا تھا کہ باوجود خاص سید الفضل ہونے کے کچھ چمدری رالہ شغل سادات کے سر براہوں کی خدائی تو ریت کی پگڑی اپنے ہاتھ سے سجی اور رسول کا اعلان کیا اور پیشانی پر مخصوص آیت قرآنی دم کر کے سہارا دے بنایا اور اپنے ہاتھ سے سادات کی سربراہی میں، چہلم کے دعوت نامے پر بھی ہم چشموں نے شرکت کی۔ حاجی میاں سب سے پہلے تشریف لائے اور مجمع چھٹ جانے کے دو تین روز بعد تک تشریف فرما رہے، اور اس دوران میں ولایت کے تمام کامیاب، مستقل کی نشاندہی کر گئے، جو اس بار وہ انجام رئیس زادے کے ذہن میں پہلے سے تھے کی جس طرح اب جرأت و مدد کے ساتھ فرض منصبی کا مسئلہ بھی، اور راستہ ہموار، چلن اور سید صاحب کا سہارا، جس کی بھی جا بجا درج کرنے کی ضرورت اتحاد و پیروی تھی۔

حاجی میاں نے بتایا۔ "ظلم کے پیٹ سے احسان کھینچا جاتا ہے۔" "دنیا ایک شکنجہ ہے، ایک گنّا ہے، جتنا دباؤ گے، اتنا ہی میٹھا رس نکلے گا۔" اور یہ ہونٹ تو وہ بچپن ہی کے وقت سے سنتا دیکھتا چلا آیا تھا "ہمارے یہاں آؤ گے تو کیا لاؤ گے؟ ہمیں اپنے یہاں بلاؤ گے تو کیا کھلاؤ گے؟" "عورت مرد کی غذا ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔ منتر جنتروں کا ختم آنے پر برہمن اور چھوٹی سیتی کا پورا سوختہ یاد کرا دیا، جو اس کے ماحول میں کوئی چیز نہ تھی، مگر اس کے اندر وہ کچھ ایسی ڈرتے کہ کہیں میری چھاپ ظاہر نہ ہو جائے، اس کو اس کے مکمل مظاہرے سے روکے ہوئے تھا۔ لیکن فلمک کی نشانیوں میں کبھی کبھی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شعور کے گدلے متعفن نادان کو جوش آتا ہے تو گنگا جمنا اور برہم پتر کے سب سیلابوں سے اوپر نکل جاتا ہے اور جل پتر کا سماں دنیا کے سامنے آ جاتا ہے۔ حاجی میاں وراثت کی تجارت کے چند اور بزرگوں نے کوئی نئی بات تو بتائی نہیں، معلوم باتیں کی دو ستی ہوئی تائیں، دور دیکھی بھالی تھیں، مگر جیسے کسی نامعلوم طبق سے ہو گیا، جو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اندر والے چمار نے کسی کونے کھدرے سے انگڑائی لی اور سینہ پر بھی چڑھ گیا۔ (ص 253 تا 255)

*

بندہ علی میں اس تنزلی کے وسیلے سے ابوالفضل صدیقی ما بنا یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ چھوٹے بھائی کی موت کے بعد حاصل شدہ دولتوں کے باوجود بندہ علی نے طبقاتی نخوت کا جو پرخم راستہ اختیار کیا تھا وہ اس کے سادہ لوح ددھیال ونھیال والوں کی نفسیاتی کجی کے باعث مڑتے مڑتے اب ذہنی پستی میں چلا گیا ہے جہاں خیر محدود اور شر جاری ہونے والا ہے۔

کہانی میں جہاں جہاں بندہ علی کی نھیال یا ددھیال والوں کا ذکر آیا ہے، وہاں ابوالفضل نے اس طبقاتی نظام کے کسی نہ کسی پہلو کو نشانہ طنز کا ہدف بنایا ہے جس نے ان آدم زادوں کو حدِ آدمیت سے نیچے، بہت نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا ہے۔

ابوالفضل صدیقی کا یہ عمل، جو کبھی کبھی کہانی کے فطری بہاؤ میں رکاوٹ بھی بنتا ہے، قاری کو باور کرتا ہے کہ یہ طبقاتی نظام اپنی رو میں آتے ہوئے آدم زادوں پر احساسِ کمتری کی اتنی تہیں چڑھا چکا ہے کہ وہ اس کمترین حالت ہی کو اپنی حیثیت تصور کرنے لگے ہیں۔ اس حصے کو شق کرنے والا کوئی (اتفاقی) محرک پیدا ہوتا ہے تو وہ اسے پہچان نہیں کر پاتے۔ نتیجتاً یہ مستقل امکان ان

تہوں پر ایک تہہ اور بن جاتا ہے۔

جس طرح مہادیو اپنے احساسِ کمتری کے باعث نہ سمجھ پائے کہ ہندو علم کا دیوان کی سربلندی کا ایک امکان ہے، اسی طرح ابوالفضل صدیقی کی کہانی ''انصاف'' کا شفاتی نامی کردار بھی ایک (اتفاقی) مکان کو اپنی کمتری ختم کرنے کا وسیلہ نہ بنا سکا۔

ابوالفضل صدیقی کی تین طویل کہانیوں کے مجموعے انصاف میں شامل کہانی ''انصاف'' کا یہ کردار چودھری شہباز خاں نامی زمیندار کے اس گھوڑے کا سائیس ہے جو ''ہال جنوری کی اسپ دوڑ اور مبارک ثانی ہولی روایت پر نہ صرف سولہ سے چار درجہ تا ہو بلکہ ایک سعد نشانی سے مزین'' (ص 102) ہے۔

موسم گرما کی ایک دوپہر وہ اپنی اصطبل کے کام سے فارغ ہو کر واپس جا رہا تھا وہ اس کا گزر ایک زیرِ تعمیر مکان کے قریب سے ہوا۔

27

کھدائی کرنے والے مزدور تقریباً نصف گہرائی تک بنیادوں کی کھائیاں کھود کر چلے گئے تھے اور جاتے وقت انھیں پانی سے لبریز کر گئے تھے تاکہ بعد دوپہر جو کام شروع ہو تو زمین پانی جذب کر چکی ہو اور کھدائی میں آسانی ہو۔ ذوقی چمار تیز تیز قدم اٹھاتے ایک ہی بنیاد کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ خلافِ معمول اس بنیاد کا تمام پانی ایک مخصوص حد پر پہنچ کر جذب ہو چکا تھا اور اس جگہ پر ایک بڑی گڑھا سی کھدائی کی سطح کے برابر زمین شق ہو گئی تھی۔ یوں تو ذوقی چمار کے پاؤں یہاں متحرک تھے لیکن اس کا دماغ گہری ریت میں گرم گرم مستی کی رونیوں کے گرد گھومتا رہتا تھا۔ تاہم نگاہ جا پڑی تو غیر معمولی امر پر تجسس سا ہوا۔ ٹھٹکے اور غور سے دیکھا۔ مٹی اور پانی کے مزاج کے محرم تھے اور یہ صاف سی بات تھی کہ بغیر کسی غیر معمولی وجہ کے یہ صورت رونما ہو۔ یہاں پر بھی کوئی درخت تھا جو اوپر سے کاٹ دیا اور جس کی جڑ کا خونخوار زمین کے اندر باقی رہ گیا ہو؟ نہیں کبھی نہیں، یہاں پر نہ درخت تھا نہ کبھی کسی نے کاٹا۔ چھتیس سال کی اس کی یادیں اس ماحول سے وابستہ تھیں اور نہ معلوم کتنی پشتیں انھیں اس ماحول میں بیت گئی تھیں۔ وہ ٹھہرے اور کھدائی کے اندر اتر گئے۔ پاؤں سے اس شق شدہ گیلی مٹی کو

Scanned with CamScanner

دیا تو امید کے مطابق نیچے سے خالی ہونے کا اندازہ ہوا۔ ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو قریب ہی ایک پھاوڑا پڑا نظر آ گیا۔ اٹھا کر ایک ہاتھ جو مارا تو پہلی ہی ضرب میں جھنکار ہوئی۔ کسی دھات کی چیز سے ٹکرایا۔ مٹی کا بھاری تودہ پھاوڑے پر اٹھا کر جو پھینکا تو پیتل کا کڑا نظر آیا اور ایک دو مزید پانچ چھ پھاوڑے گیلی مٹی ہٹانے کے بعد ایک عجیب ساخت کا برتن نظر آیا جس کے ڈھکنے پر کڑا لگا ہوا تھا۔ اور برتن کی ساخت سے اندازہ ہو گیا کہ یہ چیز نہ گمشدہ تیلی کی ہے، نہ مزدوروں معماروں کی، بلکہ کھدائی کے بعد پانی پڑنے سے ٹیلے کے اندر سے برآمد ہوئی ہے۔ وسوسے دماغ میں گھر کرنے لگے، جیسے کسی چور کے ہاتھ میں بلا ارادہ کوئی مال آ پڑے۔

ڈلی چودھری نے گھبرا کر ماحول کا جائزہ لیا۔ ایک جانب خاموش بستی تھی، دوسری جانب سنسان پڑے ہوئے سنگلاخ کھیتوں کا تاحدِ نگاہ سلسلہ جس پر دھوپ میں گیس کی دیواریں سی چل رہی تھیں۔ کسی ذی روح کا نظر آنا تو درکنار، دور کی کوئی آواز کان میں نہ پڑی۔ انھوں نے ایک گہرا ہاتھ پھاوڑے کا مارا اور برتن کو جمی ہوئی مٹی سے اکھیڑا اور کڑا پکڑ کر ہاتھ میں اٹھانے کی کوشش کی، لیکن اندازہ ہوا کہ برتن اپنی جسامت کے تناسب سے زیادہ وزنی ہے۔ وقت کی پوری زور سے پیدا کرتا۔ جب لٹکا کر لے جانا قوت سے باہر تھا تو مجبوراً سر پر جھاڑن کا پنڈو بنا کر رکھی اور اس کے اوپر دھر لیا، اور دونوں ہاتھوں کا سہارا دیے چل پڑے۔ گاؤں کی مخصوص سنسان دوپہری میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ کون کس جگہ سے یہ چیز اکھیڑ کر لے گیا، اور وہ گھبرائے سے تھے۔

چودھری آخری روٹی سینک رہی تھی۔ خلافِ معمول بوجھ سر پر لیے، اور وہ بھی ایسے کیچڑ آلود وقت، برتن اٹھائے دیکھ کر متحیر ہوئیں۔ روٹی چھوڑ کر گھبراہٹ میں دوڑی ہوئی قریب آئیں، اتارنے میں سہارا دیا۔ ڈلی کے نیچے رکھا۔ ڈلی نے دھونے کے لیے پانی لانے کا اشارہ کیا۔ متحیر چودھرائن پانی کا گھڑا اٹھا کر لے آئیں اور گلے سے پانی ڈالنا شروع کیا۔ ڈلی نے پانی کی موٹی دھار کے سہارے رگڑ رگڑ کیچڑ دھوئی۔ ڈھکن تو ظاہر تھا، مگر کڑے کے نیچے ڈھلواں ڈھکن تھا۔ ٹھونک ٹھونک اور کھینچ کھینچ کر بڑی مشکل سے مخصوص طریقے سے ڈھکنا کھلا۔ بیچ میں برادے کا تاریک دربہ اور اوپر ریشمی ورق عمل رنج بچ سامنے آگیا۔ چوہے نے گرد آلود ٹکڑے بھرے ہوئے تھے یہ ہٹا کر رگڑ رگڑ کر دھویا اور مٹی کے پیپل سے صاف تو جگہ جگہ سے چمکدار ہوتا نظر آیا۔ ٹکڑوں کے نیچے راجہ حسن کے

زمانے کے طلائی سکے بھرے ہوئے تھے۔ کل سونے کا وزن تولوں میں تو نہیں، سیروں میں حساب کیا جاتا تو تیس پینتیس سیر سے کم نہ تھا۔ ڈلی چمار کا ماتھا تو برتن کی جسامت و وزن کے عدم تناسب ہی سے ٹھنک گیا تھا، اور اب تو سب کچھ مدیشہ آنکھوں کے سامنے تو جیسے ناچ رہا ہے۔ بہت دہشت کر آ پڑا۔ عورت پہلے تو کچھ نہیں اور جب ڈلی نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بتایا کہ حضور تیلی کا جو مکان بیچے پر بن رہا ہے، اس کی بنیاد میں سے برآمد ہوا ہے اور سب کا سب سونا ہے، تو پہلے تو ٹھٹھک پڑی اور پھر ڈر سے مغلوب ہسٹیریائی سے انداز میں جیسے اپنی مخصوص آواز سے بالکل مختلف آواز میں بولی: "ہے ماتا! ہے لچھمی دیوی! تیری لیلا۔ دیا دیا ماتا!" اور یہ آواز جیسے تک تی سے تسلسل کی شکل اختیار کر گئی اور جب عورت پھر سنبھلی تو پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

اور لچھمی دیوی کا ٹھکانا تو ہر جگہ ونچی جاتی میں بھی نہیں ہے، اور یہ تو چند ویش ہی کے گھر میں سہاتی ہیں، اور شودر کے جھونپڑے میں تو لچھمی کی جھلک بھی ہل کر رہ جا کرتی ہے۔ سو تاسے دیں میں ویدوں کے اشلوک کانوں میں پڑنے پر پگھلا ہوا سیسہ بھرنے کا قانون ہے، اور سونے پر آنکھ بھی پڑ جائے تو آنکھوں میں گرم گرم سونے کی سلائیاں کھینچنے کا حکم ہے۔ صبح سے شام تک زیادہ سے زیادہ تیس چھٹانک موٹے اناج کا آٹا ختم کر سکنے والا شودر تیس سیر سونے کا بار کیسے اٹھاتا۔ بوند بھر میں چھلک پڑنے والے ظرف پر بحر ہند کے طوفان پھٹ پڑے۔ یہ تو وہ دولت تھی کہ معاشرے کے معاشرے اور قوموں کی قومیں دولت کے گٹھے کی بھرے پیٹ ہضم کر جانے والے پنڈت جی کے سامنے آتا تو ان کا پیٹ بھی پھٹنے لگتا، تاہم ڈلی چمار اور شودروں سے مختلف تھے؛ انھیں چودھری کی قربت کی سعادت نصیب تھی۔ روز بد گھوڑے کی لید پیشاب بوریں، گھاس کا گٹھا کھرلی میں رکھ کر، ہری بانات کی وردی بھی پہنتے اور چھوٹے چودھری کی پیچھے سے فٹ بھر کے وصیلے پائدان کے پیچھے کھڑے موٹر گاڑی کی گھنٹی کے ساتھ سامنے چلنے والی سواریوں کو ہٹاتے بھی جاتے۔ انھوں نے جیسے دم توڑتے سنبھالا، ہمت کر کے جیسے سے چودھری کو خبر کر چپ رہا اور سونے کی چٹان کے تلے سے یہ خدا ابلیا کر نکلا۔ حواس کے ساتھ حصہ بھی گم ہوئے۔ اس سہرے خواب کو سمجھنے کی ادنیٰ فکر و استعداد کے مطابق تعبیر بیٹھ کی گئی۔ تشکیل کی اور اس کا دل و دماغ دست شکستہ وجود چمار کے خول میں سے دفتاً خیال بیسے کی بیٹھ نکل کر باہر آ پڑا اور اس کا نا سیدھا

بہر دپ بھر اجلدی سے کھرپے کا ایک کونا کھودا اور برتن الٹ کر اس میں دفن کر دیا اور دو ہزار سال قبل مسیح کا دفینہ بیسویں صدی عیسوی کے سورج کی ایک کرن دیکھ کر پھر سربستہ راز بن گیا۔ مگر اس کے پیسے کتنے۔ ملک تو صوبہ اسرائیل کے منتظر، نہ معلوم کہاں کہاں دفن ہوں گے، البتہ آج کا مالک تو جیسے اس کے ساتھ اسی کونے میں ہی دفن ہو گیا اور ڈی بظاہر بیٹھے تھے مگر دراصل وہ چار فٹ نیچے زیر زمین سفر کر رہے تھے اور شور و دیش ان کے اندر کشتی لڑ رہے تھے۔ وہ صبح کے راتب میں وہی لقمے کھائے ہوئے تھے، مگر حاجت تنی غیر تھی کہ بھوک تو بھوک، اس چلچلاتی دوپہری میں من بھر بوجھ ڈھو کر لانے اور چار چھ فیٹ گہرا گڑھا کھودنے کے باوجود بد نصیب کو پیاس بھی نہ لگی تھی۔ گڑھا پاٹ کر برتن دفن کرنے اور اس کو اچھی طرح لیپ پوت کر برابر کرنے کے بعد غیر اختیاری طور پر اس کا ہاتھ کمر پر گیا، تہ بند کی لنگی ہوئی تھیلی نکالی اور چلم پر تمباکو جمائی، چولہے میں سے کرید کرید کر اپلے کی آگ کے انگارے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور توڑ توڑ کر چلم بھری اور کوٹھرے اور سائبان کے درمیانی دروازے پر چوکھٹ کی ٹیک لگا کر آ بیٹھے۔ نگاہ اس کونے پر مرکوز ہو گئی دوسرے تیسرے گہرے زور دار کش میں جب چلم کی آگ میں سے بالشت بھر لو اٹھی تو احساس ہوا کہ رسے وہ چلم پی رہا تھا۔ گھبرا کر ماحول کا جائزہ لیا اور پھر وہیں پر چلم الٹ کر نئی تمباکو جمائی اور وہی آگ وہیں سے بٹور کر پھر رکھ لی اور پھر لمبے لمبے کش دو تیسرے چوتھے ہی کش میں پھر بالشت بھر لو کے ساتھ چلم کی ساری تمباکو سونت گیا۔ اسی طرح تیسری اور چوتھی چلم پر وقت کا احساس ہوا۔ ماحول کا جائزہ لیا۔ چماری، ایک جھلنگا چارپائی پر لوٹ کی پڑی ہوئی، جیسے دروازہ میں کراہ رہی تھی۔ مختصر سے صحن میں ایک کونے میں کھڑے ہوئے بیر کے درخت کے سائے نے وقت کا احساس دلایا۔ چھوٹے چودھری کے لینے کے لیے ٹم ٹم کچہری سے جاتا ہے، اور اس کو ہوش سا آیا اور معاملے کی سنگینیت اور شدت کا کچھ کچھ نمایاں احساس ہوا، تو گردن سے لے کر کمر کے دیر پنجے تک جیسے برف کی سلاخ دوڑتی چلی گئی۔ تمام وجود تھرا اٹھا اور معدے بلکہ سینے کے دیر پنجے سے زیر ناف تک لہریں اٹھیں اور اترتی چلی گئیں، جیسے پیٹ کا تمام نظام ساتھ چھوڑنے کی حد تک ڈھیلا پڑ گیا۔ بمشکل فوراً وہ اس گھر سے لپک کر بنجر پر کھڑی ہوئی جھاڑیوں میں پہنچ سکا۔ رفع حاجت کے لیے بیٹھا تو محسوس ہوا کہ سلسلہ ناختم ہی ہو رہا ہے۔ کیسے ہی نہ کیسے فارغ ہو کر چلا، مگر اسے پاؤں پلٹ جانا پڑا، پھر وہی لہریں پہلے سے زیادہ ہو رہی تھیں۔ اب کی مرتبہ جیسے

Scanned with CamScanner

کے بالائی حصے سے نیچے رانوں تک سنسناتی نیچے اتر رہی تھیں جیسے اس کے بدن کا سارا وہ حصہ جسم سے علیحدہ ایک بے جان ذلیل مردار کھال کی تھیلی ہے، اور اب کی مرتبہ ٹھیک سے جھاڑیوں تک بھی نہ پہنچ پایا، راستے ہی میں بیٹھ کر جانا پڑا۔ حدت فزوں تر تھی اور ضعف تو جیسے تسلسل سے جب کمبخت کو اٹھنے کی گنجائش ہی نہ تھی گویا تن تمام جسم کی رطوبت اسی طرح بہہ جائے گی۔ اور ایک سانس بھی اچھی طرح سکون سے نہ ہو پاتا تھا، کہ اک ذرا اٹھنے کا ارادہ کرتے ہی دوسری لہریں پھر چل پڑتیں۔ مگر کیسے ہی نہ کیسے طبیعت پر قابو پایا۔ قریب کے گڑھے میں بھرے ہوئے پانی سے ناسیدھا آبدست لے کر چلا گیا، ڈھلکتا اور گرتا پڑتا گھر میں داخل ہوا۔ بڑے زور سے پیاس چمک اٹھی تھی، پوری ایک تیا گھڑے میں بھر کر چڑھا گیا۔ بہت توجہانی اور طبیعت کو سنبھال کر اصطبل کو روانہ ہو گیا، جیسے کوئی بے جان مشین۔ جلدی جلدی گھوڑے پر برش پھیر اور گاڑی میں لگا کر کچہری سے چھوٹے چودھری والا لایا۔ اس کے بعد اصطبل میں سب تمام مقررہ کام معمول کے مطابق انجام دیے۔ دونوں گھوڑوں کے پیچھے پوال بچھایا اور توبڑا چڑھایا اور جب گھوڑے نے دانہ کھالیا تو توبڑا اتار کر چلا گیا۔ اس وقت عمداً اس نے اپنے راستے کو چھوڑ دیا، جیسے کوئی مقروض قرض دار کا یا مجرم محتسب کا سامنا بچا کر رستہ چلتا ہے، اور کافی چکر کاٹ کر دوسری جانب ہو کر گھر پہنچا۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس کے قدم چوروں کی طرح پڑنے لگے اور معمول سے زیادہ ہی دبے پاؤں گھر میں داخل ہوا۔ صحن میں بیری کی شاخوں میں سے چھن چھن کر پڑتی ہوئی متحرک چاندنی، جیسے چڑیلیں سی ناچ رہی تھیں۔ [illegible] کے پیچھے اپنے پرانے ٹاٹ بچھائے ڈھیری پڑی تھی۔ اندر نگاہ ڈالی تو جیسے کوئی آسیب زدہ مکان، چماری نے ضروری بیان کی تھی دونوں میں سے نہ کسی کو ضرورت ہی تھی۔ دوپہر کی ویسی ہی پڑی تھی۔ متوقع اور پہچانی ہوئی آہٹ پر چماری چونک پڑی۔ جیسے ملیریا کا بخار اترنے کے بعد کی حالت جیسی کوئی صورت۔ اٹھ کر گرتی پڑتی صحن میں پڑے ہوئے پیڑھے پر آ بیٹھی۔ ایک پیڑھی کھسکا کر دی بھی تبکار، چودھرا کو سے بنے قریب کو بیٹھ گئے۔ دونوں میں سے کسی کی ہمت نے تار کلام کا یارا نہ دیا۔ دو تین منٹ یوں ہی بیٹھے رہے۔ البتہ اس دوران میں کئی بار گردن اٹھا اٹھا کر غیر اختیاری طور پر کوٹھرے کے دروازے پر نگاہ پڑتی رہی اندھیرے میں شاید چھپر کے اندر سے کوئی مجسم خوف ابھر، دو را حلق صاف کر کے ایک آواز سی نکالی اور جیسے وہ کہیں کوئی اور ہو۔ "اری تنی، یا کیں ارا؟"

Scanned with CamScanner

ایں۔" چماری اس کے حکم پر ہونکارا سی ریتی اٹھی۔ چھپر میں سے مٹھ بھر پھونس سونتا، چولھے پر جا کر بھوبل میں دبی ہوئی اُپلے کی آگ نکالی اور پھونس رکھ کر پھونکیں ماریں اور پھونس جل اٹھا اور روشنی کے سہارے طاق میں رکھا ہوا چراغ اُٹھایا اور بتی کو آگ دکھائی، اور چراغ روشن ہونے پر محسوسات بدلے۔ اب ایک دوسری نوعیت کا خوف سینے سے نکل نکل کر اور گرد تیرنے لگا، جیسے وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے ڈر رہے تھے۔ نہ عورت نے ہی کہا اور نہ ڈنی ہی نے کھانے کو مانگا۔ اپنے اپنے بچھونوں پر پڑے رہے۔ دونوں کو اپنے اپنے محسوسات کے مطابق اُچٹوں ڈوبوں کا بوئی سی نیندیں آئیں۔ عورت پر ہسٹریائی عذار کا دوسرا رخ طاری رہا، جیسے مستوں نے دبوچ رکھا ہو، اور ڈنی کو کسی کسی وقت نامعلوم خوف اس حد تک بے کر پہنچ گیا کہ جی چاہا کہ اس وہاں کو کونے میں سے کھود کر گھر سے نکال باہر کریں اور بچھو ڈے والی جوہڑ میں پھینک آدیں۔ بارے خدا خدا کر کے پو پھٹی اور کوؤں کی پہلی آواز پر سب چھوڑ کر اصطبل کی جانب جیسے ہرنی سی مار کر بھاگ پڑا۔ کیونکہ اس کو خوف ہوا کہ پیٹ میں کچھ لہریں اُٹھ رہی ہیں، مبادا کہیں کل کی طرح پھر دست نہ جاری ہو جائیں اور خیال باندھے میں ہی عافیت جانی۔۔۔ (ص108 تا 1.6)

❀

ڈنی اور اس کی بیوی کا یہ نفسیاتی احوال ابوالفضل صدیقی نے اپنے خاص طنزیہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اسلوب کا پردہ ہٹائیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ حوالہ مصنف کی گہری انسانی ہمدردی پر مبنی ہے اور وہ یہ بتاتا ہے کہ طبقاتی نظام کے اسیر افراد ڈنی، اس کی بیوی اور بندہ علی کی دوھیاں ... والے ہر ... امکان کو بروئے کار لائیں جو اس چنگل کے خاتمے کا سبب ہو سکتا ہے۔

کہانی "خوف" کے حذف شدہ اجزا میں مصنف نے بتایا ہے کہ ڈنی نے دفینے کا کچھ سونا چوری چھپے فروخت کیا اور حاصل شدہ رقم کو بیبیوں کی روٹی، پوری کچوری اور نگلے پکوانے پر صرف کرنے لگا۔ ڈنی کے اس عمل کو ابوالفضل اس کی خفیف سی جرأت باور کرانا چاہتے ہیں جس کا سبب ان کے نزدیک یہ ہے کہ "... ڈنی ... بندر ور شوداروں سے مختلف تھے۔ انھیں چودھری کی قربت کی سعادت نصیب تھی" (اقتباس: 27) اور:

28

وہ روز دو سبز بانات کے بہت سے گول گول چمکدار بٹن اور لال فیتے کی وردی پہن کر، اور پولیس کا جوڑا اپنی تنگ پنجی بندش کی پگڑی سجا کر اور کمر سے چمڑے کی پیٹی کس کر چھوٹے چودھری کے پیچھے کھڑے ہو کر کچہری جایا کرتے، اور پگڑی پر چھند ریشم کا کڑھا ہو چھوٹے چودھری کے نام کا تاج بھی اس سے چست ہوتا، جو ڈیلی کے رعب پر چار چاند لگا دیتا۔ وہ اونچے بچھیرے وان خوبصورت اور نئی ٹمٹم کے پیچھے کھڑے ہوئے سائیس کے فٹ بورڈ کے اوپر چھوٹے چودھری کی پیٹھ سے اٹھی رہ گئی کے ماتھے پر سینہ تان کر کھڑے ہوتے اور آنکھوں کا ٹھاٹھ کیت، خوبصورت چال چلتے وا گھوڑے، تیکھے تیوروں اور گردن کے مٹکنے ٹمٹم کے ساتھ اینڈ اینڈ کر چلتا ہوا، وجیہہ، ایک بچے ہاتھوں میں راسیں لیے گدی پر بیٹھا ہوتا۔ زرق برق سائیس پیچھے کھڑا رہتا، اور کی طرف چمکتا ہوا۔ [illegible] سے تنہا [illegible] رعب اور حسن [illegible] دیکھنے والے [illegible] [illegible] کرتے۔ [illegible] تیر کی طرح [illegible] [illegible] خالی نہ ہوتی [illegible] اس سواری [illegible] میں [illegible] ہوتی [illegible] ''اس وقت ڈپلی کے بھی بھنوؤں اور گردن میں محسوس ہو کر [illegible] چھوٹے چودھری [illegible] [illegible] پر پہنچتے تو سامنے کھڑا ہو [illegible] پولیس [illegible] کے مطابق [illegible] سے سلیوٹ دیتا۔ چھوٹے چودھری [illegible] ڈپلی کے [illegible] میں [illegible] جاتی، [illegible] آنکھوں میں [illegible] گردن ٹیڑھی ہو جاتی۔ ٹمٹم [illegible] ہوئے وہ پولیس والے کی جانب بری نگاہ ڈالتے اور پولیس والا ایک ذرا [illegible] تیوروں سے [illegible] کے سائیس کی جانب دیکھتا، اور ڈپلی جیسے [illegible] حکومت میں [illegible] محسوس کرتے اور مستقبل تک خالی [illegible] سے [illegible] (ص 103 تا 104)

*

ڈپلی اور [illegible] چودھری کے [illegible] [illegible] چودھری سے [illegible] چیچے سے [illegible] سامنے والی سواری سے [illegible] پولیس والے نے [illegible]۔

اپنے آپ کو حکومت میں شریک ہی محسوس کرتا جسے ابوالفضل نے ایک صفحے اور پونے دو سطروں میں بیان کیا ہے جیسے ہی کچھ دیر کے لیے ہوتا ہو مگر یہ بھر دور کی کایا کلپ، ڈلّی پر بڑے واضح طور سے یوں شدومد سے ظاہر ہوئی کہ ان پر طاری نسلی احساس کمتری کی تہوں میں کہیں خود اعتمادی کی ایک خفیف سی کرن چمکی تھی جس کے طفیل میں ان کے چوکے چولہے نے اعلیٰ ذات والوں جیسے چکنے چپڑے کھانوں کا مزہ دیکھا۔ ڈلّی نے بیماری کے بہانے گھر بیٹھ کر جسمانی آرام حاصل کیا اور جب متعدد وجوہ کی بنا پر چودھری شہباز خاں کو شبہ ہوا اور ڈلّی سے اس کی خوشحالی کے اسباب باتوں باتوں میں اگلوانے چاہے تو ڈلّی نے اپنے وجود سے برتر ہوشیاری برتتے ہوئے ایسا کوئی جواب نہیں دیا جو چودھری کو چھپر میں گڑے دفینے تک پہنچا سکتا۔

لیکن جب متعدد ذرائع سے چودھری اور علاقے کی پولیس کو ڈلّی کی تحویل میں پرانے سونے کے زیور اور ٹکڑے ہونے کا یقین حاصل ہو گیا تو پولیس نے ڈلّی کے گھر پر چھاپہ مارا۔ وہ اس وقت گھر میں موجود نہ تھا۔

29

لال پگڑی پولیس کی جماعت کو دیکھ کر چماری تھمیا پڑی اور پھر گھگھیاں آواز کا خوف، ہسٹریائی انداز ہو گیا۔ جیسے اختیاری طور پر چھپر سے باہر آ گئی اور صحن میں بیری کی جڑ سے لپٹ گئی۔ گاس ہوئی بکری کی آواز جیسے چھری کی دھار کے نیچے سے بلند ہوتی ہے۔ چماری کے گھر کی کائنات گئی، چند منٹ میں کانسٹبلوں نے پورا گھر روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ چند سانسیں سب سے یک ذرا سوالیہ سی میں، اور دوسرا قدم شروع ہوا۔ ہیڈ کانسٹبل نے اپنی ڈنڈا ٹیک کر اس کی نوک سے جگہ جگہ کا فرش دھم دھمانا شروع کر دیا۔ سب متوجہ ہو گئے اور سب سے زیادہ چماری۔ اس کی آواز بدل گئی، ہسٹریائی انداز شدید ہو گیا، تشنج میں خائف بندریا جیسی حرکتیں کرنے لگی اور جیسے اس کرب سے چھٹکارا حاصل کرنے کا انداز پیدا ہو۔ بیری کے تنے سے علیحدہ ہو گئی، بھیانک کراہتوں میں اندر رینگ گئی اور اس کونے میں پہنچ کر "ہے دہاتا، ہے بھگوی دیوی! دیا دیا دیا کرو!" اور پھر جنون کی حد تک پہنچے ہوئے ہسٹریائی انداز میں اس کونے کو لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سیدھا نشیبل ادھر رہیں ٹھوکتا ہوا پہنچا تو شاہد کر کے بتانے تھی بیوی بیوی بھی ملی ہیں''
(ص 154 تا 155)

*

ذکی کی بیوی کی یہ حالت عاماً اس وجہ سے ہوئی کہ اسے تا حال کسی کایا کلپ کا موقع میسر نہ آیا تھا، جبکہ ذکی کو مدتوں بھٹکنے ہی کے بعد دیر کو سہی مگر ہر روز ایسا موقع حاصل رہا تھا۔ نمٹہ ذکی حاصل شدہ دفینے کی صورت میں پیدا امکان کو حقیقتاً بروئے کار لا کر احساس کمتری سے کلی رہائی کی راہ نکال سکا مگر اس نے بیوی کے برعکس کچھ عرصہ ضرور خود اعتمادی کی کرن سے قوت حاصل کی۔ دفینے کی صورت میں پیدا شدہ امکان کو کلیتاً غیر مستعمل رکھنے والی روحانیت کے نتیجہ تاریک احساس کمتری سے ذکی کو نکل سکنے اندھیرے میں دھکیل دیا اور وہ یقیناً احساس کمتری کی ایک اور دبیز تہہ میں دب کر ''تجوری کا چابی پر چوٹ کی پڑی رہ گئی'' ہوگی۔

کہانی ''دھارا'' کا ایک کردار مسکی دھارا بھی ذکی کا ہم ذات ہے۔ ذکی میں خود اعتمادی کی کمی پیدا کرنے والی وجوہ چودھری سے قربت، بیرسٹر شاہد، وردی اور کچہری جانے کا شوق تھیں لیکن ''دھارا'' میں ابوالفضل نے روشنی کے جو اسباب انہایت سوچے سمجھے انداز میں مہیا کیے ہیں وہ ان سے زیادہ پر قوت اور معنی خیز ہیں:

''وہ جوان ہو کر بھی دو سے چار پیسے اور دو روٹی سے زیادہ ترقی نہ کر سکا تو گاؤں کے بڑے بوڑھوں کے سمجھانے کے باوجود شہر بھاگ گیا'' (ص 10) اور کانپور کی ملوں میں نوکری کرنے کے دوران اپنے رنگ اور دیگر ملوں میں کام کرنے والوں کے مطالبات منوانے کے لیے ہڑتال (ص 12) کی راہ اختیار کی۔ ''مزدوروں کے ایک بڑے جلوس کے آگے آگے ہڑتال (ص 13) کے نعرے بلند کیے۔'' ''سر پھٹا ہوا خون میں لت پت، ہتھکڑیاں پہنے ہوئے، بہت سے پولیس کے جوانوں کے درمیاں کشاں کشاں'' (ص 3) جیل گیا۔ وہ 1938ء کی سی آئی ڈی کی رپورٹ کا ایک پیش رو تھا جس کی بنا پر مزدوروں سے اپنے مطالبات منوائے اور اس ربع صدی میں مزدوروں کا سب سے بڑا کارنامہ شمار ہوئی۔ (ص 13)

کانپور کی سرِ راہ ملاقات میں دھارا کو سنگھ بابو نے یہ تاثر دیا کہ جب وہ زراعتی کالج کی تعلیم پوری کر کے گاؤں لوٹیں گے تو دھارا کو ساتھ لے جائیں گے اور اپنی زمینوں کا مختارِ کل مقرر کریں گے یوں دھارا سے اپنی بچپن کی دوستی نبھائیں گے۔

گاؤں وہیں پر دھارا کے مشاہدے و فہم کے مظاہروں کے ذریعے ابوالفضل صدیقی نے قاری کو محسوس کراتے ہیں کہ ایک وسیع تر ماحول اور جمہور سے درد کا رشتہ کرتے ہوئے دھارا میں ذہنی سے کہیں زیادہ خود اعتمادی اور اس سے بھی کچھ بڑھ کر وہ راسخ قدم تھا چکی ہے جو فردی شعور اور پھر اجتماعی شعور کو پختگی سے رہا کرتی ہے۔ راجپی گاؤں میں محدود زندگی کو میسر آدھے پونے حصے یومیہ کی ناپ کلپ کے مقابلے دھارا کو گاؤں چھوڑ کر شہر جانے، وہاں مل میں کام کرتے ہوئے اپنے ہم حال افراد سے قربتوں نے اور ان کے دکھوں میں عملی شرکت کے متنوع مراحل نے اس کی کایا کے تہہ در داخلی اس درجہ منقلب کر دیے کہ وہ زمین اور اس کے عطیات کو نت نئے حربوں سے اپنی گرفت میں رکھنے والوں کے رویے بھی پہچاننے لگا، اور ذلّت کے برخلاف اپنی قوت جواب دہی کو خلق شناسی اور خلق کے دکھوں میں شرکت سے دوست بیدار رہنا بھی سیکھ گیا۔ بہ الفاظِ دیگر، گاؤں پہ چھائی شر کی دبیز تہہ پار کرنے کے طفیل میں دھارا کو معاشی خیر و شر کی گہری تمیز اور حصولِ خیر کے لیے جمہور کے اجتماعی عمل کی دور رس معنویت کا ایقان حاصل ہوا۔

30

اپریل 1940 تک سنگھ بابو امتحانات دے کر رخصت ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصے بعد دھارا فوراً ان کے پیچھے پیچھے نیا زرعی سال شروع ہونے سے قبل ہی جیٹھ میں پھر گوٹے پہنچ گیا، تاکہ نئی اراضی ٹھیک وقت پر سنگھ بابو سے لے سکیں اور اساڑھ کی پہلی بھرن پر وہ اپنا ہل بیل کھڑا کر دے۔ مگر اس نے تو وہاں اور ہی رنگ دیکھے۔ دھارا سنگھ بابو کے پہنچنے سے تین ماہ پیشتر پہنچ چکے تھے۔ جدید قانونِ قبضۂ اراضی کا مسودہ منظور ہو چکا تھا، وزارت کی کرسیاں سے ٹوکر چھوڑ کر جیلوں میں چلے گئے تھے اور سنگھ بابو کے ہاتھ میں مسودہ پر سے [illegible] ایکٹ کی تلوار کے جدید قانونِ قبضۂ اراضی یو پی کی دفعہ نمبر 171 سے جنگی کاشت کا نیا خنجر دیے گئے تھے، اس کو ان کے

Scanned with CamScanner

بوڑھے مختار عام اور مقدم نے چھ مہینے میں بڑے زور سے اپنے زراعتی کاٹ چھانٹ آقا کی نئی اسکیم کے مطابق استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور سنگھ بابو نے پہنچتے ہی پرانی لینڈ اکوزیشن ایکٹ کی تلوار پکڑی جس کی دھار دفعہ 171 جدید قانون قبضہ اراضی ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے خنجر سے کہیں زیادہ تیز تھی، اور ان کے پہنچتے پہنچتے ہی جولائی سے ان کی اسکیم بتدریج جامہ پہن گئی۔

وردھارا نے گاؤں میں پہنچتے ہی جائزہ لیا کہ سنگھ بابو زمین دینے کے بجائے الٹی لے رہے ہیں، اور صدیوں کی بنی ہوئی زمینیں اپنے قانون اور لوہے کی مشین سے پھیر پھیر کر اپنے گرد چھانٹ رہے ہیں۔ پہلے تو ان کی اپنی بھوک دیکھ کر وردھارا کی ہمت ان سے ان کا کانپور کا جیم وعدہ یاد دلانے کی نہ پڑی، مگر کانپور میں رہ کر اور مل میں مزدوری کر کے اس میں ذرا بے باکی سی آ گئی تھی، اور لاکھ چمار سہی اور رعایا، مگر تھا تو ان کے ساتھ کا کھیلا؛ جب ایک روز ذرا جھکایا تو انھوں نے بکمال شفقت اپنے جدید آلات سے ٹریکٹر کی جانب اشارہ کیا اور اس نے مشفقانہ ہدایت کے ساتھ کہ "بس اب ذرا کی دراتی کھرپی لے کر فیلڈمین کے پاس تک چلے جایا کرو اور شکل دکھا دی، حاضری بھر جایا کرے گی اور شام کو مزدوری مل جایا کرے گی۔" وردھارا سنگھ بابو کی اس پیش کش پر دل ہی دل میں خوش ہو گیا، اور وہ سمجھ تو گاؤں میں پہنچتے ہی گیا تھا کہ سنگھ بابو زمین بانٹنے نہیں آئے ہیں بلکہ نئی ساخت کے جنسلے کھرپے اور دو آنے یومیہ اور دو روٹی بانٹ سارے گاؤں کی پیداوار سمیٹنے۔ وردھارا دنوں بعد جب فارم کے مزید پھیلاؤ میں عدالت سے اس کو بھی اپنی چار بیگھے موروثی اراضی کی بے دخلی کا نوٹس ملا تو "آؤ جی، اب تو گھر کا بھی لے جاؤ" وہ سانپ کی طرح بل کھا کر رہ گیا۔ اگرچہ کانپور کی کمائی کے مقابلے میں اس اراضی کے چھوٹے سے ٹکڑے کی کوئی وقعت نہ تھی اور اس کی پیداوار سال چھ مہینے پیچھے ہوں دیولی جب وہ شہر سے تیوہار منانے آیا کرتا تو اس کی دس بارہ دن کی پوری مٹھائی سے زیادہ نہ ہوتی تھی، مگر جب اس کی نظر گاؤں کے اندر ان بڑے بڑے خاندانوں کی جانب گئی جن کے پاس موروثی کاشت کے ستّر ستّر کافی رقبے تھے جو بآسانی ان کے کفیل تھے اور اب جن کی بے دخلیوں نے بعض خاندانوں کے تمام افراد کے ہاتھوں میں تھما دی کھرپی جیسے کے بیت (دست) کے بہ ہاتھ اور صبح و شام دو آنے یومیہ اور دو روٹی کی بھیک جھولیوں میں پڑ جاتی تھی تو اس کے خون میں جھاگ اٹھنے لگے اور وہ پیچ و تاب کھاتے سانپ کی طرح بل سے کھانے لگا، وہ نوٹس بے دخلی کاشت و عدالت سے لینڈ اکوزیشن

Scanned with CamScanner

ایکٹ کے مطابق سنگھ بابو کی صرف ایک فارم قائم کر دینے کی درخواست پر گورنمنٹ ایڈ پلان کے مطابق سب کو ایک ہی مضمون کے جیسے مشین سے کٹے ہوئے چارے کے ایک برابر ٹکڑے، سکیم کے پھیلاؤ کے مطابق یکے بعد دیگرے چلے آتے تھے، جس میں بڑے ٹھاکر جی کی طرح پل جا کر رونے پیٹنے، داد فریاد کرنے کا بھی کوئی سوال نہ تھا اور نہ عدالت ہی میں جواب دعویٰ عذرداری کی گنجائش تھی۔ طرفین کی بھٹیوں میں لوہا گرم تھا کہ یکایک بڑے نیتا جی لیڈری کا ستھوا انہائی سے کر دوڑ پڑے اور وہ دھار ور اس کے جوشیلے چیلے نوجوان کا خام مواد پکا ہوا تیار دیکھ کر ہی جو آئے تھے۔ مگر سنگھ بابو بھی پرانی سیاست کے پروردہ اور نئی پالیسی کے ساخت پرداختہ تھے۔ فارم کے قیام کی سکیم میں ایک معقول رقم پہلے ہی سے علیحدہ کیے بیٹھے تھے جس کا ایک حصہ عدالت کی "متفرقات" کی خرید میں خرچ کر چکے تھے۔ بوڑھے نیتا جی کو بھی خوب پہچانتے تھے اور جانتے تھے کہ شیر بوڑھا ہو کر "دم خوری" پر اتر آتا ہے اور بھیڑیا پرہیزگاری پر۔ اور رقم "متفرقات" کی پہلی قسط پر نیتا جی کا حلق بند ہوا اور دوسری رقم پر تو وہ بڑی پڑھائی کے علاوہ ان کے پیٹ کی چڑھی چڑھائی اتارنے لگے اور ساتھیوں میں نجات "چاہت صوتی" کے ساتھ الٹی الاپنے لگے، اور تیسری قسط پر تو فارم کی تکمیل کرا کے نہ صرف کسانوں ہی کو چھوڑ گئے بلکہ یک گونہ ترک دنیا ہی کر گئے اور سندری کا کاروبار اور دیش سیوا کی ٹوپی لنگوٹی بڑے بیٹے کو سونپ کر بقیہ عمر مالا ہی پکڑے رہنے میں اس جنم کے بیتے تیر کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ دھار نیتا جی کے اس طرح چھوڑ کر بھاگ جانے پر بہت گھبرایا اور اس کے پاؤں بھی اکھڑے، مگر کانپور گیا اور اپنی بن سری والنٹیئر فوج کی قیادت کا دم بھرنے لگا۔ اس کا جی اپنے ان ساتھیوں کو سنگھ بابو کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلے جانے کو نہ چاہا جنھوں نے اس کی آواز پر آواز ملائی تھی، مگر نیتا جی کی قیادت میں اس کے کندھے کا سہارا لے کر میدان میں آئے تھے۔ (ص 14 تا 17)

⁂

اپنے گاؤں سے الگ، کانپور میں سنگھ بابو اور دھارا نے لگ بھگ پانچ برس بتائے۔ اس مدت میں دھارا نے عامۃ الناس کی درسگاہ سے یہ تعلیم تحصیل کی کہ دھکا دکھے رشتہ استوار ہو جائے تو شہر کے ایسے مدھیروں کو چک کر سکتا ہے لیکن"۔ سنگھ بابو اپنی کٹھی میں پڑی زمینداری کی سیاست پر ٹیگور یلکچر کالج کی تعلیم و تربیت سے جلا پا کر جیسے تیسے شراب دو آتشہ بنے وہیں پہنچے تو چمر گوٹے میں فتنہ

Scanned with CamScanner

محشر جو میں اور قیامت دردآب نظر آئے۔" (ص 17)

ابوالفضل صدیقی نے ان دونوں کرداروں کے حصول میں فرق کی جانب کئی بالواسطہ اشارے کیے ہیں۔ قیام کانپور میں دھارا کا احوال اور سرگرمیاں بیان کرتے ہوئے ابوالفضل صدیقی نے یہ فنکاری برتی ہے کہ مل میں ایجی ٹیشن کی تیاری کے چندے کی مہم، احتجاجی جلوس اور زخمی حالت میں دھارا کی گرفتاری کے مواقعوں پر سنگھ بابو کو بطور ناظر پیش کرتے ہوئے دونوں کے رویوں کا فرق واضح کیا ہے مثلاً:

31

سنگھ بابو کے پانچ چھ کالج کے دوست ان کے ساتھ تھے اور سب کے سب تفریح کو نکلے تھے۔ دھارا مزدوروں کی ایک جماعت کے ساتھ ایک دکان سے چندہ کر رہا تھا۔ اس نے سنگھ بابو کے قریب آ کر مجملاً وہ مطالبات بیان کرنا شروع کیے جن کے سلسلے میں اس مل کے خلاف جس میں وہ کام کرتا تھا اور اس مل کے علاوہ اور کئی ملوں کے مطالبے پر ایجی ٹیشن کرنا چاہتا تھا اور جس کے خرچ کے لیے وہ چندہ کرتا پھر رہا تھا۔ سنگھ بابو نے مسکرا کر سنا تو جیسے ... اپنے ساتھیوں کے درمیان شان ریاست اور فیاضی دکھانے کا انھیں اس سے بہتر موقع نہ تھا۔ انھوں نے مخصوص مربیانہ پہلو لیے ہوئے ایک ذرا جھیڑ دارانہ استغنا کے ساتھ کہا۔

"وہ سب تو ان کی تمہاری اور اخباروں میں... ہوں، مگر مجھے تو تمہاری شکل ہی نئی ہے۔ مطالبات اور ایجی ٹیشن ہڑتال سے مجھے کیا غرض۔ دھارا، بتاؤ کیا دوں؟" اور پھر وہ اطیب نظروں سے ساتھیوں کو مڑ کر دیکھی اور جو کچھ دھارا نے جواب دیا وہ سنا بھی نہیں اور ساتھیوں سے بولے، "دھارا بیٹا ہمارا، پشتینی نمک خوار" اور یہ کہہ کر انھوں نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نکالی اور ایک ایک اور پانچ پانچ روپے کے نوٹ بڑھائے اور دھارا نے مسکرا کر بڑھا لی اور سنگھ بابو نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا، "اوہ، یہ تو اس میں تمھیں کچھ کمی نہیں مجھ سے، یہ لو تم خوش رہتے دھارا" اور پھر اپنے ساتھیوں کی جانب متوجہ ہو کر فخر سے کہا، "یہ یہاں چلا آیا ہے چنار سے۔ اس کے باپ دادا سات پشت میری ڈیوڑھی پر پل کر مر گئے۔" (ص 12 تا 13)

❁

اس منظر میں بالخصوص سنگھ بابو کی "شانِ ریاست"، "جاگیردارانہ استغنا" کی نمائش اور دوستوں کو بتانا کہ "ہمارا اپنا چمار، پشتینی نمک خوار"، "اس کے باپ دادا سات پشت سے میری ڈیوڑھی پر پل کر مر گئے" ظاہر کر رہا ہے کہ ابوالفضل اپنے قاری کو محسوس کرانا چاہتے ہیں کہ سنگھ بابو بھلے ہی کالج میں پڑھا ہوا ہو، مگر ہنوز اپنی اُسی آبائی روش کا اسیر ہے جو آدم زاد کو ذات پات کے بندوبست میں رکھ کر اپنی بادشاہت کے وسائل برقرار رکھتی اور انھیں مستحکم تر بناتی رہتی ہے۔ یعنی کالج کے پانچ برسوں میں سنگھ بابو اپنا یہ ذہنی شر زائل نہ کر پایا، جبکہ گل مزدوری کی اتنی ہی مدت میں دھارا اپنے اعمال کا رخ اپنی ذات کے باہر دوسرے مردوں کی فلاح و بہبود کے لیے متعین کرنا سیکھ گیا۔

بندہ علی کی ننھیال ددھیال والے بنی بنائی نفسیات کے باعث ایک مثبت امکان گنوا بیٹھے، یعنی بندہ علی سے منسلک ہی رہے۔ تو یک وقت بندہ علی مجبوراً حاجی میاں کے دکھائے اُس راستے پر چل پڑا جسے وہ جانتا تو خود بھی تھا مگر تا حال اُس سے گریز کا خواہاں تھا۔

ابوالفضل نے مولا علی کے سوئم (اقتباس: 24) اور چہلم کی فاتحہ (اقتباس: 25) پر یعنی گھر کے باہر حاجی میاں کے بدلے رنگ ڈھنگ اپنے قاری کی نظر سے گزار دیے تھے۔ آئندہ اقتباس کی ابتدائی چند سطور میں بندہ علی کے حالیہ مسائل اور طرزِ فکر کا مختصر ذکر کرنے کے بعد مصنف حاجی میاں کے اندرونِ خانہ اطوار بیان کر رہا ہے۔ اس بیان میں مصنف کی توجہ کا بڑا حصہ حاجی میاں کے ان اطوار و خصائص کو عیاں کرنے پر صرف ہوا ہے جو وہ عورت ذات کے لیے اختیار کرتا ہے۔ اس بیان میں کارفرما مصنف کی توجہ اور توجہ میں برتی گئی گہری سنجیدگی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ صنفِ نازک کے بارے میں کتنی دردمندانہ تشویش سے دوچار ہے۔ مصنف نے اپنی اس تشویش کے کئی نقش دیگر کہانیوں (جن کے اجزا اس مجموعے میں شامل ہیں) میں بھی (مرد) قارئین کی نظر سے گزار کر مرد جاتی کو تنقیح کرنے پر مجبور کیا ہے۔ مصنف کے گہرے طنزیہ اسلوب کا پردہ (اس باب میں بھی) ہٹا کر دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ وہ عورت سے متعلق مرد کے اس رویے کو، یعنی حسن کے ساتھ سر بسر جور و شر کے رویے کو معاشرے کے اخلاقی زوال اور شر کی بادشاہت شمار کر رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

کہانی کے آغاز میں عورت کے تئیں سردار علی شاہ کے رویے کا ذکر کرنے کے بعد ابوالفضل صدیقی ایسے مناسب محل کے منتظر تھے جہاں حاجی میاں کے طور کی تفصیل کے ذریعے اپنے اس احساس کو مکمل ترسیل تک پہنچا سکیں جو اس کہانی کا ایک اہم نکتہ ہے۔ اب کہانی نے مناسب موقع دیا ہے تو ابوالفضل حاجی میاں کے اندرون خانہ اطوار بیان کیا چاہتے ہیں۔ حاجی میاں کے ساتھ ہی ساتھ ان کے گھر میں کام کرنے والے دو اور مردوں (جن میں سے ایک کو وہ اپنا جانشین تصور کیے ہوئے ہیں) میں بھی ان جیسے اطوار کی نشاندہی سے مصنف نے قاری کو محسوس کرایا ہے کہ جب کسی معاشرے پر زوال کے قدم پڑتے ہیں تو ہر بڑا چھوٹا اس کی زد میں آتا ہے اور شر کے بھری موج میں پڑنے والے دراصل بصیرت سے محروم ہوتے ہیں۔

32

قتل کی واردات کے شعلوں میں سے صحیح سلامت نکلنے کے بعد بندو علی نے چھوٹے میر برداشت و رسید کی داستانوں کو ملا کر جوڑ دیا تو یہ اس کے ادراک کے نتیجے پر پہنچ سکا کہ چھوٹے میر مشتبہ ہو جانے سے، پولیس کے اثر اور اس کے سامنے سے ہٹ کر جیل چلے جانے کے سبب میدان خود بخود فراغت پر تیار ہو گئے تھے۔ اور پھر اس نے بعد دو کتوں کا: پہلے ان میں ارادوں سے چپٹ دل اور لالچ ... خاندانوں کی جگہ تھے جن میں سے ایک کے ساتھ باپ کی جانب سے، دوسرے کے ساتھ ماں کی طرف سے خون شامل تھا، اور ایک حجرے کے تحت مسجد اور طویلی کا شریک بھی تھی۔ حاجی صاحب جائیداد کی ملکیت ہاتھ میں آنے کے بعد بندو علی: بڑا دہ سیدانی یا تھا۔ جیل سے واپس آنے کے بعد چشم تحیر میں کے گرد جو ہنسی سے ... باقی تک پہ جمع ہوئے اور چھوٹی بچی ہے بیوں گڑھ گڑھ کر بنی بنی مدد تھی اور رقص نکالے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اظہار ہمدردی اور وفاداری کا مظاہرہ کر کے اس کے مقربین میں کھنچنے کے خیال سے، بندو علی کو استعمال کرنا شروع کیا۔ بندو علی نے اس سلسلے میں پہلے ہی قدم سے قبل بہت سوچا اور پھر خوب سوچ سمجھ کر حاجی میاں کی خدمت میں حاضر ہو کر رسائی حاصل کی، جو چھوٹی سی ذاتی ریاست میں بڑی ظلم آپ تھے؛ ساتھ ہی ساتھ ان علاقے کے سب سے بڑے زمیندار اور با اختیار رہنے کے قائد اور سیاستدان تھے۔ پہلے دبدبہ اور رجحان نوعیت کی دولت سے۔

ساتھ ساتھ سادات کی سعادت سے بھی مالا مال تھے، وراس سب پر سونے پہ سہاگہ، کبرسنی کی بزرگی، ایک سے ایک بڑھ کر سعادتیں۔ سب طبقے میں ان کا درجہ محترم تھا۔ پچھتر کے پیٹے میں بھی بھاری بھرکم، بلند و بالا، سرخ سپید، متناسب سا رنگ، دودھ میں دھلی ہوئی بڑی چھاتی پر مخملی بال، ترشی ڈاڑھی۔ سر پر مکہ شریف اور مدینہ منورہ کے ہر حج کے بعد یکے بعد دیگرے سات رومال، نیم عربی، نیم ایرانی لباس، عبا و جبہ، ہاتھ میں ہمہ وقت کھٹکتی ہوئی مروارید کی بیش قیمت تسبیح جس وقت اپنے نامی گرامی علاقے بھر کے سب سے اونچے ہاتھی کے اگلے ہودے میں بیٹھتے تو ہودا بھر جاتا اور ہاتھی تن جاتا۔

کراچی اور لاہور کے کاروں کے دولتمند شوقینوں کی طرح ازدواجی کاروبار میں حاجی میاں حرم کو حلال کرنے کی شرعی ترکیبوں کے رستے پندرہ سولہ سال کی عمر سے ستر پچھتر تک پہنچتے پہنچتے ہر دوسرے تیسرے برس ایک آدھ ماڈل بدلتے رہے تھے، اور سال اندر شیشوں کی سواری کے نمبر شمار میں نہ آسکے تھے، جن کی اچھی طرح صورتیں بھی یاد نہ رہ سکی تھیں۔ لیکن اولادِ نرینہ سے محروم رہے اور یہ لکت ہاتھ آئی بھی تو قدرت کی ستم ظریفی، سڑے گلے درخت پر کسی بے کیڑے لگے پھل کی صورت، جس کو ہاتھ میں لے کر دور پھینک دیتے ہیں۔ ایک ذرا جوان سی دکھائی پڑتی بیوہ زنان خانے کے باورچی خانے میں نئی نئی کام پر آئی۔ یہ باورچی خانہ صرف ان کے حرم میں چلتا تھا۔ کھانا تو باہر مطبخ سے پکا ہوا مردانے زنانے میں تقسیم ہوتا تھا اور حویلیوں میں بھی آتا تھا، لیکن بیگموں نے یہ باورچی خانہ بالعموم کھانا گرم کرنے کے لیے یا کبھی کبھی اپنے ہاتھوں سے کوئی خاص کھانا بالخصوص پوری پکوان وغیرہ تیار کرنے کے لیے، ورنہ گرم گرم چپاتیاں پکوانے کے لیے قائم کر رکھا تھا۔ اتفاق سے چاروں بیگموں کو کسی ایک بڑی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے سفر پر جانا پڑا۔ ادھر حاجی میاں کو نزلہ و زکام، ہلکی حرارت ہو گئی، حویلی سے باہر نہ نکل سکے اور یہ اس خادمہ کی تقریبِ ملاقات کا موقع ہوا۔ نزلہ و زکام کی بیماری میں پرہیز تو چلتا نہیں ہے، تاہم خادمہ سے گرم گرم پھلکے دوڑ دوڑ کر پہنچائے، بڑے اہتمام کے ساتھ شوربہ بنایا اور میاں کو گھی کی چپاتیوں میں وہ مزہ آیا کہ بیگموں کی پوری کچوریوں اور گلگلوں تک کو بھول گئے۔ "خدمت" اور "خلوت"، دور دور تک میدان خالی۔ گرم گرم چپاتیوں سے بڑھتے ہوئے پینگ ادھر سے تیسرے ہی دن گرم گرم بستر تک جا پہنچے اور پندرہ ہی دن کے اندر میاں نے اللہ دین کا چراغ رگڑ کر حرم سرا تیار کر دی۔ خادمہ مخدومہ بنتی دکھائی دی۔

بہر حال بیگمات یہاں تک تو بہت جز بز ہوئیں۔ وہ آرزو جس میں حاجی میاں کے والد مرتے مرتے رہے اور آج تک حاجی میاں مر رہے تھے، قدرت وٹی کی بھٹیارن کے پیٹ کی اندھیری کوٹھری میں سے نکال رہی تھی۔ اور بیگموں کی حسب بزرگی کی سازشوں کے درمیان مجو نے بیٹا جنا جس کو سرکاری نگاہ میں چاروں نکاحیوں نے سازش کر کے یہ اولاد ولی عہد منتخب نہ ہونے دی اور جب رہائی سے اتنا گوارا کیا کہ سرکار اس کو بھی داشتہ کے پیٹ سے نکلی رسولی سے زیادہ مختلف تصور نہ کر پائے۔ اور قدرت کی خوبی یہ تھی کہ اللہ دھولی بچہ بنا کر جو بیاہی بھیجی تھی صورت شکل کے اعتبار سے چمپ نری، ورنگ اتنا تنگ اور بے وغیرہ کسی جنگلی مخلوق اور آدمی کا کراس نظر آتا۔ جوں جوں بڑھا، پتا چلا کہ دماغی صلاحیتوں سے بھی، عقل ہی ناکارہ ہے۔ وہ بیگموں کی سازش بار آور ہوئی۔ روٹی پانی اور دن کا پتا، اور پینے ہونے کے برتن مانجھنے کی صلاحیت تک تربیت پذیر نہ ہو سکا۔ اندر سے باہر تک سب کی تفریح کا ذریعہ بن گیا۔ بڑے منشی نے "بدّا" نام رکھ دیا۔ وہ بھی ماں کے ساتھ باورچی خانے میں رکابیاں چاٹتا اور ہانڈیاں مانجھتا، اس سے زیادہ صلاحیت نہ تھی۔ بڑی بیگم ویسے اس سازش کے معاملے میں اپنی تینوں ادھیڑ، جوان سوتوں میں کسی سے پیچھے نہ تھیں، ہیں تو وہ بیوہ نسل کی عمر سے کبھی کی تیاور کر گئی تھیں، ورنہ امید تو کم جو جوانی ہی میں ہوتی تھیں، اور امید سے ہونا تو ان تینوں میں سے بھی کسی کو نصیب نہ ہوا تھا۔ لیکن بڑی بیگم تو تارک الدنیا بھی ہو گئی تھیں۔ عبادت کا ہمیشہ سے شوق تھا، ادھر کار خیر کے مشغلے کے طور پر اپنی حویلی کے ایک حصے کو یتیم خانہ سا بنا دیا تھا۔ خورد سال یتیم، یسیر بچوں کو تلاش کرا کر لاتی تھیں، وہ وارث غریب، نادار بچوں کی ذمہ داریوں سے ذریعے اپنی نگرانی میں پرورش کرتی تھیں۔ کئی لڑکیوں کی انھی جیسے گھرانوں میں شادیاں کر چکی تھیں۔ کتنے ہی لڑکے اس پال کر اور پڑھا لکھا کر کے اپنے اچھے روزگار سے لگا دیے تھے۔ مجو باندی دیہاتی حجاموں کی تو دوسرا ہی تھی۔ طاعون جو پڑا تو بھرا گھر خالی ہو گیا اور یہ بدنصیب بچ رہی۔ پتا ہوئی تو بیگم کو پتا چلا کہ لگی کیا ہے بچے کی طرح بستی میں پھرتی ہے۔ دور دور تک کوئی عزیز نہیں، اور حجاموں کی برادری تو بہت ہی مختصر اور محدود ہوا کرتی ہے۔ خبر سنتے ہی پکڑ بلایا اور پالنے لگی۔ صورت شکل جیسی دیہاتی حجاموں کی ہوا کرتی ہے ویسی ہی کالی کلوٹی لیکن مقدر سے خاتون کی وہ سے ناک نقشے میں تو پیاری ہے رہی تھی، خوب ڈیل ڈول اٹھان قد و قامت نے نکل سے آدھو چا۔ چیچک سے چہرے پہ

سے سارا گوشت نوچ لیا اور چلتے چلتے ایک آنکھ بھی پھوڑ دی۔ جوان ہو کر خوبرو نہیں تو آدمی کا بچہ ضرور بن جاتی، مگر وہ تو چڑیل بن گئی۔ یہ تو بڑی بیگم اب تک بھلی ہو رہی ہیں اب سہارا کس کے ہاتھ پیلے کر دیتیں لیکن اس کی کھپت تو حجاموں ہی میں ہو سکتی تھی، اور بستی کے نائیوں کے لونڈوں کے اب پر لگ گئے تھے، چھٹے مہینے بھاگ کر شہر جاتے اور ہیر ڈریسنگ سیلونوں میں نوکری کرتے۔ ان میں ایک آدھ لڑکی کے بھی بال ڈریس کرنے کے مواقع بہم پہنچتے۔ جب بڑی بیگم نے ان میں سلسلہ جنبانی کرائی تو پتا چلا کہ یہ تو دیہات کی حجامیوں میں مسیں تو ... سلوتری کر گئے اور بھونا پہاڑ کی پہاڑ ہو گئی، یہاں تک کہ نظر آنے لگا کہ اب بھونا اسی گھر میں ... کر دے گی، چنانچہ بھونا کے ساتھ بدی کا عنصر بھی شامل کر دیا۔ بڑی بیگم کے پاؤں دباتی جس میں اس کو بڑا اللہ تھا۔ کبھی کبھی دستیں بھی ہاتھ پاؤں دبوانے کے لیے بھی بلا لیا کرتیں۔ دستر خوان کی تجمل نہ تھی۔ میاں لوگوں کی جوانی کا طول شب ہجر اور زلف معشوق سے زیادہ طویل ہوتا ہے اور ساری عمر شب وصل میں کٹتی ہے اور تادم مرگ اور بلا استثنا ہر کنواری جوانی کو صدائے بیعت دیتی ہے۔

حاجی میاں کو شکار کا بہت شوق تھا۔ تمام جاڑوں روزانہ کا معمول تھا کہ مغرب کے وقت بستی کے قریب چاروں طرف چھوٹے بڑے تالابوں پر دبک کر بیٹھ جاتے۔ یہ وقت قازوں کی بیکالی کا تھا۔ مغرب کے وقت سے چھوٹے بڑے غٹ قیں قیں کرتے ہوئے آنا شروع ہو جاتے اور ساری رات آتے رہتے۔ اور تالابوں پر منڈلاتے وقت حاجی میاں ان کا شکار کرتے اور بالعموم رات کے گیارہ بجے کے اردگرد پلٹتے۔ اور آج چھوٹی بیگم کی خوابگاہ میں داخل ہوئے تو بیگم سو چکی تھیں اور جونا بدی آہستہ آہستہ جسم دبا رہی تھی۔ کمرے کے اندر آتے ہی وہ جاڑے کے سنّاٹوں کی خوشبوؤں میں بسا ہوا ماحول حدت انگیز بلکہ ہیجان انگیز کن تھا جس کا اب تک سناٹے کے نم اور سرد فضا میں ہی تصور ہو سکتا تھا۔ پہلی نظر کے ملتے ہی کمرے میں بیگم کے حسن کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ سی ہو گئیں، دل مچل پڑا ... نیند سے ... چہرہ خواب سے مخصوص حرارت میں کچھ اور ہی چمک ... آنکھیں کھلی ہوئی ... سے بھی زیادہ مسحور کن ... ریشم کے لچھے ... ساتھ ... تکیوں اور ... چھوٹی بیگم کا سونا ... اور ... کی دال

کلوپ کی شمعیں اس سب پر سہاگہ چڑھا رہی تھیں۔ تمام ماحول نہایت ہی متوقع تھا اور ایک سانس لیتے ہی جیسے میاں کے رگ و پے میں سرور دوڑ گیا۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی جھونا باندی چھوٹی بیگم کا دامن چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور دبے پاؤں چل پڑی۔ دوسرے تیسرے قدم پر جب روشنی میں آیا تو دالان میں کہیں دور سے پڑتی ہوئی مری مری پتوں دار روشنی میں حیرت اور تجسس کے ساتھ اوپر اٹھے ہوئے گھنے پلکے جیسا چہرہ موڑا اور اپنی واحد آنکھ سے متفسرانہ اور ایک گونہ حیرت کے انداز میں تعاقب کرتے ہوئے آقا کی جانب دیکھا اور کچھ ٹھٹکی تھی کہ کیا حکم دیتے ہیں۔ اس پر دو میاں کے اندر بجلی سی لپک گئی۔ عجیب اضطراب سینہ کے اندر سے نامعلوم کس کونے کھدرے میں سے جیسے ان حجام ہونڈوں میں سے کسی نے جست لگائی جن کو جھونا کو پسند کرتے اور جوڑا ملانے کے بے زیادہ کرنے میں بڑی بیگم کی برسوں سے ریاضت کر رہی تھیں، اور یہ خفت جام تو خیر سے مدت سے پل رہا تھا میاں کے اندر سے ٹھیٹ مرشد کی طرح پھر کی سوتا جھونا پر جا پڑا۔ اور جھونا باندی کی اوقات بڑی بیگم سے کر میاں کی مقرب خاص اور منظور نظر چھوٹی بیگم تک ساری حیثیتیں پڑی سوتی رہتیں اور جھونا ایک ذرا سی فقد میں باندی سے بیگم بن گئی۔ اور سوتے ہوئے شدہ کا پتہ اس وقت دم زدن میں ہوتا ہے اور بیٹ میں بٹ جاتا ہے۔ جھونا تو کانی کھتری تھی اور اس قسم کے پیڑ سے تو مدتوں اس حویلی کی پیٹھ میں تک یکساں متحرک رہتے ہیں۔ حویلی والوں کی نگاہ میں جھونا ایک سند تھی، جو شام سے تو متعفن ہوتا ہے اور لوٹ صبح کو دکھ کر فیصلہ صادر کر دیتا ہے۔ ویسے حاجی میاں کی اس مدد واقی پر کسی کو تعجب نہ ہوا اور بڑی باندی نے منہ موڑ کر تو بڑے جھنپنے پر منہ ڈال دیا۔ یہ وقت کی بات ہوتی ہے۔ چھوٹی بیگم کا کندن اکھیں کی نظر آیا، جھونا کا گوبر سونا دکھلائی دیا۔ افسوس ہے کہ مختلف قیاس آرائیاں ہوتی ہیں۔ یہاں تک بات پہنچی تو میاں نے اپنے بے تکلف دوستوں میں پیٹ تو بریانی، تمنجن، قورمہ، فرنی کھاتے کھاتے اب کرسی کی روٹی اور مرچ پودینے کی چٹنی کو جی چاہتا ہے والی بات بھی چمکا دی تھی۔ اصل میں جھونا کے اندر ایک مخصوص جنسی کشش کے سراغ کی شان دکھائی، ورنہ جسم ضمیر حوصلوں سے ہیں۔ میاں کانی آنکھ کھترا چہرہ، ٹھگنا سا قد، کرخت ہاتھ پاؤں، سب ایک پٹے میں ڈھل گیا اور ایک پٹے میں۔'' اور میاں نے انتخاب کی داد دی اور ان حجام ہونڈوں کو سب بیٹھوں کو قائل کر دیا جس سے شر ن ہوا تک کی تھی، جن پر بڑی بیگم جھونا کو قبول کرنے کے لیے مدتوں سے ریاضت کر رہی تھیں۔

اور بڑی بیگم کو اب تو برسوں کی گنتی بھی یاد نہیں آرہی تھی کہ کب سے وہ میاں بیوی نہیں ہوے ہیں۔ اس کے بعد تو تین چار ور خارج ہو چکی تھیں، اور اب تو چھوٹی بیگم ہی سہاگن تھیں اور چڑھی ہوئی تھیں، بقیہ اور ان کے بیچ والی دو جو تھیں وہ بھی اتر چکی تھیں، اور بڑی بیگم تو بھول بھی گئی تھیں کہ وہ بھی کبھی بیوی تھیں یا ہمیشہ سے محرمات جیسی کوئی رشتے دار۔ بیچاری مدتوں سے بقیہ عمر یادِ الٰہی اور خدمتِ خلق میں بسر کرنے کا تہیہ کر چکی تھیں اور بڑی باعمل زندگی بسر کر رہی تھیں۔ رات بھر عبادتِ خدا اور تمام دن خدمتِ خلق۔ یتیم بچوں پر مشتمل خانوادوں کی نگرانی، اور انھیں قرآن پڑھانا۔ لیکن اکثر شب کی عبادتوں میں خلل واقع ہوتا اور کبھی کبھی تو تہجد حقیقت سے پھسل کر وہم میں جا پہنچتی۔ جب میاں اور چھوٹی بیگم کی سمت سے بت بتاہٹ اور پھر کواڑوں کی کھٹ پٹ اور پھر چاپ سنائی پڑتی، وہ بچے کمرے سے نکل کر اور دالانوں سے گزرتے ہوئے صحن پار کرتے اور پیشاب کرنے کے لیے بیت الخلا جاتے تو رفعِ حاجت سے کہیں زیادہ کوئی بات بڑی بوڑھی بیگم کے ٹھنڈے رُت وپے میں محسوس ہوتی جس کی نمایاں علامت گرم گرم گیند جیسی کوئی چیز ناف کے نیچے سے لوٹتی ہوئی اوپر بڑھتی اور پھر نیچے اترتی۔ بوڑھی ساجدہ، عابدہ بیگم استغفار اور لاحول پڑھنے لگتیں، تشنج جیسی کیفیت طاری کرنا چاہتیں اور پھر تازہ وضو کر کے نیت باندھ لیتیں۔ عمل سے دستبرداری کے بعد بیتے دنوں کی یادیں بھی معدوم ہو کر ان کی حسرتوں میں ضم ہو گئی تھیں اور اب حسرتوں ہی میں زندگی کے مزے لیتیں۔ اور چھوٹی بیگم کو تو اس شب بیدار کی عبادت گاہ اور یتیم خانہ اپنے حصۂ رہائش اور خالص خلوت گاہ کے اتنے قرب میں کھلتا تھا لیکن بڑی بیگم نے نہ معلوم کیوں یہی حصہ پسند کیا تھا۔ اور اس کا پتا انھیں چھوٹی بیگم کی خلوت اکھڑ جانے کے بعد چلا، جب دھر کا حصہ ویران اور خاموش ہو گیا، کہ دوسرے تیسرے روز دو ایک نوکرانیوں نے بچھونا پر جسم چسپ کیا اور خوشبو تو صبح ہی کو نہ معلوم کیسے حویلی بھر میں سویرے ہی پھیل گئی تھی، اور جیسے اندر حجاب ذرہ وساں بھی رخصت ہو گیا اور میاں کھلم کھلا چالو ہو گئے۔ چند روز بڑی بیگم کے کانوں میں بیت الخلا کی جانب سے جانے کی چاپ کے، چھوٹی بیگم کی خلوت سے وقتوں میں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ بیگم بے چاری شیخ مینڈ ھیل دیکھ، کیوں میاں بیوی کے درمیان پھٹے میں پاؤں اڑائے جاتیں، البتہ اپنی وارڈ در خاص الخاص صیل بھولا باندی سے کبھی کوئی حرص نہ کیا۔ ور میاں بچارے یہ جوتی پیزار مستقل طور پر کیسے برداشت کر سکتے

Scanned with CamScanner

تھے، مجبوراً وہ کمرہ ہی چھوڑ دیا بلکہ حویلی کے اس حصے ہی سے کنارہ کر گئے۔ اور ویسے بھی تو حویلی پھیلی ہوئی تھی، ایک دور افتادہ سے ویران حصے میں ایک بڑے دالان در دالان کی غلام گردش نما خوابگاہ کے لیے انتخاب کر لی۔ اور رات کو بڑی بیگم شوہر کی خدمت کا ثواب حاصل کرنے کے لیے جھونا کو حقہ لے کر بھیج دیا کرتیں۔ جس روز دن میں سواری زیادہ کی ہوتی یا شکار میں پانی کے اندر گھسے ہوتے تو ذرا کی پاؤں بھی دبا دیا کرتی۔ کچھ دنوں بعد شب بیدار بڑی بیگم کی عشا سے فجر تک عبادت میں خلل واقع ہو گیا۔ اب کی شب بیداری میں چھوٹی بیگم کے کھٹکے اور چاپ کو بڑا دخل تھا، سچ پوچھیے تو عبادت کا سچا لطف اور خضوع و خشوع سب رخصت ہو گیا اور پتا چلا کہ حقیقت و مجاز ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ چھوٹی بیگم کی کھٹ پٹ ہی سے ان کی رات کی نمازیں اور تلاوت عبادت تھی۔ وہ راتیں کی گرمیوں سے کسب حرارت کر کے وہ پیٹ کا گولا متحرک ہو کر ذکر جہر کی صورت ٹھنڈی سانس بن کر ہونٹوں سے نکلتا تھا۔ اور چھوٹی بیگم کے کمرے کا سکوت ان کے اندر ایک عجیب نوعیت کا ہلکا ہلکا کرب سا بن گیا، جیسے بیک وقت دل میں میٹھی میٹھی چبھن اور کانوں میں رس گھلنے والی بات نہ رہی۔ لیکن ادھر مخملی مخملی اور ہلکی تیلیوں تکیوں کی ویران خلوتوں میں ٹھنڈک پڑ گئی اور سب پاؤں پھیلا کر سکون کی نیند سو گئیں۔ ماضی اور مستقبل سے تو سمجھوتا کر ہی چکی تھیں اب حال سے بھی مطمئن ہو گئیں اور کوئی خلش باقی نہ رہی۔ اور انھیں بیچاریوں نے کس چیز کے خیال سے بھی بڑی بیگم نے کوئی تعرض نہ کیا ورنہ جھونا باندی میاں کی آبائی جاگیر کا حصہ تھی، دو دہائی بڑی بیگم کے اپنے ہاتھ کی ساختہ پرداختہ پروردہ پروان چڑھائی، ان کا مال جیسی کوئی چیز تھی اور وہ جس گھڑی چاہتیں، اسے دیتیں بلکہ سرے سے جھونا کو ہی نکال باہر کرتیں۔ البتہ چھوٹی بیگم کی چڑھی کمان اتر جانے کا انھیں قلق بھی تھا لیکن یہ تو میاں کے دوران کے درمیان کا معاملہ تھا، اس میں ان کا کیا بس تھا۔

لیکن اس کی چبھن کی جنسی چند ہی روز بچی تھی اور بڑی بیگم کا خضوع و خشوع سب ندرہی حیرت واستعجاب اور انتشار واندیشے میں بٹ گیا۔ جھونا باندی نے عملی طور پر چھوٹی بیگم کی جگہ تو سنبھال ہی لی تھی: خیر وہ کوئی بات نہ تھی، ایسے اتار چڑھاو ازدواجی زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔ مگر یہ بات نہیں، اس کے کمرے میں قد آدم آئینے لگے تھے اور وہ اپنی مجلس میں مغرور ہیں رات کے انتظار میں تھیں جب میاں کو جھونا باندی کی اصل شکل و شبیہ نظر آ جائے اور کسی شب قدم تاب چھوٹی ذات ر

ٹکاں جائے اور میاں خود ہی کچے دھاگے میں بندھے ادھر آئیں، یہ خود میں ہی جا کر کسی بھی دن منا کر پکڑ لاؤں۔ کہ گوشۂ راس الصلوٰۃ، کہ ایک دن حویلی کے اندر ان چھن کی منی بجنے والیوں کے بھی سکوت میں دھول پڑ گئی۔ سرگوشیوں میں یہ اڑی کہ چھوٹا باندی کے اندر نام کھم ٹھہر گیا ہے اور چھ مہینے کے اندر پھٹنے والا ہے۔ یہ میاں کی عمر بھر کی ناکام کوششوں کی نادر ترین کامیابی تھی۔ سب نجومی جھوٹے ہو گئے جو ہتھیلی پر غور و خوض کے بعد چپ ہو جایا کرتے تھے کہ میاں کے ہاتھ پر سب کچھ ہے مگر اولاد کی لکیر نہیں ہے۔ اور تو اور ایک عمر سر پٹخ کر اور بھانت بھانت کے علاج کر کے وہ حکیم بھی ناکام ہو گئے جو اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ "میاں ہی کے اولاد نہیں ہے۔" میاں کو امید بندھی اور چھوٹا بیگم کی امید سے سب بیگموں کی چادر میں جگہ کم پڑ گئی اور سرکار کے سوکھے دھانوں میں پانی۔ اور جو مہینے بعد جب چھوٹا کے بطن سے لڑکی کی ولادت ہوئی تو پھر سب کو اطمینان کا سانس آیا کہ چلو کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ بیگماتیں بیچاریاں اتنا حساب کتاب نہ جانتی تھیں کہ وارث ہونے پر کل وراثت لڑکی ہی کو مل جاتی ہے۔ ان سب کے بیٹے نہ سہی، بھائی بھتیجے بھانجے تو تھے، اور حاجی میاں کی تو وراثت بیگمات تھیں، اور میاں تو حقیقی زندگی کے تھے، کہ دو بیو چلے جاؤ۔

ویسے میاں کو یہ بتانے سے تو روٹی پکانے والی خادمہ ہی آئی کہ بڑا اوزیرجی سے بوڑھے دربان فتو خاں مرحوم ان کوشش کا نتیجہ تھا، ور چھوٹا باندی کے آثار کی بنیاد یہی مشتبہ ہو تو بڑا ہے۔ ورد دونوں ہی مرتبے میں میاں بیچارے کا تو صرف ہاتھ منہ دھو کر ورق غسل کر کے سفید دولیے سے پونچھ لینے سے زیادہ دخل نہیں ہے۔ اب جو چھوٹا باندی نے بیٹی جنی تو میاں کا شبہ یقین میں بدلنے سے بہت خوش ہو گیا کہ سوت تو دو سال قبل یہ اچھی انھیں کی ضرب تقسیم ہو میاں تھا، مگر آج نور دیدہ چاند بی بی بھی انھیں کا حاصل ضرب ہے۔ بہر حال چاند بی بی نے باپ اور ماں کی شکل اور عقل کا ہی محتاج ہو سکتی تھیں۔ حویلیوں میں تحمیں جنہوں نے چلیں اور بڑا کی جانب توجہ مبذول ہوئی، لیکن میاں کو بیٹی کی پیدائش کی خوشی تو تھی کہ اور کسی شمار قطار میں تھے، چاروں بیگموں میں سے کسی کی مجال کنکری پھینکنے کی نہ ہوئی اور چھوٹا باندی کے بیٹے بن جائے کہ باندی سے بڑھ کر بیگم کے زمرے میں داخل ہو گئی۔ ورنہ وہی سوات میں جا بجا افاغنہ کی پیروی کرتی ہے اور وہ عقد صرف ختم میں یقین رکھتے ہیں، ان کے یہاں رہن کی کوئی اہمیت نہیں۔ بہر حال حاجی میاں کو اللہ نے چاندی بیٹی عطا کی ور چاندی کی

Scanned with CamScanner

برعکس نام نہند رنگی کا فور تھی۔ سرخ سپید، صحت مند، نجیب سید باپ کے بجائے کسی ریچھ کی اولاد نظر آتی تھی، وہ اٹھارھویں سال میں بڑائے بھی بر مشعلچی کی طرح رکابیاں دیگچیاں چاٹ چاٹ کر ریچھ کی طرح کریل ہاتھ پاؤں نکالے تھے۔ مخبوط الحواس سی لیکن سیہوں کے نادان سے کیا سے تو پیٹ میں مجھاتے تھے اور یہ کیڑے تو قیمتی حسن دریا کی کا پانچواں پاؤں بن کر ساتھ ہوتے ہیں۔ حاجی جون میاں کی بیٹی نے ہاتھ پاؤں نکالے، بڑے سے مشابہت نمایاں تر ہوئی۔ حویلی والوں نے تو صداز دیکھ کر ہی بھانپا تھا اور چاندنی بی تو، آفتاب آمد دلیل آفتاب، روز روشن میں اس شبیہ کی زندہ تشکیل نکھر کر سامنے آئیں۔ حاجی میاں بھی نہ دیکھتے تو تھے نہیں اور نہ دیکھتے تو بھی تاریکی کا اور سے تو ہوتا ہی ہے، بہرحال حساب دوستاں در دل، آپس کے پدر خود پسر تمام کند، ان کی نسل تو ان کے بیٹے بڑی کوشش کا نتیجہ تھی، وراثت کی تھی تو سمجھی گئی اور حق بحقدار رسید بیٹی کسی تو پھوپی ان کا مس منحرے دھو سکتا تھا، اور میاں بی بی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ جب حاجی میاں کی محمد رشت والی بیٹی نے اطرفین کی صورت چسپی جگی نظر آئی اور اس نے سیاہ تاب چہرے میں آئینے کی طرح اپنا عکس نظر آیا تو مجبور ہو کر ساری دنیا والوں کی دکھا دی۔ اور چاندنی بی بی [illegible] رسید تھی ہوئیں تو ماں باپ کی داخلی و خارجی رشتہ داریوں کا نسبت کی بے تحاشا [illegible] انھیں [illegible] حاجی میاں نے آنکھیں موند لیں۔ ساری دنیا سے مدھی ہو جاتی۔ [illegible] متعدد [illegible] بات چلا لی چاہی تو چودھویں صدی کا [illegible] نوجوانوں نے [illegible] سے بھی [illegible] اور [illegible] کے اپنے قسم [illegible] حاجی میاں کی بیٹی [illegible] شادی [illegible] کے اس کے [illegible] عمر کچھ [illegible] حاجی میاں [illegible] صاحب [illegible] کہیں زیادہ [illegible] تھے اس [illegible] نے [illegible] بڑی [illegible] تھی [illegible] بہت بڑی [illegible] مرحومہ پھوپھی کی وراثت سے بھی [illegible] تھی [illegible] وارث [illegible] سکتے تھے۔ یہاں تک [illegible] کی موت سے [illegible] کی شکل میں [illegible] سے [illegible] اور [illegible] کو چاندنی بی [illegible]

بندو علی کا مقدر کھلا تو کھلتا ہی چلا گیا۔ موت اور شادی دونوں ہی راستوں سے حاجی میاں نے بہت ہی خاموشی کے ساتھ اور اپنے طبقے کی روایت کے بالکل ہی خلاف، چہ میگوئیاں بچانے کے لیے سیدھے سادے طریقے پر نکاح کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ بندو علی کے سماجی اور اقتصادی معاملات درست کرنے کے لیے، اپنے اسٹاف کے مرد آہن کو بندو علی کے یہاں بھیج دیا، وہ یہ مرد آہن علاقے بھر کی مانی ہوئی شخصیت تھا۔ (ص 259 تا 272)

❁

حاجی میاں کا یہ حوالہ دو تین ہی بار پڑھنے سے محسوس ہو جاتا ہے کہ اس سے مصنف کا مدعا صرف یہ نہیں کہ قاری "یک بظاہر" پکے دیندار" لیکن" روایتی کاروبار" میں طاق زمیندار کی اندرون خانہ سرگرمیوں سے لطف اندوز ہو سکے۔ حالانکہ واقعات کے بظاہر سیدھے سادے بیان میں کہیں کہیں خود راوی مصنف کی لطف اندوزی یہ مترشح کرتی ہے کہ وہ قاری کو بھی حاجی میاں کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔ لیکن دیگر تمام کہانیوں کی طرح کہانی "پھیر" کا یہ حصہ بھی سہل ممتنع جیسی کیفیت کا حامل ہے اور نمایاں کردار کی ظاہری دینداری نے مصنف کے مخصوص طرز اسلوب میں استہزا کی شدت نے یہ بھرم پیدا کر دیا ہے۔ البتہ کہانی کی دوسری یا زیادہ سے زیادہ تیسری قرأت میں واضح ہونے لگتا ہے کہ بیان کا اصرار صرف ان رنگینیوں پر نہیں جن میں حاجی میاں شرابور ہے بلکہ حقیقتاً ایک اور ہی پہلو پر ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس میں "ایک ذرا جوان سی دکھائی پڑتی بیوہ" نجمہ، چار (موجودہ) بیگمات اور چھوٹا بادی کی زنان خانے میں موجودگی، اور اس سے پہلے "حرام و حلال کرنے کی شرعی ترکیبوں" کے راستے پندرہ سولہ سال کی عمر سے ستر پچھتر تک پہنچتے پہنچتے ہر دوسرے تیسرے برس ایک "نئی" آنم زلم میں عورتوں کی آمد و رفت، غور کرنے پر ایسے مردو ساں معاشرے کا نقش ابھارتی ہے جو زن (اور زمین) پر "قابو یافتہ" رہنے کے لیے ہر نوع کی "ترکیبیں" اختیار کر سکتا ہے۔

یوں، کہانی کے اس جزو میں ابوالفضل صدیقی زمیندار حاجی میاں کو عورت کے تئیں جابر مردوں کا استعارہ بنا رہے ہیں۔ وہ ان (موجودہ) بیگمات وغیرہ کا حوالہ بھی رقم کر رہے ہیں جو حویلیوں کی دیگر اشیا کی مانند بس برتی جا رہی ہیں حاجی میاں کے ہاتھوں، وہ بل تحو حاب سے

ہاتھوں، بڑا کے ہاتھوں — اور بصد خوشی۔

بے زبانی میں محصور اس شرآگیں ماحول میں ابوالفضل نے خیر کی ایک رمق "بڑی بیگم" کے روپ میں دیکھی ہے جس کے توسط سے وہ کہانی پڑھنے والے کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ شر سے شرابور ماحول میں فرد سے خیر کی کرنیں پھوٹ سکتی ہیں، پتھروں کی ماہیت یوں بھی شق ہو سکتی ہے۔

کہانی کے مندرجہ بالا اقتباس کے لگ بھگ اختتام پر ابوالفضل صدیقی کا یہ لکھنا کہ "دولہے میاں کو یہ بتانے نہ دو روٹی پکانے والی خادمہ ہی آئی کہ بڑا ڈیوڑھی کے بوڑھے دربان محبت خان مرحوم کی کوشش کا تھا اور چھوٹا بندوں کے "تارک بیوی کی مشتبہ لونڈ بڑا ہے" اور چند سطور بعد یہ بتانا کہ "میاں کو بیٹی کی پیدائش کی اتنی خوشی تھی کہ اور کس شمار قطار میں تھے، چار دن تک سوں میں سے بھی کسی کی مجال لنگری چھینکنے کی نہ ہوئی" در اصل حاجی میاں کی پر شر حویلی میں گلا گھونٹ عورتوں کی انتہائی بے زبانی کو واضح کر رہا ہے۔

مصنف کے یہ جملے، جہاں حویلی کی عورتوں کو "عسر و چھا" میں ڈھکے جبر و شر کی قیدی باور کر رہے ہیں، وہیں یہ بھی محسوس کرا رہے ہیں کہ حاجی میاں بھی تقدیر کے ایسے جبر کا شکار ہے جس کی شدت کی انتہاؤں کا اندازہ خود اس کو بھی نہیں ہے۔ وہ اولاد نرینہ سے اپنی محرومی کا مداوا اپنی بدلی فطرت سے دے کر رہا ہے مگر نہیں جانتا کہ اس کے عائد کردہ جبر سے رہائی پانے والی تہمت کے بوجھ تلے ہیں۔ وہ مجبور نہ ہوں تو بتاتیں کہ چاند بی بی، حاجی میاں کی بیٹی نہیں بلکہ "ڈیوڑھی کے بوڑھے دربان محبت خان مرحوم" کی اور اس (محبو) کی پوتی ہے جبکہ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اس نادیدہ جبر نے ہی تو نئے سرے سے چھیڑا ہے کہ محبو اور محبو کی پوتی، حاجی میاں اور ان کی مرحومہ پھوپھی صاحبہ کی مشترکہ وراثت کی مالک بن رہی ہے۔ مگر کہانی پڑھنے والا جانتا ہے کہ اس جبر کو موالی کی موت کے باعث موروثی جائیداد کی وراثت میں پیدا شدہ جبر سے ملا کر ابوالفضل نے چاند بی بی کی بیٹی اور رمضانیا کے بیٹے کی شادی سے ایسا سنگم بنا دیا ہے جہاں "موت اور شادی دونوں ہی" رمضانیا کے بیٹے کے لیے منتقل ہو گئے ہیں، کیونکہ دونوں ہی راستے وراثت سے ہیں، جو ہمیں نظر آتے ہیں۔

کہانی کے اس ابہام کا اختتام جہاں حاجی میاں کو نہ صرف چاند بی بی کے بیٹے سے رشتہ دکھا رہا ہے بلکہ یہ بھی کہ حاجی میاں نے اس رشتے کو مضبوط بنانے کے لیے "اپنے صاف سے

مرد آہن کو بندہ علی کے یہاں بھیج دیا۔" حاجی میاں کے یہ دونوں اقدام، حاصل شدہ زمینوں اور ان کے متعلقات پر گرفت مضبوط کرنے کے لیے ہیں۔ یہ زمینیں جو اس کی ہو گئی ہیں، بندہ علی کی تھی اور چاند بی بی کے عقد کے سبب دونوں کی تھی۔

بیٹی کے پیچھے پیچھے "اپنے اسٹاف کے مرد آہن کو" گویا جہیز میں، بندہ علی کے یہاں بھیجنے کی ایک وجہ حاجی میاں کے ذہن میں یہ بھی ممکن ہے کہ باپ کی موت کے بعد بندہ علی نے "ریاست کا انتظام ہاتھ میں لیتے ہی عام کاشتکاروں میں نمایاں مراعات جاری کیں اور ان مخصوص مولا رادے ربیب گھرانوں پر اکرام کی بارشیں کردیں۔" (اقتباس:20)۔ یہ عمل آداب طوئیت کی رو سے درست تھا، کیونکہ پُر خیر تھا، اور اس کا مرتکب آئندہ بھی ایسا ہی کچھ کرسکتا ہے لہذا بظاہر خیر نظر آئے مگر شر آگیں۔ حاجی میاں نے وہ "مرد آہن" بندہ علی کے یہاں بھیج دیا جو از ظاہر تا باطن شر ہی شر ہے، اور بندہ علی کے سماجی اور اقتصادی معاملات "آداب طوئیت کے مطابق" "درست" کرسکتا ہے۔

یوں آئندہ صفحات میں ابوالفضل کی توجہ ان طور طریقوں کی جانب مبذول ہو رہی ہے جو زمین اور اس کے متعلقات پر جابرانہ گرفت قائم رکھنے کے لیے جاری ہیں۔ یہ طور طریقے بھی انھوں نے ایک کردار ہی کے ذریعے نشان زد کیے ہیں۔ یہ کردار، سابقہ کردار کے توسط سے اس طرح کہانی میں آیا ہے گویا سابقہ کا لاحقہ ہے، جیسے زن، زمین اس طرح سابقہ و لاحقہ ہیں کہ بہ لحاظ صفات و اثرات دو نہیں ہیں۔

33

"بڑے منشی جی"، "موٹے منشی"، "موٹا منشا"، "کانا منشی"، "کھترا منشی"، "کالی بلا"، "دیو سیاہ"، "منشی جی شیر افگن خان"، "منکلوں شتہ" اور "بیا بنیا"— منشی کمال شیر خان کے کتنے ہی اسم صفت اور القاب تھے جو ان کے مخالفین کے حلقوں میں زباں زد تھے۔ اپنے حلقے کی مانی ہوئی وحد مرد آہن کی علامت، ورنہ آس پاس کے اضلاع کی جانی پہچانی شخصیت، اور یہ عوام خان صاحب نے بیٹی بے پناہ جسمانی طاقتوں اور مخصوص بے پایاں دماغی صلاحیتوں کے بل پر سوایا تھا۔ وہ خود ساختہ لوگ تھے جنھیں ایک آدمی نہیں بلکہ خیر کا نہیں تو شر کا ایک ادارہ کہتے ہیں۔ ویسے ایک گروہ ان کے

ڈٹ گئے جنھیں ایک آدمی نہیں بلکہ خیر کا نہیں تو شر کا ایک ادارہ کہتے ہیں۔ وہ ایک گروہ کے مدحوں کا بھی تھا۔ وہ جگہ جگہ مثبت منفی تجربوں سے پہچانے جاتے۔ کہیں ظلم، وحشت، بربریت، استحصال بالجبر، عیاری، بے ایمانی، دھوکہ دہی، بعض مختصر حلقوں میں بہادری تدبر، حکمت عملی نفس ہمدردی، یک رنگی، وضعداری اور خوش اخلاقی کے اوصاف کے مالک بھی پائے جاتے تھے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود دنیا میں ان کے سچے دوست مفقود کی حد تک کم اور دشمن زیادہ تھے۔ خداداد بے پایاں ذہانت اور بیباک جرأت، دونوں کی صفتیں لے کر دنیا میں آئے تھے۔ انھیں اپنے وقت کی بہترین رہنمائی اور بہت سے فن کی تربیت نصیب ہوئی تھی جس میں ان کی خداداد جسمانی طاقت اور چستی پھرتی نے چار چاند لگا دیے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ دشمن کی پہچان اور موقع شناسی کا مخصوص ہنر، جرأت، رزم میں شکست نا آشنا تھے، پھر عقلمند رفیقوں کی صحبت، ... اور چلتے ہوئے خاندانوں سے سب فیض نے ان کی خداداد ذہنی صلاحیتوں میں چار چاند لگا دیے تھے۔ تاریخی معرکہ و محفلوں میں یہ کہ جس رزم میں اترے مرد میدان ہی ثابت ہوئے، جس بزم میں بیٹھے صدر نشین بن کر چھائے رہے اور بڑی بڑی اہم اور پیچیدہ گتھیاں سلجھا کر رکھ دیں۔ ان کی میدان ... ایک دفعہ کوئی واردات ہو گئی۔ جو اس اعتبار سے آخر تذکرہ میں مستثنیات نظر آتے، جیسے خالق نے انھیں اپنے جذبہ برہمی کا مشغلہ بنا کر دنیا میں بھیجا تھا، اور تخلیق کا یہ غصہ پیدائش کے بعد ان کی موت تک داخلی اور خارجی دونوں ہی صورتوں میں کارفرما رہا۔ بچپن کی چیچک سے لے کر نوجوانی اور جوانی کی کوتاہیوں چھوٹوں تک تمام مدت، چہرے اور سراپا پر قدرت جیسے ظاہری برہمی کی تجدید کرتی چلی آرہی تھی، اور معرکے معرکے میں نت نیا میک اپ کرتی رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ صانعِ قدرت نے اس خارجی کریہہ المنظری کے ساتھ ساتھ داخلی طبع نہایت چڑچڑا چڑھا دیا تھا، بے مطلب کی بات کرے اور اس میں خود ترسی کی حد تک اتارنے کے فن سے آراستہ کیا تھا۔ ایسے مواقع پر ٹھیک ٹھیک تناؤ اور لغوی معنی میں رشت روئی بھی ان کے مخاطب جیسے کی آنکھوں سے محو ہو جاتی فطری درشت لہجے میں اور جسم کی وضعداریں چھپ جاتی تھیں، وہ کوئی اور آدمی ہوتے۔ بات کرنے کا انداز بدل جاتا۔ تاثیر وجود آواز کی شیرینی، لہجے کی حلاوت، شرافت کی ملاوٹ، ہی فضا سے مخاطب کو مسحور کر دیتی اور ایک دفعہ وہ غریب ان کی منطق کے آگے سر جھکا ہی دیتا۔ وہ واہ ہی کیا کرتے رہتے، اور دل میں آ

Scanned with CamScanner

کرتی ہے۔ "رنڈاکی ہوا" ہوں والی شخصیت وجود، جو پہلی نگاہ میں ذرا دور سے بیٹھا پھرتا سنگِ موسیٰ کا گھنٹہ گھر دکھائی پڑتا۔ پونے سات فیٹ قد جو ان کی اونچی بندش والی پگڑی کے ساتھ آدمی سے زیادہ دیوزادوں حدوں میں نظر آتا۔ پھر یہ کہ یہ بلندی ان کے چوڑے چکلے بازوؤں پر متناسب نظر آتی۔ وہ دوبا ہیوں تھے، ان کے ہاتھ کندھے سے لے کر پنجے تک لمبائی میں ان کے قد سے بھی غیر متناسب تھے اور انگلیاں گھٹنوں کے نیچے سے بھی نیچے لٹکتی تھیں۔ ہتھیلیاں اور انگلیاں ظلیاں کسی کھردرے درخت کی ٹہنیاں اور گٹھے ۔ ان ہاتھوں کی یہی قدرتی غیر معمولی لمبائی انھیں شمشیر زنی، لاٹھی اور کے اری، ہاتھا پائی کے فن میں اپنے مدمقابلوں پر فوقیت اور سبقت کا باعث تھی۔ بھونری سیاہ گھنی داڑھی، جیسے باریک فولادی تاروں کے گچھے رخساروں پر چپکے ہوئے اور بالوں کی نمود روش قدرتی طور پر بجائے نیچے کے اوپر کو چڑھتی ہوئی۔

جبڑوں، کنپٹیوں، رخساروں اور دہن کی گول گول سی اٹھی ہوئی موٹی موٹی ہڈیوں کی تعمیر چہرہ، سنگِ سیاہ کی پہاڑیوں کی چوٹیوں کا تصور دیتا ہوا، اوپر سے جھکی ہوئی چٹانوں کی طرح لٹکتی پیشانی جس کے نیچے تنجوں، دوں دار چوڑی چوڑی خشک ہوئی تاروں کے گچھے سی بھنویں جن کے مدھ سے وہ ہمہ وقت دہکتے شعلے سے متحرک نظر آتے۔ ویسے تو ان کی ہستی ہی بے پناہ تھی مگر فتنی کمال شیر خاں کی آنکھیں ان کے تمام وجود میں سب سے زیادہ غضب کی تھیں۔ اپنی بات سے کی کرا پکی کن منی کرتے ہوئے ان آنکھوں میں سے ایک ہوڑی اور آنکھیں نکل آتیں جو بات کرتے وقت لٹک لٹک کر رخساروں پر آ پڑتیں۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرنا تو بائیں ہاتھ کا کھیل تھا لیکن پانی کا دودھ بنانا یا دودھ کو پانی کر دینا بھی ان کے جبڑے کلے کے لیے کچھ یہی تھا، اور حق و ناحق، جنون و خرد، پاک ناپاک، حرام و حلال وغیرہ کا معیارات کی اپنی کسوٹی پر پورا اترنا لازمی تھا۔ (ص 272 تا 275)

⊛

کہانی "بھیڑیے" نے تقریباً پندرہ صفحات (272 تا 275) میں فتنی کمال شیر خاں کے مندرجہ بالا حلیے کے علاوہ حاجی میاں کے لیے اُن کی پُر تشدد اور شاطرانہ خدمات بھی بیان ہوئی ہیں تاکہ قاری سمجھ سکے کہ ایسی خدمات حاصل کرنے والا حاجی میاں درحقیقت فتنی کمال جیسوں ہی کے زمرے میں

آتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کے جبر و تشدد کا اسلوب و رویہ مختلف رہے ہیں — اور چندولی جی سے نکالنے کے بعد منشی کمال کی خدمات بندوبل کو منتقل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ مراعات و اکرام کی بارشیں کرنے والے بندوبل کے بجائے اسے ارتقا بتا حسن بنا حقیقی جبر مستحق بنانا چاہتا ہے۔

منشی کمال شیر خان کا مندرجہ بالا چہرہ مہرہ دیکھ کر مسلا ترکے نوری کو یاد آیا ہوگا کہ ابوالفضل صدیقی نے حاجی میاں کا تعارف کراتے ہوئے بھی اس کے ذیل میں اور لباس وغیرہ کی تفصیل بیان کی تھی جو اقتباس 23 اور 26 میں درج ہو چکی ہے۔ ابوالفضل صدیقی نے اپنی دیگر کہانیوں میں بھی مناسب مواقع پر و بقدر ضرورت کہانی کے اہم کرداروں کی صورت شکل چال ڈھال لباس و طرز گفتگو وغیرہ کے منفرد پہلو بیان کیے ہیں۔

آئندہ تین اقتباسات میں کہانی "دھورا" کے تین اہم کرداروں کے چہرے مہرے اور طور طریقے ابوالفضل کے مصور قلم کی مثالیں ہیں۔ چہرہ نمائی کردار نگاری میں خوب سے خوب شوخ رنگ بھی شامل کیا ہے۔

34

دھورا چٹان سا نوجوان تھا جس پر نوجوانی بھرپور شوخیوں کے ساتھ جھلکتی تھی اور کانپور ملوں کی زندگی اور چھوٹے گنڈے کی سیاست نے تپ تپ کر بجھ ہو اور بجھ بجھ کر تپ ہو جانے والا بنا دیا تھا۔ دراز قد، پیچ در پیچ اعصابی ریشوں میں لپٹا ہوا جسم، چال ڈھال میں تھوڑی بے ادبی کی ترتیب، وجود دوسروں کی معیت میں متحرک نظر آتی۔ تیوروں میں تیور ڈالے وہ جو دیکھتا وہی ریجھ کر رکھ دینے کی سی آنکھیں بن جاتے۔ وکیل صاحب کے گھر میں جب پہرہ داروں کی سختی ہوتی اور گنگا کی لہروں میں بیٹھ کر بھی اس کے جسم تو جسم، آنکھوں سے زندگی کی شریانیں ابھرتی ہوئی لگتی تھیں۔ وہ تو دولت اور طاقت کا منکر تھا کام محنت کا پرندہ تھا اور اب تو چھوٹے گنڈے میں آزادی کا سوال بنا ہوا تھا اور بھٹکے ہوئے سب کی تقدیر بدلنے بھٹکے ہوئے ستاروں کی انگلی تھام کر راہ راست پر لانا چاہتا تھا۔ اس کے مزاج میں شورش اور شخصیت کا انداز تھا۔ اس کی چال راجپوتوں سے زیادہ مشتق تھی۔ اس کا سر اور بازو کے پٹھے [illegible] سے کم جلد بالا تھے۔ وہ گردن اٹھا کر چلتا، تمکنت کے ساتھ قدم قدم [illegible]

آنکھوں میں اپنی بڑی بڑی، ہونٹوں پر بڑی بڑی مونچھوں کے نیچے ہر وقت مسکراتا سا دکھائی دیتا۔ اس کی
کڑک پر بھویں میں گرہیں پڑ جاتی تھیں اور ادنیٰ سی حرکات و سکنات میں رعونت جھلکی پڑتی...
(ص 44 تا 45)

35

ایک نہیں ہزار شکتی آپ سے مگر بھی تو کبھی نہیں آتی لیکن کہتے ہیں کہ کلجگ میں چمار کے گھر
میں پدمنی جنم لیتی ہے، اور سیوتی کے باپ کے گھر میں کلجگ کی جیتی جاگتی نشانی تھی۔ گلاب کی پتی
جیسا رنگ، صباحت و ملاحت کا زندہ نمونہ، بھرے بھرے نازک خدوخال، بیضوی چہرے پر
ابھرے ہوئے خوش نما کھڑی ستواں ناک، یاقوت کی تراشی ہوئی قاشیں سی دونوں ہونٹ جن پر بچے
موتیوں کی لڑی سی دانتوں کی قطاریں، شرمیلی سی مسکراہٹ، مسکراہٹیں ترپتی جنھیں، اور کشمیری سیب جیسے
رخسار، اور مرمریں پیشانی جس کے نیچے تلوار کی سی خم بھنویں بڑی بڑی اور آنکھیں جن میں لہریں سی
لگائے خمار کا خمل کی نیند، اور سحر کی بولی ہرنی جیسے تیور، اور مجموعی طور پر آفتاب سا دمکتا ہوا چہرہ اور
یہ سب جیسے ایک بلوریں صراحی جیسی گردن پر رکھا ہو، جس کے دائیں بائیں اٹھے ہوئے شانے، جن
کے ساتھ دوئی شیپ کے تناسب سے ابھرا ہوا سینہ، جیسے مغل طرز تعمیر کی دو محرابوں کے برابر سے
ہوئے اور ان کے نیچے پتلی کمر، اور نیچے سے بھی تنگ تند تھے، جیسے شیشی مخروط کے سارے تیج
گھر پہ تالے لاڈوں میں لپٹے ہوئے، گلابی ہاتھیں جن کے گدرا میں سخت و تیکھی کی جلا، شیشے کی
طرح تھی، گوشت وں کا پیاپ اور چھوٹے چھوٹے ہاتھ، اگر دور سے جھنکار دے کھونٹیاں (ڈھکی
ہی ہوئی) پازیبیں است رہ جاتی ہیں، گدرایا ہوا جسم جس پر سو دوں قاتی بکھری سی پڑتی۔ جیسا کہ جیسے
کی تیزیوں اور ساون بھادوں کی پھواروں کا پایا ہوا وجود دھان کے انکھوے کی طرح شاداب اور
جنگلی بانس کے کٹے کی طرح تند اور بچو مختصر تیز چیت چیت کی ہواؤں سے حرکت میں آئی ہوئی اور
موسم بہار کے پچھواڑوں ادا اچی اپنے آپ سمٹی ہوئی اور سادست روی اور یکسانیت کے ساتھ چلتی
ہوئی، حقیقت جیسے شعور کی آمد اور جیسے دورِ رومان سے بنا ہو جیسے صناعِ قدرت نے سب کچھ ملا
کر اور سکھا کر اتارا!! (ص 46 تا 47)

36

اور چڑیا بھی بانکا کہلاتا تھا اگرچہ ظاہری و باطنی دونوں صورتوں سے وہ بانکے سے زیادہ "بانکی" تھا۔ پست قد، تنگ پیشانی، کوتاہ گردن، مٹیالا مٹیالا سا رنگ اور لونکی مالی امبیا کی طرح پچکا سا چہرہ، بدن چور۔ اندر سے مسوسا ہوا اور باہر سے کمزور دکھائی پڑتا ہو۔ چھوٹی چھوٹی ذرا گہری آنکھیں جن میں صبح شام دونوں وقت سرمہ لگایا جاتا اور سیاہی کی سیاہی نظر پڑتی۔ ناریل سا سر جس پر سخت سخت تارے سے بال پیچھے سے دو تہائی اوپر تک باریک کٹے ہوئے اور بقیہ ایک تہائی سامنے کو پیشانی پر چھجے کی صورت میں پڑے ہوئے، اچھی طرح کڑوے تیل میں تر بتر، جو بہہ بہہ کر کنپٹیوں تک چیکٹ اور ہاتھوں سے چہرے پر مسل مسل کر مستقل چمک پیدا کرتا۔ کانوں میں سونے کی مرکیاں اور انگلیوں میں چاندی کی انگوٹھیاں چھلے۔ کبھی کبھی جیسے چمچے سے ٹھنڈی پڑی پونچھ بال سنوار رہے ہوتے تو گھر پر بیٹھا ہو تو ہاتھوں پر زعفران جیسے چھدرے چھدرے بال جیسے بادام کے ریشے خرید کر لگاتے ہیں اور ان کے ان میں بھی کیڑا لگ گیا ہے۔ ہاتھ میں بجائے لاٹھی کے ایک چھڑی لگی رہتی ہیں۔ جس سے دھار دار سے مشتی ہونے کا مرغوبیت، تمام جسم پر مردانگی کی ڈھال میں عورت کا سا رنگ اور زنانہ آواز میں صنف نازک کا لہجہ اور گفتگو میں مخنث نما رنگ کے محاورے... (ص 63 تا 64)

❋

کہانی "کیچڑ" کا تیسرا باب (صفحات نمبر 28) مٹی ماں کے ناک کٹنے اور ان صدمات کی تفصیل پر مبنی ہے جو ان کے والد حاجی میاں اور بعد میں بدعلی کے لیے نیم ... ان صدمات سے صرف نظر کرتے ہوئے اقتباس 33 میں مٹی کمال کے صرف ناک کٹنے کا بیان کسی وضاحت سے درج کیا گیا۔ اسلوب میں ابوالفضل صدیقی کی حقیقت نگاری کی ایک مثال شامل ہو جائے۔ جیتن شاہ کی خدمات کی تفصیل کے ساتھ اقتباس 37 میں کہانی "بھیا دودھ" (صفحات 171 تا 245) سے ان چوبیس صفحات کا مختصر درج ہے جو مہاں کی بیوی رحمان ناتی شمس کے طور طریقوں کی وضاحت کرتے ہیں۔ یہ طور طریقے ایک حد تک مختلف ہیں لیکن مرتب مسلسل بیان ہے۔

اس کے مقابلے میں ممتاز غنی حیدر خاں کہیں زیادہ توانا اور پر جہت کردار ہے۔ اس کی تشکیل میں ابوالفضل صدیقی کی بیشتر فنکارانہ صلاحیتیں اور اس دیہی معاشرت کا گہرا مشاہدہ بروئے کار آیا ہے جو ان کی زیادہ تر کہانیوں کا پس منظر رہے ہیں۔ حیدر خاں کے تمام سیاہ و سفید کے ساتھ ہی ساتھ آس پاس کے مرد و زن اور معاشرت و ثقافت کے رنگ ڈھنگ دکھا کر ابوالفضل نے حیدر خاں کو ایک عہد اور مخصوص ماحول کا جیتا جاگتا کردار بنا دیا ہے۔

کہانی 'پیمانۂ دوش' کا مرکزی کردار نجیب، تاریخ عمرانیات کا پروفیسر ہے۔ مصنف نے حیدر خاں کو پروفیسر نجیب کی یادوں کے وسیلے سے کہانی کا جزو بنایا ہے۔ مجموعی تاثر میں کہانی کے وہ صفحات اور عبارتیں شامل ہیں جو حیدر خاں سے غیر متعلق محسوس ہوتی ہیں۔

37

آج تمام رات کی ذہنی رستخیز کے بعد آدھی رات ڈھلے نور ظہور کے وقت صبح کاذب کے قریب نظر میسر ہے کی روشنی میں 'اگلے وقتوں' والوں میں سے انھیں اپنے ایک عمر بزرگوار یاد آئے جن پر سابق دور کے اثرات کی چھاپ اپنے ساتھیوں سے زیادہ گہری اور روشن تھی۔ کوچ کے گدے تکیوں میں دھنسے، پنڈلیاں سوت اور چھوڑیں جیسی کیفیت میں، ممتاز غنی حیدر خاں جیسے اس وقت نصف صدی بعد ان کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ یوں تو وہ ان کے رشتے کے ماموں تھے لیکن کہیں سگوں سے بڑھ کر ہوتے تھے۔ خاندان کے دوسرے تمام پڑھے لکھے لوگوں میں تھے اور خاندان کو ایک واحد اکائی تصور کر کے فرد فرد کے معاملات میں گہرے خلوص اور ان سے زیادہ گرمجوشی و دلداری کے ساتھ دلچسپی لیا کرتے تھے (ص 208)

ممتاز غنی حیدر بھائی ضرور تھے لیکن بڑے سمجھدار پڑھے لکھے تھے اور پہلے درجے کے ذہین، اس پر طرہ یہ کہ مکتب کی تعلیم سونے اور ملمع کے فرق کو اچھی طرح پہچانتے تھے
(ص 209)

حیدر ممتاز خود اس ذہنیت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے جس میں وقت بے وقت فیض آدمیوں سے جا پہنچتا رہتا، اور کبھی کبھی تو فیض رسانی میں اونچی جست لگاتے کہ سب دوستی منزل تک کی

دیواروں کے پار آ پڑا کرتے۔ ویسے وہ اپنے وسیع آدمیوں پر مشتمل کنبے میں جتنے آدمی نہیں سمجھے جاتے تھے اور پچھلی صدی سے وابستہ ان برشی کے بچے ہوئے خمیر سے اٹھی ہوئی جہت سے تحت بچے خاندان، بستی اور دیوان کے ذرا مختلف سے آدمی واقع ہوئے تھے۔

ہم چشموں اور ہم نشینوں میں ذرا چھٹکے چھٹکے نظر آتے تھے (ص 210 تا 211)

ویسے ذاتی حیثیت سے وہ خاصے بڑے درمیانی حیثیت کے زمیندار تھے جو پشتوں سے کھاتے پیتے ہی مستغنی تھے جبکہ وہ نیچے والے چھوٹے درجات والے بڑے بڑے زمیندار ہوا کرتے ہیں مگر یہ چھوٹی سی زمینداری جس کے وہ مالک تھے، ابھی اس نصف صدی میں ایک بڑی آبائی ریاست کی حد تک ہی چوڑی زمینداری میں سے ورثہ در وراثت حصے بخرے ہو کر رہ گئی تھی، ان کی خاندانی روایات بڑی تھیں۔ اور چونکہ آبائی ریاست کبھی وہاں تک ماتحتی ہند تقریباً سوا سو میل مربع علاقے میں پھیلی ہوئی تھی، اور اس کی بے پناہ قوت وابستگی اور بے پایاں روایات نے تحت تمام اہل خاندان کے تحفظ کا قبالہ ان کو جاری رہنا دیا تھا۔ لہٰذا اس پہلو سے وہ اس طویل و عریض آبائی وحدی زمینداری کا واحد شیر تھے جس کی تمکنت کرنا تو درکنار زندگی میں مداخلت کا بھی یارا نہ تھا، اور ان کے قصبہ و قدرت کا طمطراق سمجھ کر راضی برضا بیٹھ جاتا۔ ان کے بعض خاص طور پر معتقد پولیس افسران کی اس قوت و وابستگی پر علاقے کو "غیر منقسم ملک" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی ذات سے ان اپنی خاندانی عظمت کی بات اور ان سے آس پاس چار چھ دن تک چند آئینی حرکتیں بھی سرزد ہوتیں لیکن اکثر و بیشتر قتل ہوتی قتل پیدا کرتے۔ اور کبھی جب منتشر ہو جاتا تو سامنا بچے کی شکل کھوٹے سے رہتے اور بیتے دور سے ورثے کا سب ترین تھے، ظلم کے بیت سے احساس پیدا کرنے کا دار و مدار ذرائع اور رواں کا فن خوب آتا تھا (ص 211 تا 212)

مہر ایک کی ہر کام کے لیے آمادگی، جوڑ توڑ، حکمت عملی کے ذریعے، مزاج درخصومت مردہ دھمکا کر زیادہ دھار، اور مرنا پڑے تو اتنا رو کر پالی نہ لگے، ایسے ایسی کے سب وہ ان ایک بکھار کے حوالہ تھیں جس میں مرحوم شادی بیاہ برات میں تخمینہ میسر کی جمع وہ دھنسا اور دیکھتے سے تماشائی نظر آتے بڑے ہی مسلح اور جیسے رہتے لیکن ساتھ ہی ساتھ رشتہ داری

دھاریں کاٹ سکتی۔ جہاں ہنگامہ ہونے والا ہو وہاں یہ [illegible] رہے تو جیتے، اور جہاں نہ ہونے والا ہو وہاں بات کیا ہونی جو نہ ہو۔ غرض شیر و روباہی دونوں ان کی کھال کے نیچے چھپتے تھے۔ ہم چشم بالاتفاق ان کو تسلیم کرتے اور ان پر [illegible] کی گنجائش نہ تھی کہ جب میدان میں آنا پڑا تو [illegible] کے فن میں [illegible] ثابت ہوئے۔ [illegible] کے سپاہی [illegible] اور [illegible] "بڑی" کر کے رہے۔ ویسے رزم میں اور میدان میں [illegible] میں ہمیشہ [illegible] رہتے۔ البتہ گوریلا فائٹ اور شب خون میں اکثر حصہ لیا کرتے۔ اب کے میدان سے تو [illegible] تھے۔ ویسے عالموں اور علماؤں کے خاندان میں دوسری تیسری پشت سے پڑھے لکھے لوگوں میں سے تھے، مگر بے پناہ ذہانت کے ساتھ معروف علم سے [illegible] رہتے تھے اور علم مجلسی میں ایسے حاذق کہ [illegible] جان، خوش گفتار، شیریں سخن [illegible] اور خوش [illegible]، رزم کے وقت جان بجسم اور بزم میں [illegible] کی طرح [illegible] اور اپنی [illegible] شخصیت سے [illegible] میں تو حاذق تھے، قلم کے [illegible] خصوصی انداز [illegible] میں [illegible] کی آنکھوں میں سے گلاب [illegible] کے وقت [illegible] آنکھوں پر بھی [illegible] تھے۔ مخاطب [illegible] آنکھوں کی چمک [illegible] کی [illegible] لوٹ پوٹ ہو جاتا اور ایک دفعہ [illegible] آنکھوں پر [illegible] قدرت [illegible] عرق میں ڈوبا ہوا [illegible] تھی [illegible] قد [illegible] اور [illegible] میں [illegible] بڑے [illegible] عقلمند سے بازی اور [illegible] جس سے [illegible] بیٹھ [illegible] اور زندگی کا ایک دن بھی [illegible] سے [illegible] کہ اپنا [illegible] سے [illegible] بات [illegible] تک پہنچ گئی تو [illegible] انتقام کے مواقع [illegible] جو آئے کبھی کسی پر قرض نہ چھوڑ گئے اور ہمیشہ مع سود [illegible] چار [illegible] میں قتل [illegible] وغیرہ [illegible] سنگین جرائم میں [illegible] گرفت میں [illegible] اور [illegible] کر عدالت سے [illegible] قلم [illegible] ایک [illegible] اور [illegible]

کی سیٹ، گلی در سیکرین میں پکی ہوئی ہوں، مگر سیدی سوئیں جیسی کی چپے [illegible] راتوں اور شب رات کے حلوے جیسے رم روپے کے باوجود میاں غریب و غدے [illegible] میں پیچھے پیچھے [illegible] کنائیوں میں چوپال چوپال میٹھ میٹھ کے ملاحیاں اور گائیوں اور حویلی حویلی گھر گھر [illegible] کی پڑتی رہتیں۔ لیکن میاں کا زمانہ بیل گھوڑے والا تھا [illegible] آج کل کی طرح [illegible] رفتار سے تو چلا نہ کرتی تھیں [illegible] کرتی تھیں! ان کے زمانے کی رفتار کے معیار سے [illegible] کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ [illegible] بھی مہربانی۔ بددعائیں کہتے ہیں کہ عرش اعظم سے جا کر ٹکراتی ہیں [illegible] سب کی سب باب اجابت سے ٹکرا کر میاں پر پڑنے کے بجائے [illegible] اور پھر ان سب بددعاؤں نے منہ کی جب کھائی جب یہ [illegible] ہوگا

اور یہ میاں کی [illegible] کی انتہا تھی کہ [illegible] کی دولت بھی اللہ [illegible] [illegible] تھی [illegible] زمانے میں سینئر ٹیچر رہے تھے اور میاں کی [illegible] کی رخصت سے [illegible] تھے اور [illegible] تھے

(ص213 تا 216)

وہ کوئی ایسی ہستی تو نہ تھے کہ [illegible] کی تعداد [illegible] ہو جاتی۔ ان کی زندگی کا دائرہ تو بہت وسیع رہا تھا [illegible] تھی۔ [illegible] صدی کے میدان سے گزرتے ہوئے [illegible] سب [illegible] پہلے تو مرحوم [illegible] کے ساتھ [illegible] سب [illegible] کی [illegible] جنت کی کلی چھکڑیوں [illegible] کر ان سے دوستی حاصل کر کے [illegible] میں سے چوہدری اللہ بخش خان صاحب مرحوم نے دن [illegible] تھے [illegible] تقسیم ہوئی جو، اللہ غریق رحمت کرے، مرحوم نے [illegible] اللہ رکھا تو میاں کی [illegible] جیسی چیزیں تھیں، ویسے وہ [illegible] مزاج م[illegible] اللہ کر [illegible] ام الطہرین [illegible] تھے [illegible] میاں سے کبھی پنچوں میں بیٹھ کر انکار بھی نہ کیا تھا۔ [illegible]

درمیان حریف کو للکار کر بہادری اور بنوٹ بازی کے فن کے اعلیٰ مظاہرے پیش کیے تھے جن سے دو دو چار چار سال حمد خان صاحب کی ساکھ دھاک بلند اور مضبوط تر ہوتی گئی اور اس سطح کو پہنچ گئی جو انھیں آج بفضل حاصل تھی۔ بقیہ تین، جو اندھیری رات والے تھے، ان میں سے ایک ممتاز شرعی قسمیں کھا کھا کر الزام لگانے والوں کو مغلظات گالیاں دیتے دیتے غصے میں آپے سے باہر ہو کر رو پڑا کرتے۔ یہ الزام ان پر ان کے نوجوان غیر شادی شدہ کلوتے سالے کے قتل کا تھا جو بدنصیبی سے ان کا چچازاد بھائی اور شریک زمیندار بھی واقع ہوا تھا اور خان صاحب سے اپنے حصے کا بٹوارا کرنا چاہتا تھا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ ایسے موت سیدھی سادی طبعی سی ہوئی تھی، کوئی پیچیدگی نہ تھی۔ رات کا کھانا کھا کر چوپال بانوں کی بنی ہوئی کھری چارپائی پر سوئے، جیسے کہ برسات میں بالعموم دیہاتی سوتے ہیں، پھر مرنے والے دن میں کمان سو رہے تھے۔ صبح کو مردہ ملا اور دوپہر تک "وقت آ گیا تھا"، "وعدہ کم قدر یادہ"، "بس اتنی ہی لکھی کر رہا تھا"، "ہائے ہائے کیسا کڑیل جوان تھا"، "پھر مالک کی مرضی، اپنی کھیتی ہے جب کاٹ لے پوچھنا نہیں، کوئی دم مارنے والا کون؟" وغیرہ وغیرہ، خوشبوؤں، پھولوں اور سفید کفن میں کلمہ طیبہ کی پُررقت گونج کے درمیان دفن کر دیا گیا۔ مار پیٹ پکار تو ممکن نہ تھی۔ پھر خاں صاحب کی بیوی ہی کو تباہ و برباد چھوڑتا؟ پھر مرحوم کا آبائی زمینداری کے بٹوارے کا پیہم مطالبہ جس پر ممتاز بحیثیت قانونی نمبردار کل پر قابض تھے، خواہ مخواہ ان غریب کی جانب پانی مرتا تھا۔ دفن بلکہ کفناتے ہوئے ہی آنکھوں ہی آنکھوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔ غسال سے پوچھا تو ایک نے کہا کہ گردن پر نیل کا نشان تھا، لیکن دوسرے نے کہا کہ اس نے نہیں دیکھا۔ لہٰذا دفن سے پہلے زبان تک کسی سے اور کسی کے درمیان سوال جواب تو ممکن ہی نہ تھے، بے چارے جمع ہو کر تعزیت بلکہ ایک ایک کر کے مرنے والے کی چارپائی کا آنکھوں ہی آنکھوں میں معائنہ کرتے رہے اور شواہد سے اپنے اپنے دل ہی دل میں اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی قدر پتلی مونگیری بانس کی لچک دار لاٹھی کا ایک سرا عین ٹینٹوے کی سیدھ چارپائی کے سوکھے میں پھنسا کر اور ٹینٹوے پر سے گزار کر دوسرے کو جو دبایا تو لچک دار لاٹھی کا بانس کامیاب سے کامیاب پھانسی کے پھندے کی طرح کام کر گیا اور بس ایک ہی جھٹکے میں ٹینٹوا ایک کر دی سے جدا اور نوجوان دوسری سانس نہ لے سکا۔ جہاں کا تہاں جھگڑے کا دھڑا رہ گیا۔ اب یہ سب شروع سے آخر تک چونکیں ہی جھڑاتا ہوا، اور نہ وہاں اس وقت

Scanned with CamScanner

دانی خود دیکھ رہا تھا۔ لیکن مرید وہ تھے تو مر جو بچے سو بچے لیکن خان صاحب نے دلچسپی سے
ان کا در منتقال کی داد دی پڑتی ہے، جو نو کی کئی سیل ور بے تو زیزی۔ خیر بہر حال، اندھیری رات
والے تین کے تینوں ہی گرفت صاحب کے نام دھر دیے جائیں تو ان تینوں میں یہ نوجوان سب سے
زیادہ خوش نصیب مقتول تھا، جس کو چار کا کاندھا اور دن دہاڑے قبر کا کونا اور نماز جنازہ وغیرہ جیسی
سعادتیں نصیب ہوئیں۔ باقی دو جن میں ایک حقہ بردار رحیلا۔ پٹھان امیدوار تھی ۔ ۔ ۔ گردو بند
رہیلے چوہان تھا کہ جس سے خان صاحب کی ٹھنی چلی آتی تھی اور بات یہ تھی کہ ڈسٹرکٹ سے بڑھ کر
مقام پر آ گئی تھی کہ یہ دوہی رہتے یا یہ بھی۔ یہ کچھ رہیں دو شیر ایک بساط پر رہتے، اور ہے جیسے تو نئی حیدر
خاں یہاں پر ٹھہرے قاتل کی تعریف میں نہیں آتے! گر قاتل نہ ہوتے تو پھر مقتول ہوتے۔ اس
خاں صاحب کی اس فنکارانہ خوبصورتی کی تعریف کرلی پڑے گی جو انھوں نے اس کام کو انجام دینے
کے میں دکھلائی۔ ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ یہ پٹھان کو قبر کا نصیب ہوا اس میں تو
کیا دی چتا۔ پھر جتے اور گردو والوں نے دیا جیسا بھی ہلکی زمین پر نہ گئے کا نشان ملتا ہے۔ یہ
ہیں آسمان کو اڑ جانے کا داغ ملا ہوں الفرض جو دن دہاڑے اور روز روشن میں ہمارے خاں صاحب
نے جیسا کہ ہم نے بیان کیا، یکے بعد دیگرے ایک بڑھ کر کارنامے ہیں (ص218تا222)

بہر حال سوائے رو مقتول کی گزرگاہوں میں بجز ان کے اور ہو تا بھی کیا۔ یہ خان صاحب کی تہ
معلوم تھی تمام اور بیش بہا ایک ذرا تفصیل کے ساتھ زیر بحث آتی رہیں۔ البتہ اپنے گاؤں سے
باہر پاؤں نکالنے ورنہ پھڑوانے کی حدود تک میں نہ آ سکی ہمہ وقتیت تھیں ورنہ جیسے اس کی کشش
رعایا کی تنگ حالی میں جو ان کے اشاروں پر سال چھ مہینے میں چار چھ مرتبہ (تقاضا تو سال نہیں)
ان سے حقہ نوش انتظام کرتے کراتے رہتے تھے اور علاقے میں غذائی ورد پائی کو ارزاں رکھتے تھے۔
تعریف یہی نہیں ہوا کہ مقتاں کے صرف جبر و قدر پر قابو پانے ورد توٹی پچے میں لینے کی خاطر
مہمات بیان ہوتی رہی ہوں، فوری عدل، حقیقی انصاف، چٹ پٹ داد رسی، خصوصاً کمزوروں
بالخصوص یتیموں بیواؤں کا حق بجائے عدالت کے قسم کے اپنے زور بازو سے گھر بیٹھے دلوانے کی بھی
بے شمار باتیں یاد آ رہی ہیں۔ جیسے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دینے کے ساتھ ساتھ آ جتے اور پیدا ہو
جونے کی رامات کا بھی کھلے دل کے ساتھ تذکرہ ہوا۔ البتہ ان کا تھانے کی وہی نوعیت کا ایک ذر

بڑا کارنامہ اشاروں کنایوں، کچھ مخصوص دیہاتی اشاروں اور تشبیہوں وغیرہ کے ذریعے، چھپتے چھپاتے سے مبہم لفظوں میں، معاملہ زیر بحث آیا جس کو سب سمجھ گئے۔ حسن اتفاق سے موضوع کی اس نکڑی میں نوجوان پروفیسر صاحب بھی پہنچ گئے، اور بات تو محتاب غنی حیدر حسن کے متعلق ہو رہی تھی لیکن گھومتے ہوئے کو وہ بھی پہنچ گئے۔ یہاں کے لڑکپن کا چھوا آنکھوں دیکھا واقعہ تھا، اور آج بھی انیس سال بعد وہ دو کرانتے سے دماغ کے صفحے پر کسی عدالت العالیہ کی قانونی نظیر کی طرح اچھل اچھل پڑتا تھا، درائیں کاٹی روایت کی طرح ذہن میں سے ابھر ابھر آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔ (ص 225 تا 226)

"اللہ اکبر، کیسی ہے برٹ و گیاہ سنگ خارا کی چٹان تھی اس زرخیز دیہاتی کی سوچ!" اور سوچتے سوچتے پروفیسر کی یادیں نصف صدی پیچھے لوٹ کر چلی گئیں اور فرومات و تفصیل جاگ میں ہو گئیں۔ شمیم جیسی معصوم، کیسی بھولی، کیسی قبول صورت، کتنی اچھی۔ پردے میں بیٹھے سال بھی نہ ہوا تھا، اور یوں بھی رشتے کے ارمان گھروں میں جگہ بنا بیوں کی طرح آتے ہی جاتے ہیں، کہ رشتے کے خریدار بھائی جبو دے اندر شیطان گدگداتا ہو جاگ پڑے۔ شمیم لڑکی بھی ہو گئی اور عورت بھی۔ سب دو تین دن لے بیٹھے گئیں، اور اوپر سے نیچے تک ساری بندشیں کھل گئیں اور تمام پردے تار تار ہو گئے۔ شیطان نے بھرپور شب خون مارا اور ایسا اندھا کر دیا کہ پیار کا بوجھ اتر گیا۔ چھڑی سی بند بند حرارتی چلی گئی۔ رسوائی ہوئی، وحشت از بام ہو گئی مگر دیہاتی فضا میں آرام سے مرنی جنی عادتیں کرتی ہوتی ہیں لیکن جھنکار کہیں سنائی پڑ جاتی۔ ایک کا پردہ پورے گاؤں کا پردہ ہوا کرتا ہے، اور شریف سوہنیاں سے توسب بھائی ہوا کرتے ہیں۔ ویسے دشمنیاں بھی ہیں، عداوتیں، ضدیں، رنجشیں، اینٹھیں، مقدمے بازیاں بھی چلتی رہتی ہیں لیکن اس مقام پر پورا گاؤں، ساری بستی موافق ہی سوچتی ہوتی ہے۔ لہٰذا عملی طور پر اس کام کو انجام دینے میں کوئی رکاوٹ یا سنگین قانونی دقت یا خوف دامن گیر نہ تھا۔ بستی کے کمادین، چھوٹے دلوں کی راہوں میں خود اپنے سے مشورہ کر رہے تھے۔ یوں گمان بھی صراط سے گزر جائے۔ زبان کا تو ذکر ہی کیا، آنکھیں بھی گریہ خاموش تھیں، یہ عورت تو نے چار بہنوں پر ایک دو بار میں بول نکلتی ہوں۔ خاص طور پر جب بوڑھا گرفتار کے بتانے کا طریقہ کار دریافت تھا۔ وہ بات تو بہن بندگی تھی جیسی کہ خاص خاص دیہات میں خوشی کے وقت ہوتے ہے ساتھ پولیس کے روزنامچے میں حقیقت نامہ بھروا کر شامل کر دیا جاتا ہے کہ

Scanned with CamScanner

متوفی کا دماغی توازن خراب تھا اس لیے غنودگی میں پڑے پڑے یا وحشت کی شدت میں تنگ آکر خودکشی کر لی۔ مگر یہاں تو سب کے منہ میں [illegible] ہوئی تھی۔ بہرحال پولیس [illegible] ہوگا۔ لاش کا پوسٹ مارٹم [illegible] کرے گا۔ ذریعہ خودکشی کے نشانات تو [illegible] دیکھنے کے بعد [illegible] بہانے [illegible] کی [illegible] کی تحریر [illegible] تھی [illegible] پولیس سے [illegible] پڑ جائے گا۔ [illegible] کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنے سے [illegible] جس میں پولیس کی مداخلت کا [illegible] امکان ہو۔ [illegible] میاں حیدر خاں کے بائیں ہاتھ کے کھیل تھے [illegible] میاں حیدر خاں جیسے جیالے [illegible] تھے [illegible] کی تحقیق اور [illegible] گی۔ [illegible]

[illegible]

زندگی کی کڑی جھنکوں کا ردعمل ہے اور اس ساز کی [illegible] بھائی جان بجا رہا ہے — اور پھر اس [illegible]

[illegible]

گھبراہٹ میں سے گزرنا بلند کرتی محسوس ہوتی؛ پھر بیچاری بے زبان لڑکی سے ہمدردی اس کی گردن اور سر کو ذرا نیچے جھکنے کی محرک ہوتی اور وہ طمانیت قلب کے ساتھ خاموش ہو جاتے اور جزئیں جہاں کی تہاں دل میں جگہ کرتی رہتیں۔ اور جب وہ ناسمجھ نوخیز لونڈیا یہ سب کچھ بغیر ہی سمجھے بجھے تنی ور شیطان تو معلم الملکوت ہے، ورآتش ہاحصل اور یہ بے چاری تو ٹھنڈی مٹی تھی۔ اس نے تعلیم دی کہ چھت کے کمرے میں دوپٹہ باندھ کر لٹک جا، اور وہ اس پر بخوشی راضی ہو کر تل ہی گئی تھی مگر عین وقت پر گھر والوں نے بھانپ لیا اور اقدام کے دوران قبل بچا لیا۔ اس کی جان بچانے کے لیے نہیں، پولیس کے پنچایت نامے اور پوسٹ مارٹم کے خوف سے، جس کے بعد یہ خبر سارا گاؤں سے شہر اور شہر سے کچہری پہنچتا اور پھر سب کچھ ڈھکا چھپا روزِ روشن میں ظاہر ہو کر سڑی مٹی گاؤں واپس آتی۔ بعد بعد جو انہونی ہونے کو رہ گئی، وہ اور ہو کر رہتی۔

ویسے تو غنی حیدر خاں عصمت کے تئیں تیسرے، پوتے شاخ کے ایک جدی تایا چچا لگتے ہوں گے لیکن فی الحقیقت اس سلسلے میں وہ کسی پہلو عصمت سے متعلق سگی بھتیجی سے کم ہمدردی نہ رکھتے تھے، اور اس کی ناک سگی بیٹی سے بھی زیادہ عزیز تھی، اور پھر نادم باپ کا سر اور آنکھیں مدد کے لیے سامنے تھی ہوئی اور بے پایاں ماتم اور عظیم ترین تباہی کے خوف میں چیخی ہوئی بدنصیب ماں نے تو تھی آنسو غنی حیدر خاں کے در رو تھے، اور کس غرض سے کہ اس قصے کو اس طرح دبا دیں کہ آنکھ پھوٹنے پیر جانے۔ اور درد کے کرب میں دونوں غنی حیدر خاں سے آنکھیں پھوڑنے کی خوبصورت صورت نکالنے کے لیے یہیں مشتمل تو یہ تھی کہ بہت طریقہ کار خود بھی پیش نظر رکھتے تھے اور مدبر اور دلیر غنی حیدر خاں کے ذہن میں ایک ہی اصال جھلک سے روشنی آ گئی اور مسئلے کا حل نہایت سیدھا سمجھ میں آ گیا۔ اور غنیمت یہ تھی کہ برسات کا موسم تھا اور ساون بھادوں کی اماوس (مہینے کی تاریک ترین رات) تھی، جو ایسے کام سرانجام دینے کے لیے نہایت موزوں ہوا کرتی ہے۔ اور غنی حیدر خاں نے مختصری بات ماں اور پھر باپ سے کی، اور چند لفظ خود عصمت سے کہے اور بقیہ ستاروں کی طرح سب کچھ گزر ہوا اور گزرنے والا بیت ہی میں رہا اور چند ہی لفظوں میں ان تینوں کے اندر والی بشریت کو اچھی طرح ٹھونک بجا لیا کہ تینوں اپنی اپنی جگہ پر مضبوط ہیں۔ البتہ ماں کے اندر والا ذرا تھرتھراتا ہوا تیار ہو لیکن باپ اور بیٹی ایک سے ایک بڑھ کر راسخ تھے اور بہادری کا ثبوت اوپر سے اور تندادی بے سوئے تھے

Scanned with CamScanner

(ص 231 تا 236)

بات زیادہ چھپنے والی نہ تھی۔ بس یوں ہی ریت گر رہ گئی۔ یوں بھی شرافت کی پردہ داری لازم تھی۔ بچہ ہونے کا پاس درمیان میں تھا۔ فخری حیدر خاں کے ہاتھ حالی کا سر تھی مگر یہ ان کا مسئلہ نہ تھا۔ ہر معاملے کی ہمت تھی کہ تبصرہ کرے۔ خاں صاحب کی زندگی کو دعوت تھا۔ جوڑوں سے منگنی کا دن میں سے پہلے میں گزری اور پیٹ کی گہرائیوں میں پیچ کر ختم ہوئی [illegible] وسعت سے موزوں نمودی میں انھیں یدطولیٰ حاصل رہا تھا اور ایک سے ایک نئی ترکیب اختراع کرنے میں مہارت تھی۔ مگر پروفیسر کو بھی طرح یاد تھا کہ خان فخری حیدر خاں سے اس مہم کی تکمیل میں بہت ہی سیدھا سادہ سامان کیا تھا۔ ایک بڑے مردہ کا ڈھانچہ بھی تو ہاتھ میں نہ آیا تھا، اور نتیجہ یہ کہ پورا درختوں کا تھا کہ کار بیدار ہونے کا سب میں یہ کہ تھا۔ بس دو گٹھے راستے سے چھپ کر اور گزر جانے سے موقع کی رکی سے دو مضبوط گٹھے دریا کنارے کنڈے سے گرا کے پر پہنچ ہی رہے تھے۔ آدھی رات گئے سب سواروں کی نگہبانی بچا دونوں میاں بیوی سے گنڈا ہو کر مخالف سے جو رہتے تھے ان کی پانی جھاڑیاں تھیں اور میاں بیوی کا یہ طرف سارے کی بات کو لگے ہوئے تھے تو خان فخری حیدر حرکت میں آئے۔ [illegible] سے آدھی رات کے اندھیرے (جنگل کی سب روشنی کی) جوتا اور جیسے ہی دروازے پر جا پہنچے۔ اور دروازہ اندھیری رات میں اس وقت بھی کھلا ہوا جیسے منتظر ہو رہا تھا۔ تھیں اندر ان میں تیار بیٹھی تھی، مہمان آئی رہی۔ مہمان کو دیکھ کر ایک مرتبہ دروازے کی طرف بڑھ کر سامان اوپر سے نیچے تک دیکھتے دیکھتے جیسے آنکھ موت کی ٹھنڈی جھرجھری روئیں رونگٹے میں دوڑی مگر پھر آپ سنبھل گئی اور جیسے تن کر موت سے مقابلے کے لیے تیار ہو گئی۔ [illegible] سے خان فخری حیدر خاں، پیچھے پیچھے مدت کو تصدیق کے رنگ سے سہارے حال بجھنے کی طرف سے چل پڑی۔ وہاں سو رہی تھی، باپ سو رہا تھا یا دونوں ہی سانپ سونگھ گیا تھا۔ انھیں کا سوتا ہوا مقدر آدھی رات جاگ پڑا اور وہ سامان روایت اور حوصلے سے کچھ میں کر بستر ہو کر میدان میں آ گئی اور فخری حیدر خاں کا سہارا لیے ہوئے، رہوار کی نشست پر اور خان مستعدی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کا ماں کے بیٹے کا باپ، انھیں وہ بڑے قریب پہنچیں تو بستی والوں کے درمیان جیسے سب پتہ چل گیا اور زبان طعنے والوں کی دوں میں دراڑیں پڑیں۔ آنکھوں کی آنکھوں میں حال طور پر انھیں کے ماں باپ دشمن تھی

Scanned with CamScanner

حیدر کے درمیان بغیر ایک لفظ بھی بولے تعلق طے ہو چکا تھا۔ خوب سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک مانے ہوئے ثقافتی و سماجی کلیے پر عمل ہو رہا تھا، جس کی پشت پر ہر دور کا ٹھپہ اور قدیم سے قدیم مہر تصدیق ثبت چلی آ رہی تھی اور آج سب سے گہری مہر تصدیق خود حسین نے مردانہ وار بڑھ کر لگائی تھی۔

گاڑی سبک رو تھی اور بیل شائستہ۔ خود غنی حیدر خاں کے ہاتھوں میں رسیاں تھیں۔ اشارے مکاری کا بھی سوال نہ تھا، جیسے مالک کے دل کی مرضی پہچان کر بیل تو بیل، رہلو کے پہیے خود ہی ٹھیک سمت چل رہے ہیں۔ ماحول سیاہ سناٹے میں گم تھا۔ گلی کے کتے بھی شاید ہمراز تھے، نہ معلوم کہاں چھپے دبکے پڑے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بستی کے آس پاس درختوں میں سے الو کی مخصوص کرکراہٹ اس نم سیاہ ماحول میں دہشت کا رنگ تیز تر کر دیتی۔ بستی سے کنڈا میل پون میل کے فاصلے پر تھا، چند منٹ میں یہ صدیوں کا چلا ہوا سفر رہلو طے کر گیا۔ کرارے پر دونوں گھڑے منتظر سے دبکے بیٹھے تھے۔ ویسے یہ کنڈا ادھر سبھی اپنی مخصوص جائے وقوع کے سبب ویران رہتا تھا اور آج کل تو برسات کی، جوش جنوں شباب پر تھا۔ ہندوؤں کے وبائی یا مار گزیدہ یا حادثاتی مرے ہوئے مردوں کی لاشیں، بے جلائے، کریا کرم کرنے کے، بہائی جاتی ہیں اور یہ کنڈا علاقے بھر کے ہندوؤں کا آبی قبرستان تھا، نیز گھڑیالوں، ناکوں، مگرمچھوں اور گوہوں، دنیا بھر کے آبی حشرات کا دسترخوان تھا۔ غنی حیدر خاں نے رہلو سے ترکری سے دونوں لنگوں کے سرے دونوں گھڑوں کے گلے میں باندھ دیئے اور چپٹ کر حسین کو رہلو سے اترنے میں سہارا دیا۔ مدھکی جائے آج بس بھرا نوجوان بے حس ہو رہا تھا جیسے برف کی سل۔ انھوں نے بڑی تیزی سے اس کا دوپٹہ اتار کر منہ میں ٹھونسا۔ گرچہ حسین نے رو دینے سے کہ بری حساس ہو گیا کہ اس کی ضرورت نہ تھی، تاہم بہ نظر احتیاط، اور دوسرے بجلی کی سی پھرتی سے گھڑوں میں بندھی ہوئی رسیوں کے دونوں سرے پھندا بنا کر حسین کی پنڈلیوں میں ڈال دیئے اور پھر ہمت سے زیادہ شہ زور سے بڑھ کر باہمت غنی حیدر خاں نے تم رسے سے بھرے ہوئے گھڑوں سمیت یہ باپ کی بیٹی اپنے مضبوط بازوؤں اور چٹان کی سی چھاتی کے درمیان یوں بھینچ لی جیسے بڑے گلے جوش کی گٹھڑی … جوش کی گٹھڑی میں زلزلہ تھا اور جب … نے دونوں … کے لیے دہائی تو اندازہ ہوا کہ برف کی سل پگھل رہی ہے۔ وہ ٹھنڈے پسینے

میں شرابور بھی ۔ ذرا جھولا دے کر بنی گرفت کو جو چھوڑا تو اس سماجی بغاوت اور شدتی سازش کے ہر بستہ رہے یا رومانیت کرے کی دلچسپی اور جوشیلی لپیٹ لتڑے کی تہ میں ہل گئے ترے گتھیں لپیٹ بیچ تلی پر جا کر رکھ دیں، اور آخر کو بیٹے کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا۔ اس خوبصورتی کے ساتھ اسلوب مرتبہ آنکھی ڈوبی اور بس سے آواز پڑی کہ ایک دفعہ کو رہتی دنیا تک بازگشت کا احساس شد رہا۔
(ص 238 تا 242)

❁

ناول ''پچھیر'' کا چوتھا باب (ص 300 تا 209) اسلاو کے چند صفحات میں کسی وطن شامل ہے۔ اس میں ورق چند علی اور موروثی زادوں کی گفتگو کے توسط سے ابوالفضل صدیقی اپنے قاری پر صورت حال جانچ کر رہیں واضح کر رہے ہیں کہ خشی خان شیر خان کی کارگزاریاں موروثی زادوں کی حیثیت اور شخصیت پر کس کس طرح اثر انداز ہوئیں۔ حاجی میاں کا پہلا تحقیق بڑے سے پہلے چند علی کا خرد نظر بیا تھا بعد میں یہ ہو گیا اس کی موجودہ ذہنی حالت کے دیگر جواب دیتے ہیں۔ خشی خان نے شرعی حیثیت سے یہ سب قدم اٹھائے ان کا علم چند علی کو بھی نہیں، اور ان اقدامات سے وہ خود علی کی رعایت کے ساتھ ہی ساتھ اُسے کی اپنا مدعی بنا دیا ہے (جیسے قتل اور یہ حاجی میاں و پر تشدد خاطر خدمات کے عوض اپنے تعلقات کا قیدی بنا جاتا تھا)۔ یوں حاجی میاں کے بعد چند علی بھی ارجستہ باطن شدہ گرفتار ہو گیا ہے۔

38

موروثی اراضی سے بے دخلی کے بعد بچی کھچی پیداوار کی تو قدیم رواج کے مطابق حسب معمول حاضر کے اور موروثی دخیل کاروں کے ساتھ موروثی بھی دور سے آ کر چند علی کے پیداواری حساب جیسے میں پہنچے لیکن خشی خان شیر خان کے اشارے پر چند علی نے موروثی زادوں کی نذر دینے سے انکار کر دیا حالانکہ یہ اعزاز صرف موروثی دخیل کار کا شتکاروں کے لیے مخصوص تھا اور ان سے متعلقہ کی پرورش اب ان کی پرورش اور وہ کی تھی جو پہلے تھی، اور فوراً ہی تمام مراعات ایک مدت موروثی زادوں کے بچے تو یوں کے جانشین موروثی کا بوجھا رہے اور موروثی کی توقع سے

ساتھ معانقہ کیا اور قدرے معتدر نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ساتھ منشی جی کے اشارے پر چھوٹے منشی نے ادنیٰ طبقے کے لوگوں کے ساتھ عیدی دیئے۔ البتہ فطرے وغیرہ کے پیسے مولانا زادوں کو طلب کیا لیکن انھوں نے انکار کیا۔ تاہم کسی کی ہمت نہ پڑی کہ جلسہ چھوڑ کر دیوان خانے سے باہر چلے جائے: محفل میں آخر تک موجود رہے۔ عید کے اس اجتماع میں ذرا پھیکی سی رہی، اور مولانا زادے بہت آزردہ رہے، اور جب محفل اٹھ گئی تو تقریباً تخلیے میں مولانا زادوں نے اپنی شکایات بندو علی کے روبرو پیش کیں۔ ان میں سے ایک معتدر بزرگ نے، جو کسی زمانے میں بندو علی کے والد بڑے میر صاحب کا مقرب رہا تھا اور مزاج میں دخیل تھا، کھل کر بات کی۔ یہ بوڑھا مولانا زادہ وضع دار آدمی تھا، قرآن پڑھا ہوا تھا، اور جب مسجد کا پیش امام نہ ہوتا یا کہیں باہر گیا ہوتا تو امامت بھی کر دیتا اور پانچوں وقت اذان دیتا۔ کچھ اس بات کا اور بہت کچھ باپ کے زمانے سے مزاج میں دخیل ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا:

"میاں، دولت اور زمین آنی جانی چیز ہے۔ آپ نے بے قانونی اختیارات کا فائدہ اٹھا کر ہم لوگوں سے زمین چھین لی اور جن کو دے دی، لیکن اس گھڑی عید کی خوشی میں ہی ہماری نذر قبول کر لیتے۔ علاقے بلکہ ضلع بھر میں ہم ویسے ہی کیا کم ذلیل و خوار ہیں، اور بھری محفل میں آپ نے اور بھی ذلیل کر دیا۔ بہرحال ہمیں اس کی شکایت نہیں، نذر تو دخیل کاروں کی قبول کی جاتی ہے ورنہ مقدر نے ہمیں کوئی بھی نہ رکھا۔"

"مگر اس میں میرا کیا بس۔ کیا میں نے لٹھ مار کر زمین لوٹ لی ہے؟ وہ تو قانون نے تمھیں بے دخل کیا ہے۔ جس طرح میرے دادا کے زمانے میں قانون نے تمھیں بہت کم شرح لگان پر کبھی دخیل کاری موروثی حق دیا ہوگا، اسی طرح آج اسی قانون نے تمھارا یہ حق ختم کر دیا۔"

بڈھے نے ایک لمبی سانس لی اور کہا "ہاں میاں، میں نے کہا نہیں ابھی، زمین خدا کی ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ آپ کے بزرگوں کی مہربانی سے کبھی ہمارے بزرگوں کو بخشی اور آپ کے ساتھ ہمارے بڑے بن کر نہ چل سکے، آپ نے واپس لے لی۔ آپ مالک ہی جو ٹھہرے۔ پھر ہاتھی بکرے کی ٹوہ میں ہونا بھی یہی تھا۔"

بندو علی نے بیزاری کے ساتھ بات کاٹی "خیر، کہنا کیا ہے، وہ بتاؤ۔ اب کوئی گنجائش نہیں

پر باقی نہیں ہے۔ مدتیں ہوئیں، اٹھارہ مہینے پہلے قانون پر پورا عمل ختم کر چکا۔ ہونی کو ان ہونی کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔"

"بتاتا ہوں میاں،" فلاں نے کہا، پھر یک تلخ سا گھونٹ لے کر تو زور سے کی۔ "عرض اتنی ہے کہ ہماری ذلت اور زوال کی انتہا ہو گئی ہے۔ چودھروں نے اپنے طور پر کوڑیا صاحب جن سے پہلی فصل زیادہ مزدوری طے کر لی تھی۔ چوری چھپے مولا زادوں کے لڑکے بھی کام کر آیا کرتے تھے۔ پھر دوسری فصل سے اس نے تب کوئی کھیتی اور بڑھائی اور تیسری فصل میں دیتی کھا ڈال کر پورے رقبوں پر تب کو ہی تب کو چھین دی۔ سو تا رو رہا ہے، سرکار کو تو بس ایک دفعہ دگنی پڑھتے وقت ذرا سی رقم تھما دی۔

"ہاں میاں، یہ اس کا مقدر اور اللہ کی دین۔ سرکار کو خود کاشت نہیں کرنا تھی ورنہ ہم کسی کو موروثی پٹے پر دینا تھی تو ہمیں سے ختم کرتے۔ اتنی رقم جتنی ہم نے سرکار کو جیب سے نکال کر دائی اور موروثی حقوق کے زمانے میں دی، ہم سب جیب سے نہیں تو کہیں سے قرض دام کر کے سرکار کو دے دیتے۔"

بدو علی نے پھر بات کاٹ دی، "بھئی ان پیاروں سے فائدہ؟ سانپ نکل گیا، لکیر پیٹا کرو۔ تمھاری اس ایک بات کے میرے پاس ایک سو ایک جواب ہیں لیکن نہ اس بات کے کرنے کی ضرورت ہے نہ میں جواب دیتا ہوں۔ وہ بات بتاؤ جو تم اب چاہتے ہو۔"

فلاں نے آواز درست کی اور کہا، "بات یہ ہے کہ جب سے یہ تب کوئی کھیتی سب رقبے پر پھیل گئی ہے، مزدوروں کی بہت کمی پڑ گئی ہے۔ اس نے جیسی اجرت پر لیا ہے، ہم موروثیوں سے سب نے سب مزدوروں سے کام کرانا شروع کیا تھا کہ ایک دن شام کو ڈیڑھ دو ڈیڑھ چار جو کھیت سے پر تھے ناچتے۔ جب مزدوروں نے سبب پوچھا تو کہا کہ خوشی کمال تیر مال کہتے ہیں کہ دستور دیکھی و جیب الارض کی جلد میں کھیت مزدوری کی بھی مزدوری لکھی چلی آئی ہے۔ اس ہم نے ان جب ولی مزدور کام پر نہیں گیا تو کشی نے صبح تڑکے ہی گھر گھر پہ بیٹھ کے ہدایات کر دیں۔ جو ڈھال کو پکڑیں، پھر جو گھر میں دبک گیا تھا اس کو اندر سے گھسیٹ گھسیٹ کر لے گئے اور کوڑیا صاحب جن کے تب کو کھیتوں میں ہانک ہانک کر مولا زادوں اور چماروں کا ایک ایک جوان کھینچ دیا۔"

Scanned with CamScanner

"تو میرا اس میں کیا بس؟ میں نے ابھی بتایا نہیں تمھیں، وقت وقت کی بات ہے۔ قانون کے ہم تم سب بندے ہیں اور یہ دستور دیہی واجب العرض، شدآمد قدیم کا آئین ہے۔ اس پر حکومت کی ساری کیل گھومتی ہے۔ تم ہوٹے سب کھیت مزدور ہو۔ ابھی تم نے خود ہی کہا، زمین خدا کی ہے، جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ تم سے خدا نے چھین لی اور کوڑی مل مہاجن کو دے دی۔ اب وہ سودی دخیل کار ہے، تم کھیت مزدور۔ اور کھیت مزدوری، اجرت چھ چھٹانک موٹا اناج ہے۔ انصاف یہی ہے۔ چاہو تو ابھی سوا سو برس پرانا قانون جلد بندوبست میں کھول کر دیکھ لو۔ اور اس کو انگریز نے معقول سمجھ لیا ہے، اکبر بادشاہ کے زمانے کا جیسے کا تیسا اٹھا کر رکھ دیا ہے اور 'شدآمد قدیم' نام رکھا ہے۔ اس میں تو ہائی کورٹ بھی کچھ نہیں کر سکتی۔"

"جو میاں، وہ تو سب کچھ صحیح کہہ رہے ہیں آپ، آپ کے بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کر کے غلام کو یہ سب معلوم ہے..." اور بڈھے کی آواز رندھ گئی۔ "کل تک انھیں کھیتوں پر ہم گیہوں اگایا کرتے تھے تو ہمارے ہاں [illegible] مزدوروں کے غول آیا کرتے تھے، اور آج ہمارے بیٹوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح منشی جی کی، پیٹ کی خاطر ہنکا کر لے جاتی ہے۔ پھر اللہ تیرا شکر ہے، جس حال میں رکھے، تیری مرضی۔"

اور بڈھے کا حلق بند ہو گیا، بندہ علی نے ذرا نرم ہو کر کہا، "ملاں جی، اتنی دیر ہوئی، میں تمھاری بات نہیں سمجھا، چاہتے کیا ہو؟ مگر سمجھدار پڑھے لکھے آدمی ہو، تمھارے پیچھے میں بھی کبھی کبھی نماز پڑھ لیتا ہوں، وہ بات بتاؤ جو میں کر سکوں۔"

بڈھے نے بار بار داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، "بس سرکار، اتنی عرض ہے کہ ہمارے بیٹوں کا مقدر اب تیرے میرے کھیتوں پر مزدوری رہ گیا ہے، اس میں منشی جی دخل نہ دیں، مہاجن ہر طرح کی مزدوری بڑھانے پر تیار ہے، بلکہ وہ تو یہاں تک کہتا ہے اگر کسی کے گھر فصل بھر کھانے کو ہے تو کام کیے جائے، اور پیداوار کی بچت میں حق لے لے۔ لیکن منشی جی دھاندلی کرتے ہیں۔ نہ اس کا کام بھرپور ہونے دیتے ہیں، نہ ہماری مزدوری پوری ہاتھ آنے دیتے ہیں۔ اور مزہ یہ ہے کہ منشی جی کا یا سرکار دونوں میں کسی کا اس میں کوئی فائدہ نہیں، اور مہاجن بھی ایسے قاعدے سے خوش نہیں۔ اس میں منشی جی کی شرارت ہے۔"

بندہ علی کے علم میں یہ بات نہ آئی تھی۔ پہلے تو اس کے منھ سے یہ نکلنے والا ہوا کہ "میں منشی جی سے پوچھوں گا۔" پھر زباں رک گئی اور تیور بدل گئے۔ "بالکل ٹھیک ہے۔ ہم نے اراضی خود کاشت کرنے کے قانون سے چھڑائی ہے اور تمھیں تو حقوق بھی دے دیے ہیں، آب پاشی جو تمھیں حاصل ہیں۔ مفت، یوں ہی نہیں، بھاری رقم لے کر ہوں آں۔ جو خود کاشت کرنے کی صورت میں کھیت مزدوروں اور رعایا پر ہمیں حاصل ہوتے تھے۔ بہرحال بنیا اراضی پر کھیتی کرنے کے بجائے روزگار سے پچھتا رہا ہے، جیسا کہ ابھی تم نے بتایا کہ تب کوئی پیداوار سے سونا رول رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سونا رولنے کے لیے مفلس بے کھیت مزدوروں کی اجرت اپنے طور پر بڑھانا بھی چاہتا ہو لیکن یہ تو نئی ریت پڑتی ہے۔ اگر کل کلاں کو ہم نے کسی رقبے پر خود کاشت کی تو کھیت مزدور ہم سے بھی یہی بڑی اجرت اور حق کا مطالبہ کریں گے۔ بنیا سالہا سال پرانی پانچ سو سالہ بنی ہوئی شرح کو بگاڑنے والا کون ہوتا ہے؟"

بڈھا گھگھیا پڑا۔ "میر صاحب رحم کیجیے۔ ہمیں بستی میں پڑا رہنے دیجیے۔ خدا کے واسطے اور سرکار یہ دستور دینی شدہ قدیم کے حقوق نذرانے کس نے دخیل کار کو دیے بھی جا سکتے ہیں؟ یہ تو خدا سرکاری زمینداری برقرار رکھے، زمیندار اور کاشتکار کے درمیان ہیں اور رہیں گے، کوئی ملک مہاجن زمیندار تو نہیں ہو گیا۔"

بندہ علی کہتا رہ گیا۔ "ملاں تمھارے پیچھے میں نے نماز پڑھی ہے، ورنہ اس بے شرمی کرنے کا مزہ چکھا دیتا۔ کھیت مزدوری کیوں کرتے ہو، بنی وراثت میں جا کر وکالت کرو تم تو اس بستی کے اندر رہنے کے میرا قانونی حق ہے۔ قانون قبضہ اراضی کی رو سے جب کوئی موروثی دخیل کار اراضی سے بے دخل ہو جاتا ہے تو بستی کے اندر گھر سے بھی آپ سے آپ بے دخل ہو جاتا ہے۔ وہ تو منشی جی کی مہربانی ہے، ورنہ چاہتے تو جس دن تمھاری اراضیوں پر دخل اور قبضے کی قانونی کارروائی کی ہے، اسی دن قانونی طور پر تمھارے چھپروں کا پھونس نوچ کر تمھارے گھر کھدوا کر برابر کر دیتے۔ اور آج تک ہم کسی وقت بھی زمیندار قانونی طور اس کا مجاز ہے۔ اور تم لوگوں کی کھوپڑیوں میں ابھی تک موروثی دخل کاریوں کے خناس کے نشے رچے ہوئے ہیں۔ سوال ایں؟ جواب دیکھو تو زباں سے بولے جاتے ہیں!"

اس خلاف امید سے دل فگار جواب پر مولا زادوں کے وفد جیسے رنج سے رخی دل شق سے ہو گئے، چھاتیاں تنگی محسوس ہوئیں۔ بوڑھے ملاں نے رچ رہے شفقی امداد میں جیسے رکی ذمت کا

بیکار سا جواب دیا:

"میاں، آپ سے ایسے جواب کی امید نہ تھی۔"

اور بندو علی نے پھر بات کاٹ دی۔ "میرا جواب نہیں، یہ قانون کے من و عن غلط ہیں" اور پھر ذرا پہلو سا بدلا۔ تیوروں میں بے چینی کی شکنیں اُبھریں، آواز، لہجہ اور انداز سب بدل گیا، اور سلسلۂ کلام جاری رکھا: "اور ہاں، یہ تو بتاؤ، پھر کیوں نہیں تھی ایسی امید؟ اپنے گریبانوں میں منھ ڈال کر دیکھو میاں! بلکہ مجھ کو تو سنی سنائی جستہ جستہ پہنچتی ہے۔ اور تم تو سب جانتے ہو۔ اور تم میں سے کون سا تھا جو کسی نہ کسی طرح ملوث ہی نہ ہو۔ باقاعدہ حملہ، اور نہ سازش۔ اور کچھ نہیں تو تماشائی۔ اور بڑے سرکار کی وفات کے بعد چھوٹے سرکار مرحوم کی کارکنی اور پھر بحمداللہ اپنی ملکیت کے شروع زمانے تک دس سال کے عرصے میں اپنے ہاتھ سے میں نے سولازادوں کو اپنا سمجھ کر جو جو مراعات دیں اور جیسی جیسی چھوٹیں رعایتیں، جن کا قانون میں بھی کہیں پتا نہیں نہ روایت ہی میں تھیں، نوازا، ڈھیل دی، اور طرح دی، ہر ہر پہلو سے بھرا۔ ان کا کہیں کسی اور زمیندار کے یہاں بھی سراغ ملتا ہے؟ اور تم نے قتل کا الزام تھوپ کر مجھے ٹھکراتے پھانسی کے تختے تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ اور پھانسی کا پھندا اللہ کے کرم سے گلے میں سے نکلنے کے بعد بھی، خدا جانتا ہے، تمھیں میں نے دل ہی دل میں معاف کیا، اور اپنی شادی پر دعوت دی، جو بلاشبہ تمھاری بہت بڑی عزت افزائی تھی لیکن تم نے اس کو بھی ٹھکرا کر مجھ کو گویا ذلیل کر کے مکار۔ تم ایسے بڑھ گئے کہ اپنی حیثیت اور اصل نسل کو بھول گئے۔ شادی کی بھری محفل میں برابر والوں کے سامنے میری تذلیل ہوئی، میرا کھانا گھوروں میں دبا دیا گیا، کتوں نے کھایا، اوں، آں، ایں اور تمھاری شہ پر پہلے چند نمک حرام پولیس کے آلۂ کار بنے تھے اور اس مرتبہ بھی انھوں نے تمھاری ریس کی اور یہ بھوکے نمک حرام ہلا بھی میری دعوت رد کر گئے۔ آج تم کس منہ سے پاس معذرت کے لیے آئے ہو؟ ایں؟ بندو علی کو ڈھائی سال پہلے پھانسی کے تختے پر سے گھسیٹ کر جیل کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ کوئی دقیقہ تو تم لوگوں نے باقی رکھا؟ چلے جاؤ مردود! میرے سامنے سے، محسن کش سور کے بچو۔ خون اترتا ہے میری آنکھوں میں اے حرام زادو تمھاری ہمت میرے سامنے آنے کی کیسے پڑی؟ سانپ سے بدتر! اور کھلانے والے پر تو سانپ بھی پھن نہیں مارتا۔ خصم مر گئے نہیں کہ۔ اگر کھیت مزدوری کر کے نہیں رہنا چاہتے تو بستی چھوڑ کر کہیں اور جا بسو اور کوئی اور دھندا کرو۔ اور یہاں رہو گے تو

Scanned with CamScanner

ڈیڑھ پاؤ جو ہر کے آئے پر دن نکلنے سے دن چھپے تک کام کرو گے۔ ہوں، غاں، غوں اصل سے خرچ نہیں، کم اصل سے وفا نہیں، ٹھیک کہا ہے بزرگوں نے۔ کا کا نہ کرے سو کھا، یہ قول مصطفیٰ کا۔"

مجھے پر موت پڑ گئی۔ لیکن ایک صاحبزادے جو ساتویں آٹھویں درجے تک پڑھے ہوئے تھے، بولے، "حضور! سید صاحب، اب کرم کیجیے۔ یہ بزرگوں کی امانت ہے، آپ کی تحویل میں زمینداری کے نام سے وہ ہمارے قبضے میں دخیل کاری تھی۔ ہم بھی اسی جڑ کی شاخ ہیں جس میں آپ کی قلم لگی ہے۔ اتنا ظلم نہ کیجیے کہ ہمیں چماروں کو ایک لاٹھی سے ہانکا جائے۔ قانوناً آپ کو اختیار تھا، پانچ سو پڑے مضبوطے چھین لیے اور سب جن کو مسلط کر دیا۔ اور اللہ نے آپ کو تو بنائے ہی رکھا، ہم میں سے چند سرپھروں کی حرکتوں کے قصور میں ہم سب کو میٹ دیا آپ نے۔ اس وقت ہم لوگ منشی کمال شیر خاں کی ہی خفیہ ہدایت کے بموجب عید کی خوشی کے موقعے پر تلافی مافات میں نذر گذارنے حاضر ہوئے تھے۔ اگر آپ قبول فرما لیتے تو آپ تو آپ ہی رہتے اور ہم کھیت مزدور سے پھر دخیل کار تو نہ ہو جاتے۔ ہاں ذرا بھونی رہتی اور ہمارے آپ کے بزرگوں کی عزت۔ ہوں۔ وہ سمجھ لیجیے کہ ہم آپ سے ہیں اور آپ ہم میں سے۔"

ور بندہ علی اس انگریزی داں لونڈے کے جواب پر پہلے تو "سید صاحب" کے خطاب اور پھر "ہمیں اور چماروں کو ایک لاٹھی سے نہ ہانکیے" جیسے پر ور "بزرگوں کی امانت اور تحویل پر" وہ "جڑ شاخ اور قلم" پر دل ہی دل میں بہت جز بز ہوا اور سب سے زیادہ یہ کہ اس انکشاف پر بہت متعجب ہو کر یہ لوگ نذرانے کر منشی کمال شیر خاں کی ہدایت کے بموجب آئے ہیں۔ لیکن سب پی گیا اور بھنا کر یہ کہتا ہوا اٹھ کر چل دیا:

"بھئی آپ لوگ میرے پاس بیکار آئے ہیں۔ میں باضابطہ منشی کمال شیر خاں کو مختارِ عام بنا چکا ہوں۔ یہ انھی کے طے کرنے کی چیزیں ہیں، مجھے ان سے سروکار نہیں ورنہ اس میں کہنے سننے، اپیل مرافعے کی گنجائش ہے۔"

اور اس طرح منشی کمال شیر خاں کے فیصلے کا مرافعہ بندہ علی نے جوں کا توں انھی کے اوپر دے دیا اور فیصلہ جوں کا توں رہا اور منشی کمال شیر خاں نے نہایت عیاری کے ساتھ خود ہی تحریک کرا کرا کے اس فیصلہ قطعی کو درج کرایا اور اپنی پوزیشن مزید مستحکم کر لی۔ (ص 300 تا 309)

Scanned with CamScanner

⊛

کہانی کا پانچواں باب (ص 309 تا 358) منشی کمال شیر کے وضع کردہ اس قانون کے ساتھ رد عمل کا قصہ بیان کر رہا ہے کہ تمباکو کی کھیتی پر کام کرنے والوں کو نئیل کار کو نذیل ساہوکار بھی وہی اجرت دے گا جو دستور دیہی واجب الارض شدہ آمد قدیم کی رو سے زمیندار ادا کرتے آئے ہیں، یعنی صبح سورج نکلنے سے دن مندے تک کام کے بعد چھ چھٹانک موٹا اناج۔ اس قانون کو ساہوکار نے مجبوراً قبول کیا تو "تمام مزدوروں نے کھیتوں پر کام کرنے سے انکار کر دیا۔" اپنی فصل محفوظ رکھنے کے لیے ساہوکار "بستی سے چار میل دور سے نئے چمار مزدور چوگنی اجرت پر لے آیا، لیکن خبر پاتے ہی بستی کے مزدور کھیتوں پر پہنچ گئے جن میں چمار پیش پیش تھے۔ دوسرے گاؤں کے آئے ہوئے چماروں کے اشارے پر کام شروع کرنے سے پیشتر ہی اٹھ کر چلے گئے اور کوڑیا مہاجن کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ مجبور ہو کر بے چارے نے منشی جی کی زنجیر عدل ہلائی اور تمام صورت حال سے آگاہ کیا، اور خاص طور پر ایک چمار، پرکھوتا نامی، کی نشان دہی کی جو رنگ لیڈر تھا۔ نیز یہ بھی بتایا کہ ہر معاملے میں جس طرح یہاں پر وہ ہمیشہ مولا زادوں کا ہاتھ رہا کرتا ہے، اسی طرح اس میں بھی ہے اور خاص طور پر ان انگریزی داں صاحبزادے یوسف خاں کا نام بتایا جنھوں نے عید کے روز گستاخی کی تھی اور ہندو ملاحوں کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے تھے۔ منشی کمال شیر خاں کو تھوڑا غصہ آیا لیکن جی نے ٹھنڈا کر دیا اور کہا کہ سر دست آسانی کے ساتھ ہری سے میرا کام چلتا کرا دیں (ص 310 تا 311)

منشی کمال نے "اپنے خاص مقدم ملازم خاں کو چپکے سے پرکھوتا کو بلانے بھیجا۔ ملازم خاں پرکھوتا کی جھونپڑی کی چوپال پر پہنچے نہایت شیریں اور اپنائیت کے انداز میں کہا:

"پرکھوتا بھئی، منشی جی کا حکم ہے کہ کل چماروں کا بچہ بچہ کوڑی لال کے تمباکو کے کھیتوں پر پہنچ جائے..." (ص 312)

لیکن پرکھوتا نے اس کی شیریں آواز، اپنائیت اور منشی جی کے نام کا کچھ اثر نہ لیا۔ اس نے اس حکم کو "اپنائے"، "دھاندلی" اور "منشی جی شیر خاں کی اپنی اپج" بتاتے ہوئے کہا کہ "اجرت کی بات مہاجن اور مزدوروں کے بیچ رہے گی۔ مہاجن پوری اجرت دے، بھرپور کام لے۔" (ص 313 تا 314) پرکھوتا اور ملازم خاں کی رد و قدح (از صفحہ 312 تا 324) پرکھوتا کے انکار سے

Scanned with CamScanner

شروع ہو کر انکار پر ہی ختم ہوئی۔ آخر میں ملازم خاں نے اس سے پوچھا

39

"تو جا کر یہی کہہ دوں کہ ننگ پن پر اکڑتا ہے؟"

"ہاں جو چاہو کہہ دو۔ ننگا نہیں تو کیا دھن دولت، مال مویشی، دھرتی موروثی ہے میرے پاس؟"

درمشی کماں شیر خاں سے ملازم خاں نے من و عن یہی آخری جملے بیان کر دیے۔ انھوں نے کہا

"یار ملازم خاں، ایسی بھی کیا نرمی کہ میرے پاس اس ہوڑی کے آدمی کا چیلنج لے کر آئے ہو؟ لاحول ولا قوۃ۔ ارے وہ پکڑ کر سالے کو۔ کہتا ہے ننگا ہے تو بس الف ننگا ہی کر کے۔ وہ تیج نکلی ہے اور میرے سامنے منہ میں سے زبان یوں کھینچ کر قینچیاں لگاؤ زبان پر، ساری قانون گوئی نکال دو۔" ملازم خاں نے چلتے ہوئے ہاتھی اٹھائی تو وحشی کماں شیر خاں نے کہا۔ "ارے رے رے اس پر توپ، تم رجا رہے ہو، تمہارا پر؟ خود بھی رسی لے کر جاؤ اور کمر میں باندھ کر گھسیٹتے ہوئے۔۔۔ میں گھر کے حد سے۔" اور ملازم خاں نے۔۔۔ رسی دکھا کر ہی اٹھا لی اور چل پڑا۔ (ص 325)

ملازم خاں کی واپسی کے بعد پرکھوتا نے فیصلہ کیا کہ وہ چپ رہ نہ سکے ادھر ادھر ہو جائے مگر گھر سے بھی نہ نکل پایا تھا کہ ملازم خاں رسی لیے آ پہنچا اور چاہا کہ اسے باندھے۔ مگر پرکھوتا مدافعت پر اتر آیا۔ اس کی بیوی بھی ملازم خاں سے الجھ گئی۔ اور

40

نوجوان بیٹی خوف کے مارے گھگھیا پڑی۔ مدافعت میں ماں اور باپ دونوں کو خان صاحب سے علیحدہ کرنے کے لیے ماں باپ کے کپڑے کھینچنے لگی، اور اپنی بساط کے مطابق بیچ بچاؤ کی کوشش کرنے لگی، وہ رو رو کر گھگھیا کر خان صاحب سے رحم کی بھیک طلب کرتی رہی۔ بے بسی جیسے تصویر میں ظاہر ہوتی ہے، کرتی چیختی، ہائے وائے، بس بس، کہ وہ انسانی طاقت کا بھر پور

استحصال ہوا۔ خان صاحب کو پہلے تو چمار کی دور باش کی کوششوں میں دھکے لگے، جس میں وہ ایک مرتبہ پیچھے پڑی ہوئی پیڑھی میں الجھ کر گر بھی پڑے اور یہاں سے "مزاحمت بکار سرکار" کی عملی صورت پیدا ہوئی اور "دھینگا مشتی" خواہ حملے کی ہو یا مدافعت کی، اس میں پھول پان تو بٹا نہیں کرتے۔ چمار اور چماری دونوں سے جسمانی طاقت میں کہیں زیادہ گھٹے ہونے کا اندازہ کر کے خان صاحب نے خان بہادری اور للکار، دھونس ڈپٹ سے زیادہ کام لینا چاہا، مگر جذبات سے مغلوب شوہروں پر سوچ کا چڑھایا ہوا اردلی جادو بھی اس وقت چل نہ سکا اور خان صاحب دار و گیر کی جدوجہد میں بیچ میدان شکست کھا گئے۔ اور ظاہر ہے جو کچھ ہوا اس کو ٹکسالی زبان میں ہاتھا پائی اور مار پیٹ ہی کہا جائے گا، لیکن دراصل خان صاحب کی خاصی پٹائی ہو گئی جیسی چمار کی گلو خلاصی ہو سکی۔ اور چمار چماری تو ہوتے ہی اس لیے ہیں ان کی کیا گنتی شمار، مگر خان صاحب بہادر کی لات، گھونسوں اور ڈنڈوں سے جو مرمت ہوئی وہ سنگینیت کے اعتبار سے علاقے بھر میں پہلی اور بہت بڑی واردات تھی، اور خان صاحب جان چھڑا کر اور ٹوپی وہیں پڑی چھوڑ کر اپنی راجی اور خاص کمک لانے کے لیے بھاگے۔۔

(ص 329 تا 330)

❁

آئندہ (330 تا 345) صفحات میں ابوالفضل صدیقی نے ایک طویل منظر تحریر کیا ہے جس کا "تعارہ او روز، رہائی ہے جو پرکھو نامی ظالم خان کی گرفت سے بچنے کے لیے کر رہا ہے۔ معنوی طور سے یہ زور آزمائی رتی کے پھندے سے بچاؤ کی بجائے مزدوری کے بدلے میں منشی کماں کی "اتیائے"، "دھمدی" اور "اپنی ٹیڑ" سے مدافعت کا اولین مظاہرہ ہے۔ اس مظاہرے کے گھٹتے بڑھتے دائروں اور بگڑتی سنورتی شکلوں اور نتائج کو ابوالفضل صدیقی نے "آئندہ صفحات میں اس طور نقش کیا ہے گویا "شر کے ادارے" منشی کماں کی قائم کردہ تہ در تہ بھادوں کی اماوس نے نہ صرف "انگریزی دل صاحب وے بابو خان" بلکہ پرکھو تا اور اس کے تمام بھولے بندوں کی از خا بیر تا۔ طلی آنکھوں پر پوری طرح کر تحکاران سے انگ تنگ میں قوت مدافعت وخود اعتمادی کے چراغ روشن کر دیے ہیں جبکہ دوسری جانب بھادوں کی اماوس کو جاری و نافذ رکھنے کے خواہاں شر کے ادارے، ان چراغ قوتوں کو، بہ ہزار حیلہ، روشنیوں سے محروم ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ بھادوں کی اماوس، وہ روشنی کی کمی ہو تو

Scanned with CamScanner

کسی حیثیت پر مبنی طویل پیار کی ابتدا اس اقتباس سے ہوتی ہے:

41

....خاص کمک لانے کے لیے بھاگے اور بھاگ کر جو پلٹے تو ایک پر کھوتا وردی کی جوڑو کیا، دنیا بھر کے چماروں کو نیست و نابود کر دینے کے قابل کمک کو ساتھ لیے، بگولے کی طرح سناتے اور سیلاب کی مانند لپکتے، فتنۂ محشر جلو میں اور قیامت کبریٰ پیے، جنگ باز خاں، شہباز خاں، گوہر خاں وغیرہ وغیرہ اسم با مسمیٰ انقلاب کے ڈیڑھ دو درجن ساتھیوں کی رہنمائی کرتے ہوئے، سب نے سب آدم خور شیر کے تیوروں میں ڈوبے ہوئے۔ اور مہم کا عجیب ترین پہلو یہ تھا کہ اس جگہ پر چارج لیے اور کام سنبھالنے کے بعد منشی کمال شیر خاں آج پہلی مرتبہ بنفس نفیس میدان میں نظر آئے تھے۔ اس سے پیشتر آج تک، قبل کام کرتا رہا تھا لیکن اپنی پارٹی سے پچاس گز پیچھے گلی کے موڑ پر کھڑے تھے۔ ہاتھ میں صرف فتح پوری ساخت کا گھوڑے کا سخت کوڑا تھا۔ بشرے پر بلا کا اطمینان اور شعلہ سا آنکھوں میں تجسس اور غیظ کی ملی جلی نشانیاں تھیں۔ دارو گیر اور شکست و بست کسی نہ کسی شکل میں، خواہ وہ فوجی ہو یا جمہوری، مگر بالادست طبقے کا ذریعۂ قیام اور طرزِ معاملت رہا ہے۔ بیگار خوری، جوتے کاری، آتشزنی، رسائی اور رعایا، سرمایہ دار و محنت کش طبقے کے درمیان آئے دن کے معمول ہیں، اور منشی کمال شیر خاں کی تعیناتی سے قبل بندہ علی کے یہاں بھی حسب ضرورت چلتے ہی رہا کرتے تھے، لیکن منشی جی اپنے ساتھ ملک الموت وان ہیبت سے کر نازل ہوئے تھے، اور یہاں نازل ہی ہو کر بس بالکل کی طرح کاشتکاروں کے سب سے زیادہ مضبوط گروہ موروثی دخیل کاروں پر گرے تھے اور وہ رہبر میں بجھا کھانڈا چلایا تھا کہ ایک ہی وار میں رہتی دنیا تک جینے والے موت کے گھاٹ اتار دیے تھے۔ موروثی دخیل کاروں کی سند ریاست کی ملکیت سے بھی زیادہ قدیم تھی۔ ۔[منشی کمال] موروثی کاشت اراضی سے بے دخل ہونے کے بعد کاشتکار کی نفسیات اور ردعمل کے بڑے گہرے شناسا تھے۔ چنانچہ جیسے ہی ان کے آدمی چماروں کو پکڑ کر لانے کے لیے دوڑ بڑھے کر چلے تو ان کی چھٹی حس نے مبہم سے اندیشے کی بو سونگھی: "کہیں بے دخل شدہ مولا راؤں کا جتھا چماروں کی پشت پناہی کے لیے تیار نہ ہو جائے" اور جہاں دیدہ منشی جی اپنے آدمیوں کے روانہ ہونے کے بعد

منٹ کے اندر ہی اندر تقریباً پیچھے ہی پیچھے گدی پر سے اٹھ کر چل پڑے نہایت خراماں خراماں، بڑے اطمینان کی چال چلتے ہوئے، کوئی آہستہ آہستہ ٹہلتا ہے۔ ویسے ان کے ذہن میں مدمقابل کیڑے مکوڑے تھے، لیکن یہ سمجھ کر کہ کہیں کوئی خاص مزاحمت مقابلے کی نوبت آ جائے تو پیشتر اس کے کہ اپنے آدمی لٹھ برچھے چلائیں، وہ دور ہی سے یک شیر کی سی دہاڑ نکال کر بریوں کے گلے کی طرح منتشر کر دیں — ور ایسے بارہا تجربے تھے — اور جب وہ چر گونٹے کی لمبی گلی کے اس کنارے پر تھے تو سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ان کے آدمی چمار کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے شیر کی گونج میں بھری ہوئی آواز نکالی "اوئے بھیر... کو ننگا کر کے باندھ کر" اور خلاف امید پیچھے سے ایسے بہادر اور ہیبت، حکومت سرداری کی آواز سن کر اس کمیں کا فورس پورے ایک ڈویژن کا ہو گیا اور گھر میں داخل ہوتے وقت سب نے شیر کے جیسے ہی للکار دی اور اس کے ساتھ ہی منشی جی پھر شکار پر چڑھے ہوئے شیر کی طرح گرجے:

"اوئے بھیر... کو الف ننگا کر کے کھڑا، کمر میں رسی ڈال کر، ذرا ہم بھی دیکھیں کتنا ننگا"

اور "میں تو ننگا ہوں، میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے" والی بات، کمزور کا ظلم زبردست کے اوپر منشی جی اس کی نفسیات سے خوب واقف تھے اور اس سے بارہا دوچار ہو چکے تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ آدمی کو جسمانی طور پر زبردستی روز روشن میں ننگا کر دینے کے مضمون کن ردعمل اور اثرات سے بھی خوب شناسا تھے۔ جب زبانوں کی زبان باہر کھینچ کر قینچیوں کی ٹوٹی تھیں۔ منہ میں پیشاب کا نسخہ بھی نہایت مجرب اور تیر بہدف ثابت ہوا تھا۔ اور بارہا اس طرح بھی منہ بند کیے تھے کہ پھر کبھی آواز سنائی نہ دی، لیکن جس نے اپنے آپ کو ننگا کہہ کر یہی کمزوری کو طاقت بنا کر دھونس دی تھی، اس کو تو ہمیشہ روز روشن میں الف ننگا کرا کر ہی ذہنی اور جسمانی طور پر زیر کیا تھا، اور بغیر ایک انچی بھی جسم پر چھوئے، ان دہاڑنے صرف عریانی میں جلوس نکال کر، جیسے جسم کا بند بند توڑ دیا تھا۔ مگر گھر کے اندر تو سناٹا تھا۔ جیسے ہی مالکم خاں تو ادھر بھاگا تھا، چمار چماری شدید طوفان کی چڑھائی کے اندیشے میں ادھر ادھر روپوش ہو گئے تھے۔ البتہ تو خیر بیٹی کو گھر میں چھوڑ گئے تھے، کیونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ ایسے موقعے پر بالعموم زمیندار کی غصے میں پہلا قدم گھر کو آگ لگا دینے کا کیا کرتے تھے اور اگر آگ لگانے کا موقع نہ ہو تو بیگی یا ادلی دھمکی یوں کر دیتے تھے اور چیز گھسیٹ کر سکتے

ہم گھوڑے پر لاد دیتے ہیں، اثاثہ لپیٹ جو کچھ ہوتا ہے سوار دیتے ہیں؛ وہ اس قصبہ میں یہ وقت آ پڑنے پر کمزور ترین مخلوق کو بہترین محافظ تصور کرتے ہوئے گھر میں چھوڑ گئے تھے، چونکہ یہ مضبوط اور راسخ دیہاتی روایت تھی کہ گاؤں کی بیٹی سب کی بیٹی ہوتی ہے اور سارے گاؤں کی کمزوری ہوتی ہے اور پاک امانت تصور کی جاتی ہے، لہٰذا کسی بھی قسم کے ظلم و زیادتی سے مستثنیٰ اور معصوم تصور کی جاتی ہے، اور پھر اس ہاتھا پائی میں اس کا رول خاص طور پر غیر جانبدار اور بیچ بچاؤ والا ہی تھا جس کا مظاہرہ ان کو بھی دھینگا مشتی میں اندازہ ہو رہا تھا، کہ ماں باپ کو کھینچ کھینچ کر باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے روتی گھسیٹتی رہی ہے، چنانچہ اس معصوم سے پرخاش انتقام کا کوئی امکان نہ تھا۔ لہٰذا اس کو مدافعت کرکے بھاگ گئے تھے۔ اگر گھر کھود دیں یا آگ لگا دیں تو پاؤں پڑ کر، گڑگڑا کر، رو دھو کر باز رکھے۔ اور یہ کمزور کا آخری اور آخر دم کا بھی ہتھیار ہوا کرتا ہے، بہرحال گھر اور سوسائٹی کے کمزور ترین اور شاید موزوں ترین عنصر کو اس مہم کے لیے چھوڑ گئے تھے۔

اور ملازم خاں تو چیل ناگ ہو رہا تھا۔ زدوکوب تو خیر وہ ہی دی تھی [illegible] ت تھوڑے تھے، تھوڑی کان گلوخ کا تپاک — لیکن ارذل ہاتھوں توہین کے احساس میں اس کے دماغ میں روئیں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ بے تحاشا ہتھیاروں سے فرار ہو جانے کا اندازہ کر کے لڑکی کو پیچھے کی طرف ہاتھوں سے بیزاری سے خون میں اضطراب اندر صعب پیدا کر دی [illegible] اندر حضرت کی غریب پر آدم خور شیر کی مانند جھپٹ پڑا، اور اس کا اقدام درحقیقت آدم خور شیر سے بہت کچھ مماثل تھا بھی۔

آدم خور شیر اصلی طور پر آدم خور نہیں ہوا کرتا، اگرچہ فطری جذبے کے تحت آدم خور بنتا ہے۔ اس کا شکار اکثر عورتیں ہوتی ہیں۔ ایک ہی آدمی سے بستی میں مار دینے کے بعد پہلے قبل جسم کے کپڑے ہوس تار تار کر کے ننگا کر دیا ہوتا ہے، پھر کھانا شروع کرتا ہے۔ عورت کا گردن روکی جرم، آقا کا لامحدود تسلط، ہر پہلو سے بیکس بے پناہ حالت اور مقتول کا ضعف کی ضعیفی، تا حد نگاہ میدان یکطرفہ اور خالی سبھی کا اور خاص طور پر ملازم خاں کا موروثی سا جنون معرفت کی حد تک بلند ہو تھا۔ گاؤں، جھپٹ کر بے چاری کی دو تین چیخیں ہی جیسے مرغی کے بچے کو چیل دبوچتی ہے، چیخیں سنائی دیں اور اس نے ٹوٹی جھپٹ میں آدم خور شیر والے انداز میں اسی سرعت کے ساتھ جھپٹ کی یہ دوپٹہ، مٹکا، شلوکا تار تار کر کے، اچھی طرح سے بدن کو عت ننگا کر کے اپنا ارشاد یا

ملازم خان کی پارٹی، کچھ رسیوں کی بندشوں، بٹوں، بے تحاشا دھکّوں کے ذریعے، تھوڑا بہت جھٹکوں لاتوں
اور ہاتھوں کے ٹھونگوں سے پیٹھ، کمر اور گردن پر الف ننگی لڑکی کو سیدھا کھڑا رکھنے کی مسلسل کوشش کرتی
ہوئی، بے ڈھنگ باہر لے آئی، اور سورج کی اربوں سال سے ایک رفتار چمکتی آنکھ بھی اس منظر کی
تاب نہ لا کر جھپک گئی۔ لڑکی کو دنیا اندھیر نظر آئی اور دیکھنے والوں کو بھی کچھ اسی طرح اندازہ ہوا کہ شاید
قیامت آج ہی آ جائے۔ خوردنِ گندم کی پاداش میں جنت بدر آدم و حوا نے اللہ تعالیٰ سے رو رو کر پہلی
فریاد عریانی کی تو کی تھی جب فردوسی لباس نے ان کے جسم کو چھوڑ دیا تھا۔ ستر پوشی کا تقاضا تو ذاتی
حفاظت و زندگی سے کم شدید نہیں۔ حوا کی اس رذیل بیٹی نے بھانت بھانت کی ہسٹریائی چیخوں میں برہنگی
کی ذلت سے پناہ مانگی، گڑگڑا کر رحم کی طرح طرح درخواستیں تو گھر کے اندر ہی ختم ہو چکی تھیں اور
چوکھٹ سے صحن تک پہنچتے پہنچتے خوشامد، غصے اور پھر عاجزی کے سب مدارج طے کر چکی تھی، گھر سے باہر
گلی میں اس شدید فطری تقاضے کے تحت اور روح فرسا احساس سے نجات کے لیے آنکھ، زبان اور
رسی میں بندھے ہوئے ننگے جسم کی ہر دسترس سے کام لینا چاہا، مگر بے بس تھی۔ گلی میں چند قدم ڈالنے
کے بعد فضا میں رحم کی عام بھیک طلب کی، اور فریاد میں فلسفیوں اور دانشوروں کی فکر کو چھو آئیں، بستی کا
اور کوئی آدمی نظر پڑا تو حیثیت مقام کا درجہ یاد دلایا، مشرقی اور دیہاتی روایات کا حوالہ دیا، پکڑنے والوں
کو ان کی بیوی، مائیں، بہنیں، بیٹیاں یاد دلا کر دہائی دی، پھر کوسے اور گالیاں نکالیں۔ مگر جکڑی ہوئی
رسی سے مضبوط اور شاطر ہاتھوں میں تھی کہ بجز زبان کے اور کوئی عضو حرکت نہ کر سکتا تھا۔ زمین پر
گر پڑنا تو درکنار، وہ ذرا جھک بھی نہ سکتی تھی۔ اور چند قدم ڈالنے کے بعد اس نے کچھ دیر آنکھیں
جھکائیں تو بجھ گئی، اور نہ معلوم کیسے ہوا کہ مچھلی کی طرح ایک ہاتھ رسی کے بل میں سے نکل کر زیر ناف
چپک گیا جیسے مقناطیسی کشش کے ساتھ وہاں کا وہیں چپک کر رہ گیا ہو، اور اس غیر متوقع اقدام اور
کامیابی پر دار و گیر کرنے والوں نے اپنی شکست محسوس کی۔ ڈنڈی کے ٹھونگوں سے چھڑانے کی کوشش
کی، پھر برچھے کی نوک سے خراشیں مار مار کر ہٹانا چاہا کہ منشی جی کے کام کی بھرپور تعمیل ہو، جس میں یہ
ہاتھ اس کی غفلت سے نہ معلوم کیسے حائل ہو گیا تھا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکے تو کلائی پکڑ کر چھڑانا چاہا لیکن
اس نازک سی دوشیزہ لڑکی کی کلائی اور جسم میں فولادی شکنجے کی گرفت تھی، کھینچنے نہ کھینچ لی، جیوں کا تیوں وہ
ہاتھ جہاں کا تہاں پڑا رہا جیسے یہی اس جگہ کا منصب ہے۔ گلی میں چند قدم بڑھے تھے کہ لڑکی کے حلق

سے ذبح کرتے ہوئے ادھ کٹے گلے والی گائے کی "درنگی اور ننگے بدن کے ریشے ریشے پر جیسے آپوں آپ پھٹ کر پرخچے اڑ جانے والی کیفیت محسوس ہونے لگی، جیسے اندر سے ڈائنامائٹ کا کارتوس مشتعل ہونے والا ہے اور راستہ تلاش کر رہا ہے۔ مگر اوپر سے قابو اتنا مضبوط تھا کہ ایٹم بم تک بس کا روگ نہ تھا، جیسے وقت کا منہ، مقتدر کی گردن، سب کچھ شدید گرفت میں تھی۔ نہ معلوم کیسے ایک دفعہ کہ ذرا ڈھیل ملی تو اپنا ایک ہاتھ دانتوں تک پہنچ گیا اور جب تک داروگیر والے چنگل میں چھڑا لیں انہوں نے کھال اور گوشت پٹھوں سے چیتھڑے اڑا دیے۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں سے خودکشی کی ہوس طوفانوں کی طرح امڈ امڈ کر رہ جاتی تھی۔ آس پاس کی دیواریں بھی اس کی رسائی سے باہر تھیں، گلی میں جگہ جگہ نیم اور بیری کے درختوں کے کھردرے، سخت، موٹے تنے بھی سر کی دسترس میں نہ تھے اور کنوئیں کی سنگین جگت بھی۔ ہر چیز جو ٹکر کر اس کے سر کو پاش پاش کرنے جیسی کو بخش دے اور اس کو اس بے پایاں اذیت سے نجات دلا دے، اس کی رسائی سے باہر تھی، اور بستی کے قدیم کنوئیں کا بانس بھر گہرا پانی بھی اس کی ایک جست تک سے بہت دور تھا جو بے بسی کی حالت سے چھٹکارا دیتا اور اپنی تاریک عمیق آغوش میں لے کر سرپوشی کر دیتا۔ جب ملا ونخی اور منشی جی دوسرے گلی میں ظہر تک آتے ہی کنکھیوں کا پڑتے ہی اس کے ہونٹوں سے بھی ایک دفعہ آہ سی نکل گئی اور شاہ منشی جی چپ نہ رہ سکے، ملا اس قدر کے ذریعے نہیں آیا کہ انھوں نے تو باپ کے لیے حکم دیا تھا، ان لوگوں نے اب تک اسے توڑ کر یہ تھیں کر دی جواں کا مطلب نہ تھا۔ تاہم ملا گلاب کو اپنے ذاتی غصے کا بھی حق حق ملتا تھا، لہٰذا اب جو ہو چکا وہی ٹھیک ہے۔ ملا ونخی تن پروری کا وقار بھی آڑے آیا، بہتر تھا کہ سے نکلا۔ "وہ فرار ہو گیا؟" جو منشی جی پن کی دھونس بتاتا تھا، مجمعے میں سے کسی نے کہا

"چمار چھریا دونوں بھاگ گئے۔"

منشی جی نے ایک داخلی بل سا کھایا، چھڑی لے کر ہوا میں کوڑا پھٹکارا اور یہ کہتے ہوئے بڑھتے ہوئے پیچ و تاب کھاتے، کوڑا ہراتے آگے بڑھ گئے۔ "چھوڑو، سور کی [illegible] تو اب خالی پڑا ہی حرج" اور چند قدم بڑھنے کے بعد پھر پلٹے، اور دوسرا حکم صادر کیا۔ "جاؤ [illegible] کو گھر کھدوا کر گدھوں سے ہل چلوا دو" اور پھر دو قدم ڈال کر کہتے "سب سوں کو دیکھو، شام تک [illegible] وہ حد کر یں اجائیں گے کہاں فرار ہو کر۔" وہ شہر کی طرف دانت پیستے چلے گئے۔

Scanned with CamScanner

بربریت کا یہ مظاہرہ تاب ظلم کی نئی راہ ایجاد کر کے چمار کے جھونپڑے سے باب عالی کی جانب اسی طرح گزرتا رہا۔ گلی میں گزرتے ہوئے الٹ کر جا پڑے۔ دروازوں پر کھڑی یا اِدھر سے اُدھر گلیوں میں آتی جاتی عورتیں ہسٹریائی انداز میں بدحواس ہو گئیں اور چیخ کر بے ہوش ہو گئیں۔ ڈھائی ہزار نفوس کی آبادی کے موضعے میں کھلبلی مچ گئی، جیسے صبح ہی صبح مولا علی کی موت کی خبر حویلی سے باہر آتے ہی ہوا تھا۔ سمجھدار لوگ دم بخود رہ گئے۔ بوڑھی عورتیں سینہ کوبی اور بین کر اٹھیں۔ عورت، مرد، بچہ، بستی کا ہر فرد، خبر پر، اپنی جگہ سے اٹھ کر دھڑ دھڑ بھاگ پڑا۔ کسی نوکر لڑکے نے بڑی بیگم کو دوڑ کر حویلی میں خبر کی۔ چمار زادی سیدانی بیگم چالیس سال قبل بڑے میر صاحب کی منکوحہ بنی تھیں اور چمار باپ کے جھونپڑے سے سید شوہر کے محل میں داخل ہوئی تھیں۔ تو اس کے بعد آج پینتیس چھتیس سال ہونے کو آ گئے تھے، ڈیوڑھی کے باہر قدم ہی نہ آیا تھا۔ اور جوں ہی ملازم لڑکے نے باہر سے آ کر حویلی میں بتایا کہ کسی چمار کی لونڈیا کو دن دہاڑے مادر زاد ننگا کر کے باندھ کر رہے ہیں، بیگم جیسے نئی بچھوؤں کے ڈنکوں کی خلش سے بلبلا کر جا پڑیں۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ اس لمحے اندر وہی چماری، مگر در حقیقت سوئی ہوئی عورت تڑپ کر باہر آ گئی اور سراسر کہ بپھری شیرنی بن گئی۔ بے گوش محل سے اٹھ کر سیدھی بہو (بندہ علی کی بیوی، حاجی میاں کی بیٹی) کی حویلی میں جا دھمکیں اور دو لفظوں میں صورت حال بتا دی، اور بہو بھی غصے میں بپھری ساس کے ساتھ ساتھ ہو لی۔ اور ہزار ہا سال روایات کے قلعے توڑ تاڑ کر اپنے طبقے در حویلی و دیوان خانے کی تاریخ میں رخنہ ڈالتیں، منہ کھولے مردانے میں نکل آئیں۔ کئی نوکرانیاں "ہیں ہیں، کیا کرتی ہیں" کہتیں پیچھے پیچھے ہو لیں۔ مردانے مکان میں بھگدڑ مچ گئی۔ جو ملازم حال سے واقف جہاں تھا، اس نے وہیں کسی نہ کسی کپڑے سے منہ ڈھک لیا۔ جسے فوراً کپڑا میسر نہ آیا اس نے آنکھیں میچ کر دیوار سے منہ لگا دیا، کونے میں گھستا ہی چلا گیا۔ اس ملازم لڑکے کی رہنمائی میں بڑی چھوٹی دونوں ساس بہو بیٹھکیں دیوان خانے کا وسیع صحن پار کر کے منشی کمال شیر خان کی نشست گاہ اور دفتر کی جگہ پہنچ گئیں جہاں مجمع اکٹھا تھا اور چمار کے بچے سے چمار کی بیٹی کی روبکاری ہو رہی تھی۔ ایسے طبقے میں یہ روایت شکنی شاید کبھی سورج کی آنکھ نے بھی نہ دیکھی تھی۔ بیگمات کے یوں کھلا باہر آ جانا، یک سب شان و گمان کرنے میں گھستے ہی پورے مجمع کے منہ سے بے ساختہ ہلکی سی چیخ بلند ہوئی۔ منشی کمال شیر خان کو بھاگتے ہی بن پڑی۔ اور تو سب

Scanned with CamScanner

شکرے کے جھپٹے ہوئے چڑیوں کے جھنڈ کی طرح جدھر کو جس کا منہ تھا اسی دروازے سے بھاگ پڑا۔ منشی کمال شیر خاں کو بھاگنے کا بھی موقع نہ تھا۔ ہیبت اور حیرت میں بڑی چیخ ان کے منہ سے بھی نکل گئی۔ چوکی پر سامنے ڈیسک تھا، پیچھے گاؤ تکیہ اور دیوار، اسی چھوٹی سی تنگ جگہ میں عافیت سمجھی، جہاں کے تہاں سٹ پٹ کر ڈیسک کے پیچھے اوندھے منہ ڈھیر ہو کر سو گئے، گدی اور تکیہ پر اوڑھ لیے۔ بیگمات نے برہنہ نسوانی جسم جو دیکھا تو ہسٹریائی انداز میں ان کے منہ سے بھی موت جیسی چیخ بلند ہوگئی بہو تو بے ہوش ہو کر گر گئی، ساس نے اپنا دوشالہ اتار کر ڈال دیا۔ لڑکی مخبوط الحواس ہو رہی تھی، دوشالہ پڑتے ہی بے ہوش ہو گئی۔

وہ سب چند ساعت کے لیے موت جیسا سناٹا تھا۔ بیگم نے خود کو سنبھالا ایک نوکرانی کا دوپٹہ لے کر اوڑھا اور بدحواس بہو کو اندر لے جانے کا اشارہ کیا ہی تھا کہ دیوان خانے کے کسی حصے میں بندہ علی شطرنج کھیل رہا تھا، خبر پاتے ہی ننگے پاؤں دوڑ پڑا۔ بیچارا نوکر اور بیوی دونوں کو زنجیر عدل ہلاتے بلکہ قانون ہاتھ میں لیے اس طرح دیکھ کر ادھر سے کہ بندہ علی تک تاریخ خاموش تھی۔

"تو ابھی امی! آپ، آپ کیوں؟ وہ وہ وہ جو کچھ بات تھی مجھ سے کہتیں اور بات کیا تھی؟"

مگر وہاں کوئی صورت حال بتانے والا باقی ہی نہ رہا تھا۔ منشی کمال شیر خاں اس خرگوش کی طرح جس کی پناہ گاہ پر بھوکی شیرنی آ دھمکتی ہے اور لقمہ بنانے کے لیے راہ کی تلاش میں ہوتی ہے، ڈیسک کی بے معنی سی آڑ لیے، سانس روکے، چوکی کے گدے اور گاؤ تکیے کی دیوار میں ضم تھے۔ اور بپھری ہوئی شیرنی جیسی ماں نے بیٹے کے دو ہتڑ مارے اور غصے میں بھر کر ایک مرتبہ دوشالے میں سے لڑکی کو دبکا ہوا ننگا ڈھیر کھول کر سامنے کر کے پھر ڈھانک دیا۔ حالانکہ دو ہتڑ کے ساتھ مکالمے اور جرم کی نوعیت پر جسم میں ایک مرتبہ سنسناہٹ تو ضرور ہوئی، مگر سادق وقار کا تحفظ آڑے آیا اور ضبط کر گیا، تاہم سہم گیا۔

"امی! امی! آپ اندر جائیں!" وہ بیوی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا، "چچی جان اور انہیں... اس بیچاری کو بھی نکال لائیں تو بہتر ہے امی، آپ ہوش، اندر آ جائیں۔"

اور بڑی بیگم پھٹ پڑیں۔ "نہیں جاؤں گی تیرے باپ کے محل میں۔ ابھی قبر پر جا کر پانچ جوتیاں ماری ہوں تیرے باپ نگوڑے کی۔ تیرے یہ نمک حرام درندے! عورت کی یہ بے حرمتی!

Scanned with CamScanner

لڑکی پر، بستی کی بیٹی پر یہ ستم!"

"امی آپ اندر آجائیں!" اور نوکرانیوں کو بیوی کو سمیٹ کر لے جانے کے لیے اشارہ کیا۔

"امی میں سب نمٹ لوں گا۔ آپ اندر تو جائیں۔ یہ بزرگوں کی ناک کٹ رہی ہے کہ پردے سے بیگمیں باہر نکل آئی ہیں کبھی ڈیوڑھی کی چوکھٹ پار نہیں کی اس حویلی کی۔ سادات کو بھی ہنا... چہ چہ، کبھی ایسی کمینی ہوئی تھی۔"

"دور ہو جا میرے سامنے سے موذی! خدا کی مار تجھ پر، چلا جا ابھی! کون تیری ماں ہے اور کس کا تو بیٹا ہے؟ اگر زیادہ بدتمیزی کی تو، بھی عاق کر کے تیرے باپ کے گھر سے نکل جاؤں گی۔ یہ تو بڑا سید بنا پھرتا ہے! سادات کے یہ کرتوت ہیں! یہ وہ تو میں جانتی ہوں، جیسی تو سمجھتی کہ تو کس کمینے کا وہ ہے۔"

"امی، حد ہے... بڑے بیے! یہ ریاست کے معاملات ہیں، آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ آپ نے پردے سے باہر آ کر سادات کی ناک تو کٹا دی، اور کیا چاہتی ہیں؟ غضب خدا کا، کبھی بیگمیں اس طرح باہر آئی ہوں گی۔ جو دن بھی دیکھنا تھا، میرے اللہ! بزرگوں کی قبریں پھٹ جائیں گی، بی بی! ہائے میرے خدا، یہ کیا ہو رہا ہے آج۔"

"اگر زیادہ بولا، تو ابھی ابھی کپڑے اتار کر سب کے سامنے ننگی ہو جاؤں گی اور تیرے باپ کی ناک کٹا دوں گی۔" بندہ علی کانپ کر ہٹ گیا اور بیگم بولتی رہیں: "چل دور، خدا کی مار تجھ پر اور تیرے بزرگ نگوڑوں پہ۔" اور پھر منشی کمال شیر خاں کی اوندھے منہ پڑی ہوئی پوٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولیں "اس موئے نمک حرام پہ اللہ کی مار، علی کی سنوار، اس کو تو مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دوں، بھی تو بھی جی ٹھنڈا نہ ہو، گھنسو کا خصم، جہاں گیا نگوڑے نے تباہی مچائی۔"

یہ کہتے ہوئے لڑکی کو نہایت اہتمام اور احترام کے ساتھ اپنے دوشالے میں پہلے ہی لپیٹے دو نوکرانیوں کے سہارے اٹھوایا، جیسے ہسپتال میں ماہر نرسیں کسی حادثے سے چور زخمی کو فرسٹ ایڈ کے وقت سنبھالتی ہیں، اور حویلی میں لے کر چلی گئیں...... ممکن ہے کہ منشی کمال شیر خاں اور اس کے حواریوں نے بھی دونوں آقاؤں کی اس حرکت ناشائستہ کو جہاں دیدگی اور بیگمی ہونے پر محمول کیا ہو، لیکن دراصل ان دونوں ساس بہو کے اندر سے عام عورت نکل کر سامنے آئی تھی —— اپنے اصلی

Scanned with CamScanner

روپ اور فطری حالت میں اور بڑی بیگم کی اندرونی طاقت نے نکل کر ایک دم سیدھے بیٹے رس کے بہادر دیہاتی کی جان سوالی سب کو بیدار کر دیا اور اندر سے باہر تک نظام بخشی کی بادشاہت کا سان بام دھا دیا۔ بندہ علی چپ رہا، بخشی کمال شیر خان اور حاجی روپوش ہو گئے۔ عورت کی بے پناہ طاقت کھل کر سامنے آ گئی اور عزت سادات چھٹی کوٹ گورنمنٹ کی گرفت میں تھی۔ حویلی میں لے جا کر بیگم نے شہرے کی چھپی ہوئی گوریا کی تالیف قلب کی۔ ورد داغ روں سے جسم پر اپنے حال میں سے ایک ساڑھی نکال کر پہنائی اور دونوں ساس بہو چند نوکرانیوں کو ساتھ لے کر دن دہاڑے ڈیوڑھی میں سے دیوان خانے میں اور دیوان خانے کے پھاٹک میں سے گلی میں نکل آئیں اور چمار کے گھر کی جانب چل پڑیں۔ بستی میں بھونچال سا آ گیا۔ عورتوں کی کرنیں کی کانپ گئی تھیں۔ ادھر سے ادھر تک بھاگڑ پڑ گئی۔ جو مرد راستے میں سامنے آیا، ہٹتے ہٹاتے گرتا پڑتا، بیگم روز روشن میں منہ کھولے یا مرتھی الفت تاریخ حیرت سے منہ کھولے۔ بستی کی جو عورت راہ یا گلی میں سامنے آ گئی، حیرت کے ساتھ سجدے میں گر گئی۔

لڑکی کو اس کے گھر میں بٹھا کر بیگم نے چمار کی چوپال پہنچ کر خود ہی حاضرین کے ساتھ مرد استعداد کے مطابق ڈھنڈورا پٹوانے کے احکامات صادر کیے

1۔ پرکھو تارا اور اس کی عورت گھر واپس آ جائے۔

2۔ پرکھو تارا بیگم کی زمین پر اپنے ہاتھ سے کام کرے۔ اس کی حیثیت مزدور کی سی مرضی کے خلاف نہ لے جایا جائے اور معقول نقد اجرت دی جائے۔ (ص 330 تا 341)

❁

بستی پر طاری جمود اس کی ہاؤس میں پیدا شگاف پر آ تا کی زور آزمائی ہے، جس سے وہاں زمیندار کے گماشتے کی "مرمت ہوئی"۔ اسے کہانی کا راوی "حیثیت کے اعتبار سے مدتوں بعد میں پکی اور بڑی واردات" کہہ رہا ہے۔ دراصل یہ واردات کسی جہت سے مختلف ادھیں کرن ہے جو مدتوں بعد میں چمکی یا روشن ہوا اولین کرن گویا فتیلے کو چنگاری بنی تو زمیندار کا گماشتہ تلملاتا ہوا بھونے کی طرح سلگتا ہوا نکلا۔ اور پٹنے کو طور ملک آ کر دو دو جن آدمیوں نے سا تھ تھے۔ وہیں کرن کی سرکوبی کے لیے منشی کمال شیر خان کی پنچایت میں میدان میں تر آئے سے پہلے تک اقبال کام کرتا رہا

تھی۔" اس کے ہاتھ میں "تھوڑے نہ سخت کوڑا تھا" کیونکہ آج ایک "آدم زاد" اپنے وجود میں جنمی کرب کے طفیل، پست و برہنہ حیواں بننے کا وظیفہ کرنے چلا تھا۔ ملک سمیت حاکم خاں کے بعد منشی کی آمد، پرکھوتا کے عمل کا دوسرا "درمہیب ترین" ردعمل ہے۔

اس مہیب تا مہیب ترین ردعمل نے بستی پر طاری بھادوں کی ماوس کو اس درجہ گہرا دیا کہ سورج کی آنکھ اس منظر کی تاب نہ لا کر جھپک گئی۔۔ لڑکی کو دنیا اندھیر نظر آئی۔ گلی میں گزرتے ہوئے لوٹ لٹ کر جا پڑے، مردوں پر کھڑی یا ادھر سے ادھر گلیوں میں آتی جاتی عورتیں ہسٹریائی انداز میں بدحواس ہو گئیں اور چیخ کر بے ہوش ہو گئیں۔ بوڑھی عورتیں سینہ کوبی اور بین کرتی انھیں گویا اپنے بیٹوں پر بل کھاتے کوڑا برساتے "منشی شیر خاں اور اس کے ایڑھ دو درجن آدم خوروں کے علاوہ آسمان تا زمین سب کی بصیرت پر بستی کی مہیب ترین بھادوں کی اماوس منکشف ہے۔

ایک مہیب ترین ردعمل کا دائرہ پھیلتے پھیلتے، بڑھتے بڑھتے ایک بازی ردعمل کے حامل عمل کی صورت اختیار کر گیا۔ یوں عمل اور ردعمل کے کئی پھیر دکھانے کے بعد بھادوں کی مہیب اماوس میں لپٹی ایک بستی کو اس (آئندہ) عمل پر آمادہ دیکھنا اور دکھانا ہی غالباً ابوالفضل صدیقی کا اصل مدعا ہے۔ آئندہ عمل بھی ردعمل کے چھوٹے بڑے بنتے بگڑتے دائروں سے گزرتا ہوا اختتام کو پہنچے گا۔ ایسے نقطۂ منتہا جس کے بعد کوئی ردعمل کہانی میں درج نہیں۔

42

ایسی ہی شدت سے بستی میں دن کا چولھا تو کسی گھر میں گرم ہی نہ ہوا تھا۔ شام کو فضا میں بھی "مرگھٹ" سی چپکی ہوئی تھی۔ بچوں ہی نے کھانا کھایا۔ دونوں ہی حادثے ایک سے ایک بڑھ کر تماشہ شکن اور بند صبر چل رہے تھے۔ دن دہاڑے نوخیز دیہاتی لڑکی کا ننگا جلوس، بیگمات کا روز روشن میں حویلی کے اندر سے گلی میں درشن دینا۔ ویسے گاؤں کے اندر ابھی کئی بوڑھے زندہ تھے جنھوں نے انھیں بڑی بیگم کو انھیں گلیوں میں سے گوبر کا ٹوکرا اٹھا کر لے جاتے اور بھورے کے قریب اپلے تھاپتے دیکھا تھا، تاہم چالیس برس سے تو کسی نے آنچل کی جھلک بھی نہ دیکھی تھی۔ بہرحال دونوں ہی اقدام اپنی جگہ پر بڑی اہمیت کے حامل تھے، لیکن بیگم کے اس روایت شکن اقدام اور مراعات سے دست

Scanned with CamScanner

تو پڑھو تا بعد رنج ہی اور بستی والوں کی تشفی نہیں ہوئی، اور تم ہاں سے تحریر ہوا کہ آج ہی قصبے کے اندر بخشے وارثی سے اور بیٹھک داروں تک۔ دل تحویل کر باہر دور دور تمام علاقے کے آئے ہوئے دیہاتیوں سے تبادلہ خیال ہو، بات ایک سے دوسرے اور تیسرے یوں تھے تک پہنچی۔ سادات گڑھ کے لوگوں میں تو جیسے دل کی بھڑاس نکل گئی، پھر بھی آج کی رات بستی پر وہ ہوا اور مہیب سناٹا طاری رہا جو کبھی جیسے طاعون کی وبا میں پورے زور کے دوران راتوں کو طاری ہوا کرتا ہے۔ تاہم بستی کے مدرسے کے منشی کمال ہی خاں کی علامت میں کھلم کھلا کوئی تحریک تو در کنار نکتہ بھی اٹھ سکتی تھی، البتہ بستی سے باہر نکالے اور بات کے دریچے جو خبریں اور افواہیں پہنچیں، انھوں نے پینک (pan c) کی وبائی شکل، دیہی اور علاقے کے اندر پہلی مرتبہ اپنی رعیت کا ردعمل ظہور پذیر ہوا۔ اور مختلف چوراہوں سے اندھیری راتوں کی کالی چادریں اوڑھ کر یہ اپنی نوعیت کے بالکل ہی نادر جراثیم یوں کے بل چل چل کر سادات گڑھ کی ہم بستی میں زبانی فسانے اندر داخل ہوئے اور قصبہ کی زخم خوردہ مسلمانوں نے انھیں قبول کیا اور راتوں رات ان کے اندر سرایت ہو کر یہ دلوں میں حلول کر گئے۔ اسی طرح جیسے چوہوں کے بلوں سے نکل کر آبادی کی فضا میں طاعون کے جراثیم پھیلتے ہیں، یہ جراثیم سرعت سے سادات گڑھ کے تمام تر محیط ہو گئے۔ آج چوہدری علی محمد پر سے علاقے کی ناک ہوئی، اس کی جامع دری کو بھی وہاں اپنی بیٹی کی عصمت دری تصور کر کے مل کھانے لگا، لیکن مقابلہ ان سے تھا جب لیڈ تھے جس کی ساری عمر ہل چلاتے ہی گزر رہی تھی۔ مگر جب تک منشی جی کے تبصرے نے نوعیت کے متعلق جس کا شستہ بجائے کراں ساری بغاوت کے پروں چڑھنے کی طاقت اس تک پہنچی ہیں، چماروں کی بیچارگی نے انگلی شے بات کا ان اتفاق سے تعین بھی کر دیا اور عام برادری میں کھلم کھلا اعلان بھی کر دیا اور چماروں کے حال پر کسی اچھوت برادریوں نے دست تعاون بڑھایا اور یہ بعث بھارت سماراتی اور دیہاتی روایت میں پہلا تجربہ تھا (349تا351)

بستی سے باہر نکالے والے ہاتھ کے برابر کی خیمان کا تیادی میدان پڑا تھا... شودروں کا یہ عظیم تاریخی جنگی میدان پہ ہوا۔ یعنی سے اندر یہ صفحے خود ہی شودروں کا یہ اتحاد جس بھی بھاری تعداد بھی کی ہو لی چاہیے، لیکن اس وقت بھی ہمیشہ کی طرح ان عظیم اجتماع کی جتنی ہولی حد تک نمایاں شخصیتیں در صورتیں، جلی جو بیٹھے ہے سر برآوردہ تھا علاقے کے چند پنڈت، برہمن بھی

تھے ...(ص353)

یہ پلیٹ فارم اور اسے اب تک انھیں کی تو میراث تھا، جس کی سند مولوی کاکو تھا، لیکن آج یہ بچھا ہوا دری، منبر، متحیر اور پھر خود بزرگ تھے۔ مجمعے کے تیوروں کا اندازہ کر کے ان بزرگوں نے چہروں کو اور بھی لٹکا لیا اور بعض حضرات نے ماحول کی گندگی اور مجمعے کے مشتعل ہونے کا احساس کر کے کانوں پر جوتے بھی چڑھا لیے۔ ہر ایک پنڈت (برہمن) نے اپنے اپنے حلقۂ جسمانی کو تھام لینا چاہا اور شودروں کو موٹے منتروں اور ویدوں کے حوالوں سے ان کا مقام سمجھایا اور "راج پرجا" کے تعلقات بتائے اور اس کے خلاف عمل اور قول تو درکنار، دل کے اندر خیال بھی لانے کی اس جنم اور آنے والے اور نہ معلوم کتنے جنموں کی پاداش سمجھائی اور ایک دفعہ تو مجمعے کے اندر متزلزل ہونے جیسے آثار رونما ہوئے ہی تھے اور ہر شودر جیسے کچھ سوچ میں پڑ کر ایک دوسرے کا منہ تاکنے لگا تھا، کہ ٹھیک اسی وقت مولوی زادوں کا پورا گروہ ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے سیدھا ادھر کو آ گیا۔ فرضوں سے قبل والی سنتوں کے بعد جماعت کھڑی ہونے سے قبل آج خلاف معمول پیش امام نے ملکہ وکٹوریہ کے دور سے ملا کا پیٹنٹ وعظ یعنی حسن کا حاصل ... جو ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں مخصوص تو رہ خوروں نے گڑھا تھا اور خدا، رسول اور حاکم وقت کی اطاعت کرنے سے قرآنی حکم کی تفسیر، بندہ علی، بخشی کمال شیر خاں اور کوزیا مہاجن پر منطبق کی، اور بستی کی تاریخ میں مولوی جی کی آواز پہلی مرتبہ محراب و منبر سے ہٹ کر گونج گئی اور نماز سے فارغ ہو کر جماعت کی جماعت مسجد سے سیدھی اس مجمعے میں پہنچ گئی۔ مولوی زادے بستی کے ایک اہم عنصر تھے اور کل سال بھر پہلے تک علاقے کے سب سے بڑے رقبے کے موروثی قبیل دار کاشتکار تھے۔ شودروں میں ان کی آمد سے نئی روح پھونک گئی اور اب اس بساط پر ہر شخص کا مہرہ وزنی تھا۔ پنڈت پروہتوں کو اس کی آمد ایسی محسوس ہوئی جیسے کسی راجپوت کو مخبر کے یہاں تیج تہوار کا بھوجن کرتے ہوئے پکڑ لیا جائے، یا پانڈوؤں میں بچی ہوئی سیاہ مونچھیں ذبح کی جائیں۔ مولوی زادے آج اپنی عقل سے مولوی جی کے فتوے کا رد کر کے آئے تھے۔ سب زرعی زمین کا وہی اور قصبہ تھا۔ چمارٹولی کے معاملے میں فریادی تھے۔ کوزیا مہاجن کے ... اور خود مولوی زادے زمین کے ناشی تھے اور سب کے انٹرسٹ اس وقت ایک مرکز پر جمع ... ایک دورے میں پڑے ہوئے تھے۔ پشتینی پروہتوں اور پنچ وقتہ کے امام کی تلقین بخشی کمال شیر

خاں کا حکم اور ہندو ملی کی آبادی اور پشتینی قوت، ہر طاقت بہت سے بے زبانوں اور کمزوروں اور ہر آوار صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ ادھر بڑی بیگم کی علالت نرود مراعات کا بھی بہانہ تھا۔ سب کے سب دیکھتے ہی رہ گئے، ان شودروں کی پنچایتوں اور بے زمین کھیت مزدوروں کی برادریوں نے طے کر دیا کہ کوئی ان مہاجن کی تب وتن فصل پر کوئی کام کرنے نہیں جائے گا، چاہے بھوکوں مر جائے۔ اور جو کوئی جائے گا اس کو برادری سے خارج کر کے حقہ پانی بند کر دیا جائے گا۔ (ص 354 تا 356)

❁

کہانی ''تیسرا'' کا اختتامی باب کھولنے سے قبل (کئی لحاظ سے) مناسب محسوس ہوتا ہے کہ کہانی ''دھوڑ'' کے اس حصے کا مطالعہ کر لیا جائے جس میں (چتر تونے کی چپے چپے زمین پر اختیار حاصل کرنے کے بعد) سنگھ بابو نامی نوجوان جاگیردار کی جملہ توجہ، اب سیوتی نامی لڑکی پر، جتنی زمین کے بعد ان پر قبضہ و اختیار کے لیے بروئے کار آ رہی ہیں۔

کہانی کے ایک جزو (قسط نمبر:4) میں سیوتی کے حسن و جمال سے متعلق چودھری کے تاثرات کے بعد کہانی کے در پردہ راوی ابوالفضل نے بتایا ہے کہ سنگھ بابو پر چودھری اور دیگر حضرات کی باتوں کا اثر یہ ہوا کہ اس نے سیوتی کو پہلی بار ایک مردانہ نظر سے دیکھا اور دیکھ کر دل جان کی بے کلی میں مبتلا ہو گیا جس کی دارو اس کے نزدیک صرف سیوتی تھی (ص 49 تا 56)

گاؤں کا مکھیا سنگھ عرف چتریا ''گاؤں کی سیاست میں اس کا آدھری مشیر، اہم معاملات میں اس کا دست راست اور بے تنخواہ کا نکلی جلیس آفیسر اور اس کا بچپن کا دوست '' (صفحہ 57، ہے جو دو ہفتے سے رات کے اندھیرے میں اس کے پاس آتا ہے۔

سنگھ بابو نے دل و جان کی بے کلی میں ایک رات اور دو دن کاٹے۔ دوسری رات کا پہلا پہر بیتتے بیتتے، چتریا ملاقات کے لیے ان کے پاس خوابگاہ میں آیا۔ اس سے سنگھ بابو نے بڑے نمایاں اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے ان کی مزاج پرسی کی۔ حالانکہ

43

وہ تو کل ہی سے خود بیتی پریشانی کا سبب تاڑ گئے تھے اس کا منتظر تھا کہ وہ خود سے

Scanned with CamScanner

لفظ اب بھی زبان کے پاس نہ تھے اور چڑیا کی مجسم سوال جیسی خاموشی نے ان کے دل میں نشتر کی نوک سی چبھو دی، اور جیسے وہ ایک ہی ترنگ میں لگا کر اٹھ کر بیٹھ گیا اور فرد کی دبیز تہوں کے ساتھ اپنے اوپر کی بہت سی تہیں اتار کر پھینک دیں اور وہ یک دم اٹھارہ بیس سال پیچھے جا پڑے، جیسے وہ کسی چڑیا کا گھونسلا بھانپ کر اور سب ساتھیوں سے چھپ کر اس پر چھاپہ مارنے کی صلاح کیا کرتے تھے اور ایک کو دوسرا انڈے یا بچے چرانے کے لیے چڑھنے کو اپنی پیٹھ اور کندھے پیش کیا کرتا تھا اور بالعموم چڑیا ہی کے کندھوں پر چڑھ کر سنگھ بابو گھونسلے میں ہاتھ ڈالا کرتے تھے۔

اور چڑیا سے سنگھ بابو نے اپنے دکھ درد کی کہی اور نہایت صاف صاف کہی، اور چڑیا تو بھونچکا سی رہ گئی۔ آج سنگھ بابو کہاں سے بولے! اور وہ ان کا منہ تکتا رہا اور وہ کہتے رہے اور یہ سنتا رہا۔ پچھلی تاریخ کے عزیز ترین دنوں کے بچھڑنے کی سرسراہٹ اور پھر سناٹے میں آ گیا۔ بمشکل اس نے اس خواب جیسے ماحول کو پایا جس کی تحریک اس کے اندر سنگھ بابو کے پہلے جملوں پر ہوئی تھی، اور اس مقام پر سنگھ بابو کو اتنی مضبوطی کے ساتھ جما ہوا پا کر جیسے پہلے تو اس کو سانپ سونگھ گیا اور پھر خود اس کو اپنے وجود میں زلزلہ سا محسوس ہوا، اور وہ اپنے دوست [illegible] اور یہی کے اپنے دل ہی کا تو راز تھا جو آج سنگھ بابو کے منہ سے نکل نکل کر اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح پڑ رہا تھا۔ اس کا اپنا راز [illegible] اور جیسے [illegible] اور ابھی تک تو اس کو اپنے روتے ہیں دریائے برہم پتر کے چھوٹ کی طرح دھارا سی نظر آتا ہے اور اب تو اس کے پار ہمالیہ پہاڑ نظر آ گیا، اٹل اور جامد۔ (ص 57 تا 58)

[اور چڑیا کو اندازہ تھا کہ [illegible] خود دھار [illegible] اور اس کی تمام تر عزت اور مال فرحت سے اوپر دھار سے الاؤ اور پریشانیوں کا ترجیح دیتی تھی۔ (ص 59)

[سنگھ بابو کے دل کی بات سن کر چڑیا نے سوچیں] دیہاتی مشرقی اخلاقیات اور روایات کا سبق یاد آیا اور پھر خاص طور پر ان کے جد امجد کا رعایت کے ساتھ کہ حسن میں سلوک اور رکھ رکھاؤ اور مال، [illegible] بیٹی کا رشتہ یاد آیا۔ لیکن سنگھ بابو تو آج بھی سیوتی اور کچھ یاد ہی نہ تھا اور ایک چیز تھی کہ جال میں پھانس دینے والی جماعت کا پیش امام چڑیا یا دوست جتنی کرنے کی ہمت نہ کر سکتا تھا اور نہ سنگھ بابو ہی اس مسئلے میں [illegible] برداشت کر سکتے تھے۔ بالآخر پہلو نے احتیاط کے ساتھ

ہلانے چلانے کے بعد اسے قہر درویش بر جان درویش، اور سب اہم مسئلوں کی طرح اس مسئلے میں بھی سنگھ بابو سے ان کی مرضی کے مطابق ہاں میں ہاں ملانی پڑی، اور "سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی" کا استادانہ مدد کر کے ہی اٹھنا پڑا۔ (ص 60)

■

سیوتی کے لیے سنگھ بابو اور چتریا کی چاہت اور وصدرا اور سیوتی کی ممکنہ شادی کے ذکر سے ابوالفضل نے کہانی میں مطلوبہ پیچیدگی پیدا کر دی ہے جو قاری کو تجسس میں مبتلا کر رہی ہے۔ یہاں تک آتے آتے قاری سمجھ لیتا ہے کہ جس طرح کہانی "پھیر" میں پرکھوتا کی بیٹی تصادم میں شدت کی وجہ بنی تھی، عین اسی طرح ابوالفضل اس کہانی کا سماجی تصادم واضح کرنے کے لیے سیوتی کو وسیلہ بناتے ہیں۔ "پھیر" میں زمین پر قبضہ کرنے کے لیے پیدا شدہ تصادم، پرکھوتا کی بیٹی کے سبب شدید ہو کر دو عورتوں یعنی رمکلیا اور چاندنی با... بالخصوص رمکلیا کے باعث شدید تر صورت اختیار کرتا ہوا اس انتہا تک پہنچ گیا جس میں بے زبان کمزوروں نے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔ قاری اندازہ کر لیتا ہے کہ کہانی "گل زمین کی تلاش میں" کی طرح ... میں بھی قتل و خون اور عمل سے اسی طبقے کی عورتوں کے وسیلے سے شدید تا شدید ترین صورت اختیار کرتے ہیں جس سے کہانی کا انجام متعلق دکھایا گیا تھا۔ گویا ابوالفضل اپنے قاری کو محسوس کرانا چاہتے ہیں کہ معاملات زمین پر عورتوں کا بھی تناؤ اور دو بیان اثر قبول کرتے ہیں جتنا اور جیسا کہ اعلیٰ ذات ... کی عورتوں کا۔

کہانی "وصدرا" میں پیدا کی ہوئی پیچیدگی کو مزید پیچیدہ بناتے ہوئے ابوالفضل نے بتایا ہے کہ سنگھ بابو نے دل اچھات کی تسکین کے لیے سیوتی کے ماں باپ کے سامنے ... رقم کی پیشکش کی جس سے ان کی آنکھیں کچھ ذرا خیرہ ہوئیں لیکن سیوتی سمجھ گئی، بالکل ویسے ہی جیسے غیرت و حمیت کی پاسداری اور اپنے انسانی وقار سے آگاہ، نام نہاد نچلے طبقے میں کوئی باشعور لڑکی عفت و عصمت کے دام لگنے پر سمجھ سکتی ہے۔

کچھ بعید نہیں کہ ابوالفضل صدیقی سیوتی کے اس غیرت مندانہ عمل میں ... فہم و ظفر کی وہ خوبی بھی شامل کرنا چاہتے ہوں جو اسے قصبے یا دوستی ... میں نسوانیت اور سماجی رکھ رکھاؤ میں تربیت کی درسگاہ سے حاصل ہوئی ہیں۔ سنگھ بابو نے وصدرا ... میں ... سیوتی

کے حیلے سے باہر آ جائے مگر دھارا کی آنکھ ذرا بھی خیرہ نہ ہوئی۔

" سنگھ بابو کو اس سودے میں، اپنے لمبے چوڑے رقبے مٹی معلوم ہونے لگے جیسے ان کے فارم کی زمین کے گاؤں کی سب وسعتیں سمٹ سمٹا کر چماری کے ظرف کی تنگنائیوں میں سما گئیں۔ مگر زمین کی ملکیت کا شعور، اور وہ بھی صدیوں پرانا دماغ میں نمرودیت اور فرعونیت پیدا کر کے خدا کی تسخیر کے جہلِ مرکب میں گرفتار کرتا ہے۔" (ص 82 تا 83)

یہ چوڑے رقبے مٹی ہو گئے تو سنگھ بابو اور چتریا نے بچے لڑکپن کی مانند ایک منصوبہ بنایا"۔ جیسے وہ کسی چڑیا کا گھونسلہ بھانپ کر اور سب ساتھیوں سے چھپ کر اس پہ چھاپہ مارنے کی صلاح کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے... بڑے بچے چڑانے کے لیے چڑھنے کو اپنی پیٹھ اور کندھے پیش کیا کرتا تھا اور بالعموم چتریا ہی کے کندھوں پر چڑھ کر سنگھ بابو گھونسلے میں ہاتھ ڈالا کرتے تھے۔"
(ص 58)

منصوبہ تھا کہ چتر سنگھ اپنے آدمیوں کی مدد سے سیوتی کو اغوا کرے اور ان کے چودھری کی جاگیر میں دودھ دے جائے، سنگھ بابو گھی گاڑی سے وہاں پہنچ جائے گا۔ اس منصوبے کے جملہ مراحل کی در پردہ تکمیل کے لیے تقریباً چار ہفتے کا وقت درکار تھا، مگر سنگھ بابو کے معمر و پیر خواہ مقدم کو منصوبے کی بھنک پڑ گئی۔ اس نے سیوتی کے باپ کو بہت ڈرایا دھمکایا۔ اس نے مقدم سے وعدہ کیا کہ "کل نہیں تو کل صبح تڑکے وہ اسے [سیوتی کو] چار چھ مہینے کے لیے ننھیال بھیج دے گا اور بیچ راہ میں سے اس کا بیاہ [دھارا کے ساتھ] ہو جائے گا" (ص 77) لیکن "چتریا نے دوپہر تک سن گن پا لی کہ آج ہی رات میں سیوتی کے ماں باپ اسے ننھیال بھجوانے کے بہانے دھارا کے ساتھ کہیں غائب کرا دیں گے" (ص 81) یہ خبر لے کر وہ فوراً سنگھ بابو کے پاس پہنچا۔

44

اور آج انھیں مشورہ کرتے تیسرا پہر ہو گیا۔ شام بڑھ رہی تھی، اور جاڑوں کی شام سرپٹ دوڑتی ہے اور معاملہ "ابھی ورنہ کبھی نہیں" کے وقت پر آ گیا تھا۔ "اگر ابھی نہیں پکڑی تو پھر تا زیست سیوتیا کا سایہ بھی اس گاؤں میں دکھائی نہ دے گا" یقینی امر تھا۔ سنگھ بابو کبھی وشٹے ور ٹھنڈے ٹھار کر

تھے، ورنہ عام طور پر سیدھے اور شریف النفس، اور پھر کالج اور کالج بھی زراعتی کالج کی تعلیم اور اس کے بعد زراعتی اور کاروباری زندگی نے ان پر اور بھی زیادہ شکر پاشی اور برف باری کر دی تھی، اور کالج کے بعد پانچ سال پریکٹیکل فارمنگ کی زندگی نے انھیں جیسے کچھ اچھوت سے بے سایہ نا دیا تھا، مگر تھے ٹھاکر اور یہاں پر بھی اپنے پیٹ کی آنچ میں اپنی اصل پر پلٹے اور غصے چوہان والا حکم دیا: "سیوتی کو پکڑ لو!" اور یوں تو ایک آدھ مدد بھی چلا جاتا، مگر یکجوتی کن پڑے ہوئے تھے، اللہ داد کے بارہ تیرہ جمع ہو کر لٹھے کرتے اور بوڑھے تھیت (فارم کے مزدوروں کی نگرانی کرنے والا میٹ) کی قیادت میں گھر کے اندر جا دھمکے۔ چمار اور چڑیاں خوف کے مارے آواز بھی نہ نکال سکے اور تھیتے کی طرح سیوتی پکڑلی اور دن دہاڑے بھیڑ بکری کی طرح گھسیٹ کر لے چلے، اور جب ان بارتھوں کا رسالہ تیج کر کے چند دن گلی کے موڑ پر پہنچے تو یک دم ایک سنگین سی دیوار سامنے پائی اور انھیں معلوم ہوا کہ ذات پات ہی نہیں، صنعت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ چوری اور سینہ زوری 'دصرا' کی گرد میں تالوں کے بیس پچیس چھتے مغلوں کا غول اور گیدڑوں کے غول کو یکتا کار تھیت نے مدمقابل پا کر جیسے بڑد راست سنگھ بابو کے حلق سے اکتساب کی ہوئی ایک 'غوں' اپنی کھچڑی مونچھوں کے گچھے میں سے نکالی، مگر گیدڑوں کا غول تو اس شیر کی بھبکی میں نہ آیا اور دوسری "دھوف" جیسے ڈے کھڑ کڑی کی گل مونچھوں میں سے نکلی، مگر یہ ہاتھی کی طرح جھنجھنا کر جہاں دیدہ تھیت کے ہوشوں پر رہ گئی اور سامنے سنگین دیوار حرکت میں آئی۔ جب دونوں جانب سے لاٹھیوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے تو بوڑھا تھیت باپ کی سی شکل بنا کر جیسے زمیندار اور کھیت مزدور کے درمیان میں آ گیا اور اپنی مونچھوں پر مایوسانہ انداز میں نیچے کو ہاتھ پھیر کر، اپنی آنکھیں نیچے کیے، ہزار سالہ سمجھوتے کی تجدید کرنے لگا۔ ادھر کی طرف سے چڑیا بھی برآمد ہو پڑی اور اپنا کھیپ کا عصا تھامے درمیان میں آ گئی اور نہایت بے جا طلب کیے، اور چشتی نخوت دیتے کے بعد سنگھ بابو کے کام کو چھوڑ دینے کے متعلق قانونی مطالبہ سا کرنے لگا، اور پھر اس سینہ زوری پر بحیثیت کھیا انھیں قائل معقول کرنے لگا، اور چڑیا کے جواب میں چمار کے اندر سے جیسے شیر بپھر پڑا اور پہلا لٹھ چڑیا ہی پر پڑا اور پھر بیس کے بیسوں لٹھ چڑیا پر جمع ہو گئے۔ چٹ چٹ چٹاچٹ پتھر کی چٹان سونے کے بند سے آ ٹکرائی اور چڑیا کا عملہ حرکت تو چہان کے پیچھے ہی رہے میں ٹوٹ گیا۔ اور اب لٹھ چلا اور خوب چلا۔ اور اسانی بات یہ ہے کہ ٹھاکر کے ... نوکروں نے ایک

پکڑ خوب ذٹ کر لی، مگر اُجرت پر قتل تو کل بھی جانے مقتول مشکل سے ملا کرتا ہے۔ اور دھارا میں تھا اور سنگھ بابو جیسی بھی نہیں... یک۔ انجام وہی ہوا جو بیس کے مقابلے پر ایک کا ہونا چاہیے۔ میدان دھار کے ہاتھ رہا مگر خان سنگھ بابو کے علاوہ زخمی ہو کر ورچتر یا کا انجام دیکھ کر فرار تو ضرور ہو گئے تھے لیکن انجام اندیش تہنیت کے اشارے پر پہلا لٹھ پڑتے ہی، وہ دونوں جو سیوتی کو پکڑے ہوئے تھے، پلٹ کر دوسری گلی سے سیوتی کو گھسیٹتے لیے چلے گئے تھے۔ اور اب گلی میں بجز چتریا کی سسکتی نعش کے وہ تنہا تھا۔ اور اُسے مردہ چھوڑ کر دھار اب عالی پر چڑھ دوڑ۔ اور جوں ہی مویشی خانے کے پھاٹک میں دھار کا رسالہ داخل ہوا، بھونچال سا آ گیا۔ (ص 83 تا 85)

⊛

اس "بھونچال" کے طویل رضمی ثرات کا منظر نامہ پیش کرنے سے پہلے، ابوالفضل کا قلم بالکل وہی قلم بن گیا ہے جس نے آموں کے مقابلے میں گلاب خاص کی فتح کے باعث بڑے بڑے باغ داروں اور جاگیرداروں کی ذہنی حالت کو ایک سرریلسٹک منظر (اقتباس: 8) میں ڈھالا تھا۔ "راج ہٹ" کے مقابل سیٹھ سپر "حق ہٹ" (ص 84) پیش نظر کے اندرون میں جو تبدیلیاں دیکھنے کی آرزو مند ہے، ان کا سرریلسٹک ورژن ابوالفضل نے یوں ملفوظ کیا ہے:

> تاریخ کے ورق دھندلے ہوتے ہوتے معدوم ہو گئے، جغرافیہ قلابازیاں کھانے لگا۔ شودر کے پانچ ہزار رسالہ ٹھنڈے خون کے پانچوں عنصر دوبارہ جوش میں آ کر ابل پڑے، ... سب چھانٹ کر گئے اور برہم پتر کے تمام چڑھاوے تر گئے، بجز ہمالہ کا جو رہا تھا [illegible] اور یوی کی چوٹی پر چڑھا... (ص 86)

اس تلاطم خیز شور کے بعد شروع ہوتا ہے اس دھونک منظر کا پہلا جزو، جو فرد فرد، قدم بہ قدم، اپنی عصمت و حمیت کے گھنڈر میں نصف دھند، ساعت سے بے بہرہ جاری تاریخ کے مقابل اپنے وجود کا حرف معنی اب نئے ورق پہ ثبت کرنا چاہتا ہے:

45

اور اب دھار کے سر پھرے نوجوان چبوترے کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے اور ایک

کیپٹن سنگھ بابو کے صحن میں آج تھا اپنا ہلی و دانش متفرین۔ قتل لیے تنے کھڑے تھے، اور انھوں نے سب سے دیر و دن سیڑھی پر دھرا کا تنا ہوا سینہ اور ہتھیلی پر دھرا سر دیکھا اور آج اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ تاریخ حق کے منفی پہلو سے دو چار ہوئے۔ انھیں تو ابتدائے آفرینش سے بہت سی زندگیاں [illegible] کرتے ہیں، زندگی کو خرید کرنے کے سب آداب سکھائے گئے تھے۔ اور آج تو بہت سی لاغر زندگیاں اپنی قربانی دینے بیٹھی آئی تھیں، اور سنگھ بابو کے اندر عشق کا سودا، دولت کا نشہ، اور حکومت کا زور سب جو حفاظت خود اختیاری میں قلب ماہیت ہو کر ایک پوائنٹ پر جمع ہو گیا تھا۔ مگر آج ان کی بندوق انہی کے کندھے پر تھی اور اس کی گرپ (grip) عقل کے مضبوط پنجے میں اور سے بہت سے سینے چاندماری کے لیے تختے کی طرح سامنے تھے، اور اب تو ان میں کا آخری آدمی بھی بلند ترین سیڑھی پر پہنچ چکا تھا، اور پوری دیوار سامنے تھی، اور سنگھ بابو نے آسمان کی جانب بال بکھرا کے [illegible] جھکانے سے پہلے فیر کیا مگر ان کے جیسے آواز ان کا ن میں گئی اور پہلے چند لوگوں بڑھتی ہوئی [illegible] کے ساتھ انھوں نے دوسرا فیر ان کے سروں سے گزر کر [illegible] کرتے ہوا [illegible] جب چند لوگوں کا جھنڈ اندر، جھنڈ اپنے اوپر کی جانب [illegible] ایک اور [illegible] [illegible] ان کی کنپٹیوں پر سے موت کا طمانچہ سنسنایا۔ مگر جیسے آج [illegible] [illegible] [illegible] اور دل کی جھنجھناہٹ صدا بصحرا ہوئی، وہ اندر تھے بھرے ہوئے [illegible] [illegible] بکھرے ہوئے تھے باقی اور پیچھے نے [illegible] کی تائید سے بے یار و مددگار ایک [illegible] کاٹنے آ گئے کو اور تیسرے فیر کی Same Fight کے بعد ان کی راہ کی سیڑھیاں میں جو [illegible] [illegible] کا [illegible] ہی تھا، ور ان کی ایک دیوار سے [illegible] [illegible] تک تھی۔

سنگھ بابو کا ہاتھ شل ہو گیا اور عقل کا پنجہ شدید تر۔ دو کاروں کی قطار [illegible] [illegible] سے [illegible] ہوئی مرغی دودھ دینی گائے کے بعد سنگھ بابو پہلی مرتبہ کی قطار میں نظر آئی۔ [illegible] [illegible] انھوں نے ادھر ادھر نظر کی مگر وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ شاید اپنے [illegible] باتیں کی [illegible] سے [illegible] شاہ شطرنج پیٹا ہوا الگ گھر پیچھے کو چلا — اور [illegible] نے پچھوڑے والا [illegible] [illegible] [illegible] تھامے فرار ہو گئے سیوق، حکومت، دولت، [illegible] چھوڑ کر صرف جان لے کر اور [illegible] بعد شکست [illegible] کر کے جنگل میں پناہ لی جس میں سے [illegible] [illegible] کرتے آئے تھے اور [illegible] [illegible]

Scanned with CamScanner

کی سادہ کتاب کے اوّل ورق پر پہلے نئے باب کا عنوان ڈالا اور ''دھارا'' لکھا۔ (ص 86 تا 87)

*

کہانی کا نواں باب پارہ ہوتے ہوتے بنیادی تصادم کھل کر سامنے آ گیا اور قاری نے جان لیا کہ ابوالفضل صدیقی بلاشبہ اس کہانی میں بھی تصادم کا (اوریس) سبب ایک عورت کو بنا رہے ہیں، اور انھوں نے اس عورت کو ایک ایسے مرد سے قریب دکھا کر اپنی فکری صلابت اور فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے جو ماضی قریب میں منتشر کمزوروں کے سبب سے ایک اجتماعی قوت تشکیل دینے میں آگے آگے رہ چکا ہے۔

سمیرڈ کے گذشتہ دو اجزا (اقتباس: 44، 45) میں دھارا اور اس کے ساتھیوں کو ٹھاکر کے نوکروں کے مقابل ''سنگین سی دیوار'' اور پھر ''ہائی وولٹیج میگزین رائفل'' کے سامنے ''روبوٹ کی طرح سینہ سپر دکھا کر مصنف نے قاری کو محسوس کرایا ہے کہ دھارا اور اس کے ساتھی اس وقت بھلے ہی ایک عورت کے تحفظ اور پھر بازیابی کے لیے سنگ و آہن کے پیکر بن گئے ہوں، مگر ان کی یہ قلب ماہیت دراصل اپنی ہی اجتماعی عصمت و حمیت کے تحفظ اور بحالی کے لیے ہے جس کے وجود اور معنویت کی روشنی دھارا نے گذشتہ کئی برسوں میں کرن کرن توڑ کر ان کے باطن میں مجتمع کی ہے۔ سیوتی تو اس وقت ایک علامت ہے۔

کہانی کا دسواں باب شمبھو کو بے بس و مجبور بنانے والی بھادوں کی اس اماوس کے چاند تک انکشاف کا قصہ ہے جو اس نے گذشتہ برسوں میں ٹکڑا ٹکڑا، پہر پہر اپنے کاشتکاروں اور دراصل اپنے وجود کے اطراف و جوانب میں بھی طاری کی تھی۔ آج ان تمام ٹکڑوں کو یک لخت جوڑ دینے والا اور دیرینہ طویل ترین ٹکڑا سیوتی کو پکڑ لانے کے عمل کی صورت ظہور میں آ گیا ہے اور یہ اسی طور ظہور میں آ تا رہا ہے تو وہ ''گنے کے ایک بڑے جھنڈ میں سہمے ہوئے خرگوش کی طرح'' دبکا ہوا ہے۔

اس باب میں مصنف نے ان تمام اقدامات کی جانب اشارے کیے ہیں جو کہانی میں وقتاً فوقتاً تفصیل بیان ہو چکے ہیں، مگر ان کے ردعمل صفحۂ تحریر میں نہیں آئے تھے۔ جس طرح کہانی ''چھیر'' میں منشی کمال شیر خاں کے جملہ اقدامات کی ذمہ داری نگری پوری آبادی پر پڑ رہی تھی مگر ردعمل خاموش تھے بلکہ آبادی کے اجتماعی وجود میں قطرہ قطرہ مواد کی صورت جمع و پرورش ہو کر اپنے ظہور کے لیے ایک انگریز ڈی ایس پی صاحب اور بابو صاحب کی پیش قدمی اور پر کھوتا کی بیٹی کی بات کے منتظر تھے

Scanned with CamScanner

اسی طرح کہانی ''دھار'' میں سنگھ بابو کے اقدامات کے ردعمل پیر گوپے کے اجتماعی وجود میں قطرہ قطرہ جمع و پرورش ہو کر اپنے ظہور کے لیے سیوتی کے اغوا اور دھار کی پیش قدمی کے منتظر تھے۔

یہ الفاظ دیگر ان دونوں کہانیوں میں، زمین کو بہر طور گرفت میں رکھنے والوں کے مرحلہ وار اقدامات کی زد پوری پوری بستی پر پڑتی ہے اور ان کے ردعمل بھی بستی کے اجتماعی وجود میں شدید ترین کیفیت تک مرحلہ وار ہی پہنچتے ہیں اور جب اقدامات اور ردعمل (ہمیشہ سے) نامعلوم نقطۂ اختتام تک پہنچ گئے تو مزدور کے زبانوں کا [illegible] کہ دریا جبروت سنگھ بابو کا سے چارگی بھر افراد وجود میں آ گئے۔ سب تو جانتے ہیں جو ہر بار نظر بھی نہیں آتے مگر کہانیوں میں بالعموم دکھائے جاتے ہیں۔

46

اور جن لوگوں نے کبھی خرگوش کو خونخوار کتے یا خونخوار جبڑے سے کھولے پاس سے گزرتے دیکھا ہے، ان کے کھیتوں میں اچھل اچھل کر غوں غوں کر کے خوش تماشے دکھلاتے پھرتے تھے، اور گویا ہر سال میں ادھر سامنے والا تھا اور سنگھ بابو اپنے فارم کے سب سے اچھے قطعے کے بیچوں بیچ گھنے کیکر کے جھنڈ میں [illegible] خرگوش کی طرح دبکے ہوئے تھے، جہاں اٹھتے بیٹھتے آدمی کا بھی دن دہاڑے دم گھٹتا۔ اور جب کوئی جوکھم یا ہوا ہو، جیسے سوکھ کر تلاش کرتا ہوا اس کے پاس بیچ [illegible] ادھر سے گزرتا تو وہ بیچ [illegible] خرگوش کی طرح جھنڈ میں گم ہو کر رہ جاتے، اور جب تک وہ اس کی زد سے باہر نہ ہو جاتے سب چڑھائے [illegible] مرنے پر تیار رہتے [illegible] کی طرح جو [illegible] لٹکا رہتی ہے اور دو گولی [illegible] یا اب نہ معلوم کتنے، شاید [illegible] گاؤں [illegible] تک [illegible] شاید یہ نوبت نہ آتی۔ [illegible] جانتے تھے کہ گاؤں کا [illegible] بہت سے [illegible] کے جنگل کے [illegible] میں جتا ہے اور سب کے سب میکینیکل [illegible] اور [illegible] کے چکر میں [illegible] یہ سب [illegible] بھی پیرل طرف [illegible] اور قربان ہو گیا۔ اور انھوں نے [illegible] بیٹھے بیٹھے اندازہ کر لیا کہ اس کے مکان کے اندر سے سیوتی کے [illegible] قانون دھار کے ہاتھ میں ہے، اور اگر ہاتھ آ جائے تو ان کی جان بھی [illegible]

ہاتھ میں ہوتے کے!

اور انھوں نے غور کیا کہ اب ان کے مکان پر شور ذرا کم ہے اور بستی میں، اور سب سے زیادہ، اور انھوں نے ہر شور کو خوب پہچانا اور وہیں دبکے دبکے سمت کا اندازہ لگا کر سمجھتے رہے کہ کون کون سے نوکر کا گھر لوٹا جا رہا ہے، اور پھر انھیں چتریا کے گھر کی جانب سے لوٹ مار کی آوازیں سنائی دیں، اور وہ سب کچھ اس تاریک کنج میں بیٹھے اس طرح سمجھ رہے تھے جیسے آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اور لطف یہ کہ ادھر جنگل میں ان کی بھی تلاش بدستور جاری تھی۔ گھڑی بھر کے لیے ایک ذرا سکون سا ہوا اور پھر ایک مرتبہ جیسے بستی کے باہر چاروں طرف سے "دھیاں" سننا پڑیں۔ وہ شکاری تھے اور شکاری کے خواص خمسہ یوں بھی ذکی الحس ہوتے ہیں اور اس وقت رونگٹا رونگٹا کان بنا ہوا تھا اور نہایت دقت نظر کے ساتھ ہر آواز کا تجزیہ کر رہا تھا۔ اور پھر بڑے زور سے فارم کی اینٹوں کا پورا قبہ تھرتھرا اٹھا اور وہ سمجھ گئے کہ اردگرد کے گاؤں کے کسان مزدور یلغار کر رہے ہیں اور بستی کے باہر اور اندر بڑے زور سے "کتھے کا جنگل نہیں کٹے گا" کا نعرہ گونجا، اور وہ سمجھ گئے کہ کتھے کے جنگل کی بار دوم سیوتی بھینٹ بن گئی۔ اور یہاں تو بنی جان کے لالے تھے اور کتھے کا جنگل تو نہیں ان کے نعروں پر یاد آیا۔ اور اب نہیں یوں تھرتھرا رہی تھیں" اور وہ خوب دبک کر بیٹھ گئے۔ "خیریت نہیں۔" اور پھر انھوں نے اپنے فارم کی حدود پر نعرے سنے: "اپنی زمین چھین لیں گے۔" اور انھیں پتا چلا کہ پانچ چھ سال کی سلی ہوئی فارم کی بار دوم بھی سیوتی کے فلیتے نے تھرتھرا دی۔ اور پھر انھوں نے اپنے فارم کی حد پر اپنے فارم کا تار کا ڈنکا ٹوٹنے کی کھٹ پٹ سنی۔ اور اب رات ہو گئی تھی اور وہ ایک ایک نئے اور پرانے رنجی کسان کی آواز پہچان رہے تھے۔

سنگھ بابو سا شفیق قسم کا فارم تھا اور اپنے تجربے اور ملکیت کی حقیقت کو خوب پہچانتا تھا اور اس کے انجام سے باخبر بھی تھا، مگر اتنی جلدی نہیں! کم سے کم اپنے جدید نظام کی عمر آدھی صدی تو سمجھتا تھا۔ مگر سیوتی کا جوت لے اڑا کمبخت حق سے، اور اس وقت تو اسے کچھ بھی یاد نہ تھا، دوم، کتھے کا جنگل بس یہی حال یاد تھی اور اس نے آوازوں سے اندازہ کیا کہ چمر گونٹے اور اردگرد کے موضعات سے صرف چمار ہی نہیں، کوری، تالی رستے تو ہیں، جنگلی، کہار، سبھی اس ہوا میں چلے رہے ہیں اندھی دل کی طرح، جیسے آج اپنے نیچ پن اور غریبی میں وہ ایک دوسرے کے سگے بھائی ہیں

Scanned with CamScanner

اور جبر گونے والے بے دخل شدہ دخیل کاروں اور موروثیوں کو ان کی زمینیں واپس دلا رہے ہیں اور خود اس کی اپنی اراضیات سیر و خود کاشت کا رقبہ کھیت مزدوروں میں بانٹ کر برابر جمع کرنے ہو رہے ہیں۔ (ص 88 تا 90)

*

"دیا اپنے بچے ہیں اور غریبی میں "ہم رشتہ لوگ، ویسے ہی دکھ شریک بھائی ہیں جیسے کہانی "پھیر" کے کٹھ ملا "ستاتوں تو مستحق" (صفحہ 353) اور پھر موہ زادوں کا پورا گروہ" (اقتباس 42)

نہ صرف جبر گونے بلکہ ارد گرد کے مضافات کی کوکھ میں قطرہ قطرہ جمع و پرورش ہوتی رات سے منتخب چپ کرسنگھ بابو کو چاروں اطراف کے اندھیروں میں جکڑ لیا ہے:

47

فارم ہڑپ کر لیا، کیتھے کے جنگل کی سائٹ ہڑپ کر لی، بستی ہڑپ کر لی اور نیم تاریک رات نے سب کچھ ہڑپ کر لیا اور سنگھ بابو نے اندازہ کر لیا کہ فارم کی سب حدوں کا جھگڑا تو زدیا۔ کیتھے کے جنگل کی سائٹ پر سے کھٹیاں اکھیڑ دیں۔ بستی کے اندر اس کا اور اس کے حالی موالیوں کا ہر مکان لوٹ لیا اور اس نیم تاریک منجمد رات میں اب تک سیوتی تھرک رہی ہے۔ چند چند آدمیوں کے ملے جلے نعروں اور مشوروں کی آوازیں بتا رہی تھیں کہ فاتح فوج کی پچھلی رات کے اتنی ہی طرح پھیرہ ہے۔ ناکے ناکے پر آدمی لگے ہوئے تھے اور اب آس پاس کے گاؤں کے علاوہ دور دور سے دھاوا مسلسل مل رہا تھا اور آدھی رات تک وہ چار چار چھ چھ کوس تک جاتی آوازیں سنتے رہے۔ عظیم حادثہ شدید ایجی ٹیشن انھوں نے سب کچھ اپنے کانوں سے سن لیا، اور وہ سب کے سب تھے، اور پہلے تو یہاں سے چل کر جانا ہی ہر منٹ مشکل تر ہوتا چلا جا رہا تھا اور پھر یہ تو سارے جہان کی دشمنی تھی تو ان کے پاس جواب ہی نہ تھا، ان کے لیے تو جبر گونے کی ایک جھپٹ ہی کافی سے زیادہ مستحق ہو سکتی تھی۔ وہ پرانے زمیندار تھے اور اپنی زمینداری پر قابض، مگر وہ قبضے کی حیثیت سے بھی اور وہ بھی طرح پہچانتے تھے اور ساتھ ہی اس قبضہ، ضابطہ کی اہمیت سے بھی واقف تھے جو اس وقت پیدا ہو رہے تھے، تو وہ اس کی قانونی صورت سے بھی واقف تھے۔ اس وقت مالی اور غاصب جماعت دونوں

اپنے ہاتھ میں لے کر کر رہے تھے، اور پھر اگر دوبارہ کسی طرح قبضہ واپس بھی لے لیں تو، سے برقرار رکھنا ان بیچارے اکیلے کا کام نہ تھا، اور پھر قانونی علاج تو نہیں ہو سکتا اور آج تو سیوتی، لینڈ ایکوزیشن، سود، بقایا لگان، بیگار، رقم سودائی آبپاشی، شرح مزدوری، قبضہ، ملکیت خود بنی جاب سب کے سب ان کے اوپر ایک برابر کے تہمت تھے اور تب سیوتی کی آڑ میں نہ معلوم کتنی سیوتیاں نکل کر سامنے آ گئی تھیں اور وہ سمجھ گئے کہ صبح آفتاب حشر طلوع کرے گی۔ (ص90 تا 91)

اور کالی رات بھر پور ڈوب گئی۔ آخر شب کی اوس میں گنّے کے سرسبز پتے زیادہ کٹاردار اور بوجھل ہو کر اوپر جھک گئے اور پوری مجرم پوشی کرنے لگے، اور پھر جیسے اس کی بے کسی پر آنسو بہانے لگے۔ اور آج ہزار سالہ زمینداری سے لے کر پنج سالہ فارم تک اور اگلے پنج سالہ تھیمے کے جنگل تک، ماضی، حال، مستقبل ہر چیز گنّے کے اس جھنڈ کے تلے سمٹ سمٹا کر جمع ہو گئی تھی جس میں وہ چوہے کی طرح اپنی جان سمیٹے بیٹھے تھے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں اور دبی دبی سانسوں میں بسیرا کی پہاڑ سی رات آدھی سے زیادہ کٹ گئی اور رات کا مزاج بدلا، کہرا اور اس کی کیفیت بدلی، رک رک کر ہلکی پچھوا ہوا کے تیر چلنا شروع ہوئے اور سنگھ دیو کو گنّے کے پتوں کا ہر کھٹکا ایک قاتل کی صورت سر پر چڑھتا سنائی دینے لگا۔ اور وہ صرف ایک سوتی قمیص میں یخ بستہ رات اس سے زیادہ بھڑک کے ساتھ گزار گئے جیسے دھزیوں روئی اور اون پر لیٹ کر اپنی خوابگاہ کے اندر گزارا کرتے تھے۔ کائنات طبقۂ زمہریر بن گئی، مگر وہ تو موسم سے بے نیاز تھے، گویا برانڈی کا ایک بڑا پیگ لگائے ماحول سے بے حس —— اور تمام شب گزری، دھندلے آسماں پر صبح صادق کی نشانیاں نمودار ہوئیں۔ مکدر فضائے بسیط میں نور کے آثار نظر آئے اور آسماں کی بلندیوں میں مشرق سے مغرب تک روشنی کا ایک خط نور سا بنتا چلا گیا۔ انھوں نے بار بار اپنی گھڑی کے چمکتے ہوئے ہندسے پڑھے، اور گھڑی تو انھوں نے بارہ کے بعد ہی سے دیکھنا شروع کر دی تھی جیسے سوئیوں کی حرکت اپنی رفتار کے ساتھ انھیں موت کی منزل کی جانب لیے جا رہی ہے۔ اور موت بھی انچ انچ پر نہیں ملی میٹر کی ناپ پر بھی نہیں، ننھی منی سیکنڈ کی سوئی کی رفتار سے ان کے گرد گھومتی اور سیکنڈ کی سوئی کے ساٹھ کے ہندسے پر ان کی آنکھ خوف سے بند ہو جاتی تھی جب ناچتے ناچتے یہ ننھی سی سوئی سولی ہولی چکر دار دنیا میں ناچنے لگتی تھی، جب آسمان سے زمین تک کا کونا کونا جگمگا اٹھے گا، پھر کونے کا چپہ چپہ چمک کر بھڑک اٹھے گا، ایکھ کے کھیت کے گوشے گوشے میں

Scanned with CamScanner

روشنی ہو جائے گی اور ابدی زیست کی پہلی صبح طلوع ہوگی۔ ماٹی کے پتوں کی اوس اور امبر کی سیاہیوں کا پردہ تار تار ہو جائے گا تو رات کی تاریکی سے سورج کی کرن ہر مجرم کو روز روشن کی طرح پیش کر دے گی۔

(ص 91 تا 92)

لمحہ لمحہ بڑھتی جانب رینگتی موت کے خوف میں گھرے سنگھ بابو کی کیفیت پر مشتمل اس طویل پارے کی اختتامی سطور (جو آگے مکرر درج ہیں) پڑھتے ہوئے یاد آتا ہے کہ ناول "ایک زمین کی تلاش میں" کے اختتامی پارے میں، جس کا اقتباس حسبِ ذیل تراشہ آ رہا ہے، مکت بابو کے سوال سے لاجواب دھرم سیوتی دل کے باطن سے آیا ہوا جواب لکھتے ہوئے ابوالفضل صدیقی نے اپنے افکار و احساسات میں رچی بسی فلاح و خیر میں تر انسانی معاشرے کی آرزو، ان بلیغ جملوں میں ظاہر کی تھی:

"وہ ساجھے کی سرزمین کی مٹی اپنی چھاتی پر گلاب خاص کو کھڑا کرنے پر بڑھ گئے اور جس فضا سے پیدا ہوا اس کو پار کر، پیروں چڑھ کر چھتنار درخت بناتے اور گلاب خاص دیسی گلاب کے پھولوں کی جھاڑی کی طرح مہکے۔"

اور لمحہ لمحہ اپنی جانب بڑھتی موت کے خوف میں گھرے سنگھ بابو کی کیفیت پر مشتمل پارے کی اختتامی سطور میں ابوالفضل صدیقی کے افکار و احساسات میں کروٹیں لیتی خیر سے تر انسانی معاشرے کی آرزو، ان بلیغ جملوں کی صورت در آئی ہے:

"جب ناچتے ناچتے یہ مٹی کی سوئی سوئی ہوئی تنکدار دنیا میں ناچنے لگے گی، جب آسمان سے زمین تک ناکوتا جگمگا اٹھے گا، پھر تو نئے کا چپ چپ چمک کر جھلک اٹھے گا، کھیت کے کونے کونے میں روشنی ہو جائے گی اور ابدی زیست کی پہلی صبح طلوع ہوگی، ماٹی کے پتوں کی اوس اور امبر کی سیاہیوں کا پردہ تار تار ہو جائے گا تو رات کی تاریکی سے سورج کی کرن ہر مجرم کو روز روشن کی طرح پیش کر دے گی۔"

عام فنی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اس کہانی کے واقعات، ایک پیچیدگی اور پھر انتشار کے بعد اپنے نقطۂ عروج کو بھی پہنچ چکے ہیں۔ اگر ابوالفضل کے وضاحت تفصیل پسند طریق سے قطع نظر کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ بات اس پُر زور تیقن اور تاثراتی جملے پر مکمل ہو گئی کہ "سورج کی کرن ہر مجرم کو روز روشن کی طرح

پیش کرے گی۔" لیکن اگر اس نقطۂ نظر کے مطابق دیکھیں جس کے قائل ابوالفضل صدیقی ہیں، تو معلوم ہوگا کہ بات اس جملے پر پہنچ کر ہی مکمل محسوس ہو رہی ہو مگر ابھی انھوں نے سنگھ بابو کے کردار کو کسی انجام سے دوچار نہیں دکھایا ہے، لہٰذا کہانی آگے بڑھاتے ہوئے، سنگھ بابو کا احوال بتاتے ہیں

48

انھوں نے پھر گھڑی دیکھی اور گھبرا کر گہرا سانس لیا — لیٹ ہو رہا ہوں میں، اور زندگی کی زمین چھوٹی جا رہی ہے۔ اپنا رائفل سمیت، آج زردہ، مردے سے زیادہ؛ جس سے وہ دسیوں آدم خور شیر پچھاڑ چکے تھے، آج اپنے قادر انداز مالک کی جان بچانے سے منکر تھا۔ ٹھنڈا لوہا اور دو ٹھناکوں کے بعد تو بالکل ہی مردہ، جھنجھلی سے بدتر۔ اور وہ بغیر کسی پہلو پر غور کیے موت اور زیست کے دوراہے کی جانب بڑھنے ہی والے تھے کہ ایک شیرنی کی دردناک کپکپاتی نسائی آواز کہیں قریب ہی سے ان کے کان میں پڑی اور وہ بے حس و حرکت جیسے اس جھنڈ میں حلول کر گئے اور سانس روک کر جتنا دبک سکتے تھے دبک گئے۔ مگر آواز دوسری تھی "جیا جیا، اب چلیے، جنگل جھاڑ ہوئے گنو۔" (بہن بہن، اب چلو، رفع حاجت سے فارغ ہو لیے) اور ذرا سے ذرے کانپتے لہجے میں اس کی بار بار تکرار ہوئی اور انھوں نے بڑی ذکی الحسی سے ساتھ کان لگایا، جانی پہچانی، بچپن سے آج تک کی ہزار بار کی سنی آواز یہاں سے وہاں تک پوری کھیت کی منڈیر منڈیر پر، پورب سے پچھم اور پچھم سے پورب چلتے ہوئے، آہستہ آہستہ کوئی عورت لگا رہی ہے اور مسلسل لگائے جا رہی ہے اور برابر ادھر سے اُدھر آ جا رہی ہے، کبھی اس سے ذرا دور ہو جاتی ہے اور پھر بالکل قریب سنائی دیتی ہے۔ "جیا جیا، اب چلیے، جنگل جھاڑ ہوئے گنو" اور سنگھ بابو کے دماغ میں جھلک سے روشنی ہوگئی اور یاد آ گیا کہ یہ قطعہ ہر صبح عورتوں کی رفع حاجت کے لیے گاؤں کے قدیم رواج کے مطابق مخصوص ہے اور عورتیں رفع حاجت کے لیے آنا شروع ہو گئیں۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس وقت گاؤں کے پرانے قاعدے کے مطابق اس کے اندر کوئی مرد نہیں رہ سکتا۔ مگر کیا آج کی صبح بھی اپنے قاعدے کی پابندی کریں گے کہ یہ قطعہ خالی کر جائیں؟ اور آواز تو برابر ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر لپک رہی تھی۔ ان کے بچپن کی کھلائی "آیا" کی روتی تھرتھراتی آواز، چتریا کی ماں کی گود میں وہ پھر گونجنے آ گرتیں چار سال کی عمر میں کھیل کرتے

تھے اور جو چڑیا کو تاڑ رہا تھیں کو میں اٹھا لیا کرتی تھی۔ یہ آدھا کاتی تحیت کی منڈیر منڈیر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر چل رہی تھی۔ اور وہ آہستہ سے بڑی تقیہ کے ساتھ پیچھے ہی پیچھے کھسکے اور بڑی سبک رفتاری سے جتی الوسع پتوں کا کھٹکا بچاتے، جیسے بیوے کی طرح رینگ کر منڈیر تک پہنچ گئے اور منڈیر کے قریب والے جھنڈ میں دبک گئے۔ اور انھوں نے اندازہ کر لیا کہ عورت بالکل تنہا ہے اور شاید کسی آدمی کی آڑ میں نجی کو پکار پکار کر تلاش کرتی پھرتی ہے۔ اور جوں ہی وہ ان کے محاذ میں آئی، انھوں نے آہستہ سے کہا، ''پیچھی ہوں'' اور آہستہ سے کہا، ''آئیے'' اور راکفل تانے باہر آگئے اور عورت نے ان کے کان کے قریب منھ لا کر ہانپتی کانپتی ہوئی آواز کو سنبھالتے ہوئے بتایا کہ چڑیا کو مرا سمجھ کر چھوڑ آئے تھے اور دو گھنٹے تک تو کوئی گلی میں سے بھی اٹھا کر لے۔ یہ معمورات اس کا جواب بند رہا اور مستقل رہا ستے ہوئے نکلو اور تکتی تو میں نے بھیج کر جہاں سے اور چونکہ یہ چک مدمعاش اس وقت عورتوں کے جنگل جھاڑنے کے لیے حوالے کر گئے ہیں، اور اوپر سے یہ تو آنی اور چڑیا کا بیوپار سنا دیا کہ تھانے میں جا کر رپٹ دیں کہ ان کا مکان، ان کے سب نوکروں کے گھر اور چڑیا کا گھر لوٹ لیا، تھوڑی دور جل مویشی خانے کے حوالے کر دیے گئے، اور تمام رات دور دور تک خبر پہنچ کر آدمی جمع کرنے کے لیے چڑھتے چڑھتے پھرتے رہے، اور فارم کے تار توڑ دیے اور ہنکی اپنی زمین پر قبضہ کر لیا، کھیتے کے جنگل کی پیداوار کی کھیتیاں بکھیر دیں اور دھارا ساری رات تھوڑی پر گاؤں گاؤں بھاگتا پھرا ہے، چہرہ سے میں کوئی ایسا نہیں جو چڑیا و شفاخانے پہنچ دے۔ ان کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے ہیں اور مر چھوڑ دیے ڈر گئیں [ستھو بابو] جہاں سے مار ڈالنے کی صلاح کر چکے ہیں۔ اور اس وقت موقع اچھا ہے، وہ ٹل جائیں اور سیدھے تھانے جا کر رپٹ دے دیں۔ سب پوچھیں گے اور بہت کچھ کہہ کر ستھو بابو دراتی سے ہنستے ہوئے ادھر ادھر گردن موڑی جیسے مشورے کے لیے کوئی ملے۔ چڑیا مقدمہ کہ سے سب چیتے ستونوں کے سوا کوئی نظر نہ آیا۔ انھوں نے تھانے کی سمت، ایک اور پانچ میل تک انھیں کہ سے کی بھوت نظر آئے اور کہہ سے کی کے بھوتوں کی رہنمائی میں اپنے تن بھوت سے وجود کو لے کر چل پڑنے میں عافیت جانی گر وہ تھکے (ص95تا97)

*

کیونکہ برسوں سے نظر نظر، پھیر پھیر اپنے اطراف و جوانب پر تا کی کی بولی بھولوں کی

کہرے کے بھوتوں کی طرح پھیل گئی ہے، سب کچھ اسی میں گم ہے؛ نہ کوئی مشیر باقی ہے نہ معاون۔

ایک ضعیف سی کرن جو پیام لائی ہے اس پر عمل درآمد تک پہنچتے پہنچتے وہ روشنی مکمل کر پھیل جائے گی جس سے ماگھ پوں کی ادن اور کہرا کٹ گرے گا تو مفرور مجرم کو دور دور تک نہ معلوم کتنے قطعوں میں بھرے ہوئے خون کے پیاسے صاف دیکھ لیں گے۔

49

. مگر وہ ٹھٹکے۔ اور ہاں کر یہ مخصوص قطعہ اس وقت، ان کی تقدیر سے، مردوں سے خالی ہے اور عورتیں بھی، ابھی زیادہ دور نہیں پائی ہیں، مگر آگے چل کر رستے بھر پانچ میل تک ایسے ایسے نہ معلوم کتنے قطعے مردوں سے بھرے ملیں گے اور دور دور تک میدان میں ہر مرد انھیں اپنے ٹھنڈے خون کا پیاسا نظر آرہا تھا، اور کچھ دور چل کر تو یہ کہرے کے سوت کمبخت بھی ساتھ چھوڑ جائیں گے اور وہ کھلے میدان دھوپ میں دور سے چمک جائیں گے اور مفرور ملزم کو وہاں تو اتنی بھی آڑ نہ ہوگی جتنی اس گنے کے جھنڈ میں تھی جس نے تمام رات قلعہ بن کر اس کو پناہ دی تھی۔ (ص 97)

❁

ابوالفضل صدیقی نے چتریا کی بوڑھی ماں کے روپ میں سنگھ بابو کے لیے امید کی ایک کرن پیدا کر کے، کہانی پڑھنے والے میں پھر ایک تجسس جگا دیا ہے کہ آخر امید کی یہ ضعیف سی کرن بابو کے نیم بستہ وجود میں کس طور زندگی پیدا کرتی ہے۔ اسی نے انھیں بچپن میں ماں کی طرح گود میں کھلایا تھا۔ اس کی گود چتر سنگھ سے تقریباً خالی ہو گئی ہے تو یہ گویا انھی سے بھری گود بھرے رکھنے کا پیام لائی ہے۔

کہانی پڑھنے والا یہ ضعیف سی کرن دیکھ کر محسوس کرتا ہے کہ جس طور "بھیر" میں ابوالفضل نے پرکھوتا کی مٹی کے بجائے خلق کردہ شدت کو بندہ علی کی ماں رم کلیا کے وسیلے سے ایک انجام تک پہنچایا ہے، تقریباً اسی طرح وہ سیوتی کے باعث خلق کردہ تمام کو بھی ایک ماں، چتر سنگھ کی ماں، کے وسیلے سے کسی انجام تک لے جا رہے ہیں؛ گویا یہ رم کلیا کے بعد عورت کے ماں روپ کا دوسرا مظاہرہ دکھا رہے ہیں، اور اگر قاری کے ذہن میں گلابو کی گود میں بھرے شگفتہ باغ کے نوخیز پودے تازہ ہو جاتے ہیں تو یہ بوڑھی عورت کے ماں روپ کا تیسرا مظاہرہ ثابت ہوگی۔

Scanned with CamScanner

50

اور بڑھیا نے جلدی کرنے کا تقاضا کیا، راہموں نے ایک گھونٹ سا لے کر بڑھیا کی طرف دیکھا اور پھر ذرا رکتی ہوئی آواز میں کہا، "آپ اپنی اوڑھنی مجھے اُتار دو۔"

اور بڑھیا ذرا جھجکی، کچھ متعجب ہوئی اور پھر اس کے حفظ ماتقدم کو سمجھ کر اوڑھنی اتار کر حوالے کر دی اور پھر کہا، "جا بیٹی کدھر سے نکل جیو، جنگل سارے بیچارے کو تو ڈوبے رات۔"

اور سکھ بابو نے بہت اہتمام کے ساتھ پیٹھ پر رائفل لٹکا اور سر سے پاؤں تک خوب اچھی طرح اوڑھنی لپیٹی، جوتے اتار کے وہیں چھوڑے اور قصبے کی سمت رخ کر کے، اس طرح سے جیسے کوئی عورت پیٹھ پر بچہ لادے چلی جا رہی ہے، چل پڑے۔ (ص 97 تا 98)

*

ابوالفضل صدیقی نے "باجبروت" سکھ بابو کا یہ روپ دکھا کر اس نے اپنے "سب کو دے خیلی جنس مخفیہ" اور "ہاں میں ہاں ملانے والی جماعت کے پیش رو" (اقتباس: 43) کی دبی سے جھجکتی رکتی آواز میں اوڑھنی دی ہے، اور گھونگھٹ میں منہ چھپائے، اپنی جاگیر سے ننگے پاؤں نکل کر، اپنی سرزمین کی ریت دیتے ہوئے تنہا تھانے کی طرف جا رہا ہے! اور دوسری طرف کا یہ حال بتا رکھا

"دھاڑ ساری رات [سکھ بابو کی] گھوڑی پر گاؤں گاؤں بھاگتا پھرا ہے۔" (اقتباس 48)

کہانی پڑھنے والے کو یاد رکھنا چاہیے کہ بلند و پست کے مظاہر بے مارجنی ہیں۔ ہر بلندی میں پستی کا بیج پڑ سکتا ہے اور پستی میں کاشت ہو سکتی ہے۔ لہذا جو بلند و پست ہیں وہ سدا سدا کے لیے نہیں، یہ ایک دوسرے سے بارہا منقلب ہوں گے۔ ثبات صرف تغیر کا طرۂ امتیاز ہے اس کلیے سے چشم پوشی کی راہ منہ چھپانے سے لے کر بے کسی و لاچاری تک جاتی ہے

51

چل پڑے۔ اور نہیں بھی پتا نہ چلا کہ کہاں سے اور کس وقت وہ اپنے کتنے تارے قدر کے حد داد سے پار ہو گئے جس نے ملد بچہ مخصوص کیفیوں کے دونیں سے نکلنا مکمل تھا۔ اور...

پرندے اُڑے چلے جارہے تھے۔ جان کے خطرے کے احساس سے رفتہ رفتہ آزاد ہو کر مستقبل کا سدباب اور قبضے کے حصول وقیام کی ترکیبیں سوچتے جارہے تھے۔ اور پہلے تو حصول ہی ناممکن سا نظر آتا تھا اور... اور جوں جوں وہ تھانے کے قریب ہوتے جارہے تھے رپورٹ اوّل کا مسودہ دماغ کے اندر مرتب کرنے کی جدوجہد کررہے تھے جس کے ذریعے وہ اپنی گئی ہوئی اراضیات واپس لے سکیں، اپنے نوکروں کو پیٹنے والوں، اپنے اوپر حملہ کرنے والے مجرموں اور چرواہے کے قاتلوں اور اپنے فارم کے غاصبوں کو سزا دلا سکیں۔ مگر رپورٹ اوّل کے پہلے خانے کے بعد دوسرے خانے کی خانہ پری ہی انھیں اپنے بس کا روگ نہ معلوم ہوتی تھی، اور تیسرا تو بالکل ہی خالی نظر آتا تھا۔ وہ مدعی تھے اور خیر یہاں تک تو مع ولدیت انھیں معلوم تھا، مگر گواہ کی خانہ پری کے لیے انھیں ایک نام بھی یاد نہ آتا تھا۔ ساری دنیا تو مدعا علیہ تھی اور وہ تنہا ایک مدعی، تو پھر گواہ کہاں سے پیدا ہوتا۔ (ص 98)

⊕

کہانی "پھیر" کے پانچویں باب میں منعقدہ کٹھ کے فیصلے سے متعلق راوی کا کہنا ہے کہ "اس باغیانہ اقدام پر عدالت کا ہر آدمی انگشت بدنداں رہ گیا تھا، جیسے کرنے والوں کو بھی خود اپنے اوپر یقین نہ آیا تھا۔" (ص 359)

بے زبان کمزوروں کے اجتماعی شعور میں صدیوں سے جمع ہوتے ہوئے اب تک ظاہر کی زمین پر اتر آنے ایسا کوئی تہذیبی کہانی "دھارا" میں عصمت وحمیت کے تحفظ کے لیے اجتماعی عمل کی مانند ابوالفضل صدیقی کی شدید آرزو محسوس ہوتا ہے جس میں آدم زاد، حیات و وجود کے عمل پر مسلط کے گرد و نواح کے مذہبی علما کے بیشتر وعظ کو رد کرکے، ان کے ہر حکم، تلقین اور قول کو اپنی درگاہ کا مردود بنا دے کیونکہ یہ مذہبی اداروں کی اولادیں جیسے یہ سب اسے روشنی کے دور میں منتظم ہونے سے باز رکھ کر اک گڑھے دور کی تاریک گرہوں میں باندھے رہنا چاہتے ہیں۔

کہانی کے اختتامی چھٹے باب میں ابوالفضل ان تاریک گرہوں کی تفصیل یوں کررہے ہیں جو بہت سے بے زبان کمزوروں کے اختلاف مذہب اجتماع کے فیصلے کو تنگ بنانے کے لیے یکے بعد دیگرے قائم کی گئیں:

پہلی گرہ

اور ابھی ترپ کا ایک اور پتا ہندہ جل کے ہاتھ میں تھا۔ وہی قانون پھر حرکت میں آیا جس کو "آئین، رسم و دستور، یہی واجب، وارث شدہ قدیم" کی ترکیبوں والا نام دیا گیا ہے اور جو روایت پر مبنی ہونے کے سبب عدلیہ اور مقننہ دونوں کی ترمیم و تنسیخ کی دسترس سے باہر ہے، اور جس کا نفاذ [illegible] ہو اور سورج کی روشنی کے انداز میں ہوتا چلا آتا ہے، اور جس کا استعمال بھی ہر گھر پر گھر بیٹھے ہوتا چلا آتا ہے، اور کسی حق دار کو اس کی داد رسی سے [illegible] عدالت کے دروازے [illegible] بچے کی موت [illegible] تھی لیکن آج یہ اصولی بھی ہو گزری۔ کوڑی [illegible] کے نام کی آڑ سے اس حق کے لیے عدالت میں نالش کرنی پڑی اور اس [illegible] پاس کے زمینداروں کی چھاتیوں دہل کر رہ گئیں۔ [illegible] قریب قیامت کی نشانیاں [illegible]۔ نالش اور [illegible] ہے۔ (ص 358-359)

دوسری گرہ

اور اس نالش کی کارروائی پر دوسری شق کسی نے [illegible] منشی ماں شیر خاں مختار [illegible] عدالت خفیفہ [illegible] عدالت [illegible] سے ہو گئے۔ ایک طرف [illegible] کے مستقل [illegible] ساتھ ساتھ مخصوص رنگ [illegible] کے لوگوں [illegible] ختم [illegible] جاری ہوا کہ [illegible] عدالتی فیصلہ [illegible] اپنے خرچے [illegible] قلم کے مطالبات کا [illegible] مقدمہ [illegible] اور قرقی [illegible] لینے میں [illegible]! مال تو نہ تھا، مگر مدعا علیہم کے گھر گھر گائے بھینس بچھے بندھی تھیں، جو اس بے زمین کاشتکار دیہاتیوں کا اب واحد سرمایہ اور روزی کا سہارا تھیں، اور [illegible] سے ان تمام مویشیوں کو قرق کر کے کانجی ہاؤس [illegible] کرنے کا پروانہ حاصل کر لیا اور [illegible] قرق امین عدالت نے [illegible] گھر گھر چھاپہ مار کر بھینسیں [illegible] تک [illegible] اور [illegible] سب کانجی ہاؤس ہنکوا دیے۔ اس طرح [illegible] کاشتکاروں [illegible] دیکھتے رہ گئے [illegible] پتھر کے [illegible] جیسے [illegible] رہ گئے۔ [illegible] کا قانون [illegible]۔ (ص 359-360)

تیسری مُرہ:

اور اسی دوران کوڑیا صاحبن کے دعوے کی تائید کے لیے عدالت میں حاضر ہوکر بندہ علی کا بیان دینا ناگزیر ہوگیا۔ (ص360)

چنانچہ قصبے سے بعد دوپہر ہاتھی پر سوار ہوکر بندہ علی اور منشی کمال شیر خاں تقریباً چار بجے کچہری پہنچے، اور سب کام پہلے سے تیار تھا: آسانی یہ تھی کہ فریق ثانی میں سے عذرداری جواب دعویٰ کے لیے کوئی آیا ہی نہ تھا۔ صاحبن کے دعوے کی تردید میں بھی کسی مدعا علیہ نے کوئی عذرداری داخل نہیں کی تھی، اور تائید میں معزز اور معتبر ترین متعلقہ شخصیت پر بندہ علی کا بیان ہوگیا۔ سب جج نے بیان ختم کرتے ہی اسی پر حصر کرتے ہوئے اسٹینوگرافر کو بلا کر مختصری تجویز بول دی، اور سول آپ ڈگری دے دی۔ (ص362)

یعنی بے زبان کمزوروں کے فیصلے پر، بہت پہلے سے فعال قوت کی بندشیں ہولی تمام کرگئیں، ہر پہلو سے مستحکم ہوگئیں۔ کامیابیوں سے سرشار صاحبن نے تھیلیوں کے منھ کھول دیے: بندہ علی کو ذاتی رقم فیاضانہ بطور نذر پیش کی گئی:

52

تقریباً اس ہاتھی کو خرید کر پیش کر دیا جس کی پیٹھ پر اس وقت وہ سرکار کے ساتھ بیٹھ جانا چاہتا تھا، اور یہ نذر سرکار نے قبول فرمائی۔ ساتھ ہی ساتھ منشی کمال شیر خاں اپنی مقررہ نذر سے اور ہاتھی کے دونوں نوکر، مہاوت، اور چرکٹا، بندہ علی کا ذاتی خدمتگار، سب کے سب انعام و اکرام سے نوازے گئے۔ اور لدا پھندا ہاتھی کچہری سے قصبے روانہ ہوا... (ص363)

قصبہ پندرہ میل تھا۔ ہاتھی چل پڑا۔ پکی سڑک پر تقریباً گیارہ میل طے کرنے کے بعد مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا۔ راستے کے کنارے قدیم جنگل کے دور کی باقیات، چار پانچ ایکڑ رقبے پر پرانے درختوں اور جھاڑیوں کا ایک گھنا قطعہ ایستادہ تھا جس کے اندر کسی بزرگ کا مزار تھا۔ راستے سے بالکل متصل ایک چھوٹا سا کنواں اور بنجر اراضی کا چھوٹا قطعہ تھا، وہیں سرکار نے نماز پڑھنے کے لیے

ہاتھی بٹھانے کا حکم دیا۔ مہابت نے ڈول رسی نکال کر جلدی جلدی پانی کھینچا۔ خدمتگار نے چادریں بچھائیں۔ پانچ کے پانچ سرکار کی امامت میں نماز ادا کرنے کھڑے ہوگئے۔ کوڑی مل دوسری جانب ہاتھی کے ہودے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ یکدم جھاڑیوں کے اندر چاروں طرف سے مسلح جوان نکل آئے... (ص 364)

کہانی کے اس موڑ پر وارد کر گزشتہ واقعات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو غصّہ نے مدھم خاں و پرکھوتا کی ردوقدح اور دور تر زمانی کے ذریعے کہانی میں جو پیچیدگی پیدا کی تھی، وہ لڑکی کی گرفتاری اور برہنہ جلوس سے شدید ہوتے ہوتے بڑی بیگم کے اقدامات تک شدید تر ہوئی اور اجتماع کے فیصلے نے اُسے شدید ترین بنا دیا۔

اجتماع کا فیصلہ، بہ یک نظر، کہانی کا خاتمہ محسوس ہوتا ہے۔ اس کے باوجود مصنف نے کہانی کا چھٹا باب لکھا۔ غالباً اس باعث لکھا کہ یہ فیصلہ اُس ایک قوت کا ہے جو کرن کرن وجود پذیر ہوکر بہت بہت پہلے سے موجود بھدروں کی اداؤں کے مقابلے پر آئی ہے۔ لہٰذا یہ ممکن ہی نہ تھا کہ بہت بہت پہلے سے قائم قوت کی جانب سے ردعمل کا مظاہرہ نہ ہو۔ مطالبہ و عدالتی کارروائی کی صورت میں نووارد اور نوین قوت جو موجود قوت کو وہیں "پتھر کے دور" میں پہنچا کر، "سوت نے ڈوری" پاکر، ہاتھی پر چڑھی جھومتی بھدروں کی اداؤں کے مانند بنی آماجگاہ کو بیٹھی۔

ہاتھی قصے کی جانب چلا ہے تو کہانی کا پورا ایک صفحہ باقی ہے، جبکہ قاری محسوس کرتا ہے کہ بھدروں کی اداؤں اور نومولود روشنی کا تصادم قدم بہ قدم شدید تا شدید ترین ہوتا ہوا، آخرکار اس مقام کو پہنچ گیا ہے کہ کوڑی مل مہاجن (درحقیقت اس کے زر خرید) میر بندہ علی درشنی کمال شیر خاں وغیرہ (دراصل کوڑی مل کے) ہاتھی پر چڑھے خوش و خرم ایک ہی قصے میں واقع) شاداب گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ مگر قاری بھرم میں پڑ گیا ہے۔ کلاسیکی طرز کی طویل، قصہ در قصہ کردار در کردار داستانیں لکھنے والے ابوالفضل صدیقی کی بیشتر کہانیوں میں حقیقی انجام سے قبل ایک ایسی صورتِ حال خلق ہوتی ہے جو پڑھنے والے میں کہانی کے انجام کا بھرم پیدا کرتی ہے؛ لیکن بھرم ٹوٹتا ہے، کہانی آگے بڑھتی ہے اور ایسے (حقیقی) انجام کو پہنچتی ہے جو قاری کے لیے شاکنگ یا گہری سوچ میں ڈال دینے والا اور

کہانی کی منطق کے مطابق ہوتا ہے۔

اس کہانی میں قاری دیکھتا ہے کہ عدالت کے سہارے غاصب سے غالب تر ہوتی ہوئی اداسی کی راہ میں مدعا علیہم حارج ہی نہیں ہیں۔ ''فریق ثانی میں سے عذرداری جواب دعویٰ کے لیے کوئی آیا ہی نہ تھا۔'' ساتھ ہی اُسے یہ تاثر بھی دیا جاتا ہے کہ '' یہ بھی شاید آقا (میر بندہ علی) کی ہیبت کے طفیل تھا۔'' (ص362) تو قاری سمجھتا ہے کہ کہانی کا انجام، اپنی آماجگاہ پر بھادوں کی اداسی کا غلبہ ہی ہے۔

قاری کے ذہن سے یہ بات محو ہو جاتی ہے کہ جب بے زمین غیر کاشتکار دیہاتیوں کو مہاجن نے ''پتھر کے دور'' میں پہنچا دیا تھا تو راوی نے بتایا تھا کہ:

> '' بستی کا تھان ویران ہو گیا، اور ایک مرتبہ پھر موت کا سناٹا طاری ہوا۔ اور موت کے سناٹے میں سے اندھیری رات کی چادر میں آڑا ترچھا مدکی کچھوے کی طرح رینگتی ہوئی، اور آنگن کی آنگن میں کچھ کچرا کن کچھ راستا، اور کن کھجور، سانپ ہو گیا اور سانپ کھی چنچل تھی اور اس اندھیری رات کی حدیں رہ، گنوار کی صبح سے ملی ہوئی تھیں۔ پنجوں کے بل چل چل کر راتوں رات مُردہ بستی ہو گئی، ہر گھر کے پیچھے یک ایک جوان خاموشی کے ساتھ ہاتھ میں لاٹھی، درمہ جنگل پر لے نکل آیا '' (ص360)

قاری کو اس گروہ بندی سے کچھ توقعات بھی پیدا ہوئی تھیں مگر وہ اس گمان میں گم ہو گئی تھیں کہ مجتمع نوجوان غالباً یہ سوچ کر ہی قدم سے رُکے ہوئے ہیں کہ 'مہاجن کے دعوے کی تائید کے لیے' میر بندہ علی عدالت میں حاضر ہو کر بیان دینے کی حد تک نہ جائے اور کمزوروں زیادتوں کے خلاف ڈگری نہ ہو پائے، لیکن جب قاری آخری صفحے کے وسط میں دیکھتا ہے کہ '' یکدم جھونپڑیوں کے اندر سے چاروں طرف سے لٹھ بند جوان نکل آئے'' تو اسے پورے چار صفحے پیچھے پڑھی ہوئی یہ بات یاد آ جاتی ہے کہ اندھیری رات کو روزنگار کی صبح میں بدلنے کے لیے ہر گھر سے یک ایک کرن مجتمع ہوئی تھی... وہ سمجھ جاتا ہے کہ مدعا علیہم کی عدالت میں مسلسل عدم موجودگی کا سبب یہی عمل تھا، اور اب کیونکہ مہاجن 'معترضہ مذمہ' (ص360) سے کر میر بندہ علی کا بیان کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے وہ ''سو بیسے ڈگری'' حاصل کر لی ہے تو اندھیری رات کو روزنگار کی صبح میں بدلنے کے لیے ہر گھر سے

مجتمع کر کے ایک دم سے جھاڑیوں کے اندر سے نکل آئی ہیں اور میں بھی اس بھرم سے نکال لیا گیا ہوں جس میں مجھے ابوالفضل صدیقی نے بڑی فنکارانہ ڈھنگ سے مبتلا کر دیا تھا اور کہانی اپنے منطقی، شاکنگ اور فکر انگیز انجام کو یوں پہنچی کہ:

53

یکدم جھاڑیوں کے اندر سے، چاروں طرف سے مشٹنڈے جوان نکل آئے۔ ایک ایک قزاق رہزن کو اچھی طرح پہچان کر کود پڑا۔ مہاجن تو پانی بھرنے کی رسی کے سہارے بڑی چابکدستی سے کنویں میں اتر گیا، اور یہ سب کا سب گروہ ان پانچ آدمیوں پر لاٹھیاں برسانا شروع کر پڑا۔ فضا میں ایک مرتبہ پھر ممتاز شیر خاں کی مخصوص شیر کی سی غوں سنائی پڑی اور پھر تو آدھ گھنٹہ مسلسل بجر بجر ... جیسی آوازوں کے اور کوئی آواز بھی نہ سنائی دے سکی۔ ڈھائی سو آدمی اور پانچ ... ایک ایک پر پچاس پچاس کا اوسط اور دوسرے روز علی الصبح جب تھانے دار پانچ ... کے ... موقع واردات پر پہنچا تو ... کے کھلے کنووں سے قیمہ کی ہوئی چھوٹی بڑی ڈھیریاں ... ملیں۔ ... اور پوسٹ مارٹم کرنے والا ڈاکٹر بھی رپورٹ میں کسی کھوپڑی کو کسی دھڑ پر فٹ کرنے سے البتہ وحشت سے منتشر ڈھیروں میں ایک انگلی ہاتھ آئی جس میں نیلم کی انگوٹھی ایک لکھوٹی سے اتنی شناخت ہو سکی کہ بندو علی کی تھی۔ (ص364)

*

یہ احمد شاہ کی توقع پر تمام ہو جاتا ہے کہ ابوالفضل صدیقی کی چھ مکمل کہانیوں اور چھ کہانیوں کے خاص خاص اجزا کی جل تقسیم سے قاری وشاید اس طرز فکر و بیان سے بخوبی متعارف کر دیا ہو جس کے توسط سے مصنف نے آسودہ و محروم فرد کی صدیوں سے جاری کشمکش کو بہت ہی قریب اور صاف کر کے حوالے سے ملحوظ کیا ہے تاکہ ہم عصر اور آئندہ قاری ان کے دیکھے اور سمجھے کی روشنی سے ... زندگی میں، زمانہ کا امروز، جاری معرکہ خیر و شر ... اور اسباب خیر و شر ... کو پہچان ... سکے، ... ہو سکے۔

**

نیر مسعود کی کتابیں

عطر کافور

(کہانیاں)

قیمت: 80 روپے

ایرانی کہانیاں

(ترجمے)

قیمت: 90 روپے

انیس

(سوانح)

قیمت: 375 روپے

مرثیہ خوانی کا فن

(تنقید و تحقیق)

قیمت: 150 روپے

منتخب مضامین

(تنقید و تحقیق)

قیمت: 280 روپے

کافکا کے افسانے

(افسانے)

قیمت: 70 روپے

معرکہ انیس و دبیر

(تنقید و تحقیق)

قیمت: 150 روپے

گنجفہ

(کہانیاں)

قیمت: 200 روپے

Scanned with CamScanner

سٹی پریس میں دستیاب اردو رسائل و جرائد

سہ ماہی نقاط، فیصل آباد
مدیر: قاسم یعقوب
قیمت: 150 روپے

سہ ماہی دنیازاد، کراچی
مدیر: آصف فرخی
قیمت: 160 روپے

سہ ماہی آئندہ، کراچی
مدیر: محمود واجد
قیمت: 80 روپے

بادبان، کراچی
مدیر: ناصر بغدادی
قیمت: 200 روپے

سہ ماہی ارتقا، کراچی
ترتیب: راحت سعید، محمد علی صدیقی
قیمت: 100 روپے

سہ ماہی روشنائی، کراچی
مدیر: احمد زین الدین
قیمت: 250 روپے

سہ ماہی سمبل، راولپنڈی
مدیر: علی محمد فرشی
قیمت: 150 روپے

کتابی سلسلہ اجرا، کراچی
مدیر: احسن سلیم
قیمت: 250 روپے

کتابی سلسلہ مکالمہ، کراچی
مدیر: مبین مرزا
قیمت: 350 روپے

شعر و حکمت، حیدرآباد دکن
مدیر: شہریار، مغنی تبسم
قیمت: صفحات کے اعتبار سے

سہ ماہی نیا ورق، ممبئی
مدیر: ساجد رشید
قیمت: 120

سہ ماہی اردو، کراچی
مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان
قیمت: 100

ماہنامہ قومی زبان، کراچی
مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان
قیمت: 15 روپے

ماہنامہ الحمرا، لاہور
مدیر: شاہد علی خان
قیمت: 50 روپے

ماہنامہ نیا زمانہ، لاہور
مدیر: محمد شعیب عادل
قیمت: 20 روپے

Scanned with CamScanner

سٹی پریس کی کتابیں یہاں دستیاب ہیں

ویلکم بک پورٹ
اردو بازار
کراچی
فون:32633151

فضلی سنز
ٹیمپل روڈ، اردو بازار
کراچی
فون:32212991

تھامس اینڈ تھامس
نزد صدر جی پی او
کراچی
فون:35682220

سٹی بک پوائنٹ
نزد مقدس مسجد، اردو بازار
کراچی
فون:32732912

فرید پبلشرز
نزد مقدس مسجد
اردو بازار، کراچی
فون:32770057

کریمی بک کارپوریشن
نزد چاندنی شاپنگ مال
حیدرآباد کینٹ
فون: 780182

خالد بک ڈپو
درانی چوک
خانپور
فون:5577839

کتاب نگر
حسن آرکیڈ
ملتان کینٹ
فون:4510444

سانجھ پبلی کیشنز
دوسری منزل، عتیق بلڈنگ
ٹمپل روڈ، لاہور
فون: 042-7355323

کوپرا بک شاپ
70، شاہراہ قائداعظم
لاہور
فون:7321161

بک ہوم
بک اسٹریٹ،
46 مزنگ روڈ، لاہور
فون:7231518

مرزا غالب کتاب مرکز
I-8 دکان نمبر 10
سٹی آرکیڈ پلازہ مسیٹ
اسلام آباد

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

آج
(پہلی جلد)

ترتیب: اجمل کمال

Rs.795

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

ارشد محمود

R s.200

تیسری جنس
سندھ کے خواجہ سراؤں کی

معاشرت کا ایک مطالعہ

مؤلف: اختر حسین بلوچ

Rs.200

شہزادہ احتجاب
(ناول)

ہوشنگ گلشیری

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.70

ریت پہ بہتا پانی
(شاعری)

قاسم یعقوب

Rs.160

اردو کا ابتدائی زمانہ
(تنقید و تحقیق)

(تیسرا ایڈیشن)

شمس الرحمٰن فاروقی

Rs.250

امید اور دوسرے خطرناک مشاغل
(ناول)

لیلیٰ العلمی

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

Rs.100

اِنکی کے دیس میں
(ناول)

ولاس سارنگ

مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال

Rs.150

Scanned with CamScanner

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے "آج" کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے 65 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ "آج" کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مارکیز، "سرائیوو سرائیوو" (بوسنیا)، نرمل ورما، اور "کراچی کی کہانی" کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

"آج" کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور "آج کی کتابیں" اور "سٹی پریس" کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان میں: 600 روپے

بیرون ملک: 70 امریکی ڈالر

•

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

اس کے علاوہ ماہنامہ "شب خون" الہ آباد
کے بھی کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

Scanned with CamScanner

THE ANNUAL OF URDU STUDIES

Editor: Muhammad Umar Memon
(*University of Wisconsin, Madison*)
Assistant Editor: Jane A. Shum
(*University of Wisconsin, Madison*)

With the 25th (2010) issue of *The Annual of Urdu Studies*, this once-yearly publication will be available for South Asian readers in a special edition to be published by City Press.

Highlights of AUS 25 (2010)

The upcoming issue (roughly 400 pages) will include: (critical writing by) M.H. Askari, Anna C. Oldfield, Alison Safadi, Ian Bedford, Tariq Rahman, Ali Hashmi; (a Progressive Miscellany of writings by) Akhtar Husain Raipuri, M.H. Askari, Saadat Hasan Manto, Progressive Writers' Association, Zaheer Kashmiri, Aziz Ahmad); (Fiction by) Naiyer Masud, Zakia Mashhadi, Shafiqur Rahman, Mohsin Khan, Siddiq Alam; (Poetry by) Ghalib, Kaifi Azmi, Miraji, Ali Sardar Jafari, Zeeshan Sahil; and in its Urdu section: (fiction by) Naiyer Masud, Fahmida Riaz; (Poetry by) Najeeba Arif; and (book review by) Masoodul Hasan.

City Press
316 Madina City Mall Abdullah Haroon Road
Saddar, Karachi 74400

Scanned with CamScanner

قیمت

٣٠٠ روپے

آج کی کتابیں

٣١٦ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،
صدر، کراچی ٧٤٤٠٠

Scanned with CamScanner